محدثِ فقیہ، محقق متقن، نمونۂ سلف

شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف

مَعَالِمُ إِرْشَادِيَّة
لِصِنَاعَةِ طَالِبِ العِلْمِ

کا اُردو قالب

شاہ راہِ علم کے رہنما خطوط

- اسلاف بالخصوص قرونِ اولیٰ کی شاہ راہِ علم وعمل کے بنیادی خد وخال۔
- اُس دور کے علمی حلقوں کی سچی اور صاف ستھری تصویر۔
- افراد سازی کا صحیح منہج۔
- فضلائے نو کے احساسِ کمتری کے لئے تریاق۔
- اکابر و اسلاف اُمت پر اعتماد اور ان کے متوارث طریقے پر اہلِ علم کی ذہن سازی۔
- علمائے متقدمین اور اساطین امت کی ٹھوس علمی عبارتیں۔
- اور ان سب کے ساتھ ایک عالم ربانی کی وسعت علمی، قوت استنباط، طویل تجربات، قلب وجگر کی آتش سوزاں اور مسحور کن اسلوب نے کتاب میں اس طرح رنگ بھر دیا ہے کہ ایک ایک لفظ قلب و رُوح کی گہرائیوں میں اترتا اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مخصوص نمونہ پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ترجمہ

مفتی محمد قاسم نور حیدرآبادی

خادم تدریس مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند و سابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند

مکتبة الاتّحاد
دیوبند (الهند)

محدثِ فقیہ، محققِ متقن، نمونۂ سلف

شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کی شہرۂ آفاق تصنیف

معالم إرشادية

لِصِناعةِ طالبِ العِلم

کا اُردو قالب

شاہ راہِ علم کے رہنما خطوط

- اسلاف بالخصوص قرونِ اولیٰ کی شاہ راہِ علم وعمل کے بنیادی خدوخال۔
- اُس دَور کے علمی حلقوں کی سچی اور صاف ستھری تصویر۔
- افرادسازی کا صحیح منہج۔ • فضلائے نو کے احساسِ کمتری کے لئے تریاق۔
- اکابرو اسلافِ اُمت پر اعتماد اور ان کے متوارث طریقے پر اہلِ علم کی ذہن سازی۔
- علمائے متقدمین اور اساطینِ امت کی ٹھوس علمی عبارتیں۔
- اور ان سب کے ساتھ ایک عالمِ ربانی کی وسعتِ علمی، قوتِ استنباط، طویل تجربات، قلب وجگر کی آتشِ سوزاں اور مسحور کُن اسلوب نے کتاب میں اس طرح رنگ بھر دیا ہے کہ ایک ایک لفظ قلب وروح کی گہرائیوں میں اترتا اور "از دِل خیزد بر دل ریزد" کا محسوس نمونہ پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ترجمہ

مفتی محمد قاسم نور حیدرآبادی

خادمِ تدریس مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند وسابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند

مکتبۃ الاتّحاد

دیوبند (الهند)

تفصیلات

نام کتاب ــــــ: شاہ راہِ علم کے رہنما خطوط

تالیف ــــــ: شیخ محمد عوامہ حلبی حفظہ اللہ

ترجمہ ــــــ: مفتی محمد قاسم نورحیدرآبادی

خادم تدریس مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند وسابق معین دارالعلوم دیوبند

کمپوزنگ وسیٹنگ ــ: محمد محسن دیوبند 9045237896-8057239323

اشاعت اوّل ــــ: ۱۴۴۵ھ مطابق ۲۰۲۳ء

صفحات ــــــ: ۵۸۴

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

عناوین	صفحہ نمبر

عناوین	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عناوین

صفحہ نمبر	عناوین

دعائیہ کلمات

نمونۂ سلف حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی صاحب دامت برکاتہم

مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعلیم و تعلُّم کا راستہ ایک عظیم راستہ ہے؛ اِسی لیے متقدمین کے زمانے سے تعلیم کے آداب پر لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ عصرِ حاضر میں اِس موضوع پر ایک وقیع تصنیف ''معالمِ ارشادیہ'' نامور محقق ومحدث شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ کے قلم سے منظرِ عام پر آئی ہے، اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے، جس میں آیات واحادیث اور واقعاتِ سلف کی روشنی میں معلّم ومتعلّم دونوں کے لیے رہ نما خطوط، مفید نصیحتیں اور زرّیں اُصول درج کیے گئے ہیں، شیخ محمد عوّامہ نے اکابر واسلاف کی صحبت اُٹھائی ہے، ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انھوں نے ایک طویل عمر تعلیم وتربیت کے میدان میں گزاری ہے؛ اِس لیے ان کی تحریر افادیت سے بھرپور اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔

کتاب کی زبان عربی ہے، ضرورت تھی کہ اسے اُردو قالب میں ڈھال کر اِس کی افادیت کو عام کیا جائے، یہ جان کر مسرت ہوئی کہ عزیز مکرم مفتی محمد قاسم سلّمہٗ، سابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند نے بڑی محنت وجاں فشانی کے ساتھ اس پوری کتاب کو اُردو زبان میں منتقل کر کے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے، کتاب پر متعدد اہلِ علم کی تقریظات ثبت ہیں جنھوں نے ترجمہ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف ومترجم دونوں کو جزائے خیر عطا کرے، اِس کوشش کو بے حد مقبول فرمائے اور اِس کی افادیت کو عام وتام فرمائے، آمین۔

PIN- 247554 (U.P.) INDIA Tel: 01336-222429, Fax: 01336-222768 E-mail: info@darululoom-deoband.com

Ref. No.... ... . Date:....................

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعلیم و تعلّم کا راستہ ایک عظیم راستہ ہے؛ اِسی لیے متقدمین کے زمانے سے تعلیم کے آداب پر لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ عصرِ حاضر میں اِس موضوع پر ایک وقیع تصنیف ''معالمِ ارشادیہ'' نامور محقق ومحدث شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ کے قلم سے منظرِ عام پر آئی ہے، اپنے موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے، جس میں آیات واحادیث اور واقعاتِ سلف کی روشنی میں معلِّم ومتعلِّم دونوں کے لیے رہ نما خطوط، مفید نصیحتیں اور زرّیں اُصول درج کیے گئے ہیں، شیخ محمد عوّامہ نے اکابر واسلاف کی صحبت اُٹھائی ہے، ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انھوں نے ایک طویل عمر تعلیم وتربیت کے میدان میں گزاری ہے؛ اِس لیے ان کی تحریر افادیت سے بھرپور اور تاثیر سے لبریز ہوتی ہے۔

کتاب کی زبان عربی ہے، ضرورت تھی کہ اسے اُردو قالب میں ڈھال کر اِس کی افادیت کو عام کیا جائے، یہ جان کر مسرت ہوئی کہ عزیز مکرم مفتی محمد قاسم سلّمہٗ سابق معین مدرس دار العلوم دیوبند نے بڑی محنت وجاں فشانی کے ساتھ اس پوری کتاب کو اُردو زبان میں منتقل کر کے ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے، کتاب پر متعدد اہلِ علم کی تقریظات ثبت ہیں جنھوں نے ترجمہ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف ومترجم دونوں کو جزائے خیر عطا کرے، اِس کوشش کو بے حد مقبول فرمائے اور اِس کی افادیت کو عام وتام فرمائے، آمین۔

ابوالقاسم نعمانی
دار العلوم دیوبند
۲۰/۵/۴۴ھ

حوصلہ افزا کلمات

حضرت مولانا مفتی عبداللہ معروفی صاحب دامت برکاتہم

استاذِ حدیث وصدر شعبۂ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

باسمہٖ تعالیٰ شانہٗ

حامدًا ومصلّيًا ومسلّمًا وبعد؛ پیشِ نظر کتاب ''شاہ راہِ علم کے رہنما خطوط'' عالمِ اسلام کے مشہور ومستند عالمِ دین اور محقق شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ تعالیٰ کی شاہ کار تصنیف ''**معالم إرشادية لصناعة طالب العلم**'' کا اردو ترجمہ ہے، شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ اس دَور کے ان باتوفیق علماء میں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے علم وتحقیق کے میدان میں بڑے بڑے نُمایاں کام انجام دیے ہیں، وسعتِ مطالعہ اور علم میں گہرائی کے ساتھ حضراتِ سلفِ صالحین، ائمہ کرام وفقہاءِ عظام کے مقام ومرتبہ کی شناخت اور ان کے ساتھ حد درجہ ادب واحترام ملحوظ رکھنے اور اس کی تلقین وترغیب کے سلسلہ میں شیخ کی شخصیت اپنی مثال آپ ہے، آپ کی شخصیت میں آپ کے استاذ امام شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ کا عکسِ جمیل نمایاں طور پر نظر آتا ہے، بندہ راقم سطور کو جن عرب مصنّفین کو کثرت سے پڑھنے کا اتفاق ہوا اور جن کی تحقیقات وتحریرات نے بندہ کے دل ودماغ پر اپنا سکّہ جمایا ان میں شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، ان کی کتاب ''**أثر الحديث الشريف في اختلاف الأئمة الفقهاء**'' تو اپنے موضوع پر بے مثال تصنیف ہے، اس کتاب سے راقم سطور کو بہت نفع پہونچا، اللہ پاک مصنّف محترم حفظہ اللہ کو جزائے خیر

مرحمت فرمائے اور صحت وعافیت کے ساتھ ان کی عمر دراز فرمائے۔

اس کے ساتھ ہی اپنے سے تعلق رکھنے والے احباب خاص طور سے طلبۂ تخصص فی الحدیث کو بندہ ہمیشہ ان دونوں شیوخ (شیخ عبد الفتاحؒ اور شیخ محمد عوامہ) کی تصانیف مطالعہ میں رکھنے کی ترغیب دیتا رہا ہے، اسی کا اثر ہے کہ میرے متعدد احباب کو بھی ان حضرات کی کاوشوں سے خصوصی مناسبت حاصل ہوگئی ہے؛ چنانچہ عزیزم جناب مولانا محمد قاسم سلّمہ اللہ تعالیٰ جو دارالعلوم دیوبند کے شعبہ تخصص فی الحدیث سے فارغ ہیں ان کے دل میں **"معالم إرشادية"** کا اُردو ترجمہ کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور انہوں نے بڑی باریکی اور دلچسپی سے کتاب کا مطالعہ فرمایا، پھر نہایت کامیابی کے ساتھ سلیس اور عام فہم زبان میں کتاب کے مضامین اُردو زبان میں منتقل فرمادیے، بندہ نے متعدد مقامات پر نظر ڈالی، زبان کی سلاست وروانی سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مستقل تصنیف ہے، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی اس خدمت کو قبول فرمائیں اور مزید علمی کاموں کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

بندہ جملہ اہلِ علم، طلبہ اور تصنیف وتالیف یا دعوت وارشاد سے تعلق رکھنے والے سبھی حضرات سے اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہے، اِس طرح کی کتابیں کم ملتی ہیں، اُمید کہ اہلِ علم حضرات کی نظر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ فقط

(عبد اللہ معروفی غفرلہٗ)

خادم طلبۂ شعبۂ تخصص فی الحدیث الشریف دارالعلوم دیوبند

۲۵/رجب المرجّب ۱۴۴۴ھ

کلماتِ بابرکات

حضرت مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری صاحب دامت برکاتہم

استاذِ حدیث وفقہ دار العلوم دیوبند

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم، أمّا بعد!

مدارسِ اسلامیہ کے اساتذۂ کرام اور طلبہ عزیز کو درس وتدریس کے دَوران کن ضروری آداب وشرائط کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟ تاکہ وہ علم کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچ سکیں، اِس کے متعلق دَورِ حاضر کے عظیم محدث اور محقق نمونۂ اَسلاف شیخ محمد عوامہ حلبی حفظہ اللہ تعالیٰ کی تحریر کردہ کتاب ''**معالم إرشادية لصناعة طالب العلم**'' بلاشبہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اِس کتاب کا ورق ورق روشن ہدایات پر مشتمل ہے، آیات واحادیثِ مبارکہ، آثارِ سلف اور علماء واکابر کے سبق آموز واقعات کا یہ ایسا حسین امتزاج ہے کہ اُسے بار بار پڑھنے کے باوجود طبیعت سیر نہیں ہوتی، اور ہر مرتبہ اس کے مطالعہ سے تحصیلِ علم کی راہ میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا داعیہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

بحمدہٖ تعالیٰ احقر نے بھی اِس کتاب سے بہت استفادہ کیا، پھر اس کے منتخب مضامین ''**طلبہ اور علماء کے لیے فکر اَنگیز اور کارآمد باتیں**'' کے نام سے اُردو میں شائع کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

اَب یہ معلوم ہوکر بہت مسرت ہوئی کہ ''مدرسہ اَصغریہ دیوبند'' کے اُستاذِ گرامی، فاضل نوجوان جناب مولانا مفتی محمد قاسم صاحب حیدرآبادی زیدعلمہٗ سابق معین المدرسین دارالعلوم دیوبند نے پوری کتاب کا اُردو میں بعینہٖ مکمل ترجمہ فرمادیا ہے۔ احقر نے اس کے مسوّدہ پر نظر ڈالی، ماشاءاللہ بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ اس کی وجہ سے کتاب کا دائرۂ افادہ مزید وسیع ہوگا، اِن شاءاللہ تعالیٰ۔

اللہ تعالیٰ موصوف کی کاوش کو قبول فرمائیں، اور اِس طرح کی مزید خدمات کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

فقط والسلام

احقر محمد سلمان منصور پوری غفرلہٗ

خادمِ تدریس دارالعلوم دیوبند

۹؍جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ مطابق ۴؍دسمبر ۲۰۲۲ء بروز اتوار

مقدّمہ

حضرت مولانا مفتی محمد ساجد صاحب دامت برکاتہم

استاذِ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أمّا بعد!

مشہور محدث ومحقق علامہ شیخ محمد عوّامہ (حلب، شام) عالمِ اسلام کی ایک عبقری ونابغۂ روزگار شخصیت ہیں، تبحر علمی، وسعتِ مطالعہ تحقیق وتدقیق، حفظ واستحضار اور استنباط واستخراج کے اعتبار سے آپ کی مثال ملنی مشکل ہے۔ آپ کی معرکہ آراء تصنیفات وتحقیقات: **"أدب الاختلاف في مسائل العلم والدين"**، **"أثرالحديث في اختلاف الأئمة الفقهاء"**، **"تحقيق وتعليق مصنّف ابن أبي شيبة"** اور **"معالم إرشادية لصناعة طالب العلم"** آپ کے تبحر علمی اور وسعتِ مطالعہ کا بیّن ثبوت ہیں۔

ہم دست کتاب علّامہ موصوف کی مؤخرالذکر کتاب **"معالم إرشادية لصناعة طالب العلم"** کا اردو ترجمہ ہے، اس کے ترجمے کی سعادت عزیز مکرم جناب مولانا محمد قاسم حیدرآبادی (سابق معین مدرس دارالعلوم دیوبند) نے حاصل کی ہے۔ مترجم موصوف نے اس کتاب کا اُردو ترجمہ کر کے اُردوداں طبقہ کے لیے اس عربی کتاب سے استفادہ کی راہ نکال دی ہے۔ اللہ تعالیٰ موصوف کو بہت بہت جزائے خیر عطا فرمائے۔

اِس کتاب کی تالیف کا اصل محرک عصرِ حاضر کے کالج اور یونیورسٹیوں میں رائج

طریقۂ تعلیم و تعلّم ہے، جس سے طلبہ میں نہ علمی گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے اور نہ وقار وسنجیدگی اور نہ علما کا ادب واحترام؛ نیز وہ اصل علمی سرمایہ سے بھی دُور رہتے ہیں اوران کے اندر وہ صفات وکمالات پیدا نہیں ہوتے ہیں جو اَسلاف واکابر میں ہوا کرتے تھے؛ بلکہ اس کے بجائے ان میں سطحیت، خودرائیت اور ادعائیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ علما کی تجہیل کرتے ہیں اوران کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔

اس کے برعکس شیخ نے اس کتاب میں اسلاف اور کبار علما کے منہج اوران کے اقوال کی روشنی میں ''تحصیلِ علم کا طریقہ'' پیش کیا ہے؛ تاکہ طالبِ علم اِس طریقے کے مطابق علم حاصل کرے، جس سے اُس کے اندر اسلاف کی طرح اخلاص وللّٰہیت، علمی تبحر، علم وعمل کی جامعیت، نفع رسانی جیسی صفات پیدا ہوں۔

ساتھ ہی کتاب میں اساتذہ کو اپنے طلبہ کی تربیت اوران کی کردار سازی کے رہنما خطوط بھی بتائے گئے ہیں؛ تاکہ ان پر چلتے ہوئے وہ ان کی تربیت کریں اوران کو مستقبل میں علمی ذمے داری سنبھالنے کے لیے تیار کریں۔

ماضی وحال میں تحصیلِ علم اور طریقۂ تعلّم اور علم کے لیے محنت وجاں فشانی، وقت کی قدردانی، شوق وولولہ، بلندحوصلگی وغیرہ کے موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں؛ لیکن مذکورہ کتاب اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور معلومات سے پُر ہے، کتاب کو بنیادی طور پر چارابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے دوباب کا تعلق طالبِ علم سے ہے، جب کہ دوسرے دوباب کا تعلق ان کے مربی اساتذہ سے ہے۔

پہلے باب میں بتایا گیا ہے کہ کتاب میں جس علم سے بحث کی جارہی ہے اُس سے مرادعلمِ شرعی ہے؛ چناں چہ کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس کے علم کو علمِ شرعی کہا جاتا ہے؛ نیز علمِ نافع وغیر نافع کی تعیین بھی کی گئی ہے، علمِ نافع میں اضافہ مطلوب ہے جبکہ علمِ غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے۔

اِس باب کی فصول میں علمِ شرعی کے حصول کا منہج، علم کی فضیلت، علما کی مجالس کی اہمیت اور اِس سلسلے میں ان کے اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔

دوسرے باب میں راہِ علم کے نشانات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ نشانات یہ ہیں: تحصیلِ علم میں اخلاص، طالبِ علم کی اپنے مقام و مرتبے سے واقفیت، تحصیلِ علم کے لیے ذہانت وذکاوت کی اہمیت، وقت کی قدر و قیمت، بلند حوصلگی، یکسوئی، اچھے طلبہ کی صحبت، اساتذہ سے علم کا حصول، استاذ کا انتخاب، استاذ کی صحبت، ادب وشائستگی، تحصیلِ علم میں صبر واستقامت، مطالعہ وتکرار، مذاکرہ کی اہمیت اور علم کے لیے ذوقِ جستجو وغیرہ۔

یہ وہ نشانات ہیں کہ جن کی مدد سے ایک طالبِ علم، علم کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔

تیسرے باب میں استاذ کی طلبہ کی تربیت کے تئیں ذمے داریاں بتائی گئی ہیں، استاذ سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ طلبہ کو مفید چیزیں حفظ کرائے، ان کی زبان کی غلطیاں درست کرائے، ان کو الفاظ کی تحقیق کا عادی بنائے، ان کو اس کا خُوگر بنائے کہ وہ جمہور علمائے اسلام کے منہج کا التزام کریں اور تفرد اور شذوذ پسندی سے گریز کریں، اصلی مآخذ سے مراجعت کریں، استاذ کی زیرِ نگرانی فتویٰ نویسی کی مشق کریں۔ جو بات معلوم نہ ہو اُس کے بارے میں بلاتکلّف ’’مجھے معلوم نہیں ہے‘‘ کہنے کا عادی بنائیں، اپنے زمانے کے احوال سے واقف رہیں اور تعمیری تنقید کا ملکہ پیدا کریں وغیرہ اُمور کو اِس باب میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں بھی اساتذہ کے طلبہ کی تربیت کے تعلق سے کچھ ناگزیر ہدایات دی گئی ہیں؛ تاکہ اساتذہ ان کی روشنی میں طلبہ کی تربیت کریں: مثلاً اساتذہ اپنے طلبہ کی کردار سازی میں تدریج سے کام لیں، وہ ان کے اندر اپنے علم پر عمل کرنے کا مزاج پیدا کریں، متقدمین علما کی سیرت وسوانح عمری پڑھنے کی تلقین کریں، دنیا اور اہلِ دنیا کے مال ومتاع سے گریز کریں۔

اِس طرح وہ اپنے طلبہ کی تربیت کر کے ان صفات وکمالات سے آراستہ کریں؛ تا کہ وہ صحیح معنیٰ میں علما بن کر تیار ہوں۔

بہر حال کتاب اپنے موضوع پر بہت اہم ہے، یہ طلبہ اور علما کے لیے انتہائی مفید ہے، درحقیقت یہ انہی کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے لیے انتہائی قیمتی اور ناگزیر معلومات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ اِس کتاب سے طلبہ وعلما کو نفع پہنچائے، اور مؤلف ومترجم کے لیے اسے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

محمد ساجد قاسمی

مدرّس دار العلوم دیوبند

۲۶؍صفر ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۴؍ستمبر ۲۰۲۲ء

تأثرات

حضرت مولانا مفتی محمد مصعب صاحب دامت برکاتہم

نائب مفتی دارالعلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِس دَور کے عظیم محقق، محدثِ ناقد شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ ورعاہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ اپنے خصوصی استاذ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ وفقیہانہ ذوق کے اَمین اور سچے جانشین ہیں۔

موصوف کی شاہ کار تصنیف "**معالم إرشادية لصناعة طالب العلم**" اُن کے رُسوخ فی العلم، وسعتِ علمی، دقتِ نظری، درایت وفقاہت، علمی غیرت، تحقیق واتقان اور سلفِ صالحین کی پیروی جیسی بیش بہا صفات کا آئینہ دار ہے۔

کئی سال قبل بندے کو اِس کتاب سے استفادے کا جب موقع ملا تو تعلیم وتعلّم کی پُرخطر اور پُرعظمت طویل شاہ راہ کا احساس دوبالا ہوگیا، اس کے بعد سے مسلسل یہ کتاب الحمدللہ بندے کے مطالعہ میں ہے، یہ کتاب ایک طالبِ علم کے لیے مستقل رہبر اور ذہن ساز ہے، کتاب کی سطر سطر فکر انگیز اور دل ودماغ کی گرہوں کو کھولنے والی ہے۔

دَورانِ مطالعہ بار ہا خیال آیا کہ اس شاہ کار کتاب کا سلیس اُردو ترجمہ ہونا چاہیے؛ تاکہ اس سے استفادہ وسیع اور عام ہو، اِسی دَوران لاک ڈاؤن کا حادثہ پیش آگیا، مدارس میں درس وتدریس کا سلسلہ موقوف ہوگیا، بندے نے موقع کو مناسب خیال کرتے ہوئے اپنے

دیرینہ رفیق، عزیز گرامی حضرت مولانا مفتی محمد قاسم نُور صاحب حیدر آبادی (سابق معین مدرّس دارالعلوم دیوبند) سے اُردو ترجمہ کی درخواست کی، موصوف قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے صرف تین یا چار ماہ کے اندر پانچ سو صفحات پر مشتمل اس بے نظیر کتاب کا ترجمہ مکمل کرلیا حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم مدت میں ایسا سلیس اور رَواں دَواں ترجمہ! شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ ورعاہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے احساس تھا کہ اِس کی اُردو ترجمانی آسان نہیں ہوگی؛ اِس لیے کہ شیخ علمِ لغت کے بھی ماہر ہیں اور الفاظ کے انتخاب اور تعبیرات کے تعلق سے کافی دقت سے کام لیتے ہیں؛ لیکن مفتی قاسم صاحب جوخود اُردو ادب اور عربی ادب دونوں میں مہارت رکھتے ہیں، اُنھوں نے خدا تعالیٰ کی توفیق ومدد، فنی مہارت اور اپنے صاف ستھرے ذوق کی وجہ سے بلاشبہ ترجمانی کا حق ادا کردیا، مزید برآں کتاب کے شروع میں ایک مفصّل مقدمہ لکھ کر پوری کتاب کے مغز اور نچوڑ کو پیش کردیا ہے، مقدمہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف مترجم نے کتاب کی عبارت کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے؛ بلکہ شیخ کے فکرواحساس کا بھرپور ادراک حاصل کرنے کے بعد مضامین کی تہہ میں جا کر بہترین ترجمانی کی ہے، یہ مقدمہ بجائے خود ان شاء اللہ مہمیز کا کام دے گا۔

موقع کی مناسبت سے شیخ کی ایک دوسری کتاب **"أثر الحديث الشريف في اختلاف الفقهاء"** کی طرف بھی توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ بھی وہ تجدیدی کتاب ہے جس کو بعض محققین نے **"كتاب القرن الخامس عشر"** کا لقب دیا ہے، جس کا بنیادی موضوع **"معرفة الربط بين الحديث والفقه"** ہے، اہلِ علم موجودہ وقت میں اس موضوع کی اہمیت سے واقف ہی ہیں، کتاب کی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا قدس سرہٗ (۱۳۱۵ھ/ ۱۴۰۲ھ) نے اپنی تقریظ میں ہر مدرس اور ہر طالبِ علم کے لیے اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

”إنها مجتنبة عن الزيغ والطغيان، ومنجية عما يقع في شأن الأئمة من أهل العدوان وأصحاب الحرمان“.

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس نہایت قیمتی کاوش کو قبولیت عطا فرما کر اس کا نفع عام فرمائے اور صاحبِ ترجمہ کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

وصلّى الله تعالىٰ علىٰ سيّدنا ومولانا محمد خاتم النبيّين وعلىٰ آله الأطهار الطيّبين، ورضي الله تعالىٰ عن صحابته الكرام الغر الميامين، أجمعين، والحمد لله رب العالمين.

کتبہٗ
محمد مصعب عفی عنہٗ
خادم دار الافتاء دار العلوم دیوبند
۲۶/۷/۱۴۴۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مترجم

زیرِ نظر کتاب عالمِ ربانی، محققِ کبیر، محدثِ جلیل، نمونۂ سلف حضرت شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ کی مایہ ناز اور شہرۂ آفاق تصنیف **"معالم إرشادية لصناعة طالب العلم"** کا اُردو ترجمہ ہے جو مخدومِ گرامی حضرت مولانا مفتی محمد مصعب صاحب دامت فیوضہم (نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) کی عنایات اور توجہات کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، جن کی خوردنوازی، حوصلہ افزائی اور مسلسل خبر گیری ہی اس ترجمہ کے معرضِ وجود میں آنے کا ذریعہ بنی، اللہ تعالیٰ مفتی صاحب موصوف کو اپنے شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے۔

لاک ڈاون کے زمانے میں جب کہ درس وتدریس کا سلسلہ یکسر موقوف تھا اس ترجمہ کا آغاز کیا، پانچ سو بیالیس (۵۴۲) صفحات پر مشتمل کتاب کا ترجمہ مجھ جیسے نو آموز کے لیے ایک دشوار گذار کام تھا؛ کیوں کہ یہ ترجمہ کی راہ کا بالکل اوّلین قدم اور ابتدائی تجربہ تھا، ترجمہ نگاری کی کٹھنائیاں اور دُشواریاں اس پر مستزاد تھیں، قلم وقرطاس سے دلچسپی رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ اپنے قلبی واردات اور ذاتی خیالات کو سپردِ قلم کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے بہ نسبت ترجمہ نگاری کے، جس میں اپنی بات کہنے کے بجائے کسی اور شخص کے الفاظ کو اس طرح ادا کرنا ہوتا ہے کہ قاری کے سامنے مراد بھی واضح ہو اور متکلم کی منشا بھی پوری ہو جائے، اور جب ترجمہ کسی ایسی شخصیت کی تحریر کا ہو جو اپنا ایک ایک لفظ ناپ اور تول کر لکھتا ہے تو یہ دشواری اور بڑھ جاتی ہے؛ اِس لیے جا بجا صعوبتیں پیش آئیں؛ لیکن مفتی صاحب دامت برکاتہم کی تحریک وتحریض اور خدائے کریم کا فضل وکرم مساعد ومددگار رہا اور ٹھیک چار ماہ میں

ترجمہ کا یہ مرحلہ مکمل ہو گیا، جس کے ساتھ ہی یہ سطور شیخ کے علوم کو امت تک پہنچانے کے لیے واسطہ بن گئیں، فللہ الحمد والمنۃ۔

شیخ محمد عوّامہ حفظہ اللہ کی یہ کتاب درحقیقت تعلیم وتعلّم کے آداب پر لکھی جانے والی ان تمام کتابوں کا ایک حسین گلدستہ ہے جو اَسلاف کے قلمِ گہر بار کی عظیم شاہ کار ہیں، اس گلدستہ میں شیخ کی وسعتِ مطالعہ، حدتِ فہم اور قلبی درد وکُڑھن نے مزید نئے گوشے پیدا کر کے اس کی نافعیت اور افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں، یہ کتاب محض کتاب نہیں؛ بلکہ نئی نسل کی تربیت اور اَسلاف کے بتائے ہوئے خطوط پر ان کی ذہن سازی کا ایک مؤثر سامان ہے، اس کتاب کو پڑھنے والا اپنے آپ کو اَسلاف کے درمیان محسوس کرتا ہے، اور ان کے چشمۂ فیاض سے براہِ راست استفادہ کرتا ہے، اسلاف کی ٹھوس علمی عبارتیں اور ان کی چشم کشا ہدایات کے ساتھ شیخ کی نُورانی تحریریں قاری کو کسی اور ہی جہاں میں لے جاتی ہیں، جہاں آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹتے ہیں، کمیاں اور کوتاہیاں ایک ایک کر سامنے آتی ہیں، سوچ وفکر کے بگڑے ہوئے زاویے درست ہوتے ہیں، احساسِ کمتری جذبۂ شکر میں تبدیل ہوتی ہے، خوابیدہ جذبات پھر سے بیدار ہوتے ہیں اور مستقبل کے لیے بند راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

چونکہ شیخ کے الفاظ نپے تلے اور دریا بہ کوزہ ہوتے ہیں؛ اِس لے راقم نے دَورانِ ترجمہ ترجمانی پر اکتفا کرنے کے بجائے الفاظ وتعبیرات کی حددرجہ پاس داری کی کوشش کی ہے، جس سے بعض موقعوں پر اغلاق بھی ہوا، محض ترجمانی بھی نہیں کی گئی کہ شیخ کے الفاظ کی معنویت ختم ہو جائے، اور محض ترجمہ پر بھی اکتفا نہیں کیا گیا کہ مفہوم کے سمجھنے میں دشواری ہو، درمیان کا راستہ اختیار کیا گیا، کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو ایک آدھ لفظ بین القوسین بڑھا دیا؛ البتہ مفتی صاحب کے مشورے سے ذیلی عناوین کا بہ کثرت اضافہ کیا جس کا فائدہ ان شاء اللہ قارئین محسوس کریں گے۔ کتاب کے آغاز میں اصل کتاب ''معالمِ ارشادیہ'' کا

ایک تفصیلی تعارف بھی شامل کیا گیا ہے جس میں کتاب کی خصوصیات کے عنوان سے کتاب کے اہم اہم اقتباسات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، خصوصیات تو راقم کے ذاتی خیالات ہیں جن سے ہر ایک کا اتفاق ضروری نہیں؛ لیکن اقتباسات شیخ کے ہیں جن سے قارئین کو کتاب کی اہمیت کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور ہوگا۔

مَیں اِس موقع پر بے حد شکر گزار اور ممنونِ کرم ہوں مخدومِ گرامی سیّدی وسندی حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کا جنھوں نے اپنی تقریظ کے ذریعہ اِس طالبِ علمانہ کاوش کو سندِ اعتبار واعتماد عطا کیا، اللہ تعالیٰ حضرت کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے اور ان کے فیوض سے ہمیں اور پوری امت کو متنفع فرمائے، ساتھ ہی اپنے انتہائی مشفق ومکرم اساتذۂ کرام حضرت مفتی عبداللہ معروفی صاحب دامت برکاتہم (استاذِ حدیث وصدر شعبۂ تخصّص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند) اور حضرت مفتی محمد ساجد صاحب دامت برکاتہم (استاذِ تفسیر وادب دارالعلوم دیوبند)؛ نیز حضرت مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری دامت برکاتہم (استاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند) کے لیے بھی دل تشکر وامتنان کے جذبات سے لبریز ہے جنھوں نے اپنے تقریظی کلمات کے ذریعہ ناچیز کو اپنی حوصلہ افزائیوں سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان تمام اکابر کو اپنے خزانۂ غیب سے بھر پور بدلہ عطا فرمائے۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اِس موقع پر اپنے کرم فرما مفتی محمد عثمان صاحب زید مجدہٗ (صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند) کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے ترجمہ کی کتابت میں بھر پور ساتھ دیا، **فجزاه الله خيرا وأحسن الجزاء**۔

محمد قاسم نُور

خادم تدریس مدرسہ اسلامیہ اصغریہ دیوبند

۲۹ رجب ۱۴۴۴ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

معالم إرشادية ــــ ایک تعارف

نحمده ونصلي علىٰ رسوله الكريم، أما بعد!

''معالم ارشادیہ'' نامی یہ کتاب ایک ایسے عالم ربانی کے قلم سے نکلی ہوئی کتاب ہے جنھوں نے دیدہ ونادیدہ دونوں قسم کے اکابر واسلاف کی طویل صحبتیں اُٹھائی ہیں، جن کا دل امت کی زبوں حالی پر کُڑھتا اور تڑپتا ہے اور علم اور اسبابِ علم پر غیرت کھاتا ہے، جن کی تحریریں اپنے جلَو میں ایک عجیب تاثیر اور روحانیت لیے ہوتی ہیں کہ ایک ایک لفظ قلب وروح کی گہرائیوں میں اُترتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا محسوس نمونہ پیش کرتا ہے۔

کتاب کے آغاز سے پہلے کتاب کا تعارف ایک ضروری امر معلوم ہوتا ہے؛ لیکن یہ امر جتنا ضروری ہے اتنا ہی دشوار گزار بھی ہے، کہ مجھ جیسے طالبِ علم سے ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے قلمِ گہر بار سے نکلی ہوئی ایک شہرہ آفاق کتاب کے تعارف کا حق کیونکر ادا ہوسکتا ہے، ذیل کی سطور صرف وارداتِ قلب ہیں جو دورانِ ترجمہ راقم کو محسوس ہوئے، جنھیں اس غرض سے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے کہ شاید یہ چند حروف قارئین کے کتاب کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بن جائیں اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت کا کچھ سامان ہوجائے، واللہ الموفق والمعین۔

کتاب کا موضوع:

کتاب کا نام ''**معالم إرشادية لصناعة طالب العلم**'' ہے، **معالم:** **معلم** کی جمع ہے، جس کے معنی چراغِ راہ کے ہیں، اور **إرشادية: إرشاد** بمعنی رہنمائی کی طرف منسوب ہے، پس ''**معالم إرشادية لصناعة طالب العلم**'' کے معنیٰ ہیں:

طالبِ علم کے لیے رہنمائی کرنے والے چراغ، خود مصنف نے کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے، جس سے کتاب کے موضوع پر بھی روشنی پڑتی ہے، لکھتے ہیں:

''چونکہ علم کا یہ راستہ طویل اور مشقتوں سے پُر تھا؛ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ جب طلبہ کے سامنے یہ راستہ بیان کروں تو درمیان میں کچھ چراغ، کچھ روشنی کے مینارے اور کچھ منزلیں بنادوں، جو اُن کے لیے رہنمائی کا کام دیں اور راستہ کو روشن کر دیں اور ان چیزوں کا نام میں نے ''معالم'' رکھا ہے۔''

اِس کتاب میں کل چار باب ہیں: پہلے باب میں علم اور علماء کی اہمیت وفضیلت پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرا باب طالبِ علم سے متعلق ہدایات کے ساتھ مختص ہے، تیسرے باب میں استاذ کے لیے بحیثیتِ معلّم ہدایات ہیں اور چوتھے باب میں استاذ ہی کے لیے بحیثیت مربی ہدایات ہیں اور اخیر میں ایک خاتمہ ہے، جس میں ابو حامد محمد عربی بن یوسف فاسیؒ کی ایک مختصر مگر انتہائی قیمتی نصیحت ہے، یہ ابواب اپنے مشمولات کے اعتبار سے نہایت قیمتی جواہرات پر مشتمل ہیں۔

کتاب کی اہمیت وخصوصیات

اِس کتاب کی اہمیت اور خصوصیات پر کچھ لکھنا واقعی بڑا مشکل کام ہے، کون سا ایسا صفحہ اور کون سی ایسی سطر ہے جو اہم نہیں، اور اہمیت کا کوئی ایک پہلو ہو تو ذکر کیا جائے، خصوصیات کے دو چار گوشے ہوں تو گنوائے جائیں، یہاں تو ہر چیز بے شمار ہے، اور بے شمار بھلا شمار میں کب آسکتا ہے؟!۔

(۱) اسلاف کی کتابوں کا نچوڑ:

کتاب جس موضوع سے متعلق ہے اُس پر ائمۂ اسلاف: امام غزالی، ابنِ جماعہ، زرنوجی، خطیب اور ابنِ عبد البر رحمہم اللہ نے بھی بہت کچھ لکھا ہے؛ لیکن اس کتاب کی خوبی یہ

ہے کہ اس کے اندر نہ صرف ان تمام کتابوں سے مغز اور مکھن لے کر نہایت عمدہ ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، جس سے یہ کتاب ایک حسین گلدستہ بن گئی ہے؛ بلکہ شیخ نے بہت سے مخفی اور نایاب ذخیروں سے بھی استفادہ کیا ہے، جس کا اندازہ مراجع ومصادر کی فہرست سے لگایا جاسکتا ہے، جو دوسو (۲۰۰) سے زائد کتابوں پر مشتمل ہے، جن میں سے بظاہر اکثر پر شیخ کی استیعابی وعقابی نظر پڑ چکی ہے اور ان سے ایسے استنباطات کیے گئے ہیں جو شیخ کے ذہنِ رسا کا بین ثبوت بھی ہیں اور قاری کے لیے ذہن سازی کا مؤثر سامان بھی۔

(۲) علم وطریقۂ تعلیم متوارث ہیں:

یہ کتاب اس حقیقت کو واشگاف کرتی ہے کہ علم اور تربیت کا یہ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توارثاً سلسلہ درسلسلہ چلا آرہا ہے، لہٰذا علم ان ہی علماء سے علم حاصل کیا جائے، جن کے پاس یہ علم وعمل سینہ بہ سینہ متوارث طریقے سے پہنچا ہو، باقی کسی ایسے شخص سے علم حاصل کرنا جس کا سارا علم یا بیشتر علم کتابوں سے اخذ کردہ ہو، انتہائی نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے، چنانچہ امام غزالیؒ کے ایک اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ لکھتے ہیں:

> اس اقتباس میں نئی بات یہ ہے کہ امام غزالیؒ اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ شیخ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا اتباعِ متوارث ہو، جو ایک عالمِ ربانی سے دوسرے عالمِ ربانی کی طرف اور ایک پیر سے دوسرے پیر کی طرف تسلسل وتوارث کے ساتھ زبانِ قال سے زیادہ زبانِ حال سے منتقل ہوتا ہوا آیا ہو۔

کتاب یہ بھی سمجھاتی ہے کہ تعلیم وتعلّم کا راستہ معلوم ومتعین ہے، جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو چلایا اور صحابہؓ نے اپنے بعد والوں کو، اور اس طرح توارث کے ساتھ یہ طریقہ نسلاً بعد نسل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے، حالات چاہے جتنے بھی بدل جائیں، تغیرات چاہے جتنے بھی وقوع پذیر ہوں، دین اور علمِ دین کی حفاظت اسی وقت ہوسکتی ہے جب ان ہی پُرانے طریقوں پر جمود اختیار کیا جائے، یہ ایک اجمالی فکر ہے، جو

پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہے، شیخ لکھتے ہیں:

"اسی لیے میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں، میں درخواست کرتا ہوں اور پورے اصرار کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ: خدا کے لیے اہلِ علم میں جو بڑے حضرات بچے ہوئے ہیں، وہ تعلیم کی اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کو درست کرنے کی فکر فرمائیں اور بطورِ خاص تعلیم کے ان پُرانے حلقوں اور حلقوں کے اندر اپنائے جانے والے تعلیم کے ان پُرانے طریقوں کو دوبارہ زندہ کریں، جن کو اپنا کر ہمارے اسلاف کامیاب ہوئے اور جن کے ذریعہ انھوں نے اس علم کو سیکڑوں سال بعد آنے والی نسلوں تک بالکل تروتازہ پہنچا دیا۔

(۳) احساسِ کمتری کے لیے تریاق:

یہ کتاب پڑھ کر ایک قاری کا یہ ذہن بنتا ہے کہ ایک عالم کے عالم بننے کا سب سے اہم مقصد تدریس، تصنیف، امامت، خطابت اور دعوت وارشاد ہے، بالفاظ دگر جو امانت اپنے اساتذہ سے حاصل کی ہے، اس کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنا یہی اس کا سب سے اہم کام ہے، طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ اپنے مقام ومرتبہ کا ادراک کرے کہ کس عظیم نعمت سے خدا نے اسے نوازا ہے، دنیوی مناصب اور عہدے اسے ہرگز مرعوب ومتاثر نہ کرنے پائیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ درس وتدریس اور کتابوں میں انہماک آدمی کو قدامت پسندی اور رجعیت دکھائی دینے لگتی ہے، امامت وخطابت اور امت کی شرعی رہنمائی ایک حقیر چیز نظر آنے لگتی ہے، حتیٰ کہ اپنے اکابر واساتذہ کی عظمت ووقعت بھی دل میں نہیں رہ جاتی، یہ کتاب اس زہر کے لیے تریاق کی حیثیت رکھتی ہے

شیخ لکھتے ہیں:

طالبِ علم اپنی آنے والی ذمہ داری کی عظمت کا ادراک کرے، وہ مستقبل قریب میں ان شاء اللہ مسلمانوں کے لیے ان کی نمازوں کا امام، ان کا خطیب، ان کا مفتی، اور

دینی اور دنیوی اُمور میں انھیں اللہ کے احکام بتلانے والا ہوگا؛ لہٰذا وہ اللہ کی اس عطا پر ناز کرے اور فخر کرے، وہ ہرگز یہ خیال دل میں نہ لائے کہ وہ کمزور ہے اور اس کے ابتدائی درجوں کے ساتھی کامیاب نکل گئے، کہ کوئی ڈاکٹر بن گیا، کوئی انجینئر بن گیا، کوئی تاجر بن گیا اور وہ تو بس وہیں کا وہیں رہا! ایک مدرسہ کا طالبِ علم! ایک مسجد کا امام! جمعہ کا ایک خطیب! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہارا کسی کام کا حکم دینا، کسی کام سے روکنا، کسی چیز کو حلال قرار دینا، کسی چیز کو حرام قرار دینا، یہ درحقیقت اللہ کا حکم دینا، اللہ کا منع کرنا، اللہ کا حلال اور حرام کرنا ہے، اب تمہاری زبان سے نکلی ہوئی بات تمہاری نہیں؛ بلکہ اللہ کی بات ہوتی ہے، تمہاری بات کی تائید اللہ رب العزت کرتے ہیں، بھلا اس سے بھی بڑھ کر کوئی شرف اور اعزاز ہوسکتا ہے؟ تم مسجد کے امام نہیں؛ بلکہ بندوں اور ان کے رب کے درمیان ایک واسطہ ہو، لوگوں کی نماز تمہاری نماز سے وابستہ ہے، لوگوں کا اللہ سے تعلق تمہاری وجہ سے ہے۔

ایک دوسری جگہ منصبِ افتاء کے بارے میں رقم طراز ہیں:

یہ کوئی معمولی منصب نہیں ہے، یہ اللہ کی جانشینی کا منصب ہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا منصب ہے، یقیناً یہ دنیا کا سب سے معزز اور سب سے عظیم منصب ہے، سوچیے جب آج کا یہ طالبِ علم، جو کل کا عالم اور مستقبل کا مفتی ہوگا، اس ذات کی طرف سے دستخط کرنے کا اہل بننے والا ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، جو آسمان وزمین کا حکمراں ہے، تو کیا اس رفعت وبلندی کی کوئی انتہا ہوسکتی ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

اس علمِ شرعی اور میراثِ محمدیؐ کو اس لیے مدوّن نہیں کیا گیا تھا کہ اسے دماغوں میں محفوظ کرلیا جائے یا محاضرات اور سمیناروں میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے؛ اس علم کی تدوین احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ہوئی ہے، اس کی تدوین اس لیے

ہوئی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس کو پھیلایا جائے اور آنے والی نسلوں تک اسے صحیح اور صاف ستھری شکل میں پہنچایا جائے، جو ہر قسم کی نفسانی خواہشات اور ذاتی رجحانات کی آلودگیوں سے پاک ہو۔

(۴) تلقی عن الشیوخ کی اہمیت:

آج علمی دنیا بالخصوص عرب ممالک کے اندر جو انتشار، خودرائی اور شذوذ کا طوفان بپا ہے، اس کا اہم سبب تلقی عن الشیوخ بلکہ ملازمت شیوخ کا فقدان ہے؛ شیخ نے اس موضوع پر بہت لکھا ہے اور مستقل باب کے علاوہ بھی جہاں کہیں موقع ملا اس کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

کسی شیخ سے صرف ایک یا دو سال علم حاصل کر کے پھر خود ہی سے پڑھنے اور سمجھنے لگ جانا، اور مطالعہ ہی سے سب کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرنا، اور بھی اس قسم کے عجیب وغریب کام جو عجائبات کے اس دَور میں نوجوان کر رہے ہیں، یہ ہرگز ہرگز ہمارے اسلاف کا طریقۂ کار نہیں ہے۔

(۵) اصل موضوع کی تہوں میں غیر متعلقہ قیمتی شہ پارے:

کتاب گرچہ بنیادی طور پر تعلیم وتعلم کے موضوع کے اردگرد گھومتی ہے؛ لیکن ایک طرف شیخ کی علمی گہرائی وگیرائی اور پھر اُن کا دردوکُڑھن؛ اس کتاب میں بہت سی باتیں ایسی آگئی ہیں جو بجائے خود نہایت اہمیت کی حامل ہیں، جن سے بالعموم اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں خالی ہیں، میں ''مشتے از خروارے'' کے طور پر کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں:

(ا) ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلم معاشرے کو تین قسم کے علماء کی ضرورت ہے، ایک وہ جو منبر ومحراب کی ذمہ داری سنبھال سکیں، دوسرے وہ جو دین کے عمومی مسائل میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں اور تیسرے وہ جو اپنی علمی گہرائی وگیرائی کی بنا پر مشکل اور

پیچیدہ مسائل میں امت کی شرعی رہنمائی کرسکیں اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے ہونے والے حملوں کا منہ توڑ جواب دے سکیں، اس تیسری جماعت کے بارے میں شیخ لکھتے ہیں:

واضح رہے کہ یہ جماعت کسی ایک ملک کے لیے نہیں ہوتی؛ بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے، خواہ وہ کہیں کے بھی ہوں؛ اس لیے اس جماعت کو تیار کرنا اور اس کے لیے افراد و وسائل مہیا کرنا پوری امت کی ذمہ داری ہے، اور ضروری ہے کہ یہ جماعت مسلسل بڑھتی اور ترقی کرتی رہے؛ کیونکہ مسلمانوں پر شبہات اور گمراہی کی راہیں کھولنے والوں کی طرف سے اس جماعت کی ضرورت اور حاجت بھی مسلسل بڑھتی ہی رہتی ہے۔

(۲) متون کی جو شروحات لکھی گئیں، ان کے بارے میں یہ عام شکایت رہتی ہے کہ ان سے کتاب حل نہیں ہوتی، شیخ اس عقدے کو حل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مبتدی طلبہ کے لیے مختصر کتابچے لکھے گئے، جنھیں ہم اور آپ ''متون'' کہتے ہیں؛ تا کہ وہ پہلے ان کو قابو میں کرلیں، پھر ان سے کچھ بڑی کتابوں کی طرف منتقل ہوں۔۔۔ان متون پر جب طالبِ علم قابو پالے گا تو پھر ان کی شروحات کی طرف منتقل ہوگا، وہاں اسے مختلف اقوال، مقارنے، دلائل، مناقشات اور مضبوط اور پختہ عبارتیں ملیں گی۔

ہم پہلے سمجھتے تھے کہ یہ شروحات متن کی تشریح اور متن کو سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہیں؛ اس لیے ہم متن کی تشریح کے لیے ان شروحات کی طرف لپکتے تھے؛ لیکن وہاں تو ہمیں دشواریاں اور پیچیدگیاں ہی نظر آتی تھیں؛ کیونکہ وہ تو کسی اور مقصد سے لکھی گئی تھیں، وہ اِس لیے لکھی گئی تھیں کہ متن میں مذکور مسائل کے دلائل دیے جائیں، مزید نئی باتیں بیان کی جائیں، اور طالبِ علم کو متن کے معیار سے اُونچے معیار کی طرف لایا جائے۔

(۳) کبھی ایسا ہوتا ہے کوئی بہت بڑا عالم کسی مسئلے میں تفرد اختیار کر لیتا ہے، جس کے نام سے طالبِ علم مرعوب ہوجاتا ہے، اور قوی خطرہ ہوتا ہے کہ اس کے قدم ڈگمگا جائیں، ایسے نازک مرحلہ پر شیخ نے نہایت مضبوط دستگیری کی ہے، لکھتے ہیں:

طالبِ علم کو اِس بات سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ اس کے پاس کوئی شیخی بگھارنے والا آکر ان شاذ اقوال کے بارے میں یہ نہ سمجھانے لگے کہ: دیکھو! یہ تو حضرت ابنِ عباسؓ کا قول ہے جنھیں ''حبر الامہ'' کہا گیا ہے، یہ ابنِ عمرؓ کا قول ہے، جن کا تمسک بالدین اور سنتوں کا اتباع معروف و مشہور ہے، یہ سعید بن مسیّب کا قول ہے، جو امام التابعین تھے، یہ شُریح کا قول ہے، جو اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے قاضی گزرے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

آپ اس سے پوچھیں کہ: اچھا پھر یہ بتاؤ کہ ان دسیوں صحابہؓ، سیکڑوں تابعینؒ، ہزاروں تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے لاکھوں کروڑوں علماء کو تم نے کس خانہ میں رکھا ہے، جنھوں نے اس قول پر کوئی توجہ نہیں دی اور اس کو چھوڑ دیا؛ حالانکہ ان کی جلالتِ علمی مجموعی طور پر ان علمی مراتب سے کئی گنا زیادہ ہے جو تم ان شذوذ کے قائلین کے بارے میں گنوار ہے ہو، سن لو وہ تو اپنے اجتہاد کی وجہ سے اجر و ثواب پا گئے اور تم اپنی خواہشاتِ نفسانی اور رخصت پسندی کی وجہ سے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد رہے ہو۔

(۴) مقلدین کے لیے تقلیدِ ائمہ کا یہ مفہوم بھی کس قدر چشم کشا ہے کہ:

جب کسی کو یہ بتایا جائے کہ: مثلاً نماز کے فلاں مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے ہے اور وہ شخص نماز پڑھتے وقت امام صاحب کے اس قول پر عمل کرے، تو اس وقت اس کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ اس نے اس حکم کو اس طرح اس لیے ادا کیا ہے کہ امام صاحب کی فہم کے مطابق یہ حکم اسی طرح ادا کیا جاتا ہے، باقی جہاں

تک قلبی احساسات کی بات ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ قلبی طور پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی جُڑا رہے...... مسلمان اپنے مقتدیٰ اور پیشوا کے اعتبار سے محمدی ہی ہیں؛ البتہ اپنے مقتدیٰ کی منشا کو جاننے اور سمجھنے کے اعتبار سے حنفی اور شافعی ہیں۔

(۵) درسی کتابوں کو پڑھنے کے طریقۂ کار سے متعلق ایک نہایت قیمتی بات جس سے بالعموم طلبہ کے اندر غفلت پائی جاتی ہے یہ ہے کہ:

طالبِ علم کسی بھی علمی مسئلے کو ہلکے میں نہ لے اور یہ نہ کہے کہ یہ تو ثانوی درجے کا مسئلہ ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس کے بارے میں کوئی پوچھے گا ہی نہیں، یا یہ نادرالوقوع مسئلہ ہے، یا اور کوئی اس طرح کی ٹالنے والی بات نہ کہے؛ بلکہ وہ کتاب میں آنے والے ہر مسئلے کو خوب اچھی طرح سمجھے، اس کو حل کرے، اس کو یاد کرے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ اور احتمال باقی نہ رہنے دے، ان شاءاللہ وہ مستقبل میں اس کا بہت فائدہ دیکھے گا۔

(۶) علماء کی لغزشیں کس قدر نقصان دہ ہوتی ہیں کسی سے مخفی نہیں؛ لیکن اس سے بھی نازک مسئلہ لغزش کی تمیز کا ہوتا ہے، شیخ نے صحابیِ رسول حضرت معاذ بن جبلؓ سے لغزش کو پہچاننے کا ایک نپا تُلا پیمانہ نقل کیا ہے، میں صرف شیخ کے تبصرہ کا ایک حصہ نقل کرتا ہوں، شیخ لکھتے ہیں:

حضرت معاذؓ نے ہمیں لغزش کی علامت بھی بتلائی ہے کہ: وہ گدلی اور میلی ہوگی، اس میں حق کی طرح صفائی اور چمک نہیں ہوگی، اسے انھوں نے ''مشتبہات'' کہا ہے، یعنی وہ ایسی چیز ہوگی کہ فطری طور پر تمہارا دل یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا کہ اِس بات کا تعلق خالص چمک دار اور روشن حق سے ہو؛ چنانچہ تم کہہ اُٹھو گے کہ: یہ کیسی چیز ہے؟ کیونکہ جو خالص حق ہوتا ہے اُس پر نُور اور دلیل ہوتی ہے، جو اس کی تائید کرتی ہے۔ واللہ اعلم

(۷) طلبہ کو مطالعہ کا شوق تو ہوتا ہے؛ لیکن مطالعہ میں کتنی احتیاط کی ضرورت ہے اس کا شعور نہیں ہوتا، شیخ کی یہ نصیحت ہر طالبِ علم کو حرزِ جان بنانے کی ضرورت ہے:

طالبِ علم ہر ایک سے علم حاصل کرسکتا ہے، ہر ایک کی کتاب پڑھ سکتا ہے، ہر ایک کی حدیث سن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اچھے اور بُرے، کھرے اور کھوٹے، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہو، بلاشبہ ان دنوں جو چیزیں طبع ہوکر آرہی ہیں، یا متعدد ذرائع ابلاغ پر دکھائی جارہی ہیں، ان میں سیلاب کا جھاگ بہت زیادہ ہے؛ اس لیے طالبِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان چیزوں میں خوب احتیاط سے کام لے، وہ کوئی بھی چیز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک اپنے استاذ اور بصیرت کے حامل اپنے مربی سے مشورہ نہ کرلے کہ ان حضرات کی زمانے پر نگاہ ہوتی ہے، اور وہ ذہن کو تشویش میں ڈالنے والے مصنّفین کی جماعت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔

(۸) اساتذہ بالعموم تدریس کی مہارت پر تو توجہ دیتے ہیں اور دینا بھی چاہیے؛ لیکن ابنِ جماعہؒ نے اسلاف کی کامیابی کے اسباب میں ایک چیز اور بھی ذکر کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر آپ سلف وخلف کے احوال کا جائزہ لیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ بالعموم طالبِ علم کو اسی وقت فائدہ ہوا اور کامیابی اسی وقت اس کے ہم رکاب ہوئی، جب اس کے شیخ ورع وتقویٰ اور طالبِ علم کے تئیں شفقت ومحبت اور خیر خواہی میں اعلیٰ معیار پر رہے۔

یہ چند نمونے تھے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے، اس طرح کے اَن گنت قیمتی فوائد پوری کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔

(۶) اکابر واسلاف کی عقیدت ومحبت کا جامِ صفا:

شیخ عوامہ حفظہ اللہ کو بارگاہِ ایزدی سے اکابر واسلاف کی محبت، عقیدت اور عظمت

واحترام کا وافر حصہ ملا ہے اور تحریر کی تاثیر اس پر مستزاد ہے؛ اس لیے پڑھنے والے بھی اس عقیدت ومحبت میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں؛ جہاں کہیں اسلاف کا تذکرہ آتا ہے شیخ ان کے القاب کا ذکر نہیں چھوڑتے اور موقع ملنے پر ان کی عظمت وبزرگی پر دو چار سطر ضرور لکھ جاتے ہیں، ایک جگہ ان کے لیے دعا کرنے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> غور کیجیے! جب اسلام نے ہمیں یہ ادب سکھایا ہے کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی شخص کوئی دنیوی احسان بھی کرے تو تم اس کے بدلے میں اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرو، اگرچہ دعا ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو، تو پھر سوچیے! ان ذواتِ قدسیہ کے تعلق سے ہم پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہوگی جو دین، دنیا، آخرت، اخلاق اور آداب وغیرہ تمام شعبوں میں ہم پر احسانات کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں اور جب اپنے اساتذہ کے تعلق سے یہ ذمہ داری بنتی ہے، تو ان سے اُوپر کے آباء واجداد کے تعلق سے کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہوگی، جن کی محنتوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا! اور پھر شریعت کے سب سے اوّلین ناقل حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعلق سے کس قدر ذمہ داری بنتی ہوگی اور پھر معلّم اوّل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں ہماری کس قدر ذمہ داری بنتی ہوگی، یقیناً یہ بہت بڑی اور بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے۔

اسی طرح شیخ نے اِس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اسلاف کی کتابوں کی تحقیق وتعلیق کے دوران جب کبھی نقد کی ضرورت پڑے تو ادب کے دائرے میں ہو، اس تعلق سے شیخ کے چند قیمتی جملے دیکھیے:

> (ا) مان لو اگر اس مثال کے اندر مصنّف سے سو نقول میں سے ایک نقل میں غلطی ہوئی ہے، تو کیا میں اپنے بارے میں اِس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ: جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سب صحیح ہے!

(۲) ہمارے اسلاف کی عزت وعظمت محفوظ ہے، یہ یا اس جیسے چند استدراکات ان کے صحیح نقول کے اتھاہ سمندر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

(۳) جو مربی استاذ اپنے طلبہ کے اندر نقد کا ملکہ پیدا کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ: وہ اس کے ساتھ ان کے اندر ادب کی صفت بھی پیدا کریں، کہ ایک پلڑے میں ''**احتیاط پر مبنی نقد**'' ہو اور دوسرے پلڑے میں ''**اعتدال آمیز ادب**'' ہو، وہ بھی اس طرح کہ دونوں پلڑے بالکل برابر سرابر ہوں، کبھی کوئی پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری نہ ہونے پائے۔

اس بات پر دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

(تخریج کی) ان کتابوں کے اندر ہم حفاظِ حدیث: زیلعیؒ، ابنِ کثیرؒ، عراقیؒ، ابن ملقنؒ اور ابنِ حجرؒ وغیرہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ اصل کتاب کی حدیثوں کو کبھی ضعیف قرار دیتے ہیں، کبھی موضوع، کبھی باطل اور کبھی لا اصل لہٗ کہتے ہیں، کبھی کچھ اور حکم لگاتے ہیں؛ لیکن دوسری طرف آپ ان حضرات کی بے شمار کتابوں کے درمیان ایک لفظ بھی ایسا نہیں پائیں گے اور نہ پا سکتے ہیں، جو ناموزوں اور ادب کے حدود اور علماء کے احترام کے دائرے سے نکلا ہوا ہو۔

اسی لیے شیخ ان لوگوں پر بہت کُڑھتے ہیں جو اسلاف کا ادب واحترام نہیں کرتے؛ ایک جگہ لکھتے ہیں:

اگر امام ابنِ حجرؒ اور دوسرے ائمہ اِس دَور میں ہوتے اور ان لوگوں کی باتیں سنتے جو ایک امامِ فقہ کو اس کے دین اور اس کے علم کے اندر متہم ٹھہراتے ہیں کہ وہ حدیث میں تصرف کر کے اس کو اپنے مذہب کے مطابق بنالیا کرتے تھے! یا جو لوگ امام غزالیؒ پر چڑھ بیٹھتے ہیں، صرف اس وجہ سے کہ ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں کچھ بے اصل حدیثیں آگئی ہیں، تو سوچیے یہ حضرات کیا کہتے۔

اسی طرح ایک اہم چیز یہ ہے کہ شیخ متقدمین کی کتابوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں؛ چنانچہ ایک جگہ موجودہ دَور کے نئے طریقۂ تعلیم پر کُڑھتے ہوئے لکھتے ہیں:

پھر اس طالبِ علم کو اور کمزور بنا دیا جاتا ہے، وہ اس طور پر کہ اس کی علمی نشو و نما ایسے نوٹس پڑھا کر کی جاتی ہے جن کو یہ اساتذہ خود تیار کرتے ہیں، پھر ان کو چھاپ کر کتاب کی شکل دے دیتے ہیں، اس طرح اس طالبِ علم کا رشتہ ائمۂ سابقین کی کتابوں، ان کی اصل، معتدل اور قدیم میراث، ان کی پختہ اور ٹھوس علمی عبارتوں اور ان عبارتوں میں موجود ان موروثی اصطلاحات سے جن کا سمجھنا طالبِ علم کے لیے ضروری ہوتا ہے، بالکل ختم ہو جاتا ہے اور یہی مطبوعہ کا پیاں طالبِ علم کے لیے مستقبل میں مرجع و ماخذ بن جاتی ہیں، اس طرح ہم نے نئی نسل کے افراد کو سابق علمائے امت سے کاٹ کے رکھ دیا ہے، یہ بہت بڑا علمی خطرہ ہے، جس کے جال میں بہت سے لوگ خود بھی پھنس رہے ہیں اور دوسروں کو بھی پھنسا رہے ہیں۔

(۷) وسعتِ مطالعہ اور قوتِ استنباط کے حیرت انگیز نمونے:

شیخ کی دو خوبیاں: وسعتِ مطالعہ اور قوتِ فہم و استنباط قابلِ رشک ہے، پوری کتاب میں کوئی بات ایسی نہیں ملتی جس پر شیخ نے اسلاف کے اقوال و آثار سے دلیل نہ پیش کی ہو، جس میں بطور خاص قرونِ مشہود لہا بالخیر سے دلیل پیش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں؛ تا کہ قاری کو یہ احساس ہو کہ جو رنگ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ صدر اوّل کا رنگ و آہنگ ہے؛ شیخ کے بارے میں حضرت مولانا عبد المالک صاحب دامت برکاتہم بنگلہ دیشی نے لکھا ہے کہ:

جب میں نے شیخ کی کتاب ''أثر الحدیث الشریف'' میں غور کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ شیخ پر وہ بات سو فیصد صادق آتی ہے جو علامہ زاہد کوثریؒ کے بارے میں کہی گئی ہے کہ: ان

کے ہاتھ میں گویا ایک روشن چراغ ہوتا تھا، جس کی شعاعیں وہ کتابوں کے ذخیروں کی طرف پھیرتے، اور وہ تمام ذخیرے روشن ہو اُٹھتے، اور پھر شیخ ان کے اندر سے نادر اور عجب وغریب موتیاں نکال نکال کر محققین کے سامنے پیش کرتے جاتے۔[1]

مولانا عبدالمالک صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

شیخ عوامہ پر وہ بات بھی بالکل صادق آتی ہے جو حکیم الامت مجدد الملت حضرت تھانویؒ کے بارے میں کہی گئی ہے کہ: آپ کا ایک ہاتھ امت کے افراد کی نبض پر ہوتا تھا، جس سے ان کے پوشیدہ امراض کی تشخیص کرتے جاتے اور دوسرے ہاتھ سے کتاب وسنت کی روشنی میں علاج تجویز کرتے جاتے۔

مثال کے طور پر معاصی علم کے لیے رکاوٹ بنتے ہیں، اس پر امام شافعیؒ کا شعر تو بہت سنا اور پڑھا؛ لیکن شیخ نے اس پر دلائل کے انبار لگا دیے ہیں، جن میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرز عمل بھی ہے کہ:

انھیں جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آتا، تو اپنے شاگردوں سے کہتے کہ یقیناً مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے، جس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، پھر استغفار کرتے اور بسا اوقات کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگتے اور آپ کو وہ مسئلہ سمجھ میں آجاتا، آپ فرماتے کہ مجھے اُمید ہے کہ میری توبہ قبول ہوگئی ہے، یہ بات جب فضیل بن عیاضؒ کو معلوم ہوئی تو وہ بہت روئے، اور کہا کہ ان کے گناہوں کی کمی نے انھیں یہ کیفیت عطا کی ہے؛ ورنہ دوسروں کو اس طرف کہاں توجہ ہوتی ہے۔

بہت سی وہ باتیں جو پڑھ اور سن رکھی ہیں، ان سے ایسے معانی کا استنباط کیا ہے جن کی طرف کبھی ذہن نہیں گیا، ذیل میں اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

---

(۱) یہ اقتباس اسی طرح آگے ایک اقتباس مولانا موصوف کے ایک عربی مقالے سے ترجمہ کرکے لیا گیا ہے۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ تدوینِ حدیث کا کارنامہ تاریخِ اسلام کا ایک زریں اور تابناک باب ہے جو ہمارے اسلاف کی عظمتوں کا نشاں ہے؛ لیکن شاید اس سے کم ہی لوگ واقف ہوں کہ:

جب احادیث کی تدوین عمل میں آئی تو بعض سلف نے اس عظیم کارنامے پر بجائے خوشی کے افسوس کا اظہار کیا؛ چنانچہ دارمیؒ نے ''سنن'' کے مقدمہ میں اور بیہقیؒ نے ''المدخل'' میں امام اوزاعیؒ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: برابر یہ علم باعزت تھا، لوگ اسے شیوخ کے پاس جا کر حاصل کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ کتابوں کے اندر آ گیا، پھر نااہل لوگ بھی اسے حاصل کرنے لگے۔

اور یہ بھی سنیے کہ اس افسوس کی وجہ کیا تھی، شیخ لکھتے ہیں:

(یہ افسوس اس لیے تھا) کہ اب اس کی وجہ سے شیوخ سے علم حاصل کرنے کا طریقہ کمزور پڑ جائے گا۔

آپ تلقی عن الشیوخ کی اہمیت کا بھی اندازہ لگائیے اور شیخ کی قوت استنباط کا بھی۔

(۸) پُرتاثیر اور مستند حکایات وواقعات:

واقعات وحکایات کی تاثیر ایک مسلمہ امر ہے، بسا اوقات ایک واقعہ اتنا اثر کر جاتا ہے جو طویل نصیحتیں بھی نہیں کر پاتیں، شیخ کی وسعتِ مطالعہ نے جن واقعات کا انتخاب کیا ہے، وہ انتہائی پُراثر ہیں، بطورِ نمونہ ایک دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) سعید بن مسیبؒ کو مدینے کے گورنر عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کی بیعت سے انکار کی وجہ سے آزمائش میں ڈال رکھا تھا، وہ انھیں دھوپ میں کھڑا کرتا اور اسی حالت میں تقریباً ساٹھ کوڑے لگاتا، قتادہ کہتے ہیں کہ اسی دوران میں سعید بن مسیّب کے پاس آیا، وہ دھوپ میں کھڑے ہوئے تھے

اور بدن پر صرف ایک لنگوٹ تھی، میں نے اپنے رہبر سے کہا (کیونکہ قتادہ نابینا تھے) مجھے ان کے قریب لے چلو، وہ مجھے قریب لے گیا، میں ان کے پاس پہنچ کر ان سے علمی سوالات کرنے لگا، مجھے ڈر تھا کہ شاید پھر پوچھنے کا موقع نہ مل سکے اور سعید بن مسیبؒ بھی ثواب کی اُمید میں میرے ہر سوال کا جواب دیتے رہے، اور لوگ ہمیں حیرت سے تکتے رہے۔

(۴) امام اکمل بابرتیؒ نے اپنی شرح ''عنایہ'' کے مقدمہ میں اور امام عینیؒ نے ''بنایہ'' میں لکھا ہے کہ مصنف (صاحب ہدایہ) کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب تیرہ سال میں مکمل کی، اس طویل عرصہ میں وہ ہمیشہ روزہ رکھتے رہے، کبھی ناغہ نہیں کیا، وہ اس بات کی بھی کوشش کرتے تھے کہ ان کے روزے کی کسی کو خبر نہ ہو؛ چنانچہ خادم جب کھانا لے کر آتا تو اس سے کہتے کہ: رکھ کر چلے جاؤ، اور اس کے جانے کے بعد وہ کھانا طلبہ وغیرہ کو کھلا دیتے، اسی زہد وورع کی وجہ سے ان کی کتاب علماء کے درمیان نہایت مقبول ہوئی۔

یہ چند خصوصیات سرسری طور پر شمار کرائی گئیں، یوں تو پوری کتاب ہی گونا گوں خوبیوں پر مشتمل ہے، ہر بحث پر تشفی بخش گفتگو کی گئی ہے، خواہ وہ بحث استطراداً ہی کیوں نہ آئی ہو، شیخ نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا جو مستقل کتاب کا موضوع ہیں اور نہایت ایجاز کے ساتھ ان تمام مسائل پر پُرمغز اور مدلل گفتگو کی، ہر باب کے اندر ایسے نئے نئے پہلو پیدا کیے ہیں جو ان کی فہمِ رسا کا منہ بولتا ثبوت ہیں، اس خوبی سے موضوع کی دیگر متداول کتابیں خالی ہیں، ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف آزاد خیالی کا دَور دورہ ہے جس چیز کو غلط سمجھا اس پر کھل کر تنقید کی، اور مدلل تنقید کی۔

اخیر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ الزرقاءؒ کا ایک تبصرہ جو شیخ عوامہ کی ایک دوسری کتاب ''اثر الحدیث الشریف'' سے متعلق ہے، یہاں نقل کیا جائے، شیخ مصطفیٰ لکھتے ہیں:

"وقد أعجبتني غزارة مادّة الكتاب وما تدل عليه سعةُ اطلاع مؤلفه، وعمق فهمه، وحسن تنسيقه، حتى اجتمع له في هذا الكتاب على لطف حجمه ما يندر أن يجده الباحث في الكتب الكثيرة".

(۱) مواد کی کثرت (۲) مؤلف کے وسعتِ مطالعہ (۳) دقت فہم اور (۴) کتاب کی حسنِ ترتیب نے مجھے متاثر کیا؛ چنانچہ مؤلف کی اس مختصر سی کتاب کے اندر اتنا کچھ جمع ہو گیا ہے کہ شاید قاری کو بہت سی کتابیں پڑھنے کے بعد بھی نہ مل سکے۔

کہا جا سکتا ہے کہ شیخ مصطفیٰ الزرقاءؒ کا یہ تبصرہ اس کتاب (معالم ارشادیہ) پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔

مقدمۂ مؤلف

الحمد لله رب العالمين، الفتاح العليم، والصلاة والسلام علىٰ أنبياء الله ورسله أجمعين، وأفضلها وأعظمها علىٰ أفضلهم وأعظمهم سيّدنا ونبينا محمد بن عبدالله المبعوث رحمةً للعالمين، ومن مظاهر رحمته للعالمين أنه صلّى الله عليه وسلم بعث معلّما ميسرا، صلوات الله وسلاماته عليه وعلىٰ اله وأصحابه وتابعيهم بإحسان إلىٰ يوم الدين، أما بعد:

علم من حیث العلم انسان کی مطلوبہ چیزوں میں سب سے افضل و اشرف شے ہے، جس کی شرف و منزلت معلوم کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، چنانچہ شریعت کا علم اپنے وسائل و اہداف کے اعتبار سے تمام علوم؛ بلکہ ان تمام اشیاء سے جن کو انسان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، افضل و اشرف ہے؛ کہ اس پر عمل کرنے سے مومن کے ایمان و اعمال میں اضافہ ہوتا ہے، اور اس کے اخلاق سنورتے ہیں، نیز اسی علم کے ذریعہ تمام جہان والوں کو دین و دنیا کی سرخروئی اور ہر قسم کی سعادتیں اور خوبیاں میسر ہوسکتی ہیں۔

یہ بات مخفی نہیں کہ کسی بھی شے کے علم تک پہنچنے کے لیے اس کو طلب کرنا ضروری ہے،

امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے ایک طویل حدیث ۲: ۱۱۰۴ (۲۹) مرفوعاً نقل کی ہے، جس کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: مجھے اللہ تعالیٰ نے سختی برتنے والا اور لوگوں کی لغزشوں کو چاہنے والا بنا کر نہیں بھیجا؛ بلکہ مجھے سکھانے والا اور آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، یہی ہر معلّم کی صفت ہونی چاہیے۔

پس طلب کی حیثیت کسی شے کو پانے کے لیے وسیلہ اور ذریعہ کی ہوئی اور یہ وسیلہ اور ذریعہ (یعنی طلب) اس شے کا بنیادی جز ہوتا ہے؛ کہ اس کا حصول طلب ہی سے ممکن ہوتا ہے، لیکن طلب میں کامیابی کے لیے ایسے وسائل کا ہونا ضروری ہے، جن کے ذریعہ طلب کے اس راستے کو بصیرت اور ہدایت کے ساتھ طے کیا جاسکے؛ اور طالب کو اس کے مقاصد اور اہداف حسبِ منشا حاصل ہوسکیں۔

رہی وہ چیز جو کسی بھی طالب کو اس کی طلب کے اندر کامیابی عطا کرسکتی ہے: وہ یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرے جنھوں نے اپنے حسی اور معنوی مقاصد میں کامیابیاں حاصل کیں اور سرخرو ہوئے؛ تاکہ یہ طالب بھی ان کی طرح اپنے اہداف تک پہنچ سکے۔

اسی طرح اگلوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بعد میں آنے والوں کے لیے راستے کو روشن کریں، انھیں اپنے تجربات سے فائدہ پہنچائیں اور ان کے سفر میں ان کی رہنمائی کریں، اس سے بار بار غلطیاں نہیں ہوں گی، اور نئی لغزشیں وجود میں نہیں آئیں گی، **"فالدين النصيحة"** دین تو سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔

مجھے اس رہنمائی کی ضرورت کا احساس روز بہ روز بڑھتا جاتا تھا، خود اپنے لیے بھی اور اپنے جیسے دوسرے دوستوں کے لیے بھی؛ لیکن اسلوبِ جدید میں مجھے کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی تھی جو اس ضرورت کو پورا کرسکے اور پیاس بجھا سکے۔ میں جانتا تھا کہ اس تعلق سے لکھنے کے لیے ایسے کاتب اور ایسے قلم کی ضرورت ہے، جس میں گوناگوں صلاحیتیں موجود ہوں، جن میں اہم چیز یہ ہے کہ وہ پُرانے اور قدیم طرز تعلیم کے ساتھ جدید اور نازک طرز تعلیم کو جمع کیے ہو؛ کہ اشیاء اپنی ضد سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔

اسی لیے میں اپنے استاذ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی خدمت میں بار بار یہ درخواست پیش کرتا تھا کہ وہ اپنی سابقہ دو کتابوں **"صفحات من صبر العلماء"** اور

"قيمة الزمن عند العلماء" کی طرح طلبہ کے لیے ایک اور کتاب علم میں گہرائی وگیرائی پیدا کرنے کے بنیادی اسباب پر مشتمل تصنیف فرمادیں، جس پر انھوں نے اخیر میں ہاں بھی کردی تھی؛ لیکن کچھ لکھ نہیں پائے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

چونکہ ضابطہ ہے: **"ما لايدرك كله لايترك جله (بل: لا يترك قله)"** کہ جو شے مکمل حاصل نہ ہوسکے اس کا اکثر ہی سہی (بلکہ تھوڑا ہی سہی) اسے حاصل کرلینا چاہیے، چھوڑنا نہیں چاہیے؛ اس لیے میں یہ کرتا تھا کہ "ادب الاختلاف فی مسائل العلم والدین" لکھتے وقت جب بھی موقع ملتا کچھ کلمات یا صفحات لکھ لیتا اور اس سے پہلے "اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الفقہاء" لکھتے وقت بھی میں نے کچھ صفحات لکھے تھے، جو قدرے کم تھے۔

پھر میرے دل میں آیا کہ اس "جہد مقل" کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے کتاب کی شکل دے دوں، اللہ تعالیٰ مجھے حدود سے تجاوز کرنے سے بچائے **"فَإِنَّ اللهَ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ"** (اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتے)؛ چنانچہ میں نے یہ کتاب لکھی جو طلبۂ عزیز کے سامنے ہے، جس کے اندر میں نے مذکور الصدر دو کتابوں سے کافی مواد لیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ امت کو نفع پہنچائیں اور اس کتاب سے جو کچھ میرا مقصود ہے کہ: یہ کتاب فنِ طالب علمی میں طالب علم کی دستگیری کرنے والی ثابت ہو، اور ساتھ ہی قارئین کی نیک اور مقبول دعائیں مجھے ملیں، اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی عطا فرمائیں، واللہ ولی التوفیق۔

یہ بحث چار بنیادی ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب کے تحت کچھ فصلیں اور معالم ہیں۔

پہلا باب: علم سے ہماری مراد اور علم کی اہمیت وفضیلت

پہلی فصل: علم سے ہماری مراد

دوسری فصل: طالبِ علم کے لیے منہج کی اہمیت

تیسری فصل: علم اور علماء کی فضیلت

پہلا باب

لفظِ ''علم'' کا مصداق

اور

علم کی اہمیت وفضیلت کا بیان

پہلی فصل

لفظِ ''علم'' کا مصداق

میری اِس تحریر میں علم سے مراد شریعت کا نافع علم ہے، اور اس علم کا سب سے پہلا معلّم خون کے لوتھڑے سے پیدا ہونے والے انسان کے لیے خود اللہ رب العزت کی ذات ہے، جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ سکھایا، اور اس کو وہ باتیں سکھائیں، جو وہ نہیں جانتا تھا، پھر اس نے ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے ناخواندہ لوگوں کے لیے اور بالواسطہ تمام لوگوں کے لیے۔ معلّم بنا کر بھیجا؛ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر کتاب اور حکمت یعنی قرآن وسنت کی تعلیم دی، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍۙ﴾ (الجمعة)

ترجمہ: وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو (عقائدِ باطلہ واخلاقِ ذمیمہ سے) پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب وسنت کی تعلیم دیتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے اور (ان موجودین کے علاوہ) دوسروں کے لیے بھی (آپ کو مبعوث فرمایا) جو (اسلام لا کر) ان میں سے ہونے والے ہیں؛ لیکن ہنوز ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ زبردست حکمت والا ہے۔ (بیان القرآن)

دَورِ نبوت میں صرف کتاب وسنت کا علم تھا:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کتاب وسنت میں ہی منحصر تھی؛ اس لیے کہ وحی الٰہی (جس سے اقوامِ عالم کی سعادت وابستہ ہے)، بس یہی دو چیزیں ہیں، اور یہی دونوں مقصود ہیں، بقیہ جتنے علوم ہیں ان سب کی حیثیت کتاب وسنت کے علوم تک پہنچانے والے ایک وسیلہ کی ہے۔

پھر چونکہ صحابۂ کرامؓ کا زمانہ قرآنِ کریم کے نزول اور اسبابِ نزول کا زمانہ تھا؛ اس لیے انھیں فقہ اور اُصولِ فقہ جیسے علوم کی ضرورت نہیں تھی؛ کیونکہ وہ قرآن کی زبان کو سمجھتے تھے، اس کے معانی اور اسرار ورموز سے واقف تھے، اور شریعت سازی کے واقعات کو بذاتِ خود برتتے تھے، مزید یہ کہ وہ پیش آمدہ مسائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کر کے شرعی حکم معلوم کرلیا کرتے تھے، جس کے بعد انھیں ان علوم کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی۔

اور جہاں تک مغازی اور سیرت کا تعلق ہے تو ان علوم میں بیان کیے جانے والے کردار وہ خود تھے، اور ان ہی کے ساتھ یہ سارے واقعات وحوادث پیش آئے تھے۔

زبان سے متعلق علوم (یعنی نحو، صَرف اور بلاغت) کی بھی انھیں کوئی ضرورت نہیں تھی؛ کیونکہ وہ اہلِ زبان اور فصاحت وبلاغت کے امام تھے۔

اسی طرح علومِ عقلیہ مثلاً علمِ منطق، اصولِ مناظرہ اور اس نوع کے ان تمام علوم سے بھی وہ بے نیاز تھے جن کی بعد کے علماء کو وقتی حالات اور حوادثِ زمانہ کی وجہ سے ضرورت پڑی۔

اس طرح اس وقت کتاب وسنت کے علاوہ کسی اور علم کی ضرورت نہیں تھی، اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کارِ منصبی تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سونپا تھا: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ (النحل: ۴۴) کہ آپ ان کے سامنے ان مضامین کی توضیح وتشریح کردیں

جو ان کی طرف نازل کیے گئے، پس اس وقت دو ہی چیزیں تھیں: ایک قرآن جو نازل کیا جارہا تھا، دوسرے اس قرآن کی توضیح وتشریح۔

عہدِ نبوی میں نظامِ تعلیم کے بنیادی ستون:

اور اس تعلیم وتعلّم کا پورا نظام چارستونوں پر قائم تھا: (۱) کتاب وسنت کا علم (۲) طالبِ علم (۳) استاذ اور (۴) استاذ وشاگرد کے مابین بالفعل تعلیم وتعلّم، یہ چاروں ارکان باہم انتہائی مربوط تھے؛ اس لیے ان معالم ومنارات کا جن کے بارے میں مجھے گفتگو کرنی ہے ایک دوسرے میں گُڈ مُڈ ہونا ایک لابدی امر تھا؛ حالانکہ راقم اِس بات کے لیے کوشاں رہا کہ وہ طالبِ علم کے معالم ومنارات جن کی اتباع طالبِ علم کے لیے ضروری ہے، اور طالبِ علم کی تربیت اور کردارسازی سے متعلق استاذ کے معالم ومنارات، ان دونوں کے درمیان خط امتیاز پیدا کروں؛ تاکہ طالبِ علم کو زمانۂ طالبِ علمی میں حقیقی طالبِ علم اور مستقبل میں ایک باعمل عالم بنانے کا ہمارا خواب پورا ہوسکے۔

ہم نے طالبِ علم سے متعلق معالم ومنارات کو دوسرے باب میں، اور استاذ سے متعلق معالم ومنارات کو تیسرے اور چوتھے باب میں ذکر کیا ہے، اس معذرت کے ساتھ کہ دونوں معالم میں کچھ تداخل بھی ہوگیا ہے۔

جہاں تک ان چاروں ارکان کی اہمیت وفضیلت کی بات ہے: تو علم کی فضیلت معلوم کی فضیلت کے تابع ہوتی ہے، اور معلوم یہاں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہے، اور ظاہر ہے ان دونوں سے عظیم کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔

اور طالبِ علم کی شرف ومنزلت اس کے مطلوبہ علم کی فضیلت سے وابستہ ہوتی ہے، اور استاذ کی فضیلت کا تعلق اس علم سے ہوتا ہے جس کی وہ تعلیم دے رہا ہے۔

اور رہی بات تعلیم کی، تو وہ اپنے ثمرات اور نتائج کے اعتبار سے شرف ومنزلت پاتی ہے۔

اگر یہ ارکان اربعہ نہ ہوتے تو آج صفحۂ ہستی پر اسلام کا وجود نہ ہوتا، اور آئندہ بھی اگر اسلام زندہ رہے گا تو ان ہی کی بدولت زندہ رہے گا۔

ان فضائل ومناقب کے بعد بھی کیا کوئی عقلمند شخص ان کو حاصل کرنے میں پیچھے رہ سکتا ہے؟

مسندِ بزار اور طبرانی کی جامع صغیر [۱] میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مذکور ہے کہ: ''تم یا تو عالم بنو یا طالبِ علم بنو، یا علم کی باتوں کو توجہ سے سننے والے بنو، یا علم سے محبت کرنے والے بنو، اِن چار کو چھوڑ کر پانچویں قسم مت بنو؛ ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔'' پانچویں قسم سے مراد یہ ہے کہ علم اور اہلِ علم سے بغض رکھنے والے مت بنو؛ اور چونکہ اس زمانے میں اور بھی نئے کام وجود میں آ گئے ہیں؛ اس لیے ان چار چیزوں پر اضافہ کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ: اہلِ علم کے خادم بنو، یا کتابیں چھپوا کر اور مدارسِ اسلامیہ قائم کر کے علمِ دین کی نشر واشاعت کرنے والے بنو، یا مال کے ذریعہ طلبہ کی کفالت کرنے والے بنو وغیرہ وغیرہ۔

علم کے ارکان:

ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں کہ علم سے مراد یہاں پر احکامِ شرعیہ کا علم ہے، اور اس علم کے دو ارکان ہیں:

پہلا رکن:

مصادرِ اصلیہ سے استنباط واستخراج اور اس کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا علم ہے، اور مصادرِ اصلیہ سے مراد چار چیزیں ہیں: (۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ رسول اللہ (۳) علماءِ امت کا اجماع یا شبہ اجماع (یعنی وہ اجماع جس کے ایک آدھ لوگ مخالف بھی ہوں) (۴) اور ان تینوں پر قیاسِ صحیح۔

---

(۱) مسند بزار (۱۳۴) معجم صغیر (۷۸۶)

امام ابنِ عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ: حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ: کہ جس کو بھی کسی شے پر حلال یا حرام کا حکم لگانا ہو وہ علم کے راستے سے لگائے، اور علم کا راستہ یہ ہے کہ وہ حکم کتاب اللہ، یا سنتِ رسول اللہ یا اجماع میں صراحۃً موجود ہو، اور اگر ان میں وہ حکم نہ ملے تو مذکورہ اُصول پر قیاس ان ہی اُصول کے معنیٰ میں ہے [1]۔

اس کے بعد ابنِ عبد البرؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن شیبانیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

علم کی چار قسمیں ہیں: (۱) وہ علم جو کتاب اللہ میں اور کتاب اللہ کے مشابہ میں ہے (۲) وہ علم جو سنتِ رسول اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے مشابہ میں ہے (۳) وہ علم جو صحابہؓ کے اجماعی مسائل اور اجماعی مسائل کے مشابہ میں ہے، اسی طرح جن مسائل میں صحابہؓ کا اختلاف ہے وہ بھی اسی میں داخل ہیں (۴) وہ علم جس کو عام فقہاء نے صحیح اور مستحسن سمجھا، اور جو اس کے مشابہ اور اس کی نظیر ہے، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ: علم انہی چار قسموں میں ہی منحصر ہے۔

اس کے بعد ابنِ عبد البرؒ نے امام شافعیؒ کے قول **ما كان في معناها** (جو اس کے معنیٰ میں ہے) اور امام محمدؒ کے قول **ما أشبهه** (جو اس کے مشابہ ہے) کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس سے مراد قیاس ہے۔

دوسرا رکن:

وہ نور ہے جو شریعت کے ان چاروں مصادر میں مشغول رہنے والے شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں ایسی خشیت پیدا ہوتی ہے جو قلب میں راسخ اور پیوست ہوتی ہے، اعضاء وجوارح سے پھوٹتی دکھائی دیتی ہے، اور اس کے اثرات عام طرزِ زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

---

(۱) جامع بیان العلم (۱۴۰۳، ۱۴۰۵)

امام مالکؒ فرماتے ہیں: ''علم وحکمت تو درحقیقت ایک نُور ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں، علم مسائل کی کثرت کا نام نہیں ہے''(١)۔ اور رامہرمزی نے عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ: ''علم کثرتِ حدیث کو نہیں کہتے، علم تو اللہ تعالیٰ کی خشیت کا نام ہے''(٢)۔

علم کی اقسام:

یہ علم جس سے مذکورہ بالا ثمرات حاصل ہوتے ہیں، اور آدمی کے خوف وخشیت پیدا ہوتی ہے، اسی علم کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اس میں اضافہ کی دعا کریں، ارشادِ باری ہے: ﴿وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ ''آپ یہ دعا کیا کیجیے کہ: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما'' یہی علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے، اور اسی کو مانگنے کی آپؐ نے ہمیں تعلیم دی، آپؐ نے اس علم کو علمِ نافع بتایا، اور ہر ایسے علم سے پناہ چاہی جو نافع نہ ہو۔

مصنَّف ابنِ ابی شیبہ وغیرہ میں حضرت اُمِّ سلمہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ سلم فجر کی نماز میں سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا کیا کرتے تھے: **''أللّٰهم إني أسألك علما نافعا ورزقًا طيبا وعملًا متقبلًا''** اے اللہ! میں آپ سے علمِ نافع، پاکیزہ روزی، اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں''(٣)، اور ایک روایت میں **''رزقًا طيّبا''** کی بجائے **''رزقًا واسعًا''** کے الفاظ ہیں کہ کشادہ رزق مانگتا ہوں۔

یہ ایسی دعا ہے جو ہر مسلمان کی ضرورت ہے؛ کیونکہ اگر وہ علم کا طالب ہوگا تو اللہ تعالیٰ

(١) المحدث الفاصل (٧٥٥) جامع ابن عبد البر (١٣٩٥، ١٣٩٨، ١٣٩٩)

(٢) المحدث الفاصل (١٤٠٠، ١٤٠١)

(٣) مصنف ابن ابی شیبہ (٢٩٨٧٥)

سے علمِ نافع مانگے گا، اگر آزاد اور نفع بخش ذریعۂ معاش کا طالب ہوگا تو پاکیزہ اور حلال روزی مانگے گا؛ نیز ایک مسلمان کو دن رات میں دین کے کچھ ضروری اعمال بھی کرنے ہوتے ہیں، مثلاً پانچ وقت کی نمازیں پڑھنی ہوتی ہیں، تو وہ اللہ سے مقبول عمل کا سوال کرے گا؛ کیونکہ عمل اگر مقبول نہ ہو تو وہ عمل کرنے والے کے منہ پر مار دیا جاتا ہے، اور اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔

مصنَّف ابنِ ابی شیبہ[1] میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ: آپ سجدہ کی حالت میں یہ دعا کیا کرتے تھے: **أللّٰهم لك سجد سوادي**[2]، **وبك آمن فؤادي، اللّٰهم ارزقني علما ينفعني، وعملا يرفعني** (اے اللہ! میرے وجود نے آپ کو سجدہ کیا، اور میرا دل آپ پر ایمان لایا، اے اللہ! مجھے ایسا علم عطا فرما جو مجھے نفع پہنچائے، اور ایسا عمل عطا کر جو مجھے بلند کردے) یعنی عمل مقبول عطا کر؛ کیونکہ عمل مقبول ہی بندے کو اس کے آقا و مولا کی نگاہوں میں بلند کرتا ہے۔

علمِ غیر نافع سے چوکنا رہنے کی ضرورت:

طالبِ علم کو اِس بات سے چوکنا رہنا چاہیے کہ کہیں وہ علم غیر نافع کے جال میں نہ پھنس جائے؛ کیونکہ اس جال میں پھنسنے والے بہت ہیں، اسے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم کے اَمراض اور علم کی بیماریوں کے حوالے سے بیدار رکھے، وہ اپنا محاسبہ کرتا رہے، اور اپنی نیتوں کو ٹٹولتا رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر موقع ہاتھ سے نکل جائے، امام ذہبیؒ کی کتاب "**بيان زغل العلم والطلب**" کا مطالعہ اس سلسلے میں غفلتوں سے

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ (۴۴۰۶)

(۲) راغب کی مفردات اور ابن اثیر کی نہایہ میں س و د کے مادے میں ہے کہ: سواد سے مراد وہ پرچھائیں ہوتی ہے جو دور سے دکھائی دیتی ہے، خواہ وہ انسان ہو یا سامان یا کچھ اور۔

بیدار رہنے میں بہترین معاون ثابت ہوسکتا ہے، کاش کہ ہمارے زمانے میں بھی تقویٰ وخیر خواہی سے متصف علماء میں سے کوئی اس طرح کا رسالہ لکھ دیتا، جیسا امام ذہبیؒ نے اپنے زمانے میں لکھا تھا، تو یہ طالبانِ علومِ نبوت اور ان کے پیچھے پوری قومِ مسلم پر بہت بڑا احسان ہوتا؛ کہ آج حدیث وفقہ کے مبارک فنون میں اشتغال کا دعویٰ رکھنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن سے بچنے اور چوکنا رہنے کی ضرورت جاہلوں سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

بے عمل عالم کا انجام:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتلایا ہے کہ: قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کے خلاف فیصلہ سنایا جائے گا، اُن میں سے ایک وہ مجاہد ہوگا جو اللہ کے راستے میں شہید ہوا، دوسرے وہ عالم جو تعلیم وتعلّم میں مشغول رہا، اور تیسرے وہ مالدار جو صدقہ وخیرات کرتا رہا[1]۔

یہ حدیث میری ایک دوسری کتاب **"من صحاح الأحاديث القدسية"** میں نمبر چار پر موجود ہے، میں یہاں صرف محلِ استشہاد ذکر کرکے اس کی شرح کرتا ہوں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے نزول فرمائیں گے، تمام لوگ زانو کے بل ہوں گے، سب سے پہلے جن لوگوں کو اللہ رب العزت کی طرف سے بلایا جائے گا اُن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے قرآنِ کریم یاد کیا، دوسرے وہ ہوگا جو اللہ کے راستے میں شہید ہوا، تیسرے وہ جس کے پاس ڈھیر سارا مال تھا، پھر اللہ تعالیٰ قاریِ قرآن سے پوچھیں گے: کیا میں نے اپنے رسولؐ پر نازل کردہ قرآن تجھے نہیں سکھایا؟ وہ کہے گا: کیوں نہیں میرے رب! یقیناً سکھایا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: پھر تُو نے اپنے اس علم کے سلسلے میں کیا کیا؟ وہ کہے گا:

(۱) مسلم ۳: ۱۵۱۳ (۱۵۲) ترمذی (۲۳۸۲) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔

میں شب وروز اس میں مشغول رہا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: جھوٹ بولتا ہے، فرشتے بھی کہیں گے: جھوٹ بولتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تیرا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ کہیں: فلاں شخص قاری ہے، پس کہا جا چکا۔

اِس حدیث کی شرح میں جو باتیں میں نے وہاں لکھی ہیں انھیں قدرے اختصار کے ساتھ یہاں دہراتا ہوں:

حدیث پاک میں مذکور تین شخصوں میں سے پہلا شخص وہ ہے جس نے قرآنِ کریم کو جمع کیا، یعنی اس کو یاد کیا اور اس کو سیکھا، اس سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز پوچھیں گے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ اس کے احوال سے خوب واقف ہیں: ''کیا میں نے اپنے رسول پر نازل کردہ قرآن تجھے نہیں سکھایا؟'' یہ سوال درحقیقت اتمامِ حجت کی تمہید کے طور پر ہوگا، وہ شخص کہے گا: کیوں نہیں میرے رب! یقیناً آپ نے سکھایا، یہ اس عظیم نعمت کا اقرار ہوگا، جو اس سے بہت زیادہ شکر کی متقاضی تھی، اور وہ نعمت تھی علم کی، رب العالمین کے کلام قرآنِ کریم کے علم کی، جس میں ربِّ کائنات نے خیر کے تمام پہلو جمع کر دیے ہیں، اور دنیا وآخرت کی کوئی خیر ایسی نہیں چھوڑی جس کی طرف رہنمائی نہ کی ہو۔

لیکن یہ شخص بےتوفیق تھا، اس نے نہ دنیا میں اللہ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کیا نہ آخرت میں، جب اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ: ''تُو نے اپنے اس علم کے سلسلے میں کیا کیا؟'' تو وہ کہنے لگا کہ: ''میں صبح وشام اس میں مشغول رہا'' وہ اس خیال میں تھا کہ اس نے اپنے آپ کو صبح وشام قرآنِ کریم میں مشغول رکھا؛ حالانکہ وہ بے چارہ قرآن پاک میں مشغول رہنے، اس کو سمجھنے اور اس کی تفسیر کو پڑھنے کی روح، اور اصل مقصود سے غافل رہا، اس نے اس طرف توجہ نہیں دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل اور ارادے کو ہر غیر سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں، اور بندے کے لیے اپنی توجہ اور مقصد کو اللہ کے لیے خالص رکھنا بے حد ضروری ہے۔

قرآنِ کریم کو پڑھنے والے لوگ علم کے اعتبار سے ان باتوں سے ناواقف نہیں ہوتے؛ لیکن عمل کے اعتبار سے ضرور ناواقف ہوتے ہیں، جیسا کہ عموماً اس قسم کے قراء کا حال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں علمِ نافع عطا فرمائے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: ''تُونے جھوٹ کہا'' فرشتے بھی کہیں گے: تُونے جھوٹ کہا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اس کے اس قلبی مرض کی حقیقت کھولیں گے، اور کہیں گے: ''تیرا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ کہیں: فلاں شخص تو قاری ہے، پس کہا جاچکا'' یعنی جس چیز کو پانے کے لیے تم کوشاں تھے وہ تمہیں مل گئی، جس چیز کی تمہیں خواہش تھی وہ حاصل ہوگئی، اور اب تمہارا کوئی مطلوب باقی نہیں رہا۔

پھر اس کے بعد حکم ہوگا، اور فرشتے اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں ڈال دیں گے، جیسا کہ مسلم کی روایت میں موجود ہے۔

حصولِ علم سے مقصود کیا ہو:

اب اگر کوئی پوچھے: کہ پھر طالبِ علم کا مقصود علم حاصل کرنے سے کیا ہونا چاہیے؟

تو سنیے: طالبِ علم کا مقصود اللہ کی ذات اور اس کی رضا جوئی ہونی چاہیے۔

اللہ کی ذات کے مقصود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز میں اس کا مطمحِ نظر اللہ کی ذات ہو: پڑھائی میں، تعلیم میں، حصولِ علم کے ہر وسیلہ اور ذریعہ میں، حتیٰ کہ علم سیکھنے کے لیے آنے جانے، کتابیں خریدنے، اور صحبت کے لیے اساتذہ کے انتخاب میں بھی؛ چنانچہ وہ ایسے اساتذہ کا انتخاب کرے، جن کے قول وفعل سے دوسروں کی بہ نسبت اللہ کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہو؛ بلکہ میں آگے بڑھ کر کہوں کہ اسے اپنی عالمانہ وضع قطع میں بھی اپنی نیت اور ارادے کو درست کرنا چاہیے۔

اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کو مقصود بنانے کا مطلب یہ ہے کہ: وہ اپنے علم پر عمل پیرا ہو،

اور جو بھی خیر کی بات اس کے علم میں آئے اس کو عملی جامہ پہنائے، جس کے لیے اسے چاہیے کہ جب بھی اس کے سامنے اللہ کا یا اللہ کے رسول کا کوئی حکم آئے اسے پورا کرنے کی فکر کرے، اور جب بھی وہ کسی منہی عنہ کو پڑھے تو اس سے اپنے آپ کو روک لے۔

اس طرح کرنے سے چند ہی دنوں میں اس کے رہن سہن اور طرزِ زندگی میں خیر نظر آنے لگے گا، اور چند سال نہیں گزریں گے کہ وہ عالم باعمل بن جائے گا۔

موجودہ دَور کے کچھ مہلک اشغال:

ان سب کے ساتھ طالبِ علم کو آج کے دَور میں کچھ اور چیزوں سے بچنے کی بھی سخت ضرورت ہے اور وہ ہیں: بلاوجہ قیل وقال میں لگنا، بہت زیادہ سوالات کرنا، فضول باتیں کرنا، حجت بازی اور جھگڑوں میں پڑنا، مسائل اور محفوظات کے سلسلے میں نامانوس قسم کی چیزوں کے پیچھے پڑنا، ایسی کتابوں سے نقول لانا جو علماء کے نزدیک غیر متداول ہیں، علم کو علماء کی صحبت اور درسگاہوں میں ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے حاصل کرنے کے بجائے صرف کتابوں سے حاصل کرنا۔

اسی طرح جو آداب اہلِ علم نے اپنے اساتذہ ومشائخ کے ساتھ اختیار کیے تھے ان آداب سے روگردانی کرنا؛ بلکہ اگر کوئی ان آداب کو اختیار کرے تو اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور ایسے رذیل اوصاف سے متصف کرنا جس سے لوگوں میں اس کے تئیں نفرت پیدا ہو، اسی طرح بعض لوگوں کا یہ سمجھنا کہ علم صرف چند معلومات کا نام ہے جنھیں یاد کر کے محفوظ کرلیا جائے، یا بعض مسائل سے متعلق حوالوں کے کچھ نام یاد کرلیے جائیں کہ فلاں مسئلہ سے متعلق مباحث فلاں فلاں کتاب میں ہیں، پھر ان معلومات اور حوالوں کو لے کر مجلسوں کے اندر خوب شور مچایا جائے، یا کتابوں کے حواشی کو ان حوالوں کے ناموں سے بھر دیا جائے، پھر لوگ اسے علامۂ زماں، محققِ دوراں اور محدثِ عصر کہنے لگیں۔

یا جدید وسائل (یعنی کمپیوٹر پروگراموں) کا سہارا لے کر جنھوں نے لوگوں کو فتنہ میں ڈال رکھا ہے، اور انھیں اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اب وہ ان وسائل کی وجہ سے اپنے آپ کو عالم، مجتہد اور حافظِ وقت سمجھنے لگے ہیں، اور اِس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے مسئلہ میں علماء سے رجوع کیا کریں، انھیں خبر نہیں کہ اگر ان پروگراموں کو ایسے لوگوں نے استعمال کیا جنھیں علم میں گہرائی اور اختصاص حاصل نہیں ہے، تو یہ پروگرامس ان پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے صادق آنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائیں گے کہ: ''لوگ جاہلوں کو اپنا بڑا بنالیں گے، پھر ان سے مسئلہ دریافت کیا جائے گا، اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے''۔

اور ان دونوں سے بھی زیادہ گیا گزرا شخص تو وہ ہے جسے علم سے کچھ لینا دینا نہیں، وہ بس یہ جاننے کی فکر میں رہتا ہے کہ کون سی نئی کتاب وجود میں آئی ہے، کس نے اس کی تحقیق کی ہے، اس کے مخطوطات کہاں دستیاب ہیں، یہ سب کر کے وہ سمجھتا ہے کہ وہ مرجع العلماء بن گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز علم نہیں ہے، علم تو کسی اور ہی چیز کا نام ہے، علم نام ہے پڑھ کر یاد کرنے، اس کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے، اور اپنی زندگی میں اس کو نافذ کرنے کا، علم نام ہے اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنے، عبادت گزار بننے، پاک دامنی اختیار کرنے، نفس کا محاسبہ کرنے، ہمہ وقت اللہ رب العزت کا استحضار رکھنے، سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اپنانے اور صحابۂ کرامؓ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی اتباع کا۔

اسلاف کی سوانح کا مطالعہ کریں:

طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنے اسلاف کی سوانح، ان کے تذکرے اور ائمۂ کرام کی علمی و عملی

زندگی کا مطالعہ کیا کریں، بطورِ خاص خطیب بغدادیؒ کی "**الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع**"، ابنِ جماعہؒ کی "**تذكرة السامع والمتكلم**"، امام غزالیؒ کا مقدمہَ "**إحياء العلوم**"، ابنِ رجبؒ کی "**شرح حديث أبي داؤد: من سلك طريقا يلتمس فيه علمًا**" اور "**فضل علم السلف على الخلف**" کوضرور پڑھیں۔

اگر طلبہ نے ان کتابوں کو پڑھا، اور جو کچھ پڑھا اس کی محبت ان کے دل میں جاگزیں ہوگئی، تو اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ وہ دنیا وآخرت میں کامیاب اور بامراد رہیں گے۔

لیکن یہ دھیان رہے کہ کوئی بھی چیز علماءِ ربانیین کی صحبت سے بے نیاز نہیں کرسکتی، یہ حضرات توکتبِ ناطقہ ہوتے ہیں۔

بے عمل عالم صرف ناقلِ علم ہے:

اب اگر کوئی سوال کرے کہ: پھر آپ اس شخص کو کیا نام دیں گے جو کتابیں یاد کرتا ہو، بحث وتحقیق میں لگا رہتا ہو، اور عالم، حافظ اور فقیہ بھی کہلاتا ہو؛ لیکن وہ آپ کے بیان کردہ نہج اور طریقہ پر نہ ہو؟۔

تو میں کہوں گا کہ: میں اسے وہی نام دوں گا جو "**بهجة النفوس**" کے مصنّف ابومحمد ابن ابی جمرہ اندلسیؒ (متوفی سنہ ۶۹۹ ھ) نے دیا ہے، جسے ان کے شاگرد ابن الحاجؒ نے اپنی مشہور کتاب "المدخل" میں ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں [(۱)]:

سیّدی ابومحمد ابن ابی جمرہؒ کے سامنے جب ان کے زمانے کے کسی ایسے عالم کا تذکرہ ہوتا، جس کے اندر مذکورہ باتیں پائی جاتیں (یعنی علم تو ہوتا؛ لیکن عمل کی پونجی اس زمانے -ساتویں صدی کے اواخر- کے اعتبار سے کم ہوتی) اور اس شخص کے علم کی تعریف کی جاتی، تو وہ فرماتے: ناقل ناقل (یعنی وہ تو ناقل ہے، وہ تو ناقل ہے) اس ڈر سے کہ کہیں علم کا

(۱) المدخل کے آغاز میں ۱: ۱۷

منصب نااہلوں کی طرف منسوب نہ ہوجائے، اور اس خوف سے کہ یہ بات جھوٹ نہ ہوجائے؛ اس لیے کہ ناقلِ علم حقیقت میں عالم نہیں ہوتا، وہ تو اصحابِ پیشہ میں سے ایک پیشہ ور ہوتا ہے!!۔ یہاں ''**صحاح الأحاديث القدسية**'' کی تشریح پوری ہوگئی۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ سول کورٹس یا شرعی عدالتوں میں کام کرنے والے بعض ججس اور وکلاء کو معاملات اور پرسنل لاء کے فقہ پر ایسی دسترس حاصل ہوتی ہے، جو بہت سے طلبہ اور کبارِ اساتذہ کو بھی حاصل نہیں ہوتی؛ لیکن ان اساتذہ کے پاس ہدایت اور نُور ہوتا ہے، جبکہ ان ججس اور وکلاء کی اکثریت اس سے عاری ہوتی ہے، اس علمِ شرعی اور میراثِ محمدیؐ کو اس لیے مدوّن نہیں کیا گیا تھا کہ اسے دماغوں میں محفوظ کرلیا جائے، یا صرف محاضرات اور سمیناروں میں پیش کرنے پر اکتفا کیا جائے؛ اس کی تدوین احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ہوئی ہے، اس کی تدوین اس لیے ہوئی ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، اس کو پھیلایا جائے اور آنے والی نسلوں تک اسے صحیح اور صاف ستھری شکل میں پہنچایا جائے، جو ہر قسم کی نفسانی خواہشات اور ذاتی رجحانات کی آلودگیوں سے پاک ہو۔

ابنِ ابی شیبہؒ[(۱)] نے حضرت زید بن ارقمؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ اور حبیب ابنِ ابی ثابت سے مرسلاً متعدد روایتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمِ غیر نافع سے پناہ مانگنے کی نقل کی ہیں، اور اس سے پہلے حضرت جابرؓ کی روایت بھی نقل کی ہے، جس میں دونوں باتیں جمع ہیں: ''**سلوا الله علما نافعا وتعوّذوا بالله من علم لاينفع**'' (اللہ سے علمِ نافع کی دعا کرو اور علمِ غیر نافع سے پناہ چاہو) ان تمام روایات کی تخریج مصنف کے حاشیہ میں موجود ہے۔

علم کی تیسری قسم:

ان احادیث میں اللہ تعالیٰ سے علمِ نافع کا سوال کیا گیا ہے، اور علمِ غیر نافع سے پناہ

(۱) (۲۹۷۳۴،۲۹۷۳۶،۲۹۷۳۸-۲۹۷۵۳،۲۹۷۶۰،۲۷۲۴۸)

چاہی گئی ہے، جس سے اشارہ ملتا ہے کہ علم کی ایک تیسری قسم بھی ہے، وہ ہے علمِ ضار؛ کیونکہ علم غیر نافع سے مراد تو وہ علم ہے جو نفع بھی نہ پہنچائے اور نقصان بھی نہ پہنچائے، اگر چہ وہ بھی حقیقت میں نقصان ہی پہنچانے والا علم ہے؛ کہ اس میں آدمی اپنی صلاحیتیں، اپنا پیسہ، وقت اور محنت سب کچھ ایک ایسی چیز کے پیچھے صَرف کرتا ہے، جو آخرت میں اس کے کچھ کام نہیں آسکتیں؛ پس یہ بھی علمِ ضار ہی ہوا، اور جب یہ علم پناہ چاہے جانے کے قابل ہے، تو جس علم کے اندر خالص نقصان ہی نقصان ہو اس سے بدرجہ اولیٰ پناہ مانگنے کی ضرورت ہے۔

خلاصۂ کلام:

یہ ہے کہ علمِ نافع وہ علم ہے جس سے علم پر عمل اور اعمالِ صالحہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو، جس سے قلب روشن ہو، اور نفس سنورے، اور آدمی ہر چھوٹی بڑی چیز کے پاس طرح توقف کرنے لگے، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے متبعین کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یہ علم عطا فرمائے۔

حافظ ابنِ رجبؒ نے علمِ نافع، علمِ غیر نافع اور علمِ نافع کے حامل علماء کی علامتوں کے سلسلے میں اپنے رسالہ "**فضل علم السلف علی علم الخلف**" میں بہت قیمتی باتیں لکھی ہیں، اسے ضرور دیکھنا چاہیے (۱)۔

تابعی کبیر امام شعبیؒ نے علمِ نافع کے صرف ایک جملے کی اہمیت اور اس کے مقام و مرتبہ کی کیا خوب ترجمانی کی ہے، فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص شام کے اِس کنارے سے یمن کے اُس کنارے تک سفر کرے، اور صرف ایک کلمہ ایسا حاصل کرلے جو مستقبل میں اسے کام دینے والا ہو، تو میں سمجھتا ہوں اس کا یہ سفر ضائع نہیں ہوا (۲)۔

(۱) ص: ۷۰ سے آگے تک

(۲) خطیب نے "**الرحلة في طلب الحديث**" ص: ۲۶ میں اس کو اپنی سند سے بیان کیا ہے

دوسری فصل

طالبِ علم کے لیے منہج کی اہمیت

منہج کے معنیٰ:

لغت کے اعتبار سے **نہجٌ**، **منھجٌ** اور **منہاجٌ** کے معنیٰ ہیں: **الطریق الواضح البین المسلوک** صاف اور واضح راستہ جس پر لوگوں کی آمد و رفت ہو، یہ معنیٰ کتبِ لغت اور ان جیسی دوسری کتابوں میں موجود ہیں، دیکھیے: "**صحاح**"، "**لسان العرب**" اور "**المصباح المنیر**" میں **ن ھ ج** کا مادہ، اسی طرح راغب اصفہانیؒ کی "**مفردات**"، علامہ مناویؒ کی "**التوقیف**" اور ابوالبقاء کفوی کی "**الکلیات**" وغیرہ[1]۔

اس کے علاوہ اہلِ مغرب کے یہاں سڑکوں کا نام "**نھج فلان**" یا "**نھج کذا**" رکھنے کا معمول ہے، جیسا کہ مشرق میں "**طریق فلان**" یا "**طریق کذا**" نام رکھے جاتے ہیں۔

منہج کی اہمیت:

جب منہج کے معنیٰ راستے کے ہوئے، تو منہج کے بغیر علم سیکھنے کا مطلب ہے: اس راستے سے ہٹ کر چلنا جو صاف اور واضح ہو اور لوگوں کی آمد و رفت سے آباد ہو، اور ایسے راستے پر

(۱) صحاح ۱: ۳۴۶، لسان العرب ۲: ۳۸۳، مفردات ص ۸۲۵، توقیف للمناوی ص ۶۸۱، أبو البقاء ص ۵۲۴۔

نہ چلنے کا مطلب ہے: کسی مقصد کے بغیر چلنا، اور ظاہر ہے کہ جو چلنا بغیر کسی مقصد کے ہو وہ ناکامی سے قریب تر ہوگا، یہیں سے ہمیں منہج کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

منہج کی اہمیت جس طرح لغوی معنیٰ سے مترشح ہوتی ہے اسی طرح زندگی کے مختلف مراحل میں لوگوں کے احوال دیکھ کر بھی منہج کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے؛ چنانچہ کوئی بھی شخص کسی بھی دنیوی یا علمی کام کو انجام دیتے وقت صحیح نتائج تک اس وقت تک نہیں پہنچ پاتا اور نہ ہی پہنچنا اس کے لیے ممکن ہوتا ہے، جب تک کہ وہ کام شروع کرنے سے پہلے کام کا لائحۂ عمل اور منصوبہ نہ بنالے، اس کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال فرض کرتے ہیں:

مان لیجیے دو لڑکوں نے ماجسٹر یا پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کوئی بحث یا علمی مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا، ان میں سے ایک نے تو اپنی بحث کے لیے شروع سے آخر تک کا پورا خطہ تیار کرلیا، جبکہ دوسرے نے کچھ کیے بغیر ہی لکھنا شروع کردیا، اب جو بھی ان کے بارے میں سنے گا اسے ان کے حتمی نتیجہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ: پہلا شخص تو آگے چل کر کامیابی کی منزلیں طے کرے گا، جبکہ دوسرے کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا، یا کم از کم ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔

منہج اور راستے کو طے کرنے کے لیے معالم کا تحفہ:

چونکہ علم کا یہ راستہ طویل اور مشقتوں سے پُر تھا؛ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ جب طلبہ کے سامنے یہ راستہ بیان کروں تو درمیان میں کچھ چراغ، کچھ روشنی کے مینارے، اور کچھ منزلیں بنادوں، جو ان کے لیے رہنمائی کا کام دیں اور راستہ کو روشن کردیں، اور ان چیزوں کو میں نے ''معالم'' کا نام دیا ہے۔

معالم کے معنیٰ:

معلم کے معنیٰ لغت میں: **الأثر الذي يُستدَلّ به علی الطريق** وہ نشانات جن

سے راستہ کا پتہ لگایا جائے، یہ تعریف جوہری نے اپنی صحاح میں کی ہے، اور لسان العرب میں بھی اسی طرح کے الفاظ ہیں: **ما جُعل علامةً وعَلَما للطرق** وہ چیزیں جو راستہ دکھانے کے لیے بطور علامت اور نشان کے ہوں (۱)۔

پہلی تعریف کے الفاظ سے ہماری مراد پورے طور پر ادا ہو رہی ہے؛ چنانچہ یہ معالم ہم نے نشانات اور چراغِ راہ کے طور پر بنائے ہیں، جن سے طالبِ علم کو راستہ معلوم کرنے میں مدد ملے گی اور وہ ہدایت اور بصیرت کے ساتھ اپنا علمی سفر طے کرتا چلا جائے گا۔

معالم کا ماخذ:

اس منہج کے بیشتر ارکان و منارات جن کو ہم نے بیان کیا ہے، دینی مدارس اور شرعی اداروں میں پڑھنے والے طلبہ کے احوال و واقعات سے ہی ماخوذ ہیں، جس وقت کہ یہ مدارس ابھی زوال پذیر نہیں ہوئے تھے، ساتھ میں کچھ اضافے بھی میں نے اپنی طرف سے کیے ہیں، جو کمیّت کے اعتبار سے تو معمولی ہیں؛ البتہ نوعیت کے اعتبار سے اہم ہیں، جن کی تفصیلات پر کچھ روشنی بھی ڈالی ہے اور ان کی طرف توجہ بھی مبذول کرائی ہے۔

حصولِ علم کا منہج اور راستہ بیان کرنے کی ضرورت:

یہ منارات اگرچہ طلبہ کے احوال سے ماخوذ ہیں؛ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان منارات کو لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، یا لکھنے کا فائدہ کم ہے؛ کیونکہ اس وقت بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف میں مشغول افراد کی اکثریت وہ ہے جو دینی مدارس اور دینی اداروں سے علم حاصل نہیں کرتی؛ بلکہ یہ لوگ علم کے دسترخوان پر طفیلی بن کر آتے ہیں، اور اہلِ علم کے سامنے خود کو عالم گردانتے ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ صوتی اور بصری میڈیا ان کے لیے ڈھول بن گیا ہے، جس کے ذریعہ یہ اہلِ علم کے سامنے خوب شور مچاتے ہیں، اور وہ

(۱) صحاح ۵:۱۹۹۱، لسان العرب ۱۲:۴۱۹۔

بے چارے خاموش رہ کر بس یہی کہتے ہیں: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ.

نیز ان اخیر کی دہائیوں میں ذہنوں سے حصولِ علم کا منہج غائب ہو جانے کی وجہ سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں کے درمیان بہت سے ایسے لوگ بڑے بن بیٹھے، جو بڑے بننے کے اہل نہیں تھے، اور بہت سے بڑے لوگ جو واقعی علمی بادشاہت کے اہل تھے، بے حیثیت ہو کر علمی میدان سے غائب ہو گئے، اور بہت سے نیم طلبہ جو علم کے لیے سراسر مصیبت ہیں، علمی حلقوں پر چھا گئے۔

یہ وہ اہم سبب ہے جس کی وجہ سے حصولِ علم کے صحیح منہج کو بیان کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اور ایک دوسرا سبب جو پہلے سے بھی زیادہ اس موضوع پر لکھنے کا متقاضی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم ایک علمی مستقبل کے دہلیز پر ہیں؛ لیکن افسوس کہ یہ مستقبل انتہائی تاریک ہے، جس سے مسلمانوں اور طالبانِ علومِ نبوت کو بہت بُرے علمی نتائج حاصل ہونے والے ہیں، اور ان سب کی وجہ آن لائن یونیورسٹیوں کے ذریعہ علم حاصل کرنا ہے، ہم عنقریب ان دونوں اسباب پر ان شاء اللہ تفصیلی گفتگو کریں گے۔

منہج کی اہمیت کا فیصلہ کون کر سکتا ہے؟

کوئی بھی میدان خواہ علمی ہو یا دنیوی، ہر جگہ یہ بات مسلّم ہے کہ اس میدان کے ماہرین کی طرف سے طے کردہ اُصول کی اہمیت کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو اس فن میں اختصاص رکھتے ہیں؛ چنانچہ ایک ڈاکٹر ہی جانتا ہے کہ انتقالِ دم، کھانسی، یا زکام زدہ شخص کی چھینک کے تعدیہ سے بچنا کتنا ضروری ہے؛ اسی لیے وہ خون منتقل کرتے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کرتا ہے، اور زکام سے متاثر شخص کے ہم نشینوں پر اور خود اس مریض پر

بھی سختی برتتا ہے؛ لیکن بیشتر لوگوں کو ادراک نہیں ہو پاتا کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر کی طرف سے دی گئی ہدایات کتنی اہم ہیں؛ اس لیے وہ تساہل برتتے ہیں اور کھانے پینے میں اختلاط نہیں چھوڑتے، بلکہ ڈاکٹر کی ہدایات کا ہی مذاق اُڑانے لگتے ہیں۔

اس طرح ہم قراء حضرات کو دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ قرآنِ کریم کے حروف صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرنے پر زور دیتے ہیں؛ اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بلا وجہ کی سختی اور دشواری پیدا کی جارہی ہے؛ حالانکہ بات وہی صحیح ہے جو قراء حضرات کہتے ہیں، یہی حال دوسرے فنون اور اصحابِ فنون کا بھی ہے۔

اور بالکل یہی بات یہاں بھی صحیح منہج کے ساتھ حصولِ علم کی اہمیت کے سلسلے میں کہی جائے گی، کہ اس کی اہمیت کا اندازہ ان ہی طلبہ کو ہوسکتا ہے جو پُرفریب علمی القاب رکھنے والوں کی طرف سے مسلسل دین اور علمِ دین کی بےحرمتی ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، اور صبح وشام کڑھتے رہتے ہیں، یہی طلبہ سمجھ سکتے ہیں کہ حصولِ علم کے لیے لوگوں کو دوبارہ علمائے سابقین کے منہج کی طرف واپس لے جانا کتنا ضروری ہے؛ تاکہ مسلمان پھر سے وہ دن دیکھ سکیں جس میں ان کی زندگی ایسے باعمل علمی رُسوخ رکھنے والے سچے علماء کے درمیان زندگی گزر رہی ہو، جن کے اندر صحیح علم اور زندہ اسلام نمایاں طور پر موجود ہے، اور امت کا ہر فرد امت کی اُمیدوں اور تکلیفوں میں نہ صرف اپنے لیے؛ بلکہ پوری امت کے لیے جی رہا ہے۔

باقی وہ لوگ جن کے بارے میں ہم نے کہا کہ وہ پُرفریب علمی القاب اُٹھائے پھرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ وہ مسلسل اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ منہج کی اہمیت کا ذکر لوگوں کی سماعتوں تک نہ پہنچنے پائے، کہیں ان کے احوال اور ان کے عیوب لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہوجائیں، اور انھیں علمی حلقوں سے دربدر نہ کردیا جائے، انھیں بھی اور ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی جن کی وجہ سے انھیں علم کے حلقے میں گھسنے کی جرأت

ہوئی، اور وہ میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے منبروں پر چڑھ دوڑے، اور شاعر[1] کے اس شعر کے مصداق بن گئے:

(۱) یہ نحو کے امام ابوالحسن علی بن احمد علی الفالی (بالفاء) المؤدب (متوفی سنہ ۴۴۸ھ) ہیں، ابن الجوزی نے "**المنتظم**" (۱۶/۱۰)، یاقوت حموی نے "**معجم الأدباء**" (۱۶۶۴۶/۴)، اور ابنِ کثیر نے "**البداية**" (۷۳۹/۱۵) میں یہ اشعار ان ہی کی طرف منسوب کیے ہیں؛ البتہ یاقوت حموی نے پیچھے ۱۰۶۳/۳ پر ابوالحسن بن سعد آمدی لغوی (متوفی ۴۴۴ھ) کے ترجمہ میں بھی ان اشعار کو ذکر کیا ہے!۔

یہ اشعار شیخ فالی کے ہی ہیں نہ کہ آمدی کے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ ابن الجوزی اور خود یاقوت حموی نے بھی اسی مفہوم کے کچھ دوسرے اشعار شیخ فالی کی طرف منسوب کیے ہیں، جن کو خطیب تبریزی نے فالی سے روایت کیا ہے:

لَمّا تبدَّلَتِ المَجالسُ أوجُهًا ❖ غيرَ الذينَ عَهِدتُ مِن عُلمائِها

و رَأيتُها مَحفُوفةً بِسِوَى الأُلَى ❖ كانوا وُلاةَ صُدورِها وفِنائِها

أَنشدتُ بيتًا سائِرًا مُتقدِّمًا ❖ والعَينُ قد شرِقَت بِجارِي مائِها

أمّا الخِيامُ فإنّها كَخِيامِهم ❖ وأرى نساءَ الحَيِّ غيرَ نسائِها

جب ان مجالس کے اندر چہرے بدل گئے اور ان علماء کے چہرے نہیں رہے جن کو میں نے پایا تھا۔

اور مجھے یہ بھری ہوئی مجلسیں ان نفوس سے خالی ملیں جو ان مجلسوں کی رونق اور ان کے صدر نشین تھے۔

تو میری آنکھیں بہتے ہوئے آنسوؤں کی وجہ سے سرخ ہو گئیں اور میں نے ایک قدیم اور مشہور شعر پڑھا:

أمّا الخِيامُ فإنّها كَخِيامِهم ❖ وأرى نساءَ الحَيِّ غيرَ نسائِها

خیمے تو ان ہی کے خیموں جیسے ہیں؛ لیکن محلّے کی عورتیں ویسی نظر نہیں آتیں جیسی ان خیموں میں تھیں۔

لگتا ہے کہ شیخ فالی نے لمبی عمر پائی، اور انھوں نے اپنے ان شیوخ میں جن کا زمانہ انھوں نے پایا اور ان لوگوں میں جنھوں نے ان کا زمانہ پایا: نمایاں فرق دیکھا۔

واضح رہے کہ یہ شیخ فانی، "**الأمالي**" کے مصنّف نہیں ہیں، "**الأمالي**" کے مصنّف امام ابوعلی القالی ہیں، حافظ ابنِ کثیر کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے **الأمالي** "کو ان ہی شیخ ابوالحسن الفالی کی طرف منسوب کر دیا۔

تَصَدَّرَ لِلتدريْسِ كلُّ مُهوَّسٍ ❖ بَلِيْدٍ يُسمَّى بالفَقيهِ المُدرِّسِ
فَحُقَّ لأهلِ العلمِ أن يَّتَمَثَّلُوْا ❖ بِبَيْتٍ قَدِيْمٍ شَاعَ فِي كلِّ مجلِسِ

خبطی اور بے وقوف قسم کے لوگ مسندِ درس پر بیٹھ گئے اور انھیں استاذ اور مدرس کہا جانے لگا۔

اب اہلِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ اس قدیم عربی شعر کو پڑھیں جو بے حد مشہور و معروف ہے

لَقَدْ هُزِلَتْ حَتّى بَدا مِنْ هُزَالِها ❖ كُلاها وحتّى سامَها كلُّ مُفلِسٍ

کہ وہ دبلی ہوگئی یہاں تک کہ اس کے دُبلے پن کی وجہ سے اس کا جگر نظر آنے لگا، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مفلس قسم کے لوگ اس کے بارے میں بھاؤ تاؤ کرنے لگے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق کو اس کی اصل حالت اور اس کے اہل کی طرف لوٹا دے۔

تیسری فصل

علم اور علماء کی فضیلت

علمائے متقدمین ومتأخرین نے اس باب میں اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ ان کو جمع کرنا تو دُور کی بات، ان کو شمار کرنا بھی دشوار ہے، اپنی طالبِ علمی کے ابتدائی زمانے میں میری خواہش تھی کہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے "**الإحياء**" کے شروع میں جو باتیں لکھی ہیں، اسی طرح امام حافظ ابنِ رجب حنبلیؒ نے حدیث ابوالدرداءؓ: "**من سلك طريقا يلتمس فيه علما**" کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے، جس کو سب سے پہلے استاذ محبّ الدین الخطیب نے "**شرح حديث أبي الدرداء**" کے نام سے شائع کیا، پھر کافی عرصہ بعد وہ "**إلىٰ ورثة الأنبياء**" کے نام سے شائع ہوئی، پھر دوسرے ناموں سے شائع ہوتی رہی، میری خواہش تھی کہ اگر یہ دونوں مواد ایک ہی جلد میں جمع ہو جائیں، اور اسی کے ساتھ امام ابنِ قیمؒ نے "**مفتاح دارالسعادة**" میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے بھی کچھ انتخاب کر کے اس میں شامل کر دیا جائے، تو ایک گراں قدر اور مفید کام ہو جائے؛ گرچہ وہ اس موضوع پر علماء کی طرف سے لکھے ہوئے مواد کے سامنے "مشتے از خروارے" کا ہی نمونہ ہوگا۔

موضوع سے متعلق ائمہ واسلاف کی کاوشیں:

ہمارے ائمہ واسلاف میں سے جنھوں نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے ان میں سے ایک: امام ابوخیثمہ زہیر بن حربِ نسائیؒ (۱۶۰ - ۲۳۴ھ) ہیں، جو امام بخاریؒ اور امام

مسلمؒ کے شیوخ میں سے ہیں، انھوں نے اس موضوع پر ''کتاب العلم'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جو چھپی ہوئی ہے، ان کے علاوہ دیگر ائمہ محدثین: عبدالرزاق، ابنِ ابی شیبہ، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، امام ابنِ ماجہ، امام دارمی، ابنِ حبان اور ابوعبداللہ حاکم نے بھی اپنی اپنی کتبِ اُصول میں اس موضوع پر مستقل ابواب باندھے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مواد امام دارمیؒ کے یہاں (حدیث نمبر ۱۰۱-تا-۶۴۹) ہے؛ جنھوں نے صرف مرفوع احادیث پر اکتفا نہیں کیا؛ بلکہ اور بھی بہت سی عمدہ اور مفید چیزیں جمع کر دی ہیں، اور کل ۴۰ باب قائم کیے ہیں، جبکہ اس موضوع پر سب سے کم احادیث امام مسلمؒ کے یہاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام نفوسِ قدسیہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

اس کے بعد خطیب بغدادیؒ نے اس موضوع پر مستقل دو کتابیں: **"آداب الفقيه والمتفقه"**(۱) اور **"الجامع لآداب الراوي وأخلاق السامع"** لکھی، اور ان کے علاوہ علم پر عمل کی ترغیب کے سلسلے میں ایک مستقل رسالہ **"اقتضاء العلم والعمل"** لکھا، اسی طرح ابنِ عبدالبرؒ نے بھی ایک مستقل کتاب **"جامع بيان العلم والعمل"** تصنیف فرمائی، اور پھر امام ابوسعد سمعانیؒ نے اس موضوع کے ابواب میں سے صرف ایک باب کو لے کر **"أدب الإملاء والاستملاء"** نامی کتاب لکھی، اور اس میں بیش بہا موتی جمع کیے۔

اور اخیر میں حافظ ہیثمیؒ نے احادیثِ مبارکہ کے عظیم انسائیکلو پیڈیا ''مجمع الزوائد''(۲)

---

(۱) نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات ۳: ۱۲۳ میں یہی نام ذکر کیا ہے، جبکہ طوفی نے شرح مختصر الروضہ ۳: ۲۸۸ میں اس کا نام **''الفقيه والمتفقه''** لکھا ہے، پہلا نام بہتر ہے، گرچہ یہ دو مرتبہ **''الفقيه والمتفقه''** کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

(۲) ۱: ۱۱۹۔ ۲۰۲

میں اس موضوع سے متعلق بے حد مفید مواد اکٹھا کر دیا، جو اس موضوع پر انتہائی پُرمغز ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن پھر بھی اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے، جس کے لیے ہم دو مبحث قائم کرنا چاہتے ہیں:

۱-علم اور مجالسِ علم کی فضیلت۔

۲-علماء کی فضیلت اور امت میں ان کے اثرات۔

پہلا مبحث

علم اور مجالسِ علم کی فضیلت سے متعلق کچھ باتیں

علم کی فضیلت کتاب اللہ کی روشنی میں

پہلی فضیلت: علم کی وجہ سے آدم علیہ السلام کی تکریم:

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے شروع میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں علم کی فضیلت کو واشگاف کیا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں سے سجدہ کروا کر نہ صرف فرشتوں پر؛ بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسان وجنات پر ان کی فضیلت کا اعلان کر دیا؛ یہ سجدے کا حکم اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پہلے تمام نام سکھلائے، اور فرشتوں کے سامنے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ ان ناموں کو بتانے سے عاجز ہیں، اس وقت انھیں حکم ہوا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں؛ کیونکہ انھیں ان تمام ناموں کا علم حاصل ہے۔

اس طرح آدم علیہ السلام کو یہ اعزاز علم کی بنیاد پر حاصل ہوا، اور علم ہی کی وجہ سے وہ فرشتوں کی طرف سے سجدہ کیے جانے کے مستحق ہوئے۔

فرشتوں کے پَر بچھانے کا سبب:

ویسے تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں؛ لیکن بظاہر یہیں سے فرشتوں کی طرف سے

طالبِ علم کا یہ احترام چلا آرہا ہے کہ وہ اس کو راضی کرنے کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں، جیسا کہ مشہور حدیث میں ہے: ''**من سلك طريقا يبتغي فيه علما سلك الله له طريقا إلى الجنة، وإن الملائكة لتضع أجنحتها رضاء لطالب العلم**'' کہ جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت کے راستے پر چلاتے ہیں، اور فرشتے طالبِ علم کو خوش کرنے کے لیے اپنے پَروں کو بچھا دیتے ہیں [1]۔

اللہ رب العزت کی طرف سے ملنے والا یہ اعزاز علم اور علماء دونوں کی فضیلت و اہمیت کو بتلاتا ہے۔

دوسری فضیلت: دنیا و آخرت کی ہلاکتوں سے نجات کا ذریعہ:

علم کی فضیلت کے حوالے سے قرآنِ کریم میں جن باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ علم: اہلِ علم کے لیے دنیا اور آخرت میں ہر ہلاکت سے نجات کا سبب ہے، اور ظاہر ہے کہ ہلاکت سے نجات بھی اس ہلاکت کے اعتبار سے ہی ہوتی ہے۔

جہاں تک دنیا میں نجات کی بات ہے: تو ہدہد کے واقعہ میں اس طرف اشارہ ملتا ہے، جب سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو سخت سزا دینے یا ذبح کرنے کی دھمکی دی تھی، تو اس وقت ہدہد کو اس سخت ترین دھمکی سے نجات علم کے ذریعہ ہی حاصل ہوئی، جب اس نے آکر کہا ﴿وَ جِئۡتُكَ مِنۡ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيۡنٍ﴾ (النمل) (کہ میں آپ کے پاس سبا کی ایک یقینی خبر لایا ہوں) پھر یہی خبر اور یہی علم بلقیس اور اس کی قوم کے ایمان لانے کا بھی سبب بنا۔

رہی آخرت کی نجات: تو سورۂ قصص (آیت: ۷۶ - ۸۳) میں قارون کے واقعہ میں اس طرف اشارہ ملتا ہے، کہ دنیا دار لوگ تو قارون کی دولت اور اس کی شان و شوکت کو

(۱) یہ ترمذی (۲۶۸۲) کے الفاظ ہیں، ابن ماجہ (۲۲۳)

دیکھ کر اور اس کی اس بات کو سن کر کہ ﴿اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ﴾ (یہ سب کچھ میری ذاتی ہنرمندی سے ملا ہے) فتنہ میں پڑ گئے؛ لیکن ﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ کہ جو علم کے حامل، یعنی حقیقی علم کے حامل علمائے ربانیین تھے، انھوں نے برملا کہا: ﴿وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا﴾ (تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے اس کی حقیقت بھی ظاہر کی، جس کا ذکر ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ سے ﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ تک ہے، کہ غافل لوگوں کا انجام تو ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ﴾ ہوا کہ وہ زمین میں دھنسا دیے گئے، اور علمائے عاملین ﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ کے مژدے سے سرفراز ہوئے کہ ان کے لیے آخرت میں نیک نتیجہ لکھ دیا گیا۔

علم کی وجہ سے نجات پانے پر ایک لطیفہ:

اسی سلسلے میں کہ: عالم اپنے علم کی وجہ سے نجات پا جاتا ہے، ایک لطیفہ ذکر کیا جاتا ہے کہ: خوارج کے سردار اور سربرآوردہ لوگوں میں شبیب بن یزید شیبانی خارجی نامی ایک شخص تھا، جس نے عبدالملک بن مروان کے خلاف خروج کیا تھا، اور آخرکار پانی میں ڈوب کر مَرا، اس نے اپنی زندگی میں خلافت کا دعویٰ کیا تھا، جس پر اس کے متبعین میں سے عتبان حروری نامی ایک شخص نے اس کے بارے میں کچھ اشعار کہے، اور ان میں شبیب کو امیر المؤمنین کہا، وہ اپنے اشعار میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

فَمِنّا حُصينٌ والبَطينُ وقَعنَبُ ❖ ومِنّا أميرُ المؤمنين شَبيب

(اگر تم میں فلاں اور فلاں ہیں تو) ہم میں بھی حصین، بطین اور قعنب ہیں، اور ہم میں بھی امیر المؤمنین شبیب جیسے موجود لوگ ہیں۔

جب شبیب غرقاب ہوگیا، تو عتبان کو عبدلملک کے پاس لایا گیا، عبدالملک نے اس سے کہا: اے دشمنِ خدا! تُو نے ہی یہ شعر کہا ہے:

فَمِنّا حُصينٌ والبَطِينُ وقَعنَبُ ❖ ومِنّا أميرُ المؤمنين شَبيب

تو وہ کہنے لگا: امیرالمؤمنین! میں نے اس طرح نہیں کہا، میں نے تو یوں کہا ہے:

ومِنّا – أميرَ المؤمنين – شبيبُ

کہ اے امیرالمؤمنین (عبدالملک بن مروان)! ہم میں بھی شبیب جیسا شخص موجود ہے۔

اس کا یہ جواب عبدالملک کو بہت پسند آیا اور اسے چھوڑ دینے کا حکم دیا، اس طرح عتبان اپنے علم کی بنیاد پر اپنے کلام میں تصرف کر کے قتل ہونے سے بچ گیا[1]۔

تیسری فضیلت: زیادتیِ علم کی دعا کا حکم:

علم کے متعلق جو فضائل کتاب اللہ میں وارد ہوئے ہیں، ان میں ایک مشہور فضیلت یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علم میں اضافہ کی دعا کرنے کا حکم دیا ہے: ﴿وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ (کہ اے نبی جی! آپ یہ دعا کیا کیجیے: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما) ہمیں علم کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس میں زیادتی طلب کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو، نہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نہ آپ کے علاوہ کسی اور کو، یہ فضیلت صرف علم کو ہی حاصل ہے، اور اس علم سے مراد یقیناً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کے جاہ وجلال، اور اس کا قرب بڑھانے والی چیزوں کا علم ہے۔

(۱) اس واقعہ کو ابن خلکان ۲: ۴۵۶ نے بھی ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: یہ جواب نہایت عمدہ ہے، پھر اس کی وضاحت کی ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منقول ہے: "**اللّٰهمَّ انْفَعْنِي بِما علَّمتَنِي وعلِّمني ما يَنفعُنِي وزِدْني عِلما**" (اے اللہ! تیری طرف سے جو بھی علم مجھے عطا ہو اس سے مجھے نفع پہنچا، اور مجھے وہ علم عطا کر جو میرے لیے نافع ہو، اور میرے علم میں اضافہ فرما)(۱)۔

چوتھی فضیلت: حصولِ علم کا درجہ جہاد کے برابر:

اللہ تعالیٰ سورۂ توبہ کے اواخر میں فرماتے ہیں: ﴿**وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ**﴾ (التوبہ)

اِس آیت کا اجمالی مفہوم زمانۂ نبوت کے بعد آنے والوں کے لیے یہ ہے کہ: جہاد میں تمام مؤمنین کو نہیں نکلنا چاہیے؛ بلکہ ان میں سے ایک جماعت طلبِ علم اور تفقہ فی الدین کے لیے نکلے، پھر یہ جماعت اپنی قوم کے پاس آ کر انھیں علم سکھائے، اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرے، اس آیت میں طلبِ علم کو جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیا گیا ہے، وہی جہاد جسے **ذروة سنام الإسلام** (اسلام کے کوہان کی بلندی) کہا گیا ہے(۲)۔

ابنِ عبد البرؒ نے حضرت ابو الدرداءؓ سے دو حدیثیں نقل کی ہیں، ان سے بھی طلبِ علم کا جہاد کے برابر ہونا معلوم ہوتا ہے؛ بلکہ ان دونوں حدیثوں کے درمیان حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ: علم کا سکھانا جہاد سے بھی بہتر ہے(۳)۔

(۱) اس حدیث کو ترمذی (۳۵۹۹) اور ابن ماجہ (۲۵۱) نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے امام ترمذی نے اس کی تضعیف کی ہے۔

(۲) مذکورہ آیت کی تفسیر احکام القرآن لابن العربی ۲: ۱۰۱ میں ملاحظہ فرمائیں، قرطبی ۸: ۲۹۳ میں اس پر کچھ اضافہ بھی ہے۔

(۳) جامع ابن العربی (۱۵۹، ۱۶۱، ۱۶۰)

ابوالحسن قابسی مالکیؒ ''الرسالة المفصلة لأحوال المتعلمين''[1] میں امام ابنِ امام محمد بن سحنونؒ (۲۰۲-۲۵۶) کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ: ایک بچہ ان کے پاس علم حاصل کرتا تھا، ایک روز اس بچے کا باپ استاذ کے پاس آیا - اور وہ باپ بھی کیا خوب تھا -، کہنے لگا: میں نے کام کاج کی ساری ذمہ داری خود اپنے سر لے لی ہے، اور اس بچے کو علم کے لیے یکسو رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے، اب اسے علم کے علاوہ کسی بھی چیز میں نہیں لگاؤں گا، یہ سن کر بچے کے استاذ محمد بن سحنون فرمانے لگے - اور استاذ بھی کیا خوب تھے - فرمایا: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے اس عمل کا ثواب حج، جہاد اور سرحدوں کی حفاظت کے اجر سے بھی بڑھ کر ہے۔ حج سے مراد حجِ نافلہ اور جہاد ور باط سے مراد فرضِ کفایہ جہاد ور باط ہے۔

بچے کو علم کے لیے یکسو رکھیں:

اس واقعہ میں ہر اُس باپ اور سرپرست کے لیے ایک سبق ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بیٹے کو طلبِ علم میں لگانے کی توفیق دی ہے کہ: وہ اس بچے کی طرف سے خرچ کا بوجھ خود اُٹھالیں، جتنا بھی ان کے لیے ممکن ہو، اور اس بچے کو معاش کی ذمہ داریوں اور دنیا کی مشغولیتوں سے فارغ رکھیں؛ تاکہ اس کو دلجمعی اور اطمینانِ قلبی میسر رہے، اور وہ اپنی پڑھائی کے لیے یکسو رہ سکے۔

اس واقعہ نے مجھے حضرت انس بن مالکؓ کی ایک حدیث یاد دلادی، وہ فرماتے ہیں کہ: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دو بھائی تھے، ایک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا، اور دوسرا کمائی کرتا تھا، ایک روز کمانے والے بھائی نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر اپنے بھائی کی شکایت کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لعلّك تُرزَق به**'' ہوسکتا ہے تمہیں اسی کی وجہ سے رزق ملتا ہو[2]۔

---

(۱) ص ۸۹

(۲) رواه الترمذي (۲۳٤٥) وقال: حسن صحيح

حافظ ابنِ رجبؒ فرماتے ہیں(۱) کہ: علم ذکر کی سب سے افضل نوع ہے، اسی طرح جہاد کی بھی سب سے افضل نوع ہے۔ اور ''لطائف المعارف'' میں لکھا ہے(۲) کہ: ائمہ اربعہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ علم حاصل کرنا نفل نمازوں سے افضل ہے؛ اس لیے کہ علم ایک چراغ ہے جس سے جہالت اور بدعات کی تاریکیوں میں روشنی حاصل کی جاتی ہے، جو شخص چراغ کے بغیر کسی راستے پر چلتا ہے، خطرہ ہے کہ کسی اندھے کنویں میں گر کر ہلاک ہو جائے۔

البتہ برہان زرنوجیؒ نے اشارہ کیا ہے کہ: اس حکم (یعنی علم کا درجہ جہاد کے برابر ہونے) میں ہلکا سا اختلاف موجود ہے؛ وہ لکھتے ہیں کہ: علم حاصل کرنا بہت عظیم کام ہے، اور یہ اکثر علماء کے نزدیک جہاد سے افضل ہے(۳)۔

علم کی فضیلت احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں

پہلی فضیلت: علم کا سیکھنا فرض ہے:

آپ صلی اللہ علی وسلم کا ارشاد ہے: **"طلب العلم فريضة علىٰ كل مسلم"** علم کا سیکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اس حدیث کو ابنِ ماجہ(۴) وغیرہ نے حضرت انسؓ اور دوسرے صحابہؓ سے روایت کیا ہے، اور علماء نے اس کی سند و متن پر کافی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

(۱) شرح حدیث أبی الدرداء، ص ۳۷

(۲) ص ۱۳۰

(۳) تعلیم المتعلّم ص ۸۳

(۴) سنن ابن ماجہ (۲۲۴)

جہاں تک سند کی بات ہے: تو یہ حدیث کثرتِ طرق کی وجہ سے صحت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے، امام سیوطیؒ نے اس پر ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے، جس میں اس حدیث کے تمام طرق جمع کر دیے ہیں، یہ رسالہ چھپا ہوا ہے، جس میں صرف حضرت انسؓ سے روایت کرنے والوں کی تعداد اکیس (۲۱) تک پہنچتی ہے۔

اور جہاں تک متن کا تعلق ہے: تو اس حدیث میں علم سیکھنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، اور فرض کی دو قسمیں ہیں: (۱) فرضِ عین اور (۲) فرضِ کفایہ، علم کا سیکھنا فرضِ عین بھی ہے اور فرضِ کفایہ بھی۔

فرضِ عین کی تفصیل:

ایک مسلمان کے لیے حال کا علم سیکھنا فرضِ عین ہے، یعنی یہ جاننا کہ جس حال میں ہم ہیں اس حال میں اسلام کا ہم سے کیا مطالبہ ہے، مثال کے طور پر کوئی شخص عصر سے پہلے بالغ ہوا تو وہ اس بات کا مکلف ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ فوری طور پر طہارت اور نماز کے احکام سیکھے؛ تاکہ ظہر کا وقت نکلنے سے پہلے پہلے وہ طہارت حاصل کر کے ظہر کی نماز ادا کر سکے۔

اسی طرح اگر کوئی حج کے مہینوں میں بالغ ہوا تو اس کے ذمہ حج کی ادائیگی فرض ہے، اب اسے چاہیے کہ فوراً حج کے احکام سیکھے اور حج کی تیاری کرے، بشرطیکہ حج کے دوسرے واجبات بھی پائے جاتے ہوں، یہی حکم زکوٰۃ اور روزے کا بھی ہے۔

اسی طرح بالغ ہونے والے شخص کے والدین بھی ہوتے ہیں، ان کے حقوق جاننا بھی اس کے ذمہ فرض ہے، اگر وہ زندہ ہوں تو زندگی میں ادا کیے جانے والے حقوق اور اگر وفات پا چکے ہوں تو مرنے کے بعد عائد ہونے والے حقوق کو جاننے کی فکر کرے، اور انھیں علم اور بصیرت کے ساتھ ادا کرے، محض رواج اور معاشرے کو دیکھ کر اندھی تقلید

کرنے نہ لگ جائے، اسی طریقے سے زندگی میں جتنے بھی مراحل پیش آئیں: شادی ہو، بچہ کی پیدائش کا معاملہ ہو، تدریس کی ذمہ داری ملی ہو، قاضی کے عہدہ پر تقرری ہوئی ہو؛ غرض ہر ہر موقع پر اس حالت سے متعلق فرض علم حاصل کرتا رہے، اور اس پر عمل کرتا رہے، اور یہ بات اہلِ علم کے درمیان مشہور و معروف ہے(۱)۔

فرضِ کفایہ کی تفصیل:

فرض کی دوسری قسم فرضِ کفایہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے اس فرض کو ادا کر دیا تو آپ نے دوسروں کی طرف سے کفایت کر دی، اور ان کے ذمہ سے فرض ساقط کر دیا، یا کسی دوسرے نے اسے ادا کر دیا تو اس نے آپ کی طرف سے کفایت کر دی، اور آپ کے ذمہ سے فرض ساقط کر دیا؛ لیکن یہ اسی وقت ہے جبکہ اس فرض کی ادائیگی میں کفایت حاصل ہو جائے، اور وہ فرض ادا ہو جاوے؛ ورنہ کسی کے ذمہ سے بھی ساقط نہیں ہوگا؛ چنانچہ اگر شہر میں مثال کے طور پر دس ڈاکٹر امراضِ قلب کے ماہر ہوں؛ لیکن وہ کافی نہ ہوتے ہوں، تو اس وقت شہر کے تمام مسلمانوں کے ذمہ یہ فرض ہو جائے گا کہ وہ اپنے بچوں کو مزید اتنی تعداد میں اس فن کے اندر لگائیں کہ یہ ضرورت پوری ہو جائے؛ ورنہ شہر میں بسنے والے تمام مسلمان اس فریضہ کی عدمِ ادائیگی کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔

یہی بات ان علوم کے ماہر علماء کی تعداد کے بارے میں بھی کہی جائے گی جن کی شہر کے مسلمانوں کو ضرورت پڑتی ہے، ؛ انجینئرس، مسلم ماہرین اقتصادیات اور دیگر تمام ضروری فنون میں مہارت رکھنے والے مسلمانوں کی تعداد کا بھی یہی معاملہ ہے، کہ ہر شہر کے اندر اس شہر کے تمام مسلم باشندوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان مذکورہ میدانوں میں جتنے

(۱) اس سلسلے میں بہت سے متقدمین ومتاخرین علماء نے گفتگو کی ہے، غالباً ابن المبارک سے سب سے پہلے اس طرح کی بات نقل کی گئی ہے، جسے ابن ابی العوام نے ''فضائل ابی حنیفہؒ'' میں نقل کیا ہے۔

بھی افراد کی ضرورت ہو، اپنے بچوں کے ذریعہ اس تعداد کو پورا کریں، اور ساتھ ہی اپنے شہر کی آبادی اور اس کی ضروریات کے تنوع کو مدنظر رکھتے ہوئے افراد و وسائل اور کمیت وکیفیت کو بتدریج بڑھاتے بھی رہیں۔

ہمارا مقصد یہاں دینی اعتبار سے پیش آنے والی سخت ضرورتوں کی طرف توجہ دلانا اور ان کے تئیں مسلمانوں کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا ہے، کہ وہ دینی علوم کے مختلف میدانوں میں اپنے اپنے علاقے کی ضروریات کے اعتبار سے اپنے بچوں کی اتنی بڑی تعداد مہیا کریں کہ اس علاقے کی ضروریات کماً وکیفاً پوری ہوسکیں۔

علماء کے تئیں معاشرے کو درپیش ضروریات:

مجموعی اعتبار سے ایک مسلم معاشرہ کو کسی بھی ملک کے اندر، خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، تین قسم کے علماء کی ضرورت پڑتی ہے:

۱-منبر ومحراب کی ذمہ داری سنبھالنے، اور امامت وخطابت کا فریضہ انجام دینے کے لیے سمجھدار طلبہ کی اتنی بڑی تعداد کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس اہم دینی فریضے اور اسلامی شعائر کو ادا کرسکیں، قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسجدوں میں نماز کے وقت امام کی ضرورت پڑے گی، لوگ امام کو ڈھونڈھیں گے؛ لیکن کوئی امام نہیں ملے گا جو نماز پڑھا سکے، وہ ایک دوسرے کو امامت کے لیے آگے بڑھائیں گے، کہ تم امامت کرو، تم امامت کرو؛ لیکن کوئی تیار نہ ہوگا۔

۲-ہر مسلم معاشرہ کو علمی رسوخ رکھنے والے اتنے علماء کی ضرورت ہوتی ہے، جو انھیں درپیش عمومی مسائل میں فتویٰ دے سکیں، اور اللہ کا حکم بتا سکیں۔

۳-مسلم معاشرہ کو علماء کی ایک ایسی جماعت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جو علم کے اندر اپنی گہرائی وگیرائی، اپنے اختصاص، اپنی سمجھ بوجھ اور عمومی افکار کے اعتبار سے پہلے طبقہ

سے بڑھ کر ہوں؛ تا کہ وہ ایک طرف مشکل مسائل میں لوگوں کو اللہ کا حکم بتا سکیں، اور دوسری طرف علومِ اسلامیہ کے تئیں گمراہ کرنے والوں کی طرف سے کیے جانے والے اعتراضات کا جواب بھی دے سکیں، خواہ وہ اعتراضات عقائد سے متعلق ہوں یا کتاب اللہ سے، یا سنتِ رسول اللہ سے، یا فقہِ اسلامی سے، یا کتاب وسنت کی زبان سمجھی جانے والی عربی زبان وادب سے، یا دین کے کسی بھی علم وفن سے۔

واضح رہے کہ یہ جماعت کسی ایک ملک کے لیے نہیں ہوتی؛ بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہوتی ہے، خواہ وہ کہیں کے بھی ہوں؛ اس لیے اس جماعت کو تیار کرنا اور اس کے لیے افراد و وسائل مہیا کرنا پوری امت کی ذمہ داری ہے، اور ضروری ہے کہ یہ جماعت مسلسل بڑھتی اور ترقی کرتی رہے؛ کیونکہ مسلمانوں پر شبہات اور گمراہی کی راہیں کھولنے والوں کی طرف سے اس جماعت کی ضرورت اور حاجت بھی مسلسل بڑھتی ہی رہتی ہے۔

ہم ان شاء اللہ کسی اور موقع پر تفصیل کے ساتھ اس جماعت کی ضرورت، اس کو تیار کرنے کے طریقے اور اس کے علم وعمل کے میدانوں کے بارے میں گفتگو کریں گے، یہاں اتنا ہی کافی ہے۔

تعلیم سے غفلت برتنے پر تنبیہ:

علم کی دوسری فضیلت: عبد الرحمٰن ابنِ ابزی الخزاعی جو صغارِ صحابہؓ میں سے ہیں، ان سے یا ان کے والد ابزی سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعظ فرمایا، جس میں مسلمانوں کی بعض جماعتوں کی تعریف کی، اس کے بعد فرمایا کہ: ”بعض قوموں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں نہ دین کی سمجھ پیدا کرتی ہیں، نہ ان کو علم سکھاتی ہیں، نہ ان کو دین سے واقف کراتی ہیں، نہ ان کو اچھی باتوں کا حکم کرتی ہیں، اور نہ بُری باتوں سے روکتی ہیں، اور دوسری بعض قوموں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ

اپنے پڑوسیوں سے نہ علم سیکھتے ہیں، اور نہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتی ہیں، اللہ کی قسم! یہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو علم سکھائیں، ان میں دین کی سمجھ پیدا کریں، ان کو دین سے واقف کرائیں، انھیں اچھی باتوں کا حکم کریں، اور بُری باتوں سے روکیں، اور دوسرے بعض لوگ اپنے پڑوسیوں سے علم سیکھیں، اور ان سے دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں؛ ورنہ میں ان سب کو دنیا ہی میں سخت سزا دوں گا''۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔

لوگوں میں اس کا چرچا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کن لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمائی، جس پر بعض لوگوں نے کہا کہ: ہمارے خیال میں اشعری قوم کے لوگ مراد ہیں کہ وہ لوگ علم والے ہیں، اور ان کے آس پاس کے دیہاتی گنوار اور اجڈ قسم کے ہیں، یہ خبر اشعری لوگوں کو پہنچی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! آپؐ نے بعض قوموں کی تعریف فرمائی، اور ہم پر ناراضگی کا اظہار فرمایا، ہمارا کیا قصور ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی بات ارشاد فرمائی کہ: ''یہ لوگ اپنے پڑوسیوں کو علم سکھائیں، ان میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کریں، ان کو اچھی باتوں کا حکم کریں، اور بُری باتوں سے منع کریں، اور دوسرے لوگ اپنے پڑوسیوں سے سیکھیں، اور ان سے دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں؛ ورنہ میں ان سب کو دنیا میں سخت سزا دوں گا''۔

اشعری لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم دوسروں میں دین کی سمجھ پیدا کریں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی بات ارشاد فرمائی، انھوں نے تیسری بار پھر یہی عرض کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار بھی وہی بات ارشاد فرمائی، اس پر انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں ایک سال کی مہلت دے دیں؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک سال کی مہلت دے دی، کہ وہ اس عرصہ میں اپنے پڑوسیوں میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا

کریں، اور انھیں علم سکھائیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۝﴾ (المائدہ)

ترجمہ: بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی تھی، اور یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انھوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے، جس بُرائی میں وہ مبتلا تھے اس سے ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے، ان کا یہ کام واقعی بُرا تھا(۱)۔

تعلیم و تعلّم کی اہمیت کو بتلانے والی نصوص یوں تو کئی ایک ہیں؛ لیکن اتنی سخت ڈانٹ کہ ''میں انھیں دنیا ہی میں سخت سزا دوں گا'' کسی اور حدیث میں نہیں ملتی: اسی لیے میں نے اس حدیث کا انتخاب کیا ہے۔

علم نہ سکھانے پر ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی وجہ:

اس ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ یہ ہے کہ علم ہی سے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وکردار اور سوچ وفکر کی درستگی ہوتی ہے، اور جب کسی مسلمان کے اندر یہ سارے گوشے صحیح

(۱) اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر کی غیر مطبوع قسم میں اور ان کے طریق سے ابونعیم نے معرفہ ۱:۳۶۶ میں روایت کیا ہے اور اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس کے راوی عبدالرحمن بن ابزی ہیں، ابن اثیر نے اسد الغابہ ۱:۵۶ میں ان کی اتباع کی ہے، جبکہ بخاری نے وحدان اور ابن مندہ نے معرفہ میں اور ان کے طریق سے ابن عساکر ۵۸:۳۲ نے اسے عبدالرحمن کے والد ابزی کی روایت کے طور پر ذکر کیا ہے، اسی کو حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابزی کے ترجمہ میں راجح قرار دیا ہے۔

اس کو ابن السکن نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے: إسناده صالح جیسا کہ کنز العمال ۳:۶۸۴-۶۸۵ (۸۴۵۷) میں ہے، منذری نے بھی ترغیب ۱:۱۲۲ میں اس کو ذکر کیا ہے اور مشعر بالقبول لفظ سے اس کا آغاز کیا ہے۔

ہوجاتے ہیں تو اس کی دنیا وآخرت سنور جاتی ہے، اور اس کے سارے معاملات ٹھیک ہوجاتے ہیں (۱)۔

اور ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ: اگر علم سے افضل کوئی چیز ہوتی تو انبیائے کرام بعد میں آنے والوں کو اسی چیز کا وارث بناتے؛ لیکن انھوں نے علم کے سوا کسی چیز کا وارث نہیں بنایا۔

چنانچہ طبرانی نے ''معجم اوسط'' میں ایک حدیث -جس کی سند بقول ہیثمی حسن درجے کی ہے- روایت کی ہے: کہ حضرت ابو ہریرہؓ ایک مرتبہ مدینہ کے بازار سے گزرتے ہوئے ٹھہر گئے، اور فرمایا: بازار والو! تم لوگ کیوں عاجز ہوگئے؟ لوگوں نے پوچھا: ابو ہریرہ! کیا بات ہے؟ آپؓ نے فرمایا: وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم ہورہی ہے، اور تم یہاں بیٹھے ہو، جاکر اپنا حصہ کیوں نہیں لیتے؟ لوگوں نے پوچھا: کہاں تقسیم ہورہی ہے؟ آپؓ نے فرمایا: مسجد میں۔ لوگ دوڑے ہوئے مسجد کی طرف گئے اور حضرت ابو ہریرہؓ وہیں ٹھہرے رہے، کچھ دیر بعد لوگ واپس آگئے، تو آپؓ نے پوچھا: کیا بات ہے، واپس کیوں آگئے؟ انھوں نے عرض کیا: ابو ہریرہ! ہم مسجد میں پہنچے تو وہاں ہمیں کوئی چیز تقسیم ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی، حضرت ابو ہریرہؓ نے پوچھا: کیا تم نے مسجد میں کسی کو نہیں دیکھا؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں دیکھا، کچھ لوگ نماز پڑھ رہے تھے، کچھ لوگ قرآنِ کریم کی تلاوت کررہے تھے اور کچھ لوگ حلال وحرام کا مذاکرہ کررہے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: تم پر افسوس ہے، یہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث ہے (۲)۔

خطیب بغدادیؒ نے "**شرف أصحاب الحديث**" میں اعمش سے نقل کیا ہے کہ: ایک روز حضرت عبد اللہ ابنِ مسعودؓ اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی کا گزر ہوا، اس نے پوچھا: یہ لوگ کس لیے جمع ہیں؟ حضرت عبد اللہ ابنِ

(۱) ص ۵۴ پر ابن عباسؓ کی روایت بھی دیکھیے جسے ابن عبد البر اور خطیب نے ذکر کیا ہے

(۲) المعجم الاوسط (۱۴۲۹) مجمع الزوائد ۱: ۱۲۴

مسعودؓ نے فرمایا: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے لیے، جسے یہ لوگ آپس میں بانٹ رہے ہیں (۱)۔

پس طالبانِ علوم نبوت کو وراثتِ نبویؐ کا یہ اعزاز مبارک ہو، ان کے لیے اب ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنے علاوہ کسی اور کو اپنے سے زیادہ معزز سمجھیں!۔

مجالسِ علم کی فضیلت:

علم کی مجلسیں اسلام کا نُور ہیں، اسلام کی زندگی اور اسلام کی بقاء ان ہی مجلسوں سے وابستہ ہے، خطیب بغدادیؒ نے ''جامع بیان العلم'' میں اپنی سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ امام احمدؒ کے پاس کچھ طلبہ حدیث پڑھنے کے لیے ہاتھوں میں دوات لیے ہوئے آئے، امام احمدؒ نے ان دواتوں کو دیکھ کر فرمایا: یہ دواتیں نہیں؛ یہ اسلام کے چراغ ہیں، میں جب اس واقعہ کو مذکورہ کتاب کے اندر پڑھ رہا تھا، تو میرے دل میں خیال آیا کہ اس جملہ پر حاشیہ لگا کر اس عظیم تشبیہ کی کچھ شرح کرنی چاہیے؛ لیکن پھر مجھے ڈاکٹر علامہ احمد محمد نور یوسفؒ کی کتاب **''من أدب المحدثين في التربية والتعليم''** (۲) کے اندر اس تشبیہ کی بھرپور تشریح ملی، اللہ انھیں جزائے خیر دے، وہ لکھتے ہیں کہ: یہ ایک نہایت عمدہ تشبیہ ہے؛ کیونکہ ان دواتوں کے اندر اگرچہ سیاہی کی وجہ سے تاریکی ہوتی ہے؛ لیکن ان ہی تاریکیوں سے رشد وہدایت کا نُور طلوع ہوتا ہے، اور جب قلم ان سیاہیوں میں غوطہ زن ہوکر باہر نکلتے ہیں، اور کاغذ پر چلتے ہیں، تو ایسے لطیف اور حکمتوں سے بھرے ہوئے مضامین بیان کرتے ہیں کہ قلوب جی اُٹھتے ہیں، دل ودماغ کو جِلا مل جاتی ہے، شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں، اور حیران وسرگرداں قلوب اسلام کی روشنی سے بہرہ ور ہوجاتے ہیں (۳)۔

---

(۱) ص ۴۵

(۲) ص ۲۱۳

(۳) جامع (۵۱۳) شرف اصحاب الحدیث ص ۵۳۔۵۴

مجالسِ علم میں جبریل امین کی حاضری:

امام دارمیؒ نے ابنِ سیرینؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ وہ مسجد میں گئے، تو دیکھا کہ ایک طرف حمید بن عبدالرحمٰن حمیریؒ علم کا حلقہ لگائے بیٹھے ہیں، اور دوسری طرف ایک شخص واقعات بیان کر کے لوگوں کے قلوب کو گرما رہا ہے، ابنِ سیرینؒ تردد میں پڑ گئے کہ کس مجلس میں شرکت کروں، اسی دوران وہ زمین پر بیٹھ گئے اور انھیں اُونگھ لگ گئی، وہ فرماتے ہیں کہ: اتنے میں میرے پاس ایک شخص آیا، اور کہنے لگا کہ: تم تذبذب میں ہو کہ کس مجلس میں بیٹھوں؟ اگر تم چاہو تو میں حمید بن عبدالرحمٰن کی مجلس میں جبریل امین کا موجود ہونا تمھیں دکھا دوں (۱)۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد اِس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی مشہور حدیث کہ: فرشتے عموماً کتاب اللہ کا مذاکرہ کرنے والوں کی مجلس کو گھیر لیتے ہیں (۲)، جو کہ علم کا ایک اعزاز ہوتا ہے، اور مسلم کے اندر حضرت معاویہؓ کی حدیث میں یہ اضافہ بھی ہے کہ: اللہ تعالیٰ عموماً اپنے فرشتوں کے درمیان ایسی مجلس والوں پر فخر بھی کرتے ہیں (۳)، مذکورہ واقعہ میں اس سے بھی زائد ایک بات کا پتہ چلتا ہے، اور وہ یہ کہ سیّد الملائکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام خود علم کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں (۴)۔

---

(۱) (۳۵۷) ابن عبدالبر نے اپنی جامع میں دوسرے طریق سے اسے مطولا روایت کیا ہے۔

(۲) رواہ مسلم ۴: ۲۰۷۴ (۳۸) امام مسلم نے اس کے بعد اسے ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری سے بھی روایت کیا ہے۔

(۳) رقم (۴۰)

(۴) امام بخاری نے تاریخ کبیر ۲ (۲۶۹۷) میں حمید کے ترجمہ میں اپنی سند سے ابن سیرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: حمید اپنی وفات سے بیس سال پہلے ہی دونوں شہروں (کوفہ وبصرہ) کے سب سے بڑے عالم بن چکے تھے۔

حافظ ابنِ رجبؒ فرماتے ہیں[1] کہ: کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں، اِردگرد لوگوں کا مجمع ہے، اور سامنے امام مالکؒ کھڑے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ایک مشک رکھا ہوا ہے، آپ اس مشک سے ایک چُلّو لیتے ہیں، اور امام مالکؒ کی طرف بڑھا دیتے ہیں، پھر امام مالکؒ اس کو لے کر لوگوں پر بکھیر دیتے ہیں، لوگوں نے اس خواب کی تعبیر امام مالکؒ کے علم اور اتباعِ سنت سے کی ہے۔

علم کے حلقوں کی عبادت پر افضلیت

عبداللہ ابنِ وہبؒ کا واقعہ:

قاضی عیاضؒ نے امام عبداللہ بن وہبؒ کے تذکرے میں[1] ان کے بھتیجے احمد بن عبدالرحمٰن بن وہبؒ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''میں اسکندریہ میں اپنے چچا (عبداللہ بن وہب) کے ساتھ سرحد کی حفاظت پر تھا، کچھ لوگ چچا کے پاس آئے اور ان سے علمی استفادہ کرنا چاہا، چچا نے فرمایا: یہ تو عبادت کرنے کی جگہ ہے، یہاں میں لوگوں کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہ کر اپنے آپ کو عبادت کے لیے زیادہ فارغ نہیں کرسکتا، یہ کہہ کر انھوں نے وہ سارے اوقات جو علمی حلقے لگانے کے لیے متعین تھے، ختم کردیے، اور ہمہ تن عبادت وریاضت اور سرحد کی حفاظت میں مشغول ہوگئے، ابھی دو دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شخص آیا، اور کہنے لگا کہ: میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں مسجدِ حرام کے اندر ہوں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں موجود ہیں، آپؐ کے دائیں جانب حضرت ابوبکرؓ ہیں اور بائیں جانب حضرت عمرؓ اور سامنے آپ (یعنی ابنِ وہب) بیٹھے ہیں، میں نے دیکھا کہ مسجد میں کچھ قندیلیں انتہائی عمدہ اور تیز روشنی کے ساتھ جگمگا رہی ہیں، تبھی اچانک

(۱) شرح حدیث ابی الدرداء ص ۴۸

(۲) ترتیب المدارک ۱: ۵۶۰

ان میں سے ایک قندیل دھیمی ہوئی اور بُجھ گئی، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ: عبداللہ! اُٹھو اور اسے جا کر دوبارہ جلا دو؛ چنانچہ آپ اُٹھے اور جا کر اُسے دوبارہ جلایا، پھر دوسری قندیل کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

میں وہاں کچھ دن ٹھہرا رہا، میں نے دیکھا کہ تمام قندیلیں بجھی جارہی ہیں؛ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ان قندیلوں کو دیکھ رہے ہیں (یہ سب بجھی جارہی ہیں)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب عبداللہ کے کام ہیں، وہی ان کو بجھانا چاہتا ہے۔

عبداللہ ابنِ وہب یہ خواب سن کر رونے لگے، وہ شخص کہنے لگا کہ: میں تو آپ کو خوش خبری دینے آیا تھا، اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یہ خواب آپ کے لیے غم کا باعث ہوگا تو میں ہرگز نہ آتا، عبداللہ ابنِ وہبؒ فرمانے لگے کہ: نہیں! تم نے ٹھیک کیا جو آکر بتادیا، اس خواب کے ذریعہ مجھے نصیحت کی گئی ہے، میں سمجھ رہا تھا کہ عبادت میں لگنا علومِ دینیہ کی نشر واشاعت سے افضل ہے، اس کے بعد انھوں نے اپنے بہت سے معمولات ترک کردیے، اور اپنے آپ کو درس وتدریس اور علمی مذاکروں کے لیے وقف کردیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا اعزاز فرمایا، کہ ان کی زندگی کا اختتام علم ہی کی ایک مجلس میں ہوا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "**أهوال القيامة**" تصنیف کی، اور تصنیف کرنے کے بعد جیسا کہ علماء کا معمول ہے اپنی کتاب کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانا شروع کیا، ایک روز وہ پڑھ ہی رہے تھے کہ اچانک ان پر غشی طاری ہوئی اور بے ہوش ہوکر گر پڑے، اس کے بعد ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا، اور اسی حالت میں چند روز بعد اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے **رحمه الله رحمةً واسعةً**[۱].

(۱) مزی نے تہذیب الکمال ۱۶: ۲۸۵ اور ابن حجر نے تہذیب التہذیب ۶: ۷۳ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے دیکھیے ترتیب المدارک ۱: ۵۶۵-۵۶۶

اسد بن فراتؒ کے لیے امام محمدؒ کا عبادت کو ترک کر دینا:

اسی سلسلے میں کہ علماء ومحدثین نے علم کی مشغولیت کو عبادت پر فوقیت دی ہے، اسد بن فرات کا واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے، قاضی عیاضؒ نے ''ترتيب المدارك''(۱) میں ان کے قیروان سے مدینہ منورہ اور وہاں سے بغداد کے علمی سفر کی روداد کو تفصیل سے بیان کیا ہے، وہ سفر کرتے ہوئے امام ابویوسفؒ کی خدمت میں پہنچے، امام ابویوسفؒ نے انھیں اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ: انھیں اپنے ساتھ رکھو، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے ذریعہ دنیا وآخرت میں نفع پہنچائیں، اسد بن فرات کہتے ہیں: وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، وہ محمد بن حسن شیبانی تھے، میں نے ان کو لازم پکڑلیا، اور ایسی ملازمت اختیار کی کہ میرا شمار ان شاگردوں میں ہونے لگا، جو ان کی مجلس کے اندر بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے تھے۔

اسد کہتے ہیں کہ: میں نے محمد بن حسن سے کہا کہ: میں ایک پردیسی آدمی ہوں (مجھے جانا بھی ہے) اور آپ سے زیادہ استفادہ بھی نہیں کر پایا، امام محمدؒ نے فرمایا کہ: پھر ایسا کرو کہ دن میں عراق والوں کے ساتھ پڑھ لیا کرو، اور رات میں تنہا یہاں آکر میرے ساتھ رات گزار لیا کرو، میں تمھیں رات میں بھی پڑھا دوں گا؛ چنانچہ رات میں پڑھتے ہوئے اگر مجھے اُونگھ آنے لگتی تو وہ میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے تھے۔

قاضی عیاضؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ: ''اسد بن فرات کہتے ہیں کہ: امام محمدؒ ایک مرتبہ مکہ جاتے وقت چاہ رہے تھے کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں، میں نے اسے کچھ ناپسند سا کیا، تو ان کے شاگرد مجھ سے کہنے لگے کہ: اتنی بڑی سعادت چھوڑ رہے ہو؟ ہمیں تو حسرت ہے کہ کاش! یہ سعادت ہمیں دس ہزار درہم کے بدلے مل جاتی، یہ سن کر میں ساتھ ہولیا، اور راستے میں جو چاہتا ان سے پوچھتا رہتا، بسا اوقات وہ نماز پڑھ رہے ہوتے اور میں ان

(۱) ۱:۶۰۹۔۶۱۳

سے دریافت کر بیٹھتا، تو وہ قراءت کرنا شروع کر دیتے، یہ بتانے کے لیے میں نماز میں ہوں، میں کہتا کہ: میں کئی ملک پار کر کے آپ کے پاس پہنچا ہوں، اور آپ مجھے چھوڑ کر نماز میں مشغول ہیں! اس پر وہ نماز قطع کر دیتے اور میرے سوال کا جواب دیتے''(۱)۔

یعنی اس نماز سے فارغ ہونے کے بعد نمازوں کا سلسلہ موقوف کر دیتے، اور ان کو علم سکھانے میں مشغول ہو جاتے۔

اسد بن فراتؒ کے لیے ابن القاسمؒ کا عبادت میں کمی کرنا:

آگے قاضی عیاضؒ نے اسد بن فرات کے سفر مصر کا بھی ذکر کیا ہے، جو انھوں نے ابن القاسمؒ سے علم حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، ابن القاسمؒ نے ایک مرتبہ ان سے کہا کہ: ''میں دن رات میں دو قرآن ختم کرتا تھا؛ لیکن تمہارے آنے کے بعد سے احیائے علم کی خواہش میں اب ایک ہی ختم پر اکتفا کرتا ہوں'' اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، اور انھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے(۲)۔

امام احمدؒ کا نوافل چھوڑنا:

''**طبقات الحنابلة**''(۳) کے اندر امام ابو زرعہ رازیؒ کے تذکرے میں امام احمدؒ کے بیٹے عبداللہ بن احمد سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''جب ابو زرعہؒ یہاں آئے تو

(۱) طلبہ کو اسد بن فرات کے مفصل حالات میں اس سفر کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے، اس واقعہ سے صحبت اور ملازمت کے فوائد و برکات بھی معلوم ہوتے ہیں جو ان کے اس جملے سے مترشح ہیں کہ: وہ محمد بن حسن شیبانی تھے، میں نے ان کو لازم پکڑ لیا، اور ایسی ملازمت اختیار کی کہ میرا شمار ان شاگردوں میں ہونے لگا، جو ان کی مجلس کے اندر بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے تھے

(۲) ص ۲:۵۵

(۳) جیسا کہ حلیہ میں ہے ۹:۱۸۱

میرے والد کے یہاں ان کا قیام ہوا، وہ دونوں خوب مذاکرے کیا کرتے تھے، ایک روز میں نے اپنے والد سے سنا، وہ فرما رہے تھے کہ: ابوزرعہ کے آنے کے بعد میں نے فرائض کے علاوہ تمام نمازیں چھوڑ دی تھیں، اور ابوزرعہ کے ساتھ مذاکرے کو نوافل پر ترجیح دیتا تھا، واضح رہے کہ امام احمدؒ صحت کے زمانے میں روزانہ تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، اور ابتلاء و آزمائش کے بعد جب کمزور ہو گئے تو یہ تعداد نصف ہو گئی تھی۔

امام ابو یوسفؒ کا طرزِ عمل:

"**مناقب أبي حنيفة**"[۱] میں امام ابو یوسفؒ کے بارے میں بھی اس طرح کا طرزِ عمل منقول ہے کہ انھوں نے صبح کے اوراد و وظائف کو چھوڑ کر علم کا حلقہ لگانے کو ترجیح دی۔

ابنِ دقیق العیدؒ کا نوافل چھوڑنا:

"**المقفى الكبير**"[۲] میں امام ابنِ دقیق العیدؒ کے تذکرے میں ان کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ: جب امام رافعیؒ کی "الشرح الکبیر" منظرِ عام پر آئی تو ابنِ دقیق العیدؒ نے اسے ایک ہزار درہم کے عوض خریدا، اور اس کے مطالعہ میں لگ گئے، صرف فرائض پڑھتے اور باقی سارا وقت مطالعہ میں لگاتے، تا آنکہ اسے ختم نہ کر لیا۔

نوافل کا ترک اور حضرات صحابہؓ کرام:

نوافل چھوڑ کر علم میں مشغول رہنے کے لیے سلسلے میں ان حضرات کے لیے اُسوہ اور نمونہ حضرت عمرؓ کی ذات تھی، جن کا یہ واقعہ خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب "**آداب الفقيه والمتفقه**"[۳] میں نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ عشاء کے

(۱) للموفق المکی ص ۴۹۲

(۲) للمقریزی ۶: ۳۷۴

(۳) ص (۹۵۴)

بعد ان کے پاس پہنچے، حضرت عمرؓ نے انھیں دیکھ کر دریافت کیا: ابوموسیٰؓ! اس وقت کیسے آنا ہوا؟ حضرت ابوموسیٰ نے فرمایا: فقہ کا مذاکرہ کرنے کے لیے آیا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ: ہم لوگ کافی دیر تک مذاکرہ کرتے رہے، جب بہت دیر ہوگئی تو ابوموسیٰؓ نے کہا کہ: امیر المؤمنین! صلاۃ اللیل بھی پڑھ لیتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: "**إنّا في صلاة**" کہ ہم نماز ہی میں تو لگے ہوئے ہیں، ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ: پھر ہم لوگ فجر کے قریب تک مذاکرہ کرتے رہے۔

دوسرا اُسوہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ذات تھی، جن کا قول ابنِ عبدالبرؒ نے نقل کیا ہے: "**الدراسة صلاة**" کہ علمی مذاکرہ بھی نماز ہی ہے (۱)۔

حضرت عمر کی طرح ائمہ محدثین سے بھی فجر تک علمی مذاکروں کے واقعات منقول ہیں؛ چنانچہ وکیع بن جراحؒ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے ساتھ، اور عبداللہ بن مبارکؒ اپنے شاگرد ابن الحسن بن شقیقؒ کے ساتھ فجر تک علمی مذاکروں میں مشغول رہے (۲)۔

سخاویؒ نے "**فتح المغيث**" (۳) میں امام احمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: "**وأي عمل أفضل من طلب العلم؟**" کہ علم حاصل کرنے سے افضل عمل کیا ہوسکتا ہے؟۔

علم کے لیے رکاوٹ پیدا ہونے پر اسلاف کا عمل:

البتہ اگر کبھی کسی رکاوٹ کی وجہ سے ان حضرات کے لیے علم میں اپنے وقت کو لگانا ممکن نہ رہتا، تو یہ حضرات عبادت میں لگ جاتے، جیسا کہ حافظ ذہبیؒ نے "**سير أعلام النبلاء**" میں (۴) ابوبکر حازمیؒ (۵۴۸-۵۸۴ھ) کے تذکرے میں نقل کیا ہے، امام حازمیؒ بڑے

(۱) جامع بیان العلم وفضلہ (۹۴) میں بھی ہے، اور دیکھیے شرف اصحاب الحدیث ص ۸۳-۸۵

(۲) یہ روایات خطیب کی جامع (۱۸۹۹، ۱۹۰۴) میں موجود ہیں

(۳) ۲۹۵:۳

(۴) ۱۶۷:۲۱

پائے کے محدثین میں ہیں، حافظ ذہبیؒ نے انہیں **الحافظ، الحجة، الناقد، النسابة، البارع** جیسے القاب سے یاد کیا ہے، ان کی کتاب "**الاعتبار في الناسخ والمنسوخ من الآثار**" اہلِ علم کے درمیان مشہور ہے، صرف اڑتیس (۳۸) سال کی عمر پائی!! حافظ ذہبیؒ ان کا واقعہ لکھتے ہیں کہ: ایک مرتبہ وہ شیخ بدیعؒ کی سرائے میں قیام پذیر تھے، اور معمول بنا رکھا تھا کہ رات کے وقت اپنے کمرے میں جاتے، اور فجر تک لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے، شیخ بدیعؒ نے ایک روز اپنے خادم سے کہا کہ: آج رات چراغ کے لیے مسالہ مت دینا، ہوسکتا ہے روشنی نہ پاکر وہ آرام ہی کرلیں؛ چنانچہ رات ہوئی تو خادم نے معذرت کردی کہ آج مسالہ ختم ہوگیا ہے، امام حازمیؒ نے یہ سنا تو اپنے کمرے میں گئے اور کھڑے ہوکر نماز اور ذکر و تلاوت میں مشغول ہوگئے، اور اسی حال میں صبح کردی، شیخ بدیعؒ جب رات میں ان کا حال دیکھنے کے لیے پہنچے تو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں۔

یہ درحقیقت اس ربانی ہدایت پر عمل ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ۝﴾ (جب آپ فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیا کیجیے اور اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھیے)۔

دوسرا مبحث

علماء کی فضیلت اور امت میں ان کے اثرات سے متعلق کچھ کلمات

علماء کی فضیلت:

علمائے عاملین کی فضیلت میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں، جن میں سب سے مشہور اور اہم آیت: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۝۱۹﴾ (آل عمران:۱۸-۱۹) ہے۔ (گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی کہ: بجز اس ذات کے کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور فرشتوں نے بھی، اور اہلِ علم نے بھی (گواہی دی)، اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں، ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، وہ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں، بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) کسائی کی قراءت میں ﴿اَنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۝۱۹﴾ ہے۔

آیتِ کریمہ کا اجمالی مفہوم یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اور ان کے ساتھ ان کے فرشتوں اور اہلِ علم نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ اللہ تعالیٰ یکتا وتنہا ہیں، اور اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں، اور اِس بات کی بھی گواہی دی ہے کہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ: آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی گواہی کا ذکر ہے، فرشتوں کی گواہی کا ذکر ہے، اہلِ علم کی گواہی کا ذکر ہے؛ لیکن انبیاء ورسل کی گواہی کا ذکر نہیں، ان کی گواہی کہاں ہے؟ اس کا جواب سمجھیے: آیت میں ﴿وَأُولُوا الْعِلْمِ﴾ کی مراد کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ: ﴿وَأُولُوا الْعِلْمِ﴾ سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں، شالح بن کیسان کہتے ہیں: اس سے مراد مہاجرین وانصار ہیں، مقاتل کہتے ہیں: اہلِ کتاب میں سے ایمان لانے والے علماء یعنی: عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی مراد ہیں، جبکہ سدی اور کلبی کہتے ہیں کہ: اس سے مراد تمام مؤمن علماء ہیں (۱)۔

درحقیقت ان حضرات کا یہ اختلاف اختلافِ تضاد نہیں، اختلافِ تنوع ہے، یہ سبھی اقوال صحیح ہیں، اور بہتر یہی ہے کہ کہا جائے کہ: ﴿وَأُولُوا الْعِلْمِ﴾ سے مراد سبھی لوگ ہیں، اور آیت سے استشہاد اس طور پر ہوگا کہ: اللہ تعالیٰ نے علماء کو انبیاء کے ساتھ ان کے علمی وصف کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور فرمایا: ﴿وَأُولُوا الْعِلْمِ﴾ کہ اہلِ علم نے گواہی دی۔

چنانچہ حافظ ابنِ رجبؒ اس آیت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو الگ سے ذکر نہیں کیا؛ بلکہ علماء کے مدلول میں ہی انھیں داخل فرمایا؛ لہٰذا یہ بات علماء کے اعزاز کے لیے کافی ہے کہ انھیں ایسا نام دیا گیا ہے، جس میں انبیاء جیسی مقدس ہستیاں بھی ان کے ساتھ شریک ہیں (۲)۔

امت میں علمائے ربانیین کے اثرات:

جہاں تک علمائے ربانیین کے اثرات کی بات ہے: تو یہ ایک حقیقت ہے کہ امت میں ان کے اثرات ویسے ہی ہیں جیسے انبیاء ورسل کے اثرات ان کی اپنی امتوں میں ہوتے تھے؛ کیونکہ انھیں انبیاء ورسل کی وراثت ملی ہے، پس وارث کے یہ اثرات موروث کی دین ہیں۔

(۱) تفسیر معالم التنزیل ۲:۱۸

(۲) شرح حدیث ابی الدرداء ص ۵۰

ابوبکر آجریؒ کا ایک جامع کلام:

امت میں علماءِ ربانیین کے اثرات کے موضوع پر مختلف حضرات نے لکھا ہے، کسی نے اجمالاً تو کسی نے تفصیلاً، امام ابوبکر محمد بن حسین آجریؒ (متوفی ۳۶۰ھ) نے اپنی مختصر مگر دلچسپ کتاب "أخلاق العلماء" کے شروع میں اس موضوع پر نہایت عمدہ کلام کیا ہے، میں اسے بتمامہا نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ رب العزت نے اپنی مخلوق میں سے کچھ لوگوں کو منتخب کیا، اور انھیں ایمان کی دولت سے نوازا، پھر ایمان والوں میں سے کچھ لوگوں کا انتخاب فرمایا، اور اپنا فضل فرما کر انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی، دین کی سمجھ عطا فرمائی، قرآن کی تفسیر سکھلائی، اور تمام مؤمنین پر انھیں فضیلت عطا فرمائی، یہ ہر زمانے میں ہوتا رہا، ان ہستیوں کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ذریعہ بلند کیا، اور حلم کے ذریعہ سنوارا، ان ہی پاکیزہ نفوس کے ذریعہ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے، حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، نفع کیا ہے اور نقصان کیا ہے، اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔

ان کی فضیلت بہت زیادہ اور اجر بے پایاں ہے، وہ انبیاء کے وارث اور اولیاء کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، مچھلیاں ان کے لیے سمندر میں دعائے مغفرت کرتی ہیں اور فرشتے ان کے لیے اپنے پَر بچھاتے ہیں، قیامت میں انبیاء کے بعد انھیں بھی سفارش کا حق ملے گا، ان کے پاس بیٹھنے سے حکمت ودانائی پیدا ہوتی ہے، اور ان کے اعمال غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کی غفلت کو دُور کرتے ہیں، وہ عابدوں سے افضل اور زاہدوں سے برتر ہیں، ان کی زندگی غنیمت اور ان کی موت مصیبت کا ایک پیغام ہے، وہ غافلوں کو یاددہانی کراتے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھاتے ہیں، نہ ان کے لیے کسی شر کی توقع کی جاتی ہے، اور نہ ان سے کسی نقصان کا اندیشہ کیا جاتا ہے، ان کی حسنِ تربیت سے نیک لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی پُراثر نصیحتوں سے طاعات میں لاپرواہی برتنے والے باز آجاتے ہیں۔

ساری مخلوق ان کے علم کی محتاج ہے، ان ہی کے قول کے ذریعہ صحیح موقف رکھنے والا شخص اپنے مخالفین پر غالب آتا ہے، ان کی اطاعت تمام لوگوں پر واجب اور نافرمانی حرام ہے، جنھوں نے ان کی اطاعت کی وہ صحیح راستہ پر چل پڑے، اور جنھوں نے انکار کیا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے، جب کبھی خلیفۃ المسلمین کے سامنے ایسی کوئی بات آتی ہے جس کا حکم ان پر مشتبہ ہو جاتا ہے اور انھیں اس میں توقف کرنا پڑتا ہے، تو وہ علماء کے قول پر ہی عمل کرتے ہیں، اور انہی کی رائے کو اپناتے ہیں، اور جب کبھی مسلم حکام کو کوئی ایسی بات پیش آتی ہے جس کا حکم انہیں معلوم نہیں ہوتا، تو وہ علماء کے قول پر ہی عمل کرتے ہیں، اور انہی کی رائے پر چلتے ہیں، اور جب کبھی مسلم ججوں کے لیے کوئی مقدمہ پیچیدہ ہو جاتا ہے، تو وہ علماء کی رائے پر ہی فیصلہ کرتے ہیں، اور اسی پر اعتماد کرتے ہیں، غرض یہ علماء بندگانِ خدا کے لیے چراغ اور شہروں کے لیے منارۂ نور ہیں، امت کے وجود و بقاء کا سامان اور حکمت کے اُبلتے ہوئے چشمے ہیں، وہ شیطان کے لیے غیظ وغضب کا سبب ہیں، ان ہی سے اہلِ حق کے قلوب کو زندگی ملتی ہے، اور اہلِ باطل کے قلوب پر موت طاری ہوتی ہے، وہ زمین پر ایسے ہیں جیسے آسمان میں ستارے کہ جن سے خشکی وتری کے اندھیروں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اور اگر ستارے چھپ جاتے ہیں تو لوگ راستہ کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگتے ہیں، پھر جب تاریکی چھٹتی ہے اور ستارے نمودار ہوتے ہیں، تو انھیں دوبارہ راستہ سجھائی دیتا ہے۔"

ستاروں سے تشبیہ دینے کی وجہ:

آگے امام ابوبکر محمد بن حسینؒ نے اپنی ان باتوں پر آیات واحادیث اور آثار سے دلائل بھی پیش کیے ہیں، جن میں اس حدیث کو بھی اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جسے حضرت انسؓ نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يُهدى**

بها في ظلمات البر والبحر فإذا انطمست النجوم أو شك أن تضل الهداة''(۱) (زمین میں علماء کی مثال ان ستاروں کی طرح ہے جن سے خشکی وتری کے اندھیروں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، جب ستارے بے نور ہوجاتے ہیں تو اِس بات کا خطرہ رہتا ہے کہ مسافر راستہ نہ بھٹک جائیں)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ستاروں کے تین فوائد بیان کیے ہیں، فرماتے ہیں: ﴿وَ بِالنَّجۡمِ هُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ﴾ (النحل) ترجمہ: اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ اور سورۂ ملک آیت نمبر ۵ کے شروع میں فرماتے ہیں: ﴿وَ لَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَ جَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ﴾ ترجمہ: اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو چراغوں سے آراستہ کررکھا ہے اور ہم نے ان کو (ان) شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے (جو فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں)۔

ان آیات میں جو حال آسمان کے ستاروں کا بیان کیا گیا ہے وہی حال زمین والوں میں اہلِ علم کا ہے کہ: وہ مخلوق کو خالق کا راستہ بتاتے ہیں، زمین والوں کے لیے زینت کا سبب ہیں، اور انسان نما شیطانوں اور گمراہی کے علمبرداروں کو مارنے اور بھگانے کا ذریعہ ہیں، کہ وہ ان کے مدمقابل کھڑے ہوکر ان کے اور عام مسلمانوں کے درمیان سدِ سکندری بن جاتے ہیں، اور انھیں موقع نہیں دیتے کہ وہ عام مسلمانوں کے دین کو بگاڑ سکیں؛ کیونکہ لوگوں میں دو قسم کی تاریکیاں ہوتی ہیں: جہالت کی تاریکی اور گمراہی کی تاریکی، جس طرح پہلے انبیائے کرام کے نُور سے یہ دونوں تاریکیاں چھٹ جاتی تھیں، اب علماء کے نُور سے ان دونوں تاریکیوں کا قلع قمع ہوجاتا ہے اور یہ چیز حضرت انس ؓ کی مذکورہ حدیث کے لیے شاہد بن کر اسے تقویت پہنچتی ہے۔

---

(۱) مسند احمد ۳: ۱۵۷، اس حدیث میں کچھ ضعف ہے، بیہقی کی المدخل ص ۲۷۴ میں اس کے شواہد موجود ہیں۔

ایک عالم اور عابد سے ابلیس کا مناظرہ:

امام ابنِ عبدالبرؒ نے **"جامع بیان العلم"** میں **"تفضیل العلم علی العبادۃ"** کے عنوان سے بہت سے آثار ذکر کیے ہیں، اور ان کے ہم مثل خطیب بغدادیؒ نے بھی **"آداب الفقیہ والمتفقہ"** کے اندر مختلف ملتے جلتے عناوین کے تحت اُتنے ہی؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ آثار ذکر کیے ہیں [۱]۔

ان ہی میں ایک واقعہ ابنِ عبدالبرؒ نے تعلیقاً اور خطیب بغدادی نے مسنداً حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے [۲]، وہ فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ شیاطین نے ابلیس سے آکر کہا کہ: اے ہمارے آقا! ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کسی عابد کے مرنے پر اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا ایک عالم کی موت پر خوش ہوتے ہیں، اور آپ عالم کو گمراہ بھی نہیں کر پاتے ہیں، جبکہ عابد کو بآسانی گمراہ کر دیتے ہیں۔ ابلیس نے کہا: چلو میں تمھیں دکھاتا ہوں، یہ کہہ کر انھیں ایک عابد کے پاس لے گیا، جو نماز میں مشغول تھا، ان لوگوں نے عابد سے کہا کہ: ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، عابد نے یہ سن کر اپنی عبادت موقوف کردی، اور ان کی طرف متوجہ ہوگیا، ابلیس نے اس سے پوچھا: کیا تمہارا رب اِس بات پر قادر ہے کہ پوری دنیا کو سمیٹ کر ایک انڈے کے پیٹ میں رکھ دے، تو عابد نے جواب دیا: نہیں، قادر نہیں ہے (معاذ اللہ)، ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: دیکھا تم نے، یہ فوراً ہی کافر ہوگیا۔

پھر وہ سب ایک عالم صاحب کے حلقے میں آئے، جو اپنے شاگردوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور بات چیت کر رہے تھے، ابلیس نے کہا: ہم آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، عالم صاحب نے کہا: پوچھو، اس نے کہا: کیا آپ کا رب اِس بات پر قادر ہے کہ پوری دنیا کو

---

(۱) ابن عبدالبر (۹۰۔ ۱۳۲) والخطیب (۳۰۔ ۱۵۰) ومابعدھا۔

(۲) ابن عبدالبر (۱۲۷) خطیب (۸۹)

سمیٹ کر ایک انڈے کے اندر رکھ دے، انھوں نے کہا: بالکل قادر ہے، ابلیس نے کہا: وہ کیسے؟ انھوں نے کہا: کہ جب وہ اس کا ارادہ فرمائے گا تو کلمۂ ''کن'' کہے گا اور یہ ہو جائے گا، ابلیس نے اپنے حوارین سے کہا: دیکھا تم نے، یہ اپنے آپ سے تجاوز نہیں کر رہا ہے، یہی چیز بہت سے لوگوں پر میرا داؤ نہیں چلنے دیتی۔

میں مان لیتا ہوں کہ یہ واقعہ ایک علامتی حکایت ہے، کوئی منقول اثر نہیں ہے، کہ اس کی سند اور صحت کی تحقیق میرے ذمہ عائد ہوتی ہو؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بغیر علم کے عبادت میں لگنے والوں کا حال یہی ہوتا ہے، اور اہلِ علم اسی طرح اپنے علم کی بدولت دنیا وآخرت میں نجات پاتے ہیں۔

عبادت کا سفر علم کے راستے پر ہو:

اسی سلسلے میں کہ ایمان کی سلامتی اور عبادت کی درستگی علم ہی سے ہوتی ہے، قاضی عیاضؒ نے ''ترتیب المدارك'' میں ابنِ وہب کے تذکرے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''شروع شروع میں جب میں علم کے حصول میں نہیں لگا تھا، تو عبادت کے اندر میرا یہ حال تھا کہ شیطان مجھے عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں لگائے رکھتا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسے پیدا کیا، پریشان ہو کر میں نے ایک عالم صاحب سے شکایت کی، تو انھوں نے فرمایا: علم حاصل کرو، بس یہی چیز میرے علم حاصل کرنے کا سبب بن گئی''۔

علم وعمل کی جامعیت صراطِ مستقیم ہے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ علم اور عمل دونوں فضیلتوں اور خوبیوں کو جمع کرنے میں ہی کمال ہے، اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کی دعا ایک نمازی ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں مانگتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا، ان

لوگوں کے راستے پر جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ ان لوگوں کے راستے پر جن پر آپ کا غضب نازل ہوا، اور نہ ان لوگوں کے راستے پر جو گمراہ ہو گئے)۔

﴿الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور ﴿الضَّآلِّيْنَ﴾ کی تفسیر حضرت عدی بن حاتمؓ کی ایک طویل حدیث میں وارد ہوئی ہے[1] کہ: مغضوب علیہم سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود نے اللہ تعالیٰ کے احکامات جاننے کے باوجود کچھ پر تو عمل ہی نہیں کیا، اور کچھ کے بارے میں حیلے بہانوں سے کام لیا، اور بار بار اللہ تعالیٰ کے اوامر کی نافرمانی کر کے غضبِ الٰہی کے مستحق ہو گئے؛ اس لیے انھیں مغضوب علیہم کہا، اور نصاریٰ کا حال یہ ہوا کہ انھوں نے عمل کا ارادہ تو کیا؛ لیکن ایسے راستے پر چل پڑے جس کے بارے میں انھیں کچھ اتہ پتہ نہیں تھا، کچھ علم نہیں تھا جس کے مطابق وہ راستہ طے کرتے، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شخص مسجد پہنچنا چاہتا ہو؛ لیکن اسے راستہ معلوم نہ ہو، اور وہ بغیر کچھ جانے بوجھے اور بغیر راستہ معلوم کیے ہی چل پڑے، اور راستہ بھٹک جائے، ﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحدید: ۲۷) (اور انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہیں کیا تھا)۔

جبکہ صراطِ مستقیم، جسے منعم علیہم کا راستہ قرار دیا گیا ہے، نہ تو مغضوب علیہم کا راستہ ہے کہ جن کے پاس علم تھا؛ لیکن عمل نہیں کیا، اور نہ ہی ضالین کا راستہ ہے کہ جنھوں نے عمل تو کیا؛ لیکن علم کے بغیر؛ بلکہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جنھوں نے علم اور عمل دونوں کو جمع کیا، اور اسی علم وعمل کی جامعیت کا نام صراطِ مستقیم ہے۔

حافظ ابنِ رجبؒ نے بھی اس حدیث کو اپنے رسالہ "**شرح حديث أبي الدرداء**" میں ذکر کر کے مذکورہ بالا تینوں تشبیہات کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

(۱) عند الترمذی (۲۹۵۳، ۲۹۵۴) وقال: حسن غریب، وأحمد ٤: ۳۷۸ (۱۹۳۸۱)، وابن حبان في التقاسيم والانواع (٤٥۳۳)

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"أصحابي كالنجوم فبأيهم اقتديتم اهتديتم"**(۱) (میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی اقتدا کرو گے راستہ پا جاؤ گے)، کہا گیا ہے کہ: جس طرح چاند کی روشنی سورج سے مستفاد ہوتی ہے، اسی طرح ایک عالم کی روشنی بھی نُورِ رسالت سے مستفاد ہوتی ہے؛ اسی لیے عالم کو سورج کے بجائے چاند سے تشبیہ دی گئی، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت ایک ایسا روشن چراغ ہے جو پورے زمین کو روشن اور منور کر دیتا ہے، تو آپ کے وارث اور آپ کے جانشین علماء بھی ایسے ماہتاب کے مشابہ ہوں گے جن کے اندر بھرپور روشنی اور مکمل آب وتاب موجود ہوگی۔

اللہ کے فضل سے پوری دنیا کے اندر مسلمان ہمیشہ سے اس قسم کی بابرکت اور باسعادت جماعت کے سائے میں زندگی گزارتے چلے آئے ہیں، اور اس سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر الثبوت اور متواتر الدلالہ بشارت بھی موجود ہے: **"لاتزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق، لايضرهم من خذلهم حتى يأتي أمر الله، وهم كذلك" أي: "وهم ظاهرون"** (میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ حق پر قائم رہے گی، مخالفین ان کو نقصان نہیں پہنچ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے گا اور وہ اسی حال میں ہوں گے، یعنی حق پر قائم ہوں گے)(۲)۔

---

(۱) **في هذا الحديث كلام كثير**؛ لیکن اس کے طرق بہت ہیں، اسی لیے حافظِ ناقد ابن رجبؒ نے اپنے لیے اس حدیث کے ذکر اور اس سے اس لطیف معنی کے استنباط کو روا رکھا ہے، علامہ لکھنوی نے تحفۃ الاخیار ص ۵۳-۶۶ میں اس پر طویل کلام فرمایا ہے، اور ص ۵۴ پر صغانی سے اس کی تحسین نقل کی ہے، نیز ص ۶۳ پر صواعق (غالباً وہ الصواعق المحرقہ ہے) سے بھی اس کی تحسین نقل کی ہے، بہر حال یہ حدیث موضوع نہیں ہوسکتی

(۲) پہلے الفاظ ثوبان کی روایت کے ہیں جسے امام مسلم ۳: ۱۵۲۳ (۱۷۰) نے روایت کیا ہے، اور دوسرے الفاظ مغیرہ بن شعبہ کی روایت کے ہیں جسے بخاری (۳۶۴۰) اور مسلم (۱۷۱) نے روایت کیا ہے۔

علمِ ربانی کے اثرات حاملینِ علم کے اندر:

مخلوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ: اپنے مخلص اور سچے بندوں کے چہروں پر نورانیت، خشیت، ہیبت وجلال، اُنسیت اور اپنائیت ڈال دیتے ہیں، جو پاس بیٹھنے والوں اور ان کی طرف دیکھنے والوں میں بھی منتقل ہوتی ہیں، ان کے مبارک چہرے حزن وملال میں مبتلا لوگوں کے لیے راحت وسکون، ہمدردی ومہربانی اور سعادت وبرکت کی گھنیری چھاؤں ثابت ہوتے ہیں، اوران کے پاکیزہ نفوس ہدایت کے طلبگاروں کے لیے خیر کا سرچشمہ اور گفتار وکردار کا حامل آئیڈیل اور نمونہ ثابت ہوتے ہیں، ان کا قول وعمل دونوں ہی لوگوں کے لیے عمل اور ہدایت کا سبب بنتا ہے، اور وہ اس شعر کے مصداق؛ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو جاتے ہیں:

إذا سكتوا رأيت لهم جمالا ❖ وإن نطقوا سمعت لهم عقولًا

جب وہ خاموش رہتے ہیں تو ان کے اندر جمال نظر آتا ہے، اور جب وہ بولتے ہیں
تو عقل ودانش کی باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ امام الحجۃ یحییٰ بن یحییٰ تمیمی نیساپوری (متوفی ۲۲۶ھ) امام مالکؒ کے پاس ''موطا'' کی سماعت سے فارغ ہونے کے بعد ایک سال تک ٹھہرے رہے، اور ان کے اخلاق وعادات سے استفادہ کرتے رہے؛ کیونکہ بقول ان کے: امام مالکؒ کے اخلاق صحابہؓ وتابعینؒ کے اخلاق کا پرتَو تھے[1]۔

علمائے ربانیین کی زیارت کے اثرات:

ہمارے شیخ (عبدالفتاح ابوغدہ) **رحمه الله تعالیٰ وتغمده برحماته** نے بھی اس اہم مضمون کو[2] اپنے گراں قدر اور بیش قیمت الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) ترتیب المدارک ۱: ۵۴۴ پورا واقعہ آگے ص ۲۱۲ پر آرہا ہے۔

(۲) **رسالة المسترشدين** پر اپنے حاشیہ بلکہ اپنی شرح ص ۱۰۲ میں۔

"جو ذات ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ کی حیثیت رکھتی ہو، اس کو بذاتِ خود دیکھنے سے طبیعت پر جتنا اثر پڑتا ہے، صرف کان سے اس کے متعلق سن لینے سے اتنا اثر نہیں ہوتا، اور خیر کے اثرات بھی دیکھنے والے کے اندر نسبتۃً دیر تک باقی رہتے ہیں، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس چیز کا بھرپور حصہ ملا تھا، وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھتے، آپ کو دیکھتے، اور آپ سے قریب رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھیں آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے افضل طبقہ ہونے کا اعزاز نصیب ہوا۔

یقیناً مقتدی لوگوں کو دیکھنے سے اللہ کی یاد پیدا ہوتی ہے؛ کیونکہ ان کے چہروں پر نُور برستا ہے، ان کی چال ڈھال، ان کی خاموشی اور گویائی، ان کی حرکت وسکون اور ان کے ہر کام میں انسیت، محبت، اپنائیت اور سکون محسوس ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انھیں دیکھتے ہی بے ساختہ اللہ کی یاد آجاتی ہے، اور اللہ سے تعلق قائم کرنے کا جذبہ موجزن ہوجاتا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے: "**إذا رؤوا ذكر الله**" کہ جب ان پر نظر پڑتی ہے تو اللہ یاد آجاتا ہے"۔

آگے شیخ نے حکیم ترمذی کا ایک طویل کلام نقل کیا ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: "اس قسم کے لوگ اسلاف میں بکثرت ہوتے تھے اور ہر جگہ ہوتے تھے، لوگ صرف ان کی زیارت کے لیے ان کے یہاں جاتے تھے؛ کیونکہ صرف زیارت سے ہی دل منور ہوجاتا تھا، نیکی کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا، دین سے محبت پیدا ہوجاتی اور اللہ کی یاد آجاتی تھی"۔ اصل کتاب کے اندر شیخ کا پورا کلام ضرور دیکھیے، اللہ تعالیٰ انھیں بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اپنے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

مسلمانوں کو اس نُور اور اس میراثِ نبوی کو حاصل کرنے کے لیے ان پاکیزہ ہستیوں سے برابر تعلق قائم رکھنا چاہیے۔

دوسرا باب

طلبِ علم کے راستے کی رہنما مشعلیں

تمہید

بنیادی مشعلوں اور اُصولی شرائط کا بیان:

مجھے چھ ائمہ کرام کے اقوال ملے، جن میں طلبِ علم کے بنیادی ارکان وشرائط کو شمار کرایا گیا ہے، ان کے اندر ایک خاص بات یہ دیکھنے کو ملی کہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، یہ حضرات ان بنیادی عناصر وارکان کی تعداد میں بھی اضافہ کرتے گئے، یہ اقوال تاریخِ وفات کی ترتیب سے درج ذیل ہیں، جن میں سے بعض پر میں نے حسبِ ضرورت کچھ کلام کیا ہے۔

۱- امام محمد بن حسن شیبانیؒ (متوفی ۱۸۹ھ): ابنِ ابی العوامؒ نے اپنی سند سے امام محمدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: یہ علم اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب طالبِ علم کے اندر تین خصلتیں پائی جائیں: (۱) وہ علم کا حریص ہو (۲) ذہین وفطین ہو (۳) اور فکرِ معاش سے بے نیاز ہو[۱]۔

۲- امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ): خطیب بغدادیؒ[۲] نے امام شافعیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: طالبِ علم کے اندر تین خصلتیں ہونی چاہئیں: (۱) درازیٔ عمر (۲) ہاتھ کی کشادگی اور (۳) ذہانت، خطیب بغدادیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''جہاں تک درازیٔ عمر کی بات ہے تو اس سے ان کی مراد علم کے اندر مسلسل لگے رہنا ہے،

(۱) مناقب (۸۵۹)

(۲) آداب الفقیہ والمتفقہ ۲:۱۸۷ (۸۳۷)

اور ہاتھ کی کشادگی سے مراد ہے کہ کمائی اور کسبِ معاش سے خود کو دُور رکھنا، اگر طالبِ علم قناعت سے کام لے تو اسے بڑی حد تک کسبِ معاش سے بے نیازی ہوسکتی ہے''، اور آگے ایک صفحہ کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ذہانت بھی مل جائے، تو یہ اس کی سعادت اور کامیابی کی علامت ہے، اس کی برکت سے وہ بہت جلد اپنے مقصود تک پہنچ جائے گا''۔

اللہ تعالیٰ نے خود امام شافعیؒ کو ان خصلتوں سے؛ بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی خصلتوں سے جو امامت کے درجہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہیں، نوازا تھا، علم کے اندر انہیں بے پناہ انہماک حاصل تھا، جس کی وجہ سے ان کی کم عمری کی بھی تلافی ہوگئی تھی؛ وہ لمبی عمر نہیں پاسکے، مشہور ہے کہ ۵۴ سال کی عمر میں ہی اس دنیا سے رحلت فرماگئے، یہی وجہ ہے کہ خطیب بغدادیؒ نے ان کے قول **''طول العمر''** کی تشریح علم کے اندر مسلسل لگے رہنے سے کی ہے، اسی طرح کمائی اور کسبِ معاش سے بھی انھوں نے رسم وراہ پیدا نہیں کی، ہمیشہ قناعت کو اپنائے رکھا، اور ذہانت تو اللہ تعالیٰ نے ایسی عطا فرمائی تھی کہ اپنے اکثر ہم عصروں سے اس معاملے میں فائق رہے، اللہ تعالیٰ ان سے اور تمام ائمہ ومحدثین سے راضی ہو۔

اس کے بعد خطیب(۱) نے اپنی سند سے عبداللہ بن شبرمہؒ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، عبداللہ بن شبرمہؒ کا شمار فقہائے تابعین میں ہوتا ہے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، ابنِ شبرمہؒ نے اسے وضاحت کے ساتھ سمجھایا؛ وہ کہنے لگا: میری سمجھ میں نہیں آیا، ابنِ شبرمہؒ نے پھر سمجھایا، اس نے کہا: اب بھی سمجھ میں نہیں آیا، ابنِ شبرمہؒ کہنے لگے: **''إن كنت لم تفهم لأنك لم تفهم: فستفهم بالإعادة، وإن كنت لم تفهم لأنك لاتفهم: فهٰذا داء لا دواء له''** (اگر تم اس لیے نہیں سمجھے

---

(۱) **آداب الفقيه والمتفقه (۸۴۲)**

کہ تمھیں سمجھ میں نہیں آسکا، تو دوبارہ سمجھانے سے ان شاءاللہ سمجھ جاؤ گے، اور اگر اس لیے نہیں سمجھے کہ تم سمجھ ہی نہیں پاتے ہو، تو اس بیماری کا کوئی علاج نہیں)۔

ابنِ شبرمہؒ کے جملے: "**فستفهم بالإعادة**" (کہ تم دوبارہ سمجھانے سے سمجھ جاؤ گے) میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذہانت کبھی تو وہبی ہوتی ہے جو پیدائشی طور پر انسان کو عطا ہوتی ہے، اور کبھی کسبی ہوتی ہے، جو مسلسل لگے رہنے اور پیہم مذاکرے کرنے سے پیدا ہوتی ہے، اگر کسی کو یہ دونوں ذہانتیں نصیب ہوجائیں تو اس سے ایسے کارنامے وجود میں آتے ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں، جیسا کہ ہمارے متقدمین ومتأخرین ائمہ اسلاف کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے، والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

۳-ابو ہلال عسکریؒ (وفات: تقریباً ۴۰۰ھ) فرماتے ہیں کہ: اگلوں میں سے کسی نے کہا ہے کہ: حصولِ علم کے لیے چھ چیزیں ضروری ہیں: (۱) ذہنِ رسا (۲) درازئ عمر (۳) کسبِ معاش سے بے نیازی (۴) عملِ کثیر، یعنی: حصولِ علم میں خوب اشتغال (۵) ماہر استاذ (۶) اور علم کی شہوت، یعنی: علم سے بے پناہ محبت [1]۔ اس کے بعد ان شرائط کی مختصر اور مفید تشریح بھی مذکور ہے۔

یہاں "ماہر استاذ" سے بظاہر مراد یہ ہے کہ: ماہر ہونے کی صفت اس کے علم میں بھی ہو اور تدریس میں بھی، یعنی وہ جس مضمون کو پڑھا رہا ہو اسے اس میں اختصاص بھی حاصل ہو، اور اس مضمون کو پڑھانے اور سمجھانے میں وہ ماہر بھی ہو۔

۴-امام ماوردیؒ (متوفی ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں: وہ شرائط جن کی وجہ سے طالبِ علم کا علم بڑھتا ہے، اور کمال کے طلبگار کو کمال نصیب ہوتا ہے (بشرطیکہ توفیق الٰہی اور نصرتِ خداوندی بھی شاملِ حال ہو): کل نو (۹) ہیں، جو نمبروار یہ ہیں: (۱) عقل ودانش (۲) زیرکی (۳) ذہانت (۴) علم کی خواہش اور حرص (۵) اتنے مال پر اکتفا جس سے

(۱) **الحث على طلب العلم والاجتهاد في جمعه** ص ۴۷

کمانے کی ضرورت نہ پڑے (۶)علم کے علاوہ تمام مشاغل سے یکسوئی (۷) پراگندہ خیالات اور ذہن کو منتشر کرنے والی چیزوں سے مکمل یکسوئی (۸) درازیٔ عمر (۹) ایسا استاذ جو علم دینے میں سخی ہو[۱]۔

۵-امام الحرمین (متوفی ۴۷۸ھ): حافظ ابنِ نجارؒ[۲] نے اپنی سند سے امام الحرمینؒ کا یہ شعر نقل کیا ہے:

أخِيْ لن تنال العلم إلا بستة ❖ سأنبيك عن تفصيلها ببيان

ذكاء وحرص وافتقار وغربة ❖ وتلقين أستاذ وطول زمان

سنو! جب تک تمہارے اندر چھ چیزیں نہ پائی جائیں تم علم حاصل نہیں کر سکتے، اور وہ یہ ہیں: (۱) ذہانت (۲) علم کی حرص (۳) احتیاج اور ضرورت (۴) ترکِ وطن (۵) استاذ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا (۶) درازیٔ عمر[۳]۔

۶-ابن العربی مالکیؒ (متوفی ۵۴۳ھ) فرماتے ہیں: حصولِ علم کی شرائط دوسو (۲۰۰) سے زیادہ ہیں؛ لیکن وہ سب سات بنیادی اور اُصولی شرائط میں سمٹ جاتی ہیں، جو نمبروار یہ ہیں: (۱) اخلاص (۲) علم کے لیے تواضع (۳) استاذ کے سامنے تواضع (۴) استاذ کی منشاء کی تعمیل (۵) علم حاصل کرنے میں تدریج (۶) علم کا مذاکرہ اور تکرار (۷) اپنے علم پر عمل[۴]۔

---

(۱) **أدب الدنيا والدين** ص۱۱۱ (۲) **ذيل تاريخ بغداد** ۱:۸۹

(۳) ان دونوں شعروں کو تاج الدین سبکی نے بھی اپنی کتاب ''الطبقات'' (۵/۲۰۸) کے اندر امام الحرمینؒ کے ترجمہ میں ان کی طرف منسوب کیا ہے، مشہور ہے کہ یہ اشعار امام شافعیؒ کے ہیں؛ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، اگرچہ یہ ان کے دیوان میں بھی موجود ہیں، حضرت علیؓ اور امام شافعیؒ کی طرف منسوب بے شمار اشعار ایسے ہیں جن کی نسبت ثابت نہیں ہے، ''أصغ'' کے معنیٰ ہیں: غور سے سنو، ویسے اس شعر کے شروع میں ''أصغ'' کے بجائے ''أخي'' مشہور ہے۔

(۴) قانون التاویل ص۶۳۶

ان کے علاوہ کچھ چیزیں اور ہیں، جنھیں علامہ سخاویؒ (متوفی ۹۰۲ھ) نے اپنی کتاب "**الجواهر والدرر**" میں ذکر کیا ہے، جو شرط تو نہیں ہیں؛ لیکن حصولِ علم میں معاون بنتی ہیں، اور وہ یہ ہیں: "سمجھ کر تیز پڑھنا، صاف تحریر میں تیز لکھنا، اچھے طلبہ کی صحبت اختیار کرنا، بڑے لوگوں کے پاس آمد ورفت سے پرہیز کرنا، اور وقت کو کام میں لانا"(۱) ان سب کی تشریح کے لیے اصل کتاب کی طرف رجوع کریں۔

(۱) الجواہر والدرر ۱: ۱۶۱۔۱۷۰

پہلی مشعل

اخلاص کے ساتھ علم حاصل کرنا

حصولِ علم میں اخلاص کی اہمیت:

خطیب بغدادیؒ نے اپنے رسالے "**اقتضاء العلم العمل**" کا آغاز حمد وصلاۃ کے بعد ان الفاظ سے کیا ہے: "**إني موصيك –يا طالب العلم– بإخلاص النية في طلبه، وإجهاد النفس على العمل بموجبه، فإن العلم شجرة، والعمل ثمرة، وليس يُعدّ عالما من لم يكن بعلمه عاملا**" کہ اے طالبِ علم! میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنی نیت کے اندر اخلاص پیدا کرو، اور علم کے تقاضوں پر عمل کرنے کے لیے اپنے آپ کو تھکاؤ؛ کیونکہ علم ایک درخت ہے، اور عمل اس کا پھل ہے، اپنے علم پر عمل نہ کرنے والا شخص عالم شمار نہیں ہوتا، حافظ ابنِ صلاحؒ نے بھی طالبِ حدیث کے آداب پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے اسی اخلاص کو ذکر کیا ہے، جو ہر مسلمان اور بالخصوص ہر طالبِ علم کی زندگی کا اہم رکن ہے؛ اوپر ابن العربیؒ کے اقتباس کے اندر بھی آپ نے سات چیزوں میں سے سب سے پہلی چیز اخلاص ہی دیکھی۔

صحیح مسلم میں (۱) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا، جن کے خلاف قیامت کے دن سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا، ان میں دوسرا شخص وہ ہوگا جس نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا، اور قرآن شریف پڑھا،

(۱) صحیح مسلم ۳: ۱۵۱۳ (۱۵۲)، ترمذی (۲۳۸۲)

اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اپنی ان نعمتوں کا اظہار فرمائیں گے، وہ ان نعمتوں کا اقرار کرے گا، اللہ تعالیٰ اس سے پوچھیں گے: تُو نے ان نعمتوں کے سلسلے میں کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں نے آپ کی رضا کے لیے ہی علم سیکھا اور سکھایا، اور آپ کی رضا کے لیے ہی قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تُو جھوٹ بولتا ہے، تُو نے علم اس لیے حاصل کیا کہ تجھے عالم کہا جائے، اور قرآن اس لیے پڑھا؛ تاکہ تجھے قاری کہا جائے، پس کہا جاچکا، اس کے بعد اس کے بارے میں حکم ہوگا اور اسے منہ کے بَل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اسی طرح کی حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے ہی ترمذی نے بھی روایت کی ہے، اور اس میں ایک طویل قصہ بھی ہے، ان دونوں احادیث کی تشریح میری کتاب "**من صحاح الأحاديث القدسية**" کے اندر چوتھی حدیث کے ضمن میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اس تشریح کے اندر میں نے اخلاص کا ایک دلچسپ واقعہ بھی نقل کیا ہے، جو ابنِ قتیبہ کی "**عيون الأخبار**"(۱) سے ماخوذ ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: "مسلمہ بن عبدالملک نے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا، اس قلعہ کی دیوار میں ایک جگہ شگاف تھا، مسلمہ نے اس شگاف میں داخل ہونے کے لیے لوگوں کی تشکیل کی؛ پر کوئی تیار نہیں ہوا، اتنے میں ایک نامعلوم شخص لشکر سے نکلا، اور اس شگاف میں گھس گیا، جس کے بعد قلعہ فتح ہوگیا، جنگ کے بعد مسلمہ نے آواز لگائی کہ: شگاف میں داخل ہونے والا شخص کہاں ہے؟؛ لیکن کوئی نہیں آیا، مسلمہ نے دوبارہ اعلان کیا کہ: میں نے دربان کو حکم دے دیا ہے کہ وہ شخص جب بھی آئے میرے پاس پہنچادیا جائے، میں اسے قسم دیتا ہوں کہ وہ ضرور آئے؛ چنانچہ ایک شخص دربان کے پاس آیا اور کہنے لگا: امیرِ لشکر سے میرے لیے اجازت لے لو، دربان نے پوچھا: شگاف میں داخل ہونے والے تم ہی ہو؟ اس نے کہا: میں اسی کے بارے میں بتانے

(۱) من صحاح الاحادیث القدسیہ ص ۶۴، عیون الاخبار ۱: ۲۷۱

بتانے آیا ہوں، دربان مسلمہ کے پاس گیا اور اسے اطلاع دی، مسلمہ نے آنے کی اجازت دے دی، اس شخص نے کہا کہ: شگاف میں داخل ہونے والا شخص آپ سے تین چیزوں کا عہد لینا چاہتا ہے: ایک یہ کہ خلیفہ کے نام خط میں اس کا نام نہ لکھا جائے، دوسرے یہ کہ اس کے لیے کسی بھی چیز (یعنی مال وغیرہ) کا حکم نہ دیا جائے، تیسرے یہ کہ اس سے یہ نہ پوچھا جائے کہ وہ کس قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے؟ مسلمہ نے کہا: ٹھیک ہے، منظور ہے، اس پر اس نے کہا کہ: میں ہی وہ شخص ہوں جو شگاف میں داخل ہوا تھا۔

اس واقعہ کے بعد مسلمہ جب بھی نماز پڑھتے، تو یہ دعا کیا کرتے تھے: **"اللّٰهم اجعلني مع صاحب النقب"** اے اللہ! مجھے شگاف والے شخص کے ساتھ کردے۔

اخلاص کی تعریف:

اخلاص کی تعریف کے سلسلے میں علمائے تصوف وسلوک کے متعدد اقوال ہیں، امام غزالیؒ نے **"الإحياء"** میں اور قشیریؒ نے **"الرسالة"**(۱) میں اس کی متعدد تعریفات ذکر کی ہیں، جن میں ابویعقوب السوسیؒ کی یہ تعریف بھی ہے: **"الإخلاص فقد الأخلاص"** اخلاص نام ہے اخلاص کو کھو دینے کا، یعنی اپنے آپ کو مخلص نہ سمجھنا یہی اخلاص ہے، اور سب سے آخری تعریف یہ ذکر کی ہے: **"الإخلاص: دوام المراقبة ونسيان الحظوظ كلها"** اخلاص نام ہے: ہر وقت اللہ تعالیٰ کے استحضار اور تمام خواہشات کو بھول جانے کا۔

اس کے بعد امام غزالیؒ نے سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ کی ایک حدیث ذکر کی ہے(۲)، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتادیجیے جسے میں مضبوطی سے تھامے رہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"قل**

---

(۱) ۴: ۳۸۱، الرسالۃ ۳: ۱۳۴۳ بشرح القاضی زکریا

(۱) مسلم ۱: ۶۵ (۶۲) ترمذی (۲۴۱۰) نسائی (۱۱۴۹۰) ابن ماجہ (۳۹۷۲) **واللفظ له وللترمذي**

ربي الله ثم استقم" (کہو: میرا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاؤ) اس حدیث کی تشریح کرنے سے پہلے امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ: اخلاص کی تشفی بخش وضاحت تو سیّد الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: حدیث کا مطلب ہے کہ اپنی خواہشات اور اپنے نفس کی عبادت مت کرو، صرف اپنے رب کی عبادت کرو، اور اپنی عبادت میں اس طرح جمے رہو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ: مؤمن کو اپنی نظریں ہر ماسوی اللہ سے ہٹا لینی چاہئیں، اور یہی حقیقی اخلاص ہے۔

اخلاص کی اہمیت ائمہ حدیث کے نزدیک:

امام ابنِ صلاحؒ نے اپنے مقدمہ کی اٹھائیسویں (۲۸) نوع "**معرفة آداب طالب الحديث**" کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے: سب سے پہلی چیز جو طالبِ حدیث کے لیے ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ: اپنے اندر اخلاص پیدا کرے، اور طلبِ حدیث کو کسی دنیوی غرض کے حصول کا ذریعہ نہ بنائے۔

ابنِ صلاحؒ نے امام حماد بن سلمہ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ: جس نے حدیث پاک کو غیر اللہ کے لیے سیکھا اس کے ساتھ تدبیر کی گئی (۱)، اسی طرح سفیان ثوریؒ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ: اگر حدیث پاک حاصل کرنے کا مقصد اللہ کی رضا ہو تو میرے نزدیک آدمی کے لیے اس سے افضل عمل کوئی نہیں ہے (۲)۔

حماد بن سلمہؒ اور سفیان ثوریؒ کے ان ارشادات میں ''حدیث'' کا ذکر بظاہر اس لیے ہے کہ اس زمانے میں حدیث کا علم ہی عام اور شائع تھا، اس سے ان دونوں کی مراد یہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اگر کوئی حدیث کے علاوہ مثلاً تفسیر کا علم غیر اللہ کے لیے حاصل کرے تو یہ اس کے لیے جائز ہوگا، اور اس کے ساتھ تدبیر نہیں کی جائے گی؛ بلکہ مطلب یہ ہے کہ شریعت کا

(۱) جامع ابن عبد البر (۱۱۵۳) جامع خطیب (۲۰)

(۲) یہ الفاظ شرف اصحاب الحدیث (۱۷۶) میں ان سے منقول الفاظ کے قریب قریب ہیں۔

کوئی بھی علم اگر غیر اللہ کے لیے حاصل کیا جائے، چاہے وہ کسی بھی فن سے متعلق ہو، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ تدبیر کی جائے گی، اسے حصولِ علم میں توفیق دینے کے بجائے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے گا، اور ہلاکت و بربادی اس کا مقدر بنے گی۔

غیر اللہ کے لیے علم حاصل کرنے کا مطلب:

لیکن یہ سب اسی شخص کے بارے میں ہے جس کی نیت خالص غیر اللہ کی ہو، یعنی وہ کسی خاص دنیوی فائدے یا فاسد مقصد کو پانے کے لیے ہی علم حاصل کرے، جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علم اس لیے مت حاصل کرو کہ اس کے ذریعہ علماء پر فخر جتاؤ، یا بے وقوفوں سے بحث و مباحثہ کرو، یا اس کے ذریعہ مجلسیں جماؤ، جو ایسا کرے گا اس کے لیے آگ ہے آگ" اس حدیث پر کچھ کلام ہے؛ لیکن وہ مضر نہیں ہے(۱)۔

آغاز میں اگر نیت کا استحضار نہ ہو:

اگر ایسا ہو جائے کہ طلبِ علم کے آغاز میں طالبِ علم کی کوئی نیت ہی نہ ہو، نہ اچھی نیت ہو اور نہ بُری نیت ہو، پھر بعد میں وہ اپنا معاملہ ٹھیک کر لے اور کوئی اچھی نیت کر لے، تو اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ لطف و مہربانی کا معاملہ فرمائیں گے۔

ابنِ عبد البرؒ نے ایک باب باندھا ہے: "**باب الخبر عن العلم أنه يقود إلى**

---

(۱) ابن ماجہ (۲۵۴) التقاسیم والانواع لابن حبان (۲۸۱۰) مستدرک حاکم ۱:۸۶ (۲۹۰) حاکم نے اس حدیث کی تصحیح کی ہے، اس باب میں متعدد مرفوع احادیث اور سلف کے موقوف آثار ہیں جو مذکورہ بالا تینوں مصادر میں مذکور ہیں، نیز منذری کی ترغیب ۱:۱۱۵، جامع ابن عبد البر ۱:۶۴۸، میں **باب ذم الفاجر من العلماء و ذم العلم للمباهاة والدنيا** جامع خطیب ۱: ۱۲۳ میں باب النية في طلب الحديث میں بھی مذکور ہیں، نیز مناوی کی فیض القدیر میں حدیث نمبر (۸۶۰۱، ۸۸۴۰) کی شرح بھی دیکھیے۔

اللہ تعالیٰ علیٰ کل حال" (کہ علم ہر حال میں اللہ تک پہنچا تا ہے)، اور اس کے تحت جلیل القدر تابعی حبیب بن ابی ثابتؒ (۱۱۹ھ) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ہم نے جب اس امر کو حاصل کرنا شروع کیا تو ہماری کوئی نیت نہیں تھی، بعد میں ہمارے اندر نیت آئی (۱)۔

ابنِ عبدالبرؒ نے اس اثر سے پہلے متعدد سندوں سے امام معمر بن راشد بصری یمنیؒ (۱۵۴ھ) کا یہ مشہور جملہ بھی نقل کیا ہے: "**طلبنا العلم لغیر اللہ فأبی أن یکون إلا للہ**" کہ ہم نے علم کو غیر اللہ کے لیے حاصل کیا؛ لیکن وہ انجامِ کار اللہ کے لیے ہی ہو کر رہا، امام بدر بن جماعہؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف "**تذکرۃ السامع والمتکلم**" میں طلبہ کے تئیں اساتذہ کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: دوسرا ادب یہ ہے کہ استاذ یہ دیکھ کر کہ طالبِ علم کی نیت میں اخلاص نہیں ہے اس کو علم سکھانے سے انکار نہ کرے؛ بلکہ اسے تعلیم دیتا رہے، اُمید ہے کہ علم کی برکت سے ان شاء اللہ اس کی نیت میں اخلاص پیدا ہو جائے گا، بعض اسلاف کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ: ہم نے علم کو غیر اللہ کے لیے حاصل کیا؛ لیکن انجام کار وہ اللہ کے لیے ہو کر رہا، دوسرے یہ کہ اگر مبتدی طلبہ کی تعلیم کے لیے اخلاصِ نیت کی شرط لگا دی گئی، جبکہ بیشتر کے اندر اس کا پیدا ہونا دشوار ہے، تو بہت سے لوگ علم سے محروم رہ جائیں گے (۲)۔

طلبہ کی صورتِ حال تو عرصۂ دراز سے یہ چلی آرہی ہے کہ انھیں ان کے ماں باپ کی طرف سے علم کے حصول میں لگا دیا جاتا ہے، اس وقت طالبِ علم کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ نیت کسے کہتے ہیں؟ نیت کی اہمیت کیا ہوتی ہے؟ اور حصولِ علم میں اخلاصِ نیت کا کیا مطلب ہوتا ہے؟۔

مبتدی طلبہ کی نیت درست کرانے کی کوشش ہو:

ایسے میں والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ بچے کی نیت کو درست کرانے کی کوشش

(۱) جامع بیان العلم (۱۳۸۰)

(۲) ص ۴۷

کریں، اور والدین کی کوتاہی کی صورت میں استاذ کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو اس طرف متوجہ کریں۔

اسی لیے ابنِ جماعہؒ آگے لکھتے ہیں: لیکن استاذ کو چاہیے کہ وہ مبتدی طالبِ علم کو بتدریج حسنِ نیت پر قولاً وفعلاً اُبھارتا رہے، اور جب طالبِ علم استاذ سے تھوڑا سا مانوس ہوجائے تو استاذ اسے بتائے کہ وہ حسنِ نیت کی برکت سے علم وعمل کے اندر بڑا مقام حاصل کرلے گا، لطائف کا فیضان، حکمت بھری باتیں، قلب کی نورانیت، سینے کا انشراح، عزم وارادہ کی توفیق، حق بات تک رسائی، احوال کی بہتری، بات کی درستگی اور قیامت کے دن درجات کی بلندی یہ ساری چیزیں اخلاص کی برکت سے اسے ملیں گی۔

فاضل علمویؒ نے **"المعيد في أدب المفيد والمستفيد"** میں لکھا ہے کہ: کہ یہ سوچ کر کسی کو پڑھانے سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی نیت صحیح نہیں ہے؛ اس طرح سے تو بہت سا علم ضائع ہوجائے گا؛ علم سے مانوس ہونے کے بعد اُمید ہے کہ علم کی برکت سے اس کی نیت درست ہوجائے گی، علماء کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ: ہم نے علم کو غیر اللہ کے لیے حاصل کیا؛ لیکن انجام کار وہ اللہ کے لیے ہوکر رہا(۱)۔

ہر میدان میں کامیابی کا راز اخلاصِ نیت:

کسی بھی شے کے اندر کامیابی پانے کے لیے اخلاص کی وہی اہمیت ہے جو جسم کے اندر روح کی ہے، کہ جس طرح بغیر روح کے جسم بے کار ہے، اسی طرح بغیر اخلاص کے کسی بھی کام کے اندر کامیابی نہیں مل سکتی، آج مسلمانوں نے جس اکسیر کو اپنے ہر عمل میں کھویا ہے، وہ اخلاص کی دولت ہے، اس کی سب سے بڑی دلیل صدیوں پر محیط ہماری طویل تاریخ ہے، کہ مسلمانوں نے کس طرح تھوڑے سے اسباب ووسائل کے ذریعہ، جن کا آج

(۱) ص ۴۵

کے اسباب ووسائل سے کوئی موازنہ ہی نہیں، نہ معلوم کتنے علوم وفنون ایجاد کر لیے، نہ جانے کتنی تہذیبیں بناڈالیں، نہ جانے کتنے ملکوں کی بنیادیں رکھ دیں، اور نہ جانے کتنی حکومتوں کو اپنے زیرِ نگیں کرلیا، جبکہ آج ڈھیروں اسباب ووسائل کے ہوتے ہوئے بھی ہم ان تمام میدانوں میں، جن میں ہمارے اسلاف نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، برابر پستی اور پسماندگی کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

ہماری تاریخ میں کتنے ہی ایسے امام گزرے ہیں، جنھوں نے تنِ تنہا علم اور اہلِ علم کے سامنے ایسے بڑے بڑے کارنامے پیش کیے، جس کو انجام دینے سے آج پوری اکیڈمیاں عاجز ہیں؛ حالانکہ ہمارے اور ان کے درمیان اسباب ووسائل کے اعتبار سے اتنا ہی؛ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ بُعد تھا، جتنا بُعد زمانہ کا ہے؛ یہ سب ان کے اخلاص اور ان کی بلند ہمتی کی ہی کرشمہ سازیاں تھیں، رضی اللہ عنہم وارضاہم۔

ایک مسئلہ کی اَسّی (۸۰) ہزار صورتیں!!:

یہ تو ان کارناموں کی بات تھی جو ہمارے سامنے موجود ہیں، اور بے شمار علوم تو ایسے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ہی دفن ہوگئے، ابنِ فرحون نے امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن الشارمساحیؒ (۵۸۹-۶۶۹ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے: کہ انھیں مدرسہ مستنصریہ میں تدریس کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس مدرسہ کو سب سے پہلے خلیفہ مستنصر باللہ نے قائم کیا تھا، خلیفہ نے حکم دیا کہ تمام مدارس کے اساتذہ، تمام اربابِ حکومت، اور تمام دفاتر کے منشی ان کے دربار میں حاضر ہوں؛ چنانچہ سب حاضر ہوئے، شیخ بھی وہاں موجود تھے، حاضرین میں سے بعض نے شیخ کے سامنے بیوع الآجال (اُدھار بیع) کا مسئلہ رکھا، شیخ نے فرمایا: مجھے اس سلسلے میں اَسّی (۸۰) ہزار صورتیں یاد ہیں، بغداد کے فقہاء کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی، تو شیخ نے ان کے سامنے تمام صورتوں کو بیان کرنا شروع کر دیا؛ ابھی دوسو تک نہیں پہنچے کہ ان لوگوں کے

لیے سننا دشوار ہوگیا، اور انھوں نے شیخ کو روک دیا، اور ان کے فضل وکمال اور وسعتِ علمی کا اعتراف کیا، یہ موضوع تو بڑی دلچسپ داستانیں لیے ہوئے ہے[1]۔

(۱) الدیباج المذہب (۱:۷ ۳۸) روح المعانی ۱:۵ ۴ ۲ میں علامہ آلوسی کی وہ بحث بھی دیکھنے کے لائق ہے جو انھوں نے بسم اللہ کے اندر پائے جانے والے مضامین اور اسرار ورموز کے تعلق سے کررکھی ہے، یہ خیال کی ایک قسم ہے۔

اس قسم کی کچھ چیزیں اب بھی مطبوع یا مخطوطے کی شکل میں موجود ہیں، جو ان علماء کے ساتھ دفن نہیں ہوئیں، ان ہی میں امام عبقری اسماعیل مقری شافعیؒ (متوفی ۸۳۷ھ) کا کلام بھی ہے، جس کے اندر انھوں نے دھوپ میں گرم کیے ہوئے پانی کو استعمال کرنے نہ کرنے کے مسئلے پر ایک دو نہیں؛ بلکہ پچاس لاکھ اسّی ہزار ایک سو چار صورتیں بیان کی ہیں، اور اس سے بھی زیادہ تعجب اور عبقریت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے ساٹھ مطبوعہ سطروں کے اندر سمیٹ دیا ہے!!۔

دوسری مشعل

طالبِ علم کا اپنے مقام ومرتبہ اور اپنے کارِ منصبی کو پہچاننا

طالبِ علم کے لیے علم کی اہمیت اور اس کے مقام ومرتبہ کو جاننا: ان اہم ترین اور بنیادی ضروریات میں سے ہے جن پر طالبِ علم کے اس راستے اور منہج کا دارومدار ہے، یہ واقفیت ہی درحقیقت وہ مٹی ہے جس میں طالبِ علم اپنا علمی پودا لگاتا ہے؛ جو نہ صرف اسے بلکہ پورے اسلام اور مسلمانوں کو مستقبل میں پکے ہوئے پھل عطا کرتا ہے۔

وہ چیزیں جن کی قدروقیمت جاننا ضروری ہے:

طالبِ علم کے لیے دو چیزوں کی قدروقیمت کا جاننا بے حد ضروری ہے:

(۱) علم کی قدروقیمت:

طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ علم کے مقام ومرتبہ کو پہچانے، جس کی فضیلت واہمیت اور مذہبِ اسلام میں جس کے بلند مقام ومرتبہ کی ایک جھلک میں نے پیچھے دکھلائی ہے، طالبِ علم ان فضیلتوں کو برابر یادرکھے، اور اس بات کا یقین کرے کہ یہ جتنے فضائل پیش کیے گئے ہیں، یہ سمندر کا ایک قطرہ ہیں، اس سے اس کے اندر علم کی تعظیم بڑھے گی، اس عظیم سعادت کا ادراک کرلینے کے بعد اسے چاہیے کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرنے

کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی شے لگا دے؛ تاکہ وہ اس شرف کو پورے استحقاق کے ساتھ حاصل کر سکے؛ کیونکہ امتِ محمدیہؐ کے لاکھوں کروڑوں افراد میں سے اس کا اس سعادت کے لیے انتخاب ہوا ہے۔

سنن ابنِ ماجہ، مسند احمد اور ابنِ حبان میں ابوعِنَبہ خولانی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**لايزال الله يغرس في هٰذا الدين غرسا يستعمله لطاعته**" اللہ تعالیٰ برابر اس دین میں پودے لگاتے رہتے ہیں جنھیں اپنی طاعت کے لیے استعمال کرتے ہیں(۱)۔ پس یہ جو اللہ نے تمہیں بویا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔

(۲) اپنی ذمہ داری کی قدر و قیمت:

دوسری: یہ ہے کہ طالبِ علم اپنی آنے والی ذمہ داری کی عظمت کا ادراک کرے، وہ مستقبل قریب میں ان شاء اللہ مسلمانوں کے لیے ان کی نمازوں کا امام، ان کا خطیب، ان کا مفتی، اور دینی اور دنیوی اُمور میں انھیں اللہ کے احکام بتلانے والا ہوگا۔

طالبِ علم اللہ کی اس عطا پر ناز اور فخر کرے، وہ ہرگز یہ خیال دل میں نہ لائے کہ وہ کمزور ہے، اور اس کے ابتدائی درجوں کے ساتھی کامیاب نکل گئے، کوئی ڈاکٹر بن گیا، کوئی انجینئر بن گیا، کوئی تاجر بن گیا اور وہ تو بس وہیں کا وہیں رہا! ایک مدرسہ کا طالبِ علم! ایک مسجد کا امام! جمعہ کا ایک خطیب! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہارا کسی کام کا حکم دینا، کسی کام سے روکنا، کسی چیز کو حلال قرار دینا، کسی چیز کو حرام قرار دینا، یہ درحقیقت اللہ کا حکم دینا، اللہ کا منع کرنا، اللہ کا حلال اور حرام کرنا ہے، اب تمہاری زبان سے نکلی ہوئی بات تمہاری نہیں بلکہ اللہ کی بات ہوتی ہے، تمہاری بات کی تائید اللہ رب العزت کرتے ہیں، بھلا اس سے

(۱) ابن ماجہ (۸) مسند احمد ۴: ۲۰۰ التقاسیم والانواع لابن حبان (۴۶۱۰)

بھی بڑھ کر کوئی شرف اور اعزاز ہو سکتا ہے؟ تم مسجد کے امام نہیں؛ بلکہ بندوں اور ان کے رب کے درمیان ایک واسطہ ہو، لوگوں کی نماز تمہاری نماز سے وابستہ ہے، لوگوں کا اللہ سے تعلق تمہاری وجہ سے ہے، یہ ہے طالبِ علم کا حقیقی مقام اور عظیم مرتبہ، جب وہ اللہ کا اور اپنے علم کا حق پہچان لے۔

طالبِ علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث ہے:

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے ایمان اور اپنی شریعت پر عمل کرنے کا راستہ کتاب اللہ میں واضح کر دیا؛ لیکن چونکہ کتاب کو پہنچانے اور اس کی تشریح وتوضیح کے لیے کسی ہستی کی ضرورت تھی؛ اس لیے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبلغ، داعی اور قرآن کا شارح بنا کر بھیجا؛ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھی اس ناحیہ سے وہ احوال آنے تھے جو تمام انسانوں پر آتے ہیں، یعنی محدود زندگی اور اس کے بعد موت؛ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ جانشین اور وارث بھی ہونے ضروری تھے، حکمتِ الٰہیہ دیکھیے کہ وہ جانشین اور وارث علماءِ کرام قرار پائے، اسی بات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے: ”**إن العلماء ورثة الأنبياء**“ کہ علماء انبیاء کے واث ہیں، بلاشبہ اس رتبہ سے بڑھ کر کوئی رتبہ نہیں، صرف ایک رتبہ ہے اور وہ بھی اسی کے ساتھ حاصل ہو جاتا ہے یا اس سے بھی پہلے مل جاتا ہے، اور وہ ہے لوگوں تک شریعت پہنچانے میں اللہ تعالیٰ کی جانشینی اور خلافت کا رتبہ، پس یہ جانشین اور خلیفہ یہی آج کا طالبِ علم ہے، جو کل عالم بنے گا اور مستقبل میں لوگوں کو فتوے دے گا۔

طالبِ علم اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے:

امام ابنِ قیمؒ نے (۱) اس سلسلے میں ایک عمدہ بحث کی ہے، میں اسے مکمل نقل کرتا ہوں،

(۱) اپنی کتاب **إعلام الموقعين** ۱:۱۰ میں

وہ فرماتے ہیں کہ: جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبلیغ کی ذمہ داری کا دارومدار اس بات پر ہے کہ جس چیز کو پہنچایا جا رہا ہے پہنچانے والے کو اس کا علم ہو، اور سچائی کے ساتھ اس کو پہنچایا جائے، تو تبلیغ کا منصب، خواہ روایتِ حدیث کی شکل میں ہو یا افتاء کی شکل میں، اسی شخص کے لیے سزاوار ہے جو علم اور صدق سے متصف ہو، کہ وہ اس چیز کو جانتا بھی ہو جسے وہ دوسروں تک پہنچا رہا ہے، اور اس کو پہنچانے میں سچا بھی ہو، اسی کے ساتھ وہ اچھے کردار اور بہترین سیرت کا بھی حامل ہو، اس کے اقوال وافعال میں عدالت پائی جاتی ہو، اس کا ظاہر وباطن یکساں ہو، خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی، اور زندگی کے تمام احوال میں، غور کیجیے جب ایک بادشاہ کی طرف سے دستخط کرنے کا عہدہ اتنا بڑا ہوتا ہے جس کی اہمیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، اور نہ اس سے کوئی ناواقف رہ سکتا ہے، وہ اعلیٰ ترین عہدوں میں شمار ہوتا ہے، تو پھر اس عہدے کا کیا مقام ہوگا جس میں زمین وآسمان کے پالنہار تمام مخلوقات کے خالق ومالک کی طرف سے دستخط کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔

لہٰذا جس شخص کو بھی یہ عہدہ ملے اسے چاہیے کہ وہ اس عظیم منصب کے لیے بھرپور تیاری کرے، اور سمجھے کہ اسے کتنا بڑا عہدہ سونپا گیا ہے، اس کے سینے میں حق بات کہنے اور حق بات کا برملا اظہار کرنے سے کسی قسم کی کوئی تنگی نہ ہو؛ اللہ اس کا ہادی اور ناصر ہے، یہ منصب عظیم تر کیوں نہ ہو، جبکہ اس منصب کی ذمہ داری خود رب الارباب نے لے رکھی ہے ﴿وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ﴾ (النساء: ۱۲۷) (اور لوگ آپ سے عورتوں کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ: اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تم کو حکم دیتے ہیں، اور وہ آیات بھی جو کہ قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں) بھلا جس منصب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لے لی اس کی قدر ومنزلت کا کیا ٹھکانہ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَسْتَفْتُونَكَ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۖ﴾ (النساء: ۱۷۶) (لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں،

آپ فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے) لہٰذا ایک مفتی کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ کس ذات کی نیابت کر رہا ہے، اور ساتھ ہی اس بات کا استحضار بھی ہونا چاہیے کہ کل اسے اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دہی بھی کرنی ہے۔

سب سے پہلے اس ذمہ داری کو جس ذات نے اُٹھایا، وہ ہمارے اور آپ کے آقا سیّد المرسلین امام المتقین خاتم النبیّین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو اللہ کے بندے، اس کے رسول، اس کی وحی کے امین اور اس کے اور بندوں کے درمیان سفیر ہیں۔

اس اقتباس میں ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مفتی اپنے اس رب کا نائب اور خلیفہ ہوتا ہے، جس نے خود بعض ان مسائل میں جو امت کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے افتاء کا کام انجام دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ابنِ قیم نے اپنی کتاب کا نام "**إعلام الموقّعين عن رب العالمين**" (اپنے رب کی طرف سے دستخط کرنے والوں کو آگاہی) رکھا ہے، یعنی مفتی جس وقت اپنا فتوے صادر کرتا ہے اور اپنے دستخط کے ذریعہ اس پر مہر لگاتا ہے، تو وہ حقیقت میں زمین و آسمان کے پالنہار اور تمام جہانوں کے رب کی طرف سے دستخط کر رہا ہوتا ہے، کہ میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اور جو کچھ لکھ رہا ہوں، یہ میری بات نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی بات ہے، اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے۔

یہ عظیم مرتبہ جس کی کوئی برابری نہیں کر سکتا، اس مرتبہ کی ذمہ داری سنبھالنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر عظیم ترین اور کامل صفات پیدا کرے، جیسا کہ ابنِ قیمؒ نے کچھ صفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یقیناً یہ منصب اِس بات کا حقدار ہے کہ جس کسی کے دل میں بھی اسے پانے کی تمنا ہو، وہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ مقام تک پہنچنے کے لیے اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی شے لگا دے، یہ کوئی معمولی منصب نہیں ہے، یہ اللہ کی جانشینی کا منصب ہے، یہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا منصب ہے، یقیناً یہ دنیا کا سب سے معزز اور سب سے عظیم منصب ہے۔

ذرا سوچیے! جب آج کا یہ طالبِ علم، جو کل کا عالم اور مستقبل کا مفتی ہے، اس ذات کی طرف سے دستخط کرنے کا اہل بننے والا ہے، جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، جو آسمان وزمین کا حکمراں ہے، تو کیا اس رفعت وبلندی کی کوئی انتہا ہوسکتی ہے، جو اللہ کی طرف سے اسے عطا ہوئی ہے، اور اب اس کے لیے کتنا ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس عظیم سعادت کی تن، من، دھن سے حفاظت اور پاسداری کرے۔

یقیناً ایک طالبِ علم کے لیے اپنے علم کی قدر ومنزلت کو سمجھنا اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ اس مقام ومرتبہ کا ادراک کرنا بے حد ضروری ہے۔

علم کی تعظیم ضروری ہے:

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ علم ایک عظیم اور باعزت شے ہے، جو بھی اسے اس کا حق دے گا اور اس کی تعظیم وتکریم کرے گا، علم اسے عظمتوں سے نوازے گا اور بلندی عطا کرے گا، اور جو اس کے حق میں کوتاہی کرے گا تو وہ خود ہی ذلیل خوار ہوجائے گا، علم تو عظیم ہے اور عظیم ہی رہے گا، اس کو عظمت دینے والا اللہ ہے؛ اس لیے کہ جس علم کی ہم بات کررہے ہیں، وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے اوراق میں بکھرا ہوا ہے، اور اللہ کی ذات اس بات سے بلندتر ہے کہ وہ اپنی کتاب اور اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو مفسدین کے ہاتھوں کھلواڑ بننے دیں۔

ولو أنّ أهلَ العلم صانُوه صانَهم ❖ ولو عظّمُوه في النفوسِ لَعَظّما
ولكنْ أَهانوه فهانُوا ودَنَّسوا ❖ مُحَيّاهُ بالأطْماع حتّى تَجَهَّما

اگر اہلِ علم اس علم کی حفاظت کرتے تو علم بھی ان کی حفاظت کرتا، اگر وہ دلوں میں اس

کی عظمت پیدا کرتے تو علم بھی انھیں عظمت عطا کرتا؛ لیکن انھوں نے علم کی توہین کی، جس کے نتیجہ میں وہ خود ذلیل ہوئے، انھوں نے علم کے چہرے کو اپنی خواہشات سے آلودہ کیا، یہاں تک کہ اس نے تُرش روئی اختیار کرلی[1]۔

(۱) یہ دونوں شعر قاضی ابوالحسن علی بن عبدالعزیز جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) کے لازوال قصیدے سے ماخوذ ہیں، جس کے بعض اشعار کو خطیب نے بھی اپنی سند سے ''جامع بیان العلم'' (۸۸۲) میں ذکر کیا ہے، اور تاج الدین سبکیؒ نے بھی اس پورے قصیدے کو اپنی سند کے ساتھ **''معید المنعم''** میں چھیالیسویں (۴۶) مثال کے تحت ذکر کیا ہے، اور اخیر میں لکھا ہے کہ: سچ کہا اس شاعر نے، اگر یہ لوگ علم کی تعظیم کرتے تو علم بھی ان کی تعظیم کرتا، میں اس شعر کو **''لعَظّما''** عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھتا ہوں؛ کہ علم کی جب تعظیم کی جاتی ہے تو وہ بھی تعظیم کرتا ہے، اور وہ خود عظمتوں والا ہے، اسی لیے میں **''ولکن أهانوه فهانوا''** (جمع کے صیغہ کے ساتھ) پڑھتا ہوں؛ لیکن اس شعر کی روایت **''فهان''** (مفرد کے صیغہ کے ساتھ) اور **''لعُظِّم''** عین کے ضمہ کے ساتھ ہے؛ بہتر وہی ہے جس کو میں نے ذکر کیا ہے۔)

تیسری مشعل

علم کے راستے میں ذکاء (ذہانت) کی اہمیت

ذکاء (ذہانت) کی ضرورت پر ائمہ کا اتفاق:

تمام ائمہ: امام شافعیؒ، امام عسکریؒ، امام ماوردیؒ اور امام الحرمینؒ اِس بات پر متفق ہیں کہ طالبِ علم کے لیے ذہانت ایک ضروری شے ہے، ان حضرات کے اقوال پیچھے گزر چکے ہیں، امام عسکریؒ نے اس کے لیے "**الذهن الثاقب**" کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کا مطلب ہے: **الفطنة والذكاء** (ذہانت اور سمجھداری)، **ثقوب الذهن** کا مطلب ہوتا ہے: **شدة الفطانة** فہم کی قوت اور مضبوطی۔

لیکن ماوردیؒ نے ذکاء اور فطانت کے درمیان فرق کیا ہے؛ چنانچہ انھوں نے تین چیزیں الگ الگ ذکر کی ہیں: **العقل، الفطانة، الذكاء.**

میرے خیال میں جس نے صرف **ذكاء** کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، اس نے سب چیزیں مراد لے لی ہیں: عقل، فطانت، **سرعة الخاطر والبديهة** (تیز فہمی)، **توقد الذهن وحضوره** (ذہن کا روشن ہونا اور استحضار)، **جودة القريحة والاستنباط** (قوت استناج واستنباط کی مضبوطی)، اوران جیسے دیگر ملتے جلتے الفاظ اور معانی۔

ذکاء کے معنیٰ:

ذکاء کے معنیٰ ہیں: **سرعة الفطنة وحدة الفهم** (قوتِ فہم کی مضبوطی اور بات کو جلد

سمجھ جانا) ابنِ فارس(۱) کے بقول اس مادہ کے اندر تیزی اور حدت کے معنیٰ پائے جاتے ہیں۔

ذہانت کی قسمیں:

ذہانت کی دو قسمیں ہیں: ایک وہبی جو پیدائشی طور پر بعض لوگوں کو ملتی ہے، اور دوسرے کسبی جو عمر اور زندگی کی سرگرمیوں اور روزمرہ کے تجربات کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے، پھر جس طریقے سے وہبی ذہانت سب کے اندر یکساں نہیں ہوتی، کسی میں کم کسی میں زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح کسبی ذہانت کے بڑھنے کی شرح بھی ہر ایک کے اندر الگ الگ ہوتی ہے، جس کا جیسا پیشہ اور کاروبار ہوتا ہے، اور لوگوں سے جس قسم کا رابطہ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے یہ ذہانت بھی بڑھتی جاتی ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص کے اندر دونوں قسم کی ذہانتیں جمع ہوجاتی ہیں کہ وہ پیدائشی ذہین بھی ہوتا ہے اور اس کے کاروبار اور پیشے کی نوعیت بھی ایسی ہوتی ہے جس سے اس کی ذہانت کو جلا ملتی ہے، مثلاً: وسیع پیمانے پر تجارت کرنا، یا جج یا وکالت کا پیشہ اختیار کرنا، یا کوئی اور ایسا پیشہ جس کی وجہ سے اسے روز بروز لوگوں کے اُلجھے ہوئے احوال سے آگاہی اور واقفیت حاصل ہوتی ہے، ایسا شخص ابنِ رومی کے اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے:

ألمعـــي يـــرى بـــأول رأي ❖ آخر الأمرين من وراء المغيب

ذہین وفطین آدمی اوّل وحلہ میں ہی غیب کے پردوں سے دونوں کاموں میں سے آخر کو دیکھ لیتا ہے۔

استاذ ذہین طلبہ پر خصوصی توجہ دے:

اپنے طلبہ کے درمیان سالہا سال رہنے والے استاذ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں سے ہونہار اور ذہین لڑکوں کا انتخاب کرے، ان پر خصوصی توجہ دے، ان پر نظر رکھے، ان کے احوال کی خبر گیری کرے، اور ان کو مالی اعتبار سے بے نیاز بنانے کی

(۱) مقاييس اللغة ۲: ۳۵۷

کوشش کرے؛ تاکہ وہ علم کے لیے یکسو ہوکر ضائع ہونے سے بچ جائیں، اس طرح ان شاء اللہ ان کی صلاحیتیں کام آجائیں گی۔

نیز استاذ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: وہ ذہین طلبہ کی دوسری قسم یعنی کسبی ذہانت والوں پر بھی صبر واستقلال کے ساتھ محنت کرتا رہے، ان سے بھی فائدہ اُٹھائے؛ تاکہ وہ بھی ضائع ہونے سے بچ جائیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جس طالبِ علم پر بھی استاذ نے صبر وتحمل کے ساتھ محنت کی، وہ علم میں بہت بلند مرتبہ تک پہنچا، اور بعض تو اپنے وقت کے امام بن گئے۔

امام شافعیؒ کا صبر وتحمل کے ساتھ طالبِ علم پر محنت کرنا:

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ سبکیؒ نے "طبقاتِ شافعیہ"(۱) کے اندر ربیع بن سلیمان مرادیؒ کے تذکرے میں نقل کیا ہے، جو امام شافعیؒ کے راویہ کہلاتے ہیں، سبکیؒ قفال کے "فتاویٰ" کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ربیع بن سلیمان بطیء الفہم تھے، انھیں بات دیر سے سمجھ میں آتی تھی، ایک مرتبہ امام شافعیؒ نے ان کے سامنے ایک مسئلہ کی چالیس مرتبہ تقریر کی؛ لیکن وہ سمجھ نہیں سکے، اور مارے شرم کے مجلس سے اُٹھ کر چلے گئے؛ امام شافعیؒ پھر انھیں تنہائی میں بلایا، اور جب تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا اس مسئلے کو سمجھاتے رہے، اللہ تعالیٰ امام شافعیؒ سے راضی ہو! کس قدر ان کے اندر صبر، تحمل، ذوق، ادب اور شفقت تھی، ایک ایسے شخص کے تئیں جس کے اندر انھیں خیر نظر آرہا تھا۔

اس واقعہ سے دو سطر اُوپر ہی لکھا ہوا ہے کہ: امام شافعیؒ نے ایک مرتبہ ربیع سے فرمایا تھا: "ما أحبك إلي" مجھے تم سے کس قدر محبت ہے، یہ بھی فرماتے تھے کہ: میری کسی نے بھی ایسی خدمت نہیں کی جیسی خدمت ربیع بن سلیمان نے کی، ایک دن کہنے لگے: ربیع! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں یہ علم تمھیں لقمہ بنا کر کھلا دیتا، یقیناً امام شافعیؒ کی ذات ہر استاذ اور ہر معلّم کے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے۔

(۱) ۲: ۱۳۴

چوتھی مشعل

وقت اور حصولِ علم کے تئیں حرص

حرص کی تعریف (۱):

راغب اصفہانیؒ کی ''مفردات'' میں ہے: **''الحرص: فرط الشَّرَہ وفرط الإرادۃ** حرص نام ہے: شدید خواہش اور شدید چاہت کا، یعنی حرص کہتے ہیں: کسی چیز کو شدت سے چاہنا اور شدت سے اس کی خواہش کرنا؛ لہٰذا حرص صرف رغبت کا نام نہیں؛ بلکہ شدتِ رغبت اور شدتِ خواہش کا نام ہے۔

تین چیزوں کی حرص:

حرص کا تعلق تین چیزوں سے ہے: (۱) وقت کی حرص (۲) علم حاصل کرنے کی حرص (۳) کسی خاص علمی فائدہ کو حاصل کرنے کی حرص اس ڈر سے کہ کہیں وہ چھوٹ نہ جائے، یہ حرص اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب طالبِ علم کے اندر حصولِ علم کے تئیں بلند ہمتی اور شدید قسم کی کُڑھن پیدا ہو، جو صبح وشام اس کے دل و دماغ پر چھائی رہے، اور اس کا حال وہی ہو جائے جو ''عقلائے مجانین'' (عقلمند مجنونوں) کا ہوا:

(۱) اس چوتھی مشعل یعنی حرص کے ان تینوں پہلوؤں کا پانچویں مشعل **علو الهمة في طلب العلم** (حصولِ علم میں بلند ہمتی) کے ساتھ گہرا ربط ہے، جہاں حرص کے تئیں اسلاف کے متعدد نادر اور قیمتی واقعات موجود ہیں۔

مجـانين إلا أن سِـرَّ جنـونهم ❖ خفيٌّ على أبوابه يسجُد العقل

کہ یہ مجنون ہیں؛ مگر ان کے جنون کا راز چھپا ہوا ہے، ان کے جنون کے آستانے پر عقل بھی آ کر سجدہ کرتی ہے(۱)۔

---

(۱) عقلائے مجانین کے واقعات:

انھی عقلائے مجانین میں: امام ابوالعباس محمد بن یعقوب الأصمؒ (۲۴۷-۳۴۶ھ) بھی ہیں، حافظ ذہبیؒ نے ''سیر اعلام النبلاء'' میں ان کے تذکرے کے اندر حاکمؒ کی ''تاریخ نیساپور'' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: میں ایک روز ابوالعباس اصمؒ سے ملنے کے لیے ان کی مسجد آیا، وہ عصر کی اذان دینے کے لیے مئذنہ میں پہنچے؛ اور بلند آواز سے کہنے لگے: **أخبرنا الربيع بن سليمان، أخبرنا الشافعي** اور ہنس پڑے، لوگ بھی ہنسنے لگے، پھر اذان دی۔

ان ہی ''عقلائے مجانین'' میں: امام حافظ ابوبکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندیؒ (متوفی ۳۱۲ھ) بھی ہیں، خطیب نے تاریخ بغداد (۳۴۵/۴) میں اپنی سند سے بواسطۂ عتیقی ابنِ شاہینؒ سے نقل کیا ہے کہ: باغندیؒ ایک روز نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے، اور تکبیر کے بعد کہنے لگے: **حدثنا لُوين،** ہم نے لقمہ دیا تو ان کو تنبہ ہوا، اور **بسم الله الرحمٰن الرحيم الحمد لله رب العالمين** کہہ کر قراءت شروع کی۔

اس واقعہ کو ابن الجوزیؒ نے بھی عتیقی سے ''**المنتظم**'' (۳۴۵/۱۳) میں نقل کیا ہے، اور ایک دوسری سند سے بواسطۂ ابن المہتدی ابنِ شاہینؒ سے نقل کیا ہے کہ: میں ایک روز باغندیؒ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا، انھوں نے نماز شروع کی، تو کہنے لگے: **حدثنا لوين،** لوگوں نے کہا: **سبحان الله،** تو کہنے لگے: **أنبأنا شيبان بن فروخ الأيلي،** لوگوں نے پھر **سبحان الله** کہا تو کہا: **بسم الله الرحمٰن الرحيم**۔

انھی عقلائے مجانین میں ایک: قاضی ابوجعفر محمد بن احمد بن محمود نسفی حنفیؒ (متوفی ۴۱۴ھ) بھی ہیں، ابن الجوزیؒ نے ''**المنتظم**'' (۱۶۲/۱۵) میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: ابوجعفر کو فقہ میں بڑی مہارت تھی، وہ ایک مسکین اور تارک الدنیا انسان تھے، ایک رات وہ فقر اور تنگدستی کی وجہ سے کرب کی حالت میں رات گزار رہے تھے، اتنے میں ان کے ذہن پر ان کے مسلک کی کوئی فرع کھلی، تو وہ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے، اور کہنے لگے: کہاں ہیں بادشاہ؟ کہاں ہیں شاہزادے؟ بیوی نے آ کر حال دریافت کیا، تو اسے سارا ماجرا سنایا، بیوی کو بڑا تعجب ہوا!!۔ ☞

(۱) وقت کی حرص(۱):

ایک طالبِ علم؛ بلکہ ہر مسلمان کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ وقت کی اس نعمت کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک ایک منٹ جو گزر رہا ہے وہ درحقیقت منٹ نہیں؛ بلکہ خود آدمی کا بعض حصہ جارہا ہے، یہ منٹ پھر لوٹ کر نہیں آئے گا؛ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ان منٹوں کو ایسی چیزوں سے پُر کیا جائے، جو دنیا و آخرت میں کام آسکیں، امام ابن الجوزیؒ کی نظر جب سورۂ ق آیت نمبر ۱۸ میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پڑی: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا؛ مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار رہے) تو انھوں نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرکے فرمایا، جو ان کی مشہور نصیحت کے اندر موجود ہے کہ: بیٹے! تمہارے الفاظ اور تمہاری نظروں کو دو فرشتے محفوظ کررہے ہیں، یاد رکھو! زندہ آدمی کی سانسیں حقیقت میں اس کی موت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم ہیں، جو سانس بھی تمہارے اندر سے نکل رہی ہے،

☜ یہ قاضی ابوجعفر گویا امام محمدؒ کے حال کی عکاسی کررہے تھے، امام محمدؒ سے جب رات میں کوئی پیچیدہ مسئلہ حل ہوجاتا، تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلتا: **أين أبناء الملوك من هذه اللذات؟** شاہزادوں کو ان لذتوں کی کیا خبر!! یہ واقعہ آگے صفحہ ۱۴۴ پر آرہا ہے۔

اس قسم کا جملہ دراصل سب سے پہلے عارف باللہ قدوۃ الانام امام ابراہیم بن ادہمؒ (متوفی ۱۶۱ھ) نے ایک واقعہ میں کہا تھا، جسے ابونعیم نے حلیہ (۷/۳۷۰-۳۷۱) کے اندر ذکر کیا ہے: "**لو يعلم الملوك وأبناء الملوك ما نحن عليه من السرور والنعيم إذاً لجالدونا على ما نحن فيه بالسيوف**" اگر بادشاہ اور ان کے شہزادے اس سرور اور راحت سے واقف ہوجائیں جو ہم غریبوں کو میسر ہے، تو تلواروں کے ذریعہ ہم سے چھیننے کی کوشش کریں۔

(۱) میں معزز قارئین سے کہنا چاہوں گا کہ وہ استاذ محترم سیّدی عبد الفتاح ابوغدہ تغمدہ اللہ برحمتہ کی کتاب "قیمۃ الزمن عند العلماء" کا ضرور مطالعہ کریں، اور بار بار کریں، یہ کتاب ان باتوں پر اُبھارنے میں بہترین مددگار ثابت ہوتی ہے۔

وہ سانس نہیں تمہارا ایک قدم ہے جسے تم اپنی موت کی طرف بڑھا رہے ہو، اور جلد ہی تم اس تک پہنچ جاؤ گے"(۱)۔ ابن الجوزیؒ کی اس نصیحت میں ہر عقلمند کو غور کرنا چاہیے۔

وقت کے تعلق سے دو اہم حدیثیں:

اس سلسلے میں دو حدیثیں قابلِ ذکر ہیں، جن میں سے ایک کا تعلق دنیا سے ہے اور دوسری کا آخرت سے، ان حدیثوں میں علماء اور طلبہ کو بہ نسبت دوسروں کے زیادہ غور وفکر کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

پہلی حدیث: ابنِ ابی شیبہ نے عمرو بن میمون سے مرسلاً اور حاکم نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے موصولاً روایت کیا ہے کہ: پانچ چیزوں کے آنے سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو: موت سے پہلے اپنی زندگی کو، مصروفیت سے پہلے اپنی فراغت کو، فقر سے پہلے اپنی مالداری کو، بڑھاپے سے پہلے اپنی جوانی کو اور بیماری سے پہلے اپنی صحت کو، **صححه الحاكم علىٰ شرط الشيخين ووافقه الذهبي**(۲).

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پانچوں نصیحتوں میں سے ہر ہر نصیحت اتنی اہم ہے کہ وہ اپنے اپنے موقع پر وصیت کرنے والوں کی سب سے قیمتی وصیت اور نصیحت کرنے والوں کی سب سے اہم نصیحت مانی جاتی ہے، اور جب یہ سب اکٹھی زبانِ نبوت سے صادر ہو رہی ہوں تو سوچیے یہ حدیث کس قدر اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے، بلاشبہ یہ نصیحتیں کسی طالبِ علم؛ بلکہ کسی بھی مسلمان کو پیش کیا جانے والا سب سے قیمتی ہدیہ ہیں، **والنصح أعلى ما يباح ويوهب** (نصیحت بیچی جانے والی اور ہبہ کی جانے والی چیزوں میں سب سے قیمتی شے ہے)۔

---

(۱) **لفتة الكبد إلي نصيحة الولد** ص۸

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ(۳۵۴۶۰)بإسناد قوي، حاکم(۷۸۴۶)

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کو اس بات کی نصیحت اور تاکید کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف اپنی زندگی کی نعمت سے ہی فائدہ اُٹھالے، اس سے پہلے کہ موت اچانک اسے آدبوچے، یا صرف اپنی فراغت سے ہی فائدہ اُٹھالے، قبل اس کے کہ مشغولیت اس کے سر پر آن پڑے، یا صرف اپنی مالداری یا جوانی یا صحت سے ہی فائدہ اُٹھالے، قبل اس کے کہ یہ نعمتیں اس سے چھن جائیں، تو اس وقت ایک طالبِ علم؛ بلکہ ہر مسلمان کی ذمہ داری کس قدر بڑھ جائے گی، جب اسے یہ پانچوں کی پانچوں نعمتیں میسر ہو جائیں۔

دوسری حدیث: ترمذی نے ابو برزہ اسلمیؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بندے کے قدم قیامت کے دن اس وقت تک نہیں ہٹیں گے جب تک کہ اس سے یہ سوال نہ کر لیے جائیں کہ: اپنی عمر کن کاموں میں بتائی؟ اپنے علم پر کیا عمل کیا؟ مال کہاں سے کمایا؟ اور کہاں خرچ کیا؟ اور اپنا جسم کن کاموں میں استعمال کیا؟(۱)

جب ہر مسلمان اور ہر طالبِ علم کا یہ حال ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہٹ سکتا، جب تک اس سے دنیا کی بنیادی نعمتوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے کہ: یہ نعمتیں کہاں اور کیسے استعمال کیں؟ اور حساب لینے والا کوئی اور نہیں خود رب العالمین ہوگا، جس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی، تو بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی تیاری میں ہمہ تن لگ جائیں، اور ان سوالوں کے ایسے جواب تیار کر لیں جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو سکیں۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ قیامت کا حساب اجمالی نہیں؛ بلکہ تفصیلی ہوگا؛ اس لیے اپنے احوال اور اپنی آخرت پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اللہ ہم سب کو عافیت عطا کرے(۱)۔

(۲۴۱۷)وقال: حسن صحیح

(۲) عافیت کا مطلب علمائے لغت نے لکھا ہے: **دفاع اللہ عن العبد** اللہ کا بندے سے ہٹانا، اس سے ان کی مراد ہے **دفع اللہ عن العبد المکارہ** اللہ تعالیٰ کا بندے سے ناگوار چیزوں کو ہٹا دینا۔

علمی رسوخ اور بلند علمی مقام کیسے حاصل کریں؟

ہمارے عزیز طلبہ جو نجاح وفلاح کے متمنی، علمی رسوخ پیدا کرنے اور بلند علمی مقام حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں، میں خیر خواہانہ طور پر ان کی رہنمائی کے لیے اس کا راز بتلاتا ہوں کہ: اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں:

(۱) پہلی چیز کا تعلق تم سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ: تم حصولِ علم کے تئیں اپنے اندر بلند ہمتی پیدا کرو، اور زندگی کی گھڑیوں کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرو۔

(۲) اور دوسری چیز کا تعلق انعامات اور بخششوں کے مالک اللہ رب العزت سے ہے، کہ وہ اپنی توفیق تمہارے شاملِ حال کردیں، یاد رکھو اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر اخلاص، سچی طلب اور علم کی تڑپ دیکھی، تو ہرگز وہ تمہیں اپنی توفیق سے محروم نہیں کریں گے۔

یہ دو چیزیں جس کسی میں جمع ہوجائیں وہ ان شاء اللہ ایک نہ ایک دن ضرور عالم ربانی اور مقتدیٰ بنے گا۔

یہ چند معمولی کلمات تمھیں ایک نہیں؛ کئی کتابوں سے بے نیاز کردیں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ (ابراہیم: ۳۴) (کہ اللہ نے تمھیں ہر وہ چیز دی جو تم نے اس سے مانگی) چاہے زبانِ قال سے مانگی ہو یا زبانِ حال سے؛ لہٰذا اللہ پر پورا بھروسہ رکھو وہ تم پر اپنا فضل ضرور فرمائیں گے، اور تمہارا سوال ضرور پورا کریں گے۔

ائمہ واسلاف کے نزدیک وقت کی اہمیت:

اس موقع پر جبکہ وقت کے تئیں حرص کا مضمون چل رہا ہے، ہدایت کے روشن مینار اور فضائل کے مرکز ومنبع علمائے ربانیین کی سیرتوں کے تذکرے نصیحت اور تذکیر کا بہترین ذریعہ ثابت ہوں گے، نہ صرف اس موقع پر؛ بلکہ طالبِ علم اور طالب خیر کی زندگی کے تمام مراحل میں تذکیر اور یاددہانی کا بہترین سرمایہ ہیں۔

ابن الجوزیؒ کا حال:

جن ائمہ کے اندر وقت کو کام میں لانے کی شدید حرص تھی ان میں ایک نمایاں نام امام ابوالفرج ابن الجوزیؒ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں تمھیں اپنا حال بتاتا ہوں، بچپن ہی سے مجھے علم کا بے حد شوق تھا، اور یہ شوق کسی ایک فن کے ساتھ مختص نہیں رہا؛ بلکہ مختلف فنون سے دلچسپی رہی، اس پر مستزاد یہ کہ میری بلند ہمتی کسی بھی فن کو تھوڑا بہت جان لینے پر قانع نہیں ہوتی، جو فن بھی میں پڑھتا ہوں اس کا استیعاب کرنا چاہتا ہوں؛ لیکن افسوس کہ وقت کے اندر اتنی گنجائش نہیں، زمانہ انتہائی تنگ ہے(۱)۔

وقت کو ضائع ہونے سے بچانا:

ابن الجوزیؒ ”صید الخاطر“ میں فکر نمبر ۱۶۳: **دواء البطالین** کے تحت لکھتے ہیں: جب میں نے دیکھا کہ وقت سب سے قیمتی شے ہے، اور اسے خیر کے کاموں میں صَرف کرنا انتہائی ضروری ہے، تو مجھے فضول آنے والے لوگوں سے ملاقات ناگوار محسوس ہونے لگی، اب اگر میں انھیں روکوں تو یہ بھی مناسب نہیں کہ اس سے انس و محبت کا تعلق ختم ہو جائے گا، اور اگر یوں ہی رہنے دوں تو وقت ضائع ہوتا ہے؛ اس لیے میں نے یہ طریقہ اپنایا کہ حتی المقدور ملاقات کو ٹالنے کی کوشش کرتا، اگر ملاقات سے چارہ نہیں ہوتا تو بات نہایت ہی مختصر کرتا؛ تاکہ ملاقات جلد ختم ہو جائے، پھر میں نے ملاقات کے اوقات کے لیے کچھ ایسے کام طے کر لیے جو گفتگو سے مانع نہیں بنتے؛ تاکہ یہ وقت بھی خالی نہ جائے، مثلاً کاغذ کاٹنا، قلم چھیلنا، کاپیاں باندھنا وغیرہ کہ یہ سب کام ضروری ہیں، اور ان میں دماغ لگانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی؛ چنانچہ میں یہ سب کام لوگوں کی ملاقات کے لیے اُٹھا کر رکھ دیتا؛ تاکہ میری زندگی کا کوئی بھی لمحہ ضائع نہ ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں عمر عزیز کے لمحات کی قدر

(۱) صيد الخاطر، خاطرة (۲۱ بين العلم والعمل) ص ۶۲

و قیمت کو سمجھنے اور اس کو کام میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ: میں جان گیا کہ زندگی کی اہمیت اور عافیت کے اوقات کی قدر و قیمت بس وہی شخص سمجھ سکتا ہے، اور وہی اس سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔ ﴿وَ مَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝۳۵﴾ (فصلت) (یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں)۔

طالبِ علمی کے زمانے میں بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ:

یہی وہ بلند ہمتی اور وقت کے تئیں سخت محاسبہ تھا جس کی بدولت امام ابن الجوزیؒ نے چار صدیوں تک اسلامی دارالخلافہ کہے جانے والے شہر بغداد کے بڑے بڑے کتب خانے کھنگال ڈالے، فکر نمبر ۳۲۷: القدماء أصحاب هِمَمٍ عليّة کے تحت لکھتے ہیں: میں اپنا حال بتاتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کبھی سیر نہیں ہوتی، جب بھی میں کوئی نئی کتاب دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے مجھے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو، میں نے مدرسہ نظامیہ میں وقف شدہ کتابوں کی فہرست دیکھی، کل چھ ہزار کتابیں تھیں (میں نے سب کا مطالعہ کر ڈالا) اسی طرح مدرسہ ابوحنیفہ کی کتابیں، حمیدی کی کتابیں، اپنے اساتذہ عبدالوہاب انماطی اور ابنِ ناصر سلامی کی کتابیں اور ابومحمد بن خشاب کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں، یہ کتابیں کئی اونٹوں کے بوجھ کے برابر تھیں، ان کے علاوہ جو کتاب بھی میری دسترس میں آ سکی میں نے اس کو پڑھ ڈالا، اگر میں کہوں کہ: میں نے بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، تو زیادہ محسوس ہوگا، میں تو اب بھی طلب میں ہوں (۱)۔

---

(۱) اس جملے میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ میں اب بھی طالبِ علمی کے مرحلہ میں ہوں، اور دوسرے یہ کہ میری علمی تشنگی اب بھی نہیں بجھی، میں مطالعہ کرنے کے لیے مزید کتابوں کی طلب اور تلاش و جستجو میں ہوں، یہی مفہوم قریب تر ہے۔

عید کے روز مطالعہ:

مغربِ عربی کے مؤرخین میں ایک نام ابوالحسن علی بن موسیٰ بن محمد بن عبدالملک بن سعید (متوفی ۶۸۵ھ) کا ہے، جو ابنِ سعید سے مشہور ہیں، اور **"المُغرِب في حُلَى المَغرِب"** کے مصنف ہیں، وہ اپنے والد کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ: ''میں عید کے روز ان کے پاس گیا تو دیکھا کتابوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، میں نے کہا: ابوجان! آج کے دن بھی آپ آرام نہیں کریں گے؟ انھوں نے غصے سے مجھے دیکھا، اور کہنے لگے کہ: میں نہیں سمجھتا کہ تم کبھی کامیاب ہو پاؤ گے، کیا اس کے علاوہ بھی کسی کام میں راحت و آرام مل سکتا ہے، بخدا! ایسی راحت تو مجھے کسی چیز میں نظر نہیں آتی، میں تو تمنا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری عمر دوگنی کردے، اور میں **"المُغرب"** کو اپنی منشا کے مطابق پورا کرسکوں''[۱]۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، وہ اپنی کتاب پوری نہیں کر پائے، اور ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

واقعی ہمتیں تو ایسی ہوتی ہیں؛ ورنہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔

هم الرجال وعيبٌ أن يقال لمن
لم يتصف بمعاني وصفهم رجل

مرد کہے جانے کے قابل تو یہی لوگ ہیں، اور جو شخص ان جیسی صفات کا حامل نہ ہو اس کو مرد کہنا عیب کی بات ہے۔

امام ابنِ عطاء اللہ اسکندری نے اپنی کتاب **"الحكمة العطائية"** میں سچ لکھا ہے: **"من لم تكن له بداية مُحرِقة لم تكن له نهاية مُشرِقة"** کہ جو ابتدا میں اپنے آپ کو نہیں جلاتا اس کو روشن مستقبل نصیب نہیں ہوتا۔

---

(۱) نفح الطیب ۲: ۳۳۴

ابنِ ابی حاتمؒ کی وقت کی قدر دانی کا واقعہ:

وقت کے تئیں ان ائمہ کی حرص کا ایک نمونہ- جو اگلی بحث "**حرصهم على اغتنام الفائدة**" (علمی فائدہ حاصل کرنے کی حرص) کا بھی ایک نمونہ ہے- وہ ہے جسے امام ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ [1]: احمد بن علی رقّام نے ایک مرتبہ امام ابن امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رازیؒ سے معلوم کیا کہ: انھوں نے اپنے والد سے اتنی ساری حدیثیں اور اتنے سارے مسائل کیسے سن لیے؟ انھوں نے بتایا کہ: بارہا ایسا ہوا کہ میرے والد کھانا کھا رہے ہیں اور میں ان سے پڑھ رہا ہوں، وہ راستہ چل رہے ہیں اور میں ان سے پڑھ رہا ہوں، وہ بیت الخلاء میں داخل ہو رہے ہیں اور میں ان سے پڑھ رہا ہوں، وہ کسی چیز کو تلاش کرنے کے لیے گھر میں داخل ہو رہے ہیں اور میں ان سے پڑھ رہا ہوں [2]۔

نزع کی حالت میں بھی علمی افادہ واستفادہ:

باپ بیٹے کے درمیان وفات سے پہلے تک یہی حال رہا، جیسا کہ خود ابنِ ابی حاتم نے عقبہ بن عبدالغافر اَزْدی کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: میں نے اپنے والد سے نزع کی حالت میں عقبہ بن عبدالغافر کے بارے میں دریافت کیا کہ: کیا انھیں صحبت کا شرف

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۳:۲۵۱

(۲) اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہوسکتا ہے کہ: جب ان کے والد بیت الخلاء کی طرف جاتے تو یہ راستے میں ان سے پڑھتے ہوئے جاتے، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے والد نے مجد ابنِ تیمیہؒ کی طرح معمول بنالیا تھا جو بیت الخلاء جاتے وقت اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے کہہ جاتے تھے کہ: اس کتاب کو بلند آواز سے پڑھتے رہو؛ تاکہ میں سنتا رہوں، جیسا کہ ابنِ رجب کی "**ذيل طبقات الحنابلة** (۴/۵) میں مذکور ہے، دونوں ہی احتمال اس جملہ میں موجود ہیں، واللہ اعلم۔

حافظ ابنِ رجب نے ابنِ تیمیہؒ کے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اس واقعہ سے ابنِ تیمیہؒ کی علمی لگن او وقت کی حفاظت کے تئیں ان کی شدید حرص کا پتہ چلتا ہے۔

حاصل ہے؟ تو انھوں نے فرمایا: نہیں! مسکین کے قول کے مطابق وہ صحابی نہیں ہیں! (۱)،
اللہ اکبر! ایک طرف بیٹے کو دیکھیے وہ اپنے والد بزرگوار سے استفادہ کرنے کے کس قدر حریص ہیں، اگر چہ باپ پر گرانی بھی ہورہی ہے، اور دوسری طرف والد بزرگوار کو دیکھیے کہ ان کے اندر افادہ کی کتنی حرص ہے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی بتانے سے پیچھے نہیں ہٹ رہے ہیں، اور بیٹے کے سوال پر پریشان نہیں ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے اور تمام ہی علمائے اسلام سے راضی ہوں۔

ابو ہلال عسکریؒ نے امام عبقری خلیل بن حامد فراہیدی رحمہا اللہ سے نقل کیا ہے کہ: وہ ساعتیں میرے اوپر بڑی گراں گزرتی ہیں، جن میں میں کھانا کھاتا ہوں (۲)۔

عابد، زاہد، فقیہ داؤد طائیؒ بھی اسی زمانے کے ہیں، ابونعیم لکھتے ہیں کہ: ایک مرتبہ ان کی دایہ نے ان سے کہا کہ: ابوسلیمان! آپ کو روٹی کھانے کی خواہش نہیں ہوتی؟ انھوں نے کہا کہ: دایہ جی! روٹی چبانے اور چورا بھگو کر پینے میں پچیس آیتوں کی تلاوت کا فرق پڑتا ہے (۳)۔

آرام کے وقت کو کام میں لانا:

ابن الجوزیؒ نے ''الفنون'' کے مؤلف ابوالوفاء بن عقیل حنبلیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: میں نے ابنِ عقیل کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ایک تحریر دیکھی ہے، جس میں وہ اپنا حال بیان کرتے ہیں کہ: میں اپنی زندگی کے ایک لمحہ کو ضائع کرنا بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھتا، جب علمی مذاکروں سے میری زبان تھک جاتی ہے، اور مطالعہ کرتے کرتے میری نگاہ جواب دے جاتی ہے، اور میں آرام کی غرض سے لیٹ جاتا ہوں، تو اپنے دماغ کو استعمال

(۱) الجرح والتعدیل ۶ (۱۷۴۲)

(۲) الحث علی طلب العلم ص ۸۷

(۳) حلیۃ الاولیاء ۷: ۳۵۰

کرنے لگتا ہوں، اور مسلسل سوچتا رہتا ہوں، یہاں تک کہ جب میں اُٹھتا ہوں تو میرے ذہن میں لکھنے کے لیے بہت سی باتیں آچکی ہوتی ہیں، آج میں اَسّی (۸۰) کی دہائی میں ہوں؛ لیکن اپنے اندر علم کی حرص اور تڑپ ایسی محسوس کرتا ہوں جو بیس سال کی عمر میں بھی میرے اندر نہیں تھی (۱)۔

وقت کے ضیاع پر ابنِ عقیل کی تنبیہ:

ابن الجوزیؒ نے ہی وزیر بن وزیر ابوشجاع محمد بن حسین اہوازیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: وہ پانی کی پاکی ناپاکی کے سلسلے میں وساوس میں مبتلا تھے، جس پر ابنِ عقیل نے انھیں ایک خط لکھ کر نصیحت کی، اور وقت اور پانی کی نعمتیں ضائع کرنے پر ان کی سرزنش کی، انھوں نے لکھا کہ: فقہاء کا اتفاق ہے کہ عقلاء کے نزدیک سب سے اہم پونجی وقت ہے، یہ ایسی قیمتی شے ہے جسے بچا بچا کر استعمال کرنے کی ضرورت ہے، کام بہت ہیں اور وقت بجلی کی طرح گزر رہا ہے، اور پانی تو ایسی شے ہے جس سے سب سے کم عبادت ہوتی ہے اگر اس پانی کے تعلق سے احتیاط برتنے کے خیالات دل میں آتے ہیں، تو یاد رکھو اس سے وقت کا ایک بڑا حصہ ضائع ہوجائے گا، اور پھر اس کی تلافی اس احتیاط کے عوض ملنے والے ثواب سے ہرگز نہیں ہوسکتی، اور احتیاط بھی کس چیز میں؟ جو اپنی اصل کے اعتبار سے پاک ہے (۲)۔

وقت بچانے کے لیے اسلاف کے حیلے:

حافظ ابنِ رجبؒ نے ان ہی ابنِ عقیل کی ''الفنون'' سے ایک اقتباس نقل کیا ہے، وہ اپنے بارے میں بتاتے ہیں: کہ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ کھانے میں کم سے کم وقت

(۱) المنتظم ۷:۱۸۱

(۲) المنتظم ۱۷:۲۲

لگے؛ اسی لیے میں روٹی کھانے کے بجائے چُورہ پھانک کر اسے پانی سے نگل لیتا ہوں؛ کیونکہ روٹی چبانے میں وقت زیادہ لگتا ہے، جبکہ چُورہ پھانکنے میں مطالعہ کے لیے یا کوئی نیا علمی فائدہ لکھنے کے لیے کافی وقت بچ جاتا ہے(۱)۔

ابنِ ابی اُصَیبِعہ امام فخر الدین رازیؒ سے نقل کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: بخدا! مجھے کھاتے وقت علمی مشغولیت چھوٹنے پر بڑا افسوس ہوتا ہے؛ کیونکہ وقت بڑی قیمتی شے ہے(۲)۔

امام ذہبیؒ؛ امام نوویؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ: ان کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوتا تھا، نہ دن میں نہ رات میں، ہر وقت مشغول رہتے، حتیٰ کہ راستہ چلتے ہوئے بھی، ان کا معمول تھا کہ رات دن میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے اور صرف ایک مرتبہ سحر کے وقت پانی پیتے تھے(۳)۔

قلم بنانے کے وقت کو کام میں لانا:

حافظ ابنِ عساکر امام ابوالفتح سلیم بن ایوب رازیؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ: مجھے ابوالفتح کے بارے میں بتایا گیا کہ: وہ سانسوں کے اعتبار سے اپنا محاسبہ کرتے تھے، ان کا کوئی بھی لمحہ بغیر فائدے کے نہیں گزرتا تھا، یا تو کتاب نقل کر رہے ہوتے، یا پڑھا رہے ہوتے، یا پڑھ رہے ہوتے، وہ کتابیں بہت نقل کرتے تھے، ہمارے شیخ ابوالفرج اسفرائینی بیان کرتے ہیں کہ: ایک دن ابوالفتح اپنے گھر جا کر واپس آئے، اور کہنے لگے: میں نے راستے کے درمیان ایک جزء پڑھ لیا، شیخ نے مؤمل بن حسن کے حوالے سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ: ایک مرتبہ ابوالفتح کی قلم گھس گئی، اور لکھنے کے قابل نہیں رہی، تو مؤمل نے دیکھا کہ ابوالفتح اس کو ٹھیک کرنے اور قط بنانے تک برابر اپنے ہونٹ ہلاتے رہے، بعد

(۱) ذیل طبقات الحنابلة ۱:۳۲۵

(۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء ۲:۳۴

(۳) تذکرۃ الحفاظ ۴:۱۴۷۲

میں پتہ چلا کہ وہ قلم بناتے بناتے قرآن کی تلاوت کررہے تھے؛ تا کہ کوئی وقت بھی خالی نہ جانے پائے[۱] **رحمه الله تعالىٰ رحمةً واسعةً.**

حالتِ طواف میں بھی علمی مشغولیت:

خیر اور افادے کی حرص میں اسی جیسا؛ بلکہ اس سے بھی بڑھا ہوا واقعہ عبداللہ بن مبارکؒ کا ہے، ابنِ ابی العوامؒ نے اپنی سند سے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ: عبداللہ بن مبارکؒ بیت اللہ کا طواف کررہے تھے اور کہہ رہے تھے: "**فلان قوي، وفلان ضعيف**" (فلاں راوی قوی ہے اور فلاں راوی ضعیف ہے)[۲] یعنی طواف کے دوران بھی جرح وتعدیل میں مشغول تھے! گویا ایک وقت میں دو عبادتوں کو جمع کررکھا تھا۔

علمی مذاکرے اور ذکر:

علامہ سخاویؒ نے اپنے استاذ حافظ ابنِ حجرؒ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ: وہ عشاء کے بعد یا کسی اور وقت لوگوں کے ساتھ مذاکرے کے لیے بیٹھتے تو آستین کے اندر ایک تسبیح لے لیتے، جو کسی کو نظر نہیں آتی، اور برابر اس کو پڑھتے رہتے اور ذکر کرتے رہتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ تسبیح ان کی آستین سے گر پڑتی تو طبیعت پر اس کا اثر پڑتا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کو اس کا علم ہو[۳]۔

سو (۱۰۰) روز میں حافظ ابنِ حجرؒ کے کارنامے:

اس سے کچھ اُوپر سخاویؒ نے ذکر کیا ہے[۴] کہ حافظ ابنِ حجرؒ نے دمشق میں ۲۱ر رمضان

(۱) تبيين كذب المفتري ص ۲۶۳

(۱) فضائل أبي حنيفة (۶۱۸)

(۳) الجواہر والدرر ۱: ۱۷۱

(۴) الجواہر والدرر ۱: ۱۶۰

سنہ ۸۰۲ھ سے یکم محرم سنہ ۸۰۳ھ تک کل سو دن قیام کیا تھا، اس عرصے میں انھوں نے جن کتابوں کو پڑھایا سماعت کی، علامہ سخاویؒ نے ان کا تذکرہ کیا ہے، جو تقریباً ۳۰؍ضخیم جلدیں ہوتی ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ: اگر اجزائے حدیثیہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ تقریباً ڈیڑھ سو اجزائے حدیثیہ بنتی ہیں، ان کے علاوہ مستقل اجزائے حدیثیہ بھی کئی ایک پڑھیں جن کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے(۱)۔

مزید لکھتے ہیں کہ: انھوں نے اس عرصے میں اپنے ہاتھ سے اجزائے حدیثیہ اور مختلف فوائد پر مشتمل آٹھ سے زائد جلدیں بھی لکھیں، اور اسی کے ساتھ ضیاء الدین مقدسی کی کتاب **"المختارة"** کی کتاب پر اطراف حدیث کا کام بھی کیا، جو ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے، علامہ سخاویؒ لکھتے ہیں کہ: اگر اس پوری مدت میں صرف یہی ایک کام ہو جاتا تو ان کی جلالتِ شان کے لیے کافی تھا۔

(یہاں حرص کی ایک نوع یعنی وقت کے تئیں حرص کی بحث پوری ہوئی، آگے بقیہ دو چیزوں کی حرص پر گفتگو ہے)۔

(۲) حصولِ علم کی حرص:

(۳) کسی خاص فائدے کو حاصل کرنے کی حرص کہ کہیں چھوٹ نہ جائے:

یہی وہ مضمون ہے جسے امام بخاریؒ نے سمجھانا چاہا ہے، حافظ ابنِ حجرؒ(۲) نے ان کے کاتب محمد بن ابی حاتم الوراق سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: مجھے یہ بات سننے کو ملی کہ امام موصوف نے حافظہ قوی کرنے کے لیے "بلاذر"(۳) پی ہے، میں نے ایک روز موقع

(۱) ذہبی نے سیر میں لکھا ہے کہ ایک جزءِ حدیثی تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔

(۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷-۴۸۸

(۳) بلاذر ایک پھل ہے جس کی شکل پرندے کے دل جیسی ہوتی ہے، سیاہی مائل ☜

دیکھ کر تنہائی میں ان سے دریافت کیا: کیا حافظہ بڑھانے کے لیے کوئی دوا ہے؟ انھوں نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں، پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: میری نظر میں حافظہ کے لیے دو چیزوں سے بہتر کچھ نہیں: ایک علمی پیاس اور دوسرے دائمی نظر و مطالعہ **"لا أعلم شيئا أنفع للحفظ من نَهْمة الرجل ومداومة النظر"**.

امام بخاریؒ نے حافظہ کے لیے دو چیزیں بتائی ہیں: ایک **"نهمة"** اور دوسرے **"مداومة النظر"**، **مداومة النظر** کے بارے میں تو ہم ان شاءاللہ آئندہ گفتگو کریں گے(۱)۔

نَهْمة کی تفصیل یہ ہے کہ **نهمة** کے معنیٰ ہیں: **شدة الحرص على الشيء** کسی چیز کی شدید حرص اور خواہش، اور آپ جانتے ہیں کہ جس کو علم کی حرص اور بھوک لگ جاتی ہے، پھر اسے کبھی سیری نصیب نہیں ہوتی، جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں آیا ہے: **"منهومان لايشبعان: منهوم في علم لايشبع، ومنهوم في دنيا لايشبع"** دو حریص ایسے ہیں جنھیں کبھی سیری حاصل نہیں ہوتی، ایک علم کا حریص اور دوسرے دنیا کا حریص (۲)۔

ابراہیم ہمذانیؒ کی علمی حرص:

علمی پیاس کے حوالے سے اسلاف کے عبرت انگیز واقعات منقول ہیں: امام کبیر

☜ سبز ہوتا ہے، اور اندر خون جیسی کوئی چیز ہوتی ہے، یہ بھول کی بیماری اور حافظے کی کمزوری کو ختم کرنے میں بہت مفید ہے، جیسا کہ ابنِ بیطار کی جامع (۱/ ۱۵۴) اور ملک مظفر ابنِ رسول ۳۱ کی معتمد کے اندر موجود ہے، علماء اسے قوتِ حافظہ بڑھانے کے لیے استعمال کرتے تھے؛ لیکن اس کا زیادہ استعمال مضر ہے؛ فتوح البلدان کے مصنف علامہ بلاذری کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔)

(۱) آٹھویں مشعل میں ص ۱۶۰

(۲) **رواه الحاكم (۳۱۲) وقال: صحيح علي شرطهما ولم أجد له علة،** ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے؛ لیکن اس میں قتادہ کا حضرت انسؓ سے عنعنہ ہے۔

ابراہیم بن حسین بن دیزیل ہمذانی؛ امام بخاری وامام مسلم وغیرہ کے ہم عصر ہیں، حافظ ذہبیؒ ان کے تذکرے کے شروع میں لکھتے ہیں کہ: ان کا لقب "سِیْفَنّة" پڑ گیا تھا، سِیْفَنّة: ایک پرندہ ہے، جو مصر میں پایا جاتا ہے، وہ جس درخت پر بھی بیٹھ جاتا ہے اس کے سارے پتے کھا جاتا ہے، اور اس کو برہنہ کر کے چھوڑتا ہے، یہی حال ابراہیم کا تھا، وہ جس شیخ کے پاس بھی پہنچتے جب تک ان سے ساری حدیثیں نہ لے لیتے، جدا نہ ہوتے (۱)۔

علمی نکتہ سنتے ہی اس کو محفوظ کرنے کی فکر:

امام ابنِ عساکرؒ نے اپنی تاریخ میں (۲) ابوالقاسم ابراہیم بن محمد نصر آبادی کا تذکرہ بھی لکھا ہے، جن کا شمار علمی اسفار کرنے والے ائمہ حدیث اور محقق ائمہ تصوف میں ہوتا ہے، ۳۶۷ھ میں مکہ میں وفات پائی، ابنِ عساکرؒ نے ان کے شاگرد اور سفر حج کے رفیق امام ابوعبدالرحمٰن سلمی سے نقل کیا ہے (۳) کہ: جنگل میں داخل ہونے کے بعد جہاں کہیں بھی ہم پڑاؤ کرتے، تو جب تک پڑاؤ رہتا استاذ برابر دوات، قلم دان اور کاغذ کے ساتھ چمٹے رہتے، میں نے عرض کیا کہ: آپ اس جگہ بھی ان مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، جبکہ لوگ آرام اور تھکن دُور کرنے کی فکر میں ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ: ابوعبدالرحمٰن! بسا اوقات میں شتربان سے یا کسی اور سے کوئی حکمت کی بات سن لیتا ہوں، تو سوچتا ہوں اس کو جلد سے جلد لکھ لوں، کہیں بھول نہ جاؤں۔

کوڑے کھا رہے استاذ سے علمی سوالات:

اس سے بھی قدیم واقعہ کتاب وسنت کے امام قتادہ بن دعامہؒ کا ہے، جو سیّد التابعین

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۳: ۱۸۵

(۲) ۷: ۱۰۳

(۳) ص ۱۰۹

حضرت سعید بن مسیّبؒ کے ساتھ پیش آیا، سعید بن مسیّبؒ کو مدینے کے گورنر عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹوں ولید اور سلیمان کی بیعت سے انکار کی وجہ سے آزمائش میں ڈال رکھا تھا، وہ انھیں دھوپ میں کھڑا کرتا اور اسی حالت میں تقریباً ساٹھ کوڑے لگاتا، قتادہ کہتے ہیں کہ: اسی دوران میں سعید بن مسیّبؒ کے پاس آیا، وہ دھوپ میں کھڑے ہوئے تھے اور بدن پر صرف ایک لنگوٹ تھی، میں نے اپنے رہبر سے کہا (کیونکہ قتادہ نابینا تھے): مجھے ان کے قریب لے چلو، وہ مجھے قریب لے گیا، میں ان کے پاس پہنچ کر ان سے علمی سوالات کرنے لگا، مجھے ڈر تھا کہ شاید پھر پوچھنے کا موقع نہ مل سکے، اور سعید بن مسیّبؒ بھی ثواب کی اُمید میں میرے ہر سوال کا جواب دیتے رہے، اور لوگ ہمیں حیرت سے تکتے رہے (۱)۔

متعدد ائمہ کی علمی لگن کے تذکرے:

عسکریؒ کہتے ہیں: امام النحوفی الکوفہ ثعلب کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب رہتی تھی، جسے وہ پڑھتے رہتے، اگر کوئی ان کی دعوت کرتا تو شرط لگا دیتے کہ انھیں ایک تکیہ کے بقدر جگہ ملنی چاہیے جہاں وہ کتاب رکھ کر پڑھ سکیں، ابوبکر خیاط نحوی (جو تیسری صدی کے اواخر کے ہیں) ہر وقت مطالعہ میں مشغول رہتے، حتی کہ راستہ چلتے ہوئے بھی پڑھتے رہتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مطالعہ کرتے کرتے کسی گڑھے میں جا گرتے یا کوئی چوپایہ لات مار دیتا! ابنِ فرات کا معمول تھا کہ وہ روزانہ صبح میں کچھ نہ کچھ ضرور یاد کرتے، چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، امام ابوحنیفہؒ سے کسی نے حافظہ مضبوط کرنے کا نسخہ دریافت کیا، تو فرمایا: **"البِزر، البِزر"** (چراغ کا تیل! چراغ کا تیل) یعنی علم کے لیے راتوں کو جاگنے سے حافظہ مضبوط ہوتا ہے، سقراط سے کسی نے پوچھا کہ: آپ نے اتنی ساری باتیں کیسے یاد کرلیں؟ انھوں نے فرمایا: میں نے جتنا چراغوں میں تیل ڈالا ہے اتنا تو پانی بھی نہیں پیا!!! (۲)۔

(۱) حلیۃ الاولیاء: ۲: ۱۷۱

(۲) الحث علی طلب العلم ص ۷۷

کنویں کے اندر رہ کر افادہ واستفادہ:

ان سب کے بعد امام شمس الائمہ سرخسیؒ (متوفی سنہ ۴۹۰ھ) کی شخصیت آتی ہیں، ان کے اور ''اوزجند'' کے حاکم کے درمیان کچھ اَن بَن ہوگئی تھی، جس پر حاکم بھڑک اُٹھا، اور انھیں ایک کنویں میں قید کردیا، ان کے تلامذہ کو خدشہ ہوا کہ کہیں وہ اسی اذیت میں انتقال نہ فرما جائیں، تو انھوں نے باہم مشورہ کرکے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم لوگ روزانہ کنویں کی منڈیر پر آکر بیٹھ جایا کریں، اور آپ کنویں کے اندر سے ہی حاکم شہید کی کتاب ''الکافی'' کی شرح کا املاء کرادیا کریں، ''الکافی'' امام محمدؒ کی کتبِ ستہ ظاہر الروایہ کا ملخص مجموعہ ہے، امام سرخسیؒ نے اسے بخوشی قبول کرلیا، اور کنویں کے اندر سے ہی اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المبسوط'' کا املاء کرایا، جو تیس اجزاء پر مشتمل ہے، اس سے فارغ ہوکر اُصولِ فقہ کی ایک کتاب بھی املاء کرائی جو دو جلدوں میں شائع ہوئی، اس کے بعد امام محمدؒ کی ''سیرِ کبیر'' کی ایک مستقل شرح بھی لکھوانی شروع کردی، اور اس کی بھی دو جلدیں لکھوادیں، پھر اللہ تعالیٰ نے رِہائی کی صورت پیدا فرمادی، اور انھوں نے شہر فرغانہ جاکر اپنی اس شرح کو مکمل کیا۔

یہ سارا املاء انھوں نے قوتِ حافظہ کی مدد سے کرایا، کتاب سامنے نہیں ہوتی تھی، اللہ تعالیٰ اس چلتے پھرتے کتب خانے سے راضی ہو(۱)۔

واقعی یہ قید اور یہ اذیتیں نہ استفادہ کرنے والوں کی راہ میں رکاوٹ بن سکیں، اور نہ افادہ کرنے والے کو افادے سے روک سکیں۔

پیچھے امام ابنِ حاتمؒ اور ان کے بیٹے کے واقعہ میں بھی آپ نے اس قسم کی چیز دیکھی تھی(۲)۔

---

(۱) حافظ قرشی کی **الجواهر المضية** ۳:۷۸ وغیرہ میں ان کا ترجمہ دیکھیے۔

(۲) ص ۸۶۔۸۷ پر

سماعتِ حدیث کے حلقے اور علمی حرص کے دلچسپ نمونے:

حال ہی میں محترم ڈاکٹر محمد مطیع اللہ حفظہ اللہ کی ایک کتاب "**في ربوع الشام: دمشق**" منظرعام پر آئی ہے، اس کتاب میں انھوں نے دمشق میں اجزائے حدیثیہ کی سماعتوں کی کچھ جھلکیاں بھی دکھائی ہیں، ان سماعتوں میں کچھ اس طرح کی تصویریں بھی ملتی ہیں کہ[1]:

-ایک استاذِ حدیث کے یہاں وفات سے صرف چار روز پہلے سماعت ہوئی۔

-ایک سماعت کے واقعہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ: ہم اس وقت اپنی سواریوں پر غوطہ دمشق سے نیرب کی طرف تفریح کے لیے جارہے تھے۔

-ایک سماعت کے حلقے میں آٹھ ماہ کے بچے کو اس کی دایہ حدیث پاک سنانے کے لیے لے کر آئی۔

-سنہ ۶۳۵ھ میں دمشق کے نواح میں حدیث کی سماعت ہوئی، جبکہ اس وقت دشمنوں نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا۔

-سنہ ۷۰۵ھ میں "**کسوۃ**" نامی گاؤں میں حاجیوں کے استقبال کے لیے آئے ہوئے لوگوں نے حدیث پاک کی سماعت کی۔

-سنہ ۶۵۲ھ میں دمشق میں درب الفراش والے راستے پر واقع حمام صوفی میں ایک جزء کی سماعت ہوئی۔

-سنہ ۶۴۲ھ میں حج پر آئی ہوئی ایک جماعت نے ایک جزء کی سماعت کی، جن کے ساتھ ایک پانچ سالہ بچی بھی تھی۔

---

(۱) بالترتیب ان متفرق صفحات میں: ۴۷۳، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۸، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۶، ۴۸۸، ۵۱۰، ۵۱۵۔

-سنہ ۷۲۲ھ میں ایک ایسے گھرانے نے حدیث کی سماعت کی، جو ''غوطہ دمشق'' سے ''مقری'' نامی گاؤں تفریح کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ایک تین سالہ بچی بھی تھی۔

-سنہ ۷۰۷ھ میں جیزہ سے قاہرہ کی طرف جاتی ہوئی ایک کشتی میں ایک جزء کی سماعت ہوئی۔

-ایک جماعت کے ساتھ حدیث پاک کی سماعت کے وقت ایک پانچ دن کا بچہ بھی تھا، جسے اس کی ماں لے کر آئی تھی۔

-ایک جماعت کے ساتھ حدیثِ پاک کی سماعت میں امام بِرزالی کی بیٹی فاطمہ بھی تھی، جس کی عمر اس وقت صرف نو مہینے- بلکہ پانچ مہینے-تھی۔

ان سماعتوں میں ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ: اپنے وقت کو علم میں مشغول کرنے کی کس قدر حرص ان حضرات کے اندر ہے، چاہے وہ کوئی خوشگوار وقت ہو، جیسا کہ ایک تفریح گاہ میں سماعت کا واقعہ پیش آیا، یا سخت ناگفتہ بہ حالات ہوں، جیسے دمشق کے اندر محاصرے کے دوران سماعت ہوئی، یا کسی قریبی سفر پر ہوں، جیسے جیزہ سے قاہرہ یا غوطہ دمشق سے نیرب جاتے ہوئے سماعت ہوئی، یا حاجیوں کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے ہوئے ہوں، جیسے کسوہ نامی گاؤں کا واقعہ ہے۔

نیز ان سماعتوں میں ایک چیز اور نظر آتی ہے وہ یہ کہ یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی علمِ دین بالخصوص حدیث پاک کی برکتوں سے مستفید کرنے کے حریص رہتے تھے، کہیں پانچ دن کا، کہیں آٹھ مہینے کا اور کہیں نو مہینے کا بچہ حدیث پاک کی سماعت کر رہا ہے، ان بچوں کو حدیث پاک کی مجلس میں لانے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ بچے بھی اُس علم کی برکتوں سے مستفید ہوں جس علم کی والہانہ محبت و شیفتگی ان کی رَگ رَگ میں سمائی ہوئی تھی، اور اس حاضری کی برکت سے وہ اس پاکیزہ علم کو حاصل کرنے اور اس

کی آبیاری کرنے کے لیے ''**رجال الغد المأمول**'' (مستقبل کی اُمیدوں کے مرکز)(۱) بن کر اُبھریں۔

غرض مصائب اور سختیاں چاہے جس نوع کی بھی ہوں، کسی بھی وقت اہلِ علم کے لیے علمی مشغولیت سے مانع اور رکاوٹ نہ بن سکیں؛ بلکہ علم کے اندر اشتغال ہی ان کے لیے ہر مصیبت سے تسلی کا سامان اور ہر تکلیف کے لیے آرام دہ مرہم ثابت ہوا، پیچھے گزرا کہ امام سرخسیؒ کنویں کے اندر پڑے ہوئے ہیں، سعید بن مسیّبؒ کوڑے کھا رہے ہیں، ابوحاتم رازیؒ جاں کنی کے عالم میں ہیں؛ لیکن انھیں علمی افادے کی دُھن لگی ہوئی ہے(۲)۔

امام الحرمین کے والد امام ابومحمد جوینیؒ قنوتِ فجر میں یہ دعا کیا کرتے تھے: ''**اللّٰهم لاتعقنا عن العلم بعائق ولا تمنعنا بمانع. آمين آمين**'' اے اللہ! کسی رکاوٹ کی وجہ سے ہمیں علم سے محروم نہ کیجیے، نہ کسی مانع کی وجہ سے اس سے دُور کیجیے(۳)۔

---

(۱) حافظ ابراہیم کے دیوان (۲/۷۳) میں ان کے قصیدے ''**تحية العام الهجري ۱۳۲۷**'' کے وہ سات خوبصورت اشعار ضرور پڑھیے، جن میں سے ہر شعر اسی نداء ''**رجال الغد المأمول**'' کے ذریعہ شروع ہوتا ہے، ان میں سب سے آخری شعر یہ ہے:

رجالَ الغد المأمول إن بلادكم ❖ تناشدكم بالله أن تتذكّروا

عليكم حقوق للبلاد أجلُّها ❖ تعهُّد روض العلم فالروض مُقفر

اے وہ لوگو جو کل کی اُمیدوں کے مرکز ہو! تمہارا ملک تم کو قسم دیتا ہے کہ بخدا یاد کرو۔ تمہارے اُوپر تمہارے ملک کے کچھ حقوق ہیں، جن میں سب سے اہم حق علم کے باغیچہ کی رکھوالی ہے، دیکھو یہ باغیچہ ویران ہوا جارہا ہے۔

(۲) ص ۹۳، ۹۴، ۸۷ پر

(۳) طبقاتِ سبکی ۵: ۷۴

موت کی گھڑیوں میں بھی علمی مذاکرے:

امام زفرؒ کا نزع کی حالت میں مذاکرہ:

ابنِ ابی العوامؒ نے امام ابو نعیم فضل بن دکینؒ سے نقل کیا ہے، جو طبقہ اور حجیت دونوں اعتبار سے امام بخاری کے کبار اساتذہ میں ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: امام زفرؒ کی موت کا وقت قریب تھا، میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اس جاں کنی کے عالم میں بھی کہہ رہے ہیں: فلاں حالت میں بیوی کو پورا مہر ملتا ہے، اور فلاں حالت میں دو ثلث ملتا ہے[۱]، یعنی موت کے وقت بھی اپنے آپ سے فقہی مذاکرہ کرنے میں مشغول ہیں۔

امام ابو یوسفؒ کا نزع کی حالت میں مذاکرہ:

اس کے بعد ابنِ ابی العوام نے امام صاحبؒ کے ایک دوسرے شاگرد امام ابو یوسفؒ کا بھی اسی طرح کا واقعہ نقل کیا ہے، وہ اپنی سند سے ابراہیم بن جراح سے نقل کرتے ہیں کہ: امام ابو یوسفؒ مرض الوفات میں مبتلا تھے، میں ان کی عیادت کے لیے پہنچا تو دیکھا ان پر بے ہوشی طاری ہے، جب ہوش آیا تو مجھ سے کہنے لگے: ابراہیم! ایک مسئلہ بتاؤ، میں نے کہا: اس حالت میں بھی! کہنے لگے: کوئی حرج نہیں، ہوسکتا ہے کسی کو اس کی وجہ سے نجات مل جائے، پھر فرمایا: بتاؤ، رمی جمار کے اندر پیدل رمی کرنا افضل ہے یا سوار ہوکر؟ میں نے کہا: پیدل کرنا افضل ہے، کہنے لگے: غلط کہا، میں نے کہا: سوار ہوکر کرنا افضل ہے، کہنے لگے: اب بھی غلط ہے، میں نے کہا: پھر آپ ہی بتا دیجیے، فرمایا: جس رمی کے بعد ٹھہر کر دعا کی جاتی ہے، اس میں پیدل رمی کرنا افضل ہے، اور جس رمی کے بعد دعا نہیں ہوتی اس میں سوار ہوکر رمی کرنا افضل ہے، اس کے بعد میں وہاں سے اُٹھ کر باہر آ گیا، ابھی دروازے تک نہیں پہنچا کہ اندر سے چیخ سنائی دی، اور پتہ چلا کہ امام صاحبؒ کا

---

(۱) فضائل ابی حنیفہ (۶۸۱)

انتقال ہوگیا ہے، رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعةً(۱).

امام محمدؒ کی نزع کے وقت علمی مشغولیت:

زرنوجیؒ "تعلیم المتعلّم" میں لکھتے ہیں کہ: امام محمدؒ کو کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ: نزع کے وقت آپ کی کیا کیفیت تھی؟ فرمایا: میں ایک مکاتب کے مسئلے پر غور کر رہا تھا، اور مجھے روح نکلنے کا پتہ ہی نہیں چلا!(۲)۔

حافظ ابنِ عساکرؒ نے(۳) امام ابومسعود رازیؒ کے تذکرے کے اخیر میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے، جو محمد بن یوسف بنا سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے ابومسعود احمد بن فرات کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، وہ مجھے دیکھ کر کہنے لگے: حدثنا وأخبرنا، میں نے کہا: ابومسعود! آخرت میں بھی حدثنا وأخبرنا، کہنے لگے: ہاں! آخرت میں بھی حدثنا وأخبرنا.

حلب کے دو بڑے علماء کی نزع کے وقت مشغولیت:

میرے آبائی وطن حلب میں دو بڑے عالم گزرے ہیں، جو بلا استثناء میرے حلب کے تمام اساتذہ کے شیخ ہوتے ہیں: ایک علامۂ زماں عالم ربانی پیکر زہد وتقویٰ فقیہ شیخ محمد سعید اِدلبی (۱۲۸۸-۱۳۷۰ھ) اور دوسرے محدث ومؤرخ، حدیث وسنت کے قیمتی ذخیروں کو منظر عام پر لانے والے شیخ علامہ محمد راغب (۱۲۹۳-۱۳۷۰ھ)، عجیب بات ہے کہ دونوں شیوخ کا انتقال ایک ہی سال ہوا، ایک ہی محلّہ میں رہتے تھے اور ایک ہی حالت میں وفات پائی۔

---

(۱)(۷۶۵)

(۲)تعليم المتعلم ص ۸۴

(۳)اپنی تاریخ میں ۵:۵۷

شیخ محمد سعید ادلبیؒ کا واقعہ: شیخ سے کسی نے پوچھا تھا: کہ سکرات الموت کی حالت میں آدمی کو کیا کرنا چاہیے؟ انھوں نے فرمایا: علم میں مشغول رہنا چاہیے؛ یہی حال ان کا ہوا، انھیں مرض الوفات میں جب بھی سکرات الموت سے افاقہ ہوتا، وہ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتے: کتاب دو، چنانچہ جب موت آئی تو اس حال میں کہ ایک کتاب ان کے سینے پر رکھی ہوئی تھی۔

شیخ محمد راغبؒ کی وفات کا واقعہ: شیخ کے پاس ایک شاگرد آیا، شیخ کے اِردگرد ٹیک لگانے کے لیے کئی ایک تکیے رکھے ہوتے تھے؛ تاکہ جس طرف بھی مُڑیں کسی پر ٹیک لگالیں، اس طالبِ علم نے آکر کوئی سوال کیا، انھوں نے کہا: فلاں کتاب اُٹھاؤ، وہ مطلوبہ کتاب اُٹھا کر لایا، شیخ نے ابھی اسے ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ مرض میں شدت محسوس ہوئی، جس پر ان کے بیٹے آگئے، اور شیخ نے طالبِ علم سے معذرت کی، اور جانے کا اشارہ کیا، وہ اُٹھ کر باہر جانے لگا، ابھی دروازے سے آگے بھی نہیں بڑھا تھا کہ شیخ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی، اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت فرمائے۔

پانچویں مشعل

عُلُوُّ الهمّة في طلب العلم

(طلبِ علم میں بلند ہمتی)

همّة (حوصلہ) کی تعریف:

علمائے کرام نے ''ہمت'' کی متعدد تعریفیں کی ہیں؛ جو تقریباً ہم معنیٰ ہیں، اور اختلافِ لفظی کے قبیل سے ہیں، ان میں سب سے اچھی تعریف راقم کے نزدیک وہ ہے جو اُصولِ فقہ کے امام، علم اخلاق کے ماہر، سابق شیخ الازہر محمد الخضر حسینؒ (۱۲۹۳-۱۳۷۷ھ) نے کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: علمائے اخلاق نے اس صفت کی نہایت جامع مانع توضیح کی ہے، اور وہ ہے: "**استصغار ما دون النهاية من معالي الأمور**"[۱] کہ ہمت نام ہے: ہدف تک پہنچنے کے لیے راستے کی تمام بڑی بڑی رکاوٹوں کو معمولی سمجھنے کا۔

قرآن وحدیث میں بلند ہمتی کی ترغیب:

اللہ تعالیٰ نے خیر کے کاموں میں اپنے بندوں کی ہمتوں اور حوصلوں کو اُبھارا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرۃ:۱۴۸) (سوتم نیک کاموں میں ایک

(۱) رسائل الاصلاح ۲: ۲۰۳ یہ کتاب اسم بامسمّٰی ہے جو صحیح علم، صحیح عمل اور درست فکر پر مشتمل ہے۔

دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کرو)، ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ﴾ (الصافات) (ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے) ﴿وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾ (المطففين) (اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنی چاہیے)۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حوصلے بلند رکھنے کی ترغیب دی ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**المؤمن القوي خير من المؤمن الضعيف، وفي كلّ خير، احرص على ما ينفعك، واستعن بالله، ولا تعجز**"[1] طاقت ور مؤمن کمزور مؤمن سے بہتر ہے اور یوں تو ہر مؤمن میں خیر ہے، جو چیزیں تمہارے لیے فائدے مند ہوں ان کے حریص رہو، اس پر اللہ سے مدد مانگو اور پست ہمتی کا شکار مت بنو۔

ایک مؤمن کے لیے علم سے زیادہ فائدہ مند کیا چیز ہوسکتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ پر غور کیجیے: "**احرص**" (حریص رہو) "**استعن**" (مدد حاصل کرو) "**لاتعجز**" (عاجز مت بنو) ان میں کس قدر ہمت اور حوصلہ بڑھانے والے مضامین ہیں، لاکھوں درود وسلام ہوں اس ذات پر جس نے خیر کا کوئی شعبہ ایسا نہیں چھوڑا جس کی طرف ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔

بلندیٔ ہمتی کے حوالے سے زمخشری کے اشعار:

علامہ زمخشریؒ کے اشعار اس سلسلے میں مشہور ہیں، جن کا مطلع ہے:

سهري لتنقيح العلوم ألذُّ لي ❖ من وصل غانية وطيب عناق

مجھے علوم کی تنقیح وتحقیق کے لیے راتوں کو جاگنے میں وہ لذت ملتی ہے، جو پَری پیکر دوشیزہ کے ساتھ ملاقات اور اس سے بوس وکنار میں بھی نہیں ملتی۔

(۱) صحیح مسلم ۴: ۲۰۵۲ (۳۴)

آخر میں کہتے ہیں:

يا من يحاول بالأماني رتبتي ❖ كم بين مستفل وآخر راقي

أأبيت سهران الدجى وتبيته ❖ نوما وتبغي بعد ذاك لحاقي

اے وہ شخص جو محض آرزوؤں کے ذریعے میرے مرتبے تک پہنچنا چاہتا ہے، کم رتبہ اور بلند رتبہ والے آدمی کے درمیان کس قدر فرق ہوتا ہے۔

میں تو رات کی تاریکیاں جاگ کر گزاروں اور تو پڑا سوتا رہے، اور پھر چاہے کہ میرا مرتبہ حاصل کرلے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟(۱)

کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے:

علم ایک مومن کے لیے ایمان کے بعد سب سے عظیم مقصود ہوتا ہے، اور کہاوت ہے کہ: **من يخطب الحسناء يستسهل مهرها**'' (جو کسی خوبصورت دوشیزہ کو پیغامِ نکاح دینا چاہے، وہ مہر کو زیادہ اہمیت نہ دے) اس کہاوت کو نحو کے مشہور امام ابنِ ہشام (متوفی ۷۶۱ھ) نے اپنے اشعار میں بھی استعمال کیا ہے، جنھوں نے صرف ۵۳ کی عمر پائی، اور امامت کا یہ مقام حاصل کیا، وہ کہتے ہیں:

ومن يصطبر للعلم يظفر بنيله ❖ ومن يخطب الحسناء يصبر على البذل

ومن لم يذل النفس في طلب العلا ❖ يسيرا يعش دهرا طويلا أخا ذل

جو علم کے لیے ہر طرح سے صبر کرتا ہے، وہ اس کو حاصل کر کے رہتا ہے، قاعدہ ہے کہ جو خوبصورت عورت کو پیغام دینا چاہتا ہے اسے مہر کی کمی بھی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

جو بلندیوں تک پہنچنے کے لیے چندروز کی ذلتیں برداشت نہیں کرتا، اسے پوری زندگی

(۱) مکمل اشعار نیز زمخشری کی طرف ان کی نسبت کے بارے میں گفتگو ہمارے شیخ کی کتاب **صفحات من صبر العلماء** ص۱۳۹ میں ضرور دیکھیں

ذلت کے ساتھ گزارنی پڑتی ہے[1]۔

"**ومن يصطبر للعلم**" کے الفاظ پر غور کیجیے، اس میں "**يصبر**" سے زیادہ تاکید پائی جاتی ہے؛ قاعدہ ہے: "**زيادة المبنى تدل علىٰ زيادة المعنى**" (حرف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے)۔

طالبِ علم کو اسی طرح ہونا چاہیے، وہ علم کے راستے میں اپنی قیمتی سے قیمتی شے لگادے، اور تمام رُکاوٹوں کا مقابلہ کر کے ان پر غلبہ پانے کی کوشش کرے؛ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اخلاص اور اپنی محنت اور لگن کے بقدر کچھ علم حاصل کر سکے۔

ابو ہلال عسکریؒ کے ولولہ انگیز جملے:

ابو ہلال عسکریؒ[2] کہتے ہیں: عزیز من! اگر تم مخلوق کے درمیان نیک نامی، بلند رتبہ، اور نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتے ہو، اگر تمھیں ایسی عزت وشرافت کی تلاش ہے جس پر زمانہ اثر انداز نہ ہو سکے، اور صدیاں گزرنے پر بھی اس میں کوئی کمی نہ آسکے، اگر تم چاہتے ہو کہ تمھیں بغیر اقتدار کے رعب ودبدبہ، بغیر مال کے مالداری، بغیر ہتھیار کے طاقت وقوت، بغیر خاندان کے معاشرے میں غلبہ، بغیر اُجرت کے نوکر چاکر اور بغیر دیوان اور تنخواہ کے سپاہی مہیا ہو جائیں، تو پھر علم کے حصول میں لگ جاؤ، اور جہاں جہاں سے وہ مل سکتا ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرو، پھر دیکھو کیسے بہترین فوائد حاصل ہوتے ہیں، اور کیسے قابلِ اعتماد اور خالص منافع ہاتھ لگتے ہیں، علم حاصل کرنے کے لیے چند راتیں محنت کر لو، پھر زندگی بھر عزت وشرافت کے مزے لوٹو گے، ساری عمر نیک نامی کے پھل کھاؤ گے، اور مرنے کے بعد بھی اپنے پیچھے اپنا تذکرہ چھوڑ جاؤ گے۔

---

(۱) الدرر الکامنہ ۲:۳۰۹

(۲) اپنے مفید جز **الحث علي طلب العلم والاجتهاد في جمعه** ص ۴۳ میں۔

اس کے بعد ابو ہلال عسکریؒ نے حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کیا ہے: **"قيمة كلّ امرئ ما يُحْسِنه"** (ہر آدمی کی قدر و قیمت کام کو اچھے طریقے سے کرنے میں ہوتی ہے) پھر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر تم اس ارشاد میں غور کرو تو سمجھ میں آجائے گا کہ علم کے لیے کس قدر محنت کرنے اور اپنے آپ کو لگانے کی ضرورت ہے، جب تک اس کی قدرت حاصل ہے، اس میں کسی بھی قسم کی کوتاہی اور سستی مناسب نہیں؛ کیونکہ عقلمند آدمی اپنی قدر و قیمت گھٹانے پر کبھی راضی نہیں ہوتا، اور نہ کسی ایسی چیز کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے جس سے اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہو(۱)۔

علامہ علمویؒ کے ترغیبی جملے:

المعيد في أدب المفيد" میں علامہ علمویؒ طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: طالبِ علم کو چاہیے؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حصولِ علم کے لیے اپنے حوصلے بلند رکھے، زیادہ علم مل سکتا ہو تو تھوڑے پر ہرگز راضی نہ ہو، انبیاء کی اس میراث کو تھوڑا بہت حاصل کرنے پر قناعت نہ کرے، اور کسی بھی ایسے علمی فائدے کو حاصل کرنے میں دیر نہ کرے جو اسی وقت حاصل کر سکتا ہو، اسے کل کی اُمید پر اور لیت ولعل میں پڑ کر ٹال نہ دے؛ کیونکہ تاخیر میں بڑی آفتیں ہیں، پھر یہ کہ اگر وہ تاخیر کیے بغیر اسی وقت اس فائدے کو حاصل کر لے گا تو آنے والے وقت میں اس سے فائدہ اُٹھالے گا، وہ فرصت اور نشاط کے اوقات کو بھی بہت غنیمت جانے، اور بے کاری کے عوارض، ذمہ داریوں کے بوجھ اور اُکتاہٹ کے موانع آنے سے پہلے پہلے خوب مطالعہ کر لے اور خوب استنتاج و استنباط کر لے(۲)۔

یہ بڑی قیمتی نصیحتیں ہیں، ان میں دو جملے بطور خاص قابلِ توجہ ہیں:

(۱) ص ۴۵۔۴۶

(۲) ص ۶۷

انبیاء کی میراث میں تھوڑے پر قناعت مناسب نہیں:

پہلا جملہ: ''انبیاء کی میراث میں سے تھوڑا سا حاصل کرنے پر قناعت نہ کرو'' یہ انتہائی قیمتی اور اہم بات ہے، جو طالبِ علم کو ایک اہم اور قیمتی نکتہ کی طرف متوجہ کر رہی ہے کہ: تم علم نہیں حاصل کر رہے ہو؛ بلکہ میراث میں سے اپنا حصہ لے رہے ہو، کس کی میراث؟ انبیاء ورسل کی میراث! تو سوچو کیا تم جو بھی مل جائے اسی پر قناعت کر لوگے، یا زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کروگے؟ تمہارا حال تو متنبّی کے اس شعر جیسا ہونا چاہیے:

إذا غامرت في شرف مروم ❖ فلا تقنع بما دون النجوم

فطعم الموت في أمر حقير ❖ كطعم الموت في أمر عظيم

جب تم کسی مرتبہ کو حاصل کرنے کے لیے دل وجان سے لگ جاؤ، تو ستاروں سے پہلے کسی بھی چیز پر قناعت نہ کرو۔ کیونکہ کسی معمولی سے کام میں آنے والی موت کا مزہ بھی ویسا ہی ہوتا ہے، جیسا کسی بڑے کام کو انجام دیتے ہوئے آنے والی موت کا ہوتا ہے۔

آج کا کام کل پر مت ٹالو:

دوسرا جملہ: ''کل کی اُمید اور لیت ولعل میں پڑ کر اس فائدے کو ٹال نہ دو'' میں یہاں لیت ولعل سے بچنے کے سلسلے میں اسلاف کے تین آثار ذکر کرنا چاہتا ہوں، جنھیں ابن ابی الدنیا نے (۱) نقل کیا ہے:

پہلا اثر: ابو اسحاق سبیعیؒ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: عبد قیس کے ایک شخص سے کسی نے کہا: کچھ نصیحت کر دو، اس نے کہا: ''**سوف**'' سے بچتے رہنا۔

دوسرا اثر: ابو الجلد جیلان بن فروہ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ: ''**سوف**'' شیطان کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔

---

(۱) اپنی کتاب **قصر الامل** (۲۰۶۔۲۰۸) میں

تیسرا اثر: حضرت انس بن مالکؓ کا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ٹال مٹول ابلیس کے لشکروں میں سے ایک بہت بڑا لشکر ہے، اس کے ذریعہ اس نے بہتوں کو دھوکہ دیا ہے۔

بلا شبہ یہ ایسی خصلت ہے جس سے بچنا ہر ایک کے لیے بالخصوص طالبِ علم کے لیے بے حد ضروری ہے۔

علم تن آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا:

ابونصر یحییٰ بن ابی کثیر یمامیؒ جو بڑے تابعین میں سے ہیں، اور کتبِ ستہ وغیرہ کے مشہور راوی ہیں، ان کا ایک مشہور جملہ ہے، جو پست ہمت اور سست طلبہ کو برانگیختہ کرنے میں بڑا پُراثر ہے، وہ کہتے ہیں: "**لایستطاع العلم براحة الجسد**" (تن آسانی کے ذریعہ علم حاصل نہیں کیا جاسکتا) اس جملہ کے تعلق سے ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے:

امام مسلمؒ کا واقعہ:

امام مسلمؒ نے (۱) مواقیت صلات کے سلسلے میں حضرت ابومسعود بدریؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی متعدد الفاظ سے کل تیرہ (۱۳) شیوخ سے حدیثیں روایت کی ہیں، وہ شیوخ یہ ہیں: قتیبہ بن سعید بغلانیؒ (بغلان بلخ کا ایک گاؤں تھا، جو اب افغانستان میں شامل ہے) یحییٰ بن یحییٰ نیساپوریؒ، ابوبکر بن ابی شیبہ کوفیؒ، عمرو بن محمد ناقد بغدادی رقیؒ (جو شام کے تھے)، حرملہ بن یحییٰ تجیبی مصریؒ، محمد بن عبداللہ بن نمیر کوفیؒ، ابوغسان مسمعیؒ (جن کا نام مالک بن عبدالواحد بصری ہے)، محمد بن مثنیٰ عنزی بصریؒ، عبیداللہ بن معاذ عنبری بصریؒ، زہیر بن حرب نسائیؒ (جو نسا کی طرف منسوب ہے) ثم البغدادیؒ، احمد بن ابراہیم دورقی بغدادیؒ، احمد بن یوسف ازدی نیساپوریؒ۔

ان شیوخ سے روایتیں نقل کرنے کے بعد امام مسلم اپنی سند سے یحییٰ بن ابی کثیر کا

(۱) صحیح مسلم ۱: ۴۲۵-۴۲۷ (۱۶۶-۱۷۴)

مذکورہ بالا جملہ نقل کرتے ہیں: "**لایستطاع العلم براحة الجسد**" (کہ علم تن آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا)۔

یہ بات معلوم ہے کہ صحیح مسلم کی امتیازی خصوصیت صحیح بخاری کے مقابلے میں ایک یہ ہے کہ اس میں مقدمہ کے بعد -بقول ابنِ صلاح کے- احادیث کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، نہ کوئی کلام اور نہ کوئی عنوان، تسلسل کے ساتھ احادیث ذکر کردی گئی ہیں، تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر امام مسلمؒ نے اس مقولے کو یہاں کیوں ذکر کیا؟

قاضی عیاضؒ کہتے ہیں کہ: یہ اشکال بہت سے لوگوں کو ہے کہ امام مسلمؒ نے اس مقولہ کو یہاں کیوں ذکر کیا؟ یہ نہ امام مسلم کا کلام ہے، نہ حدیثِ رسول ہے، نہ ان کی شرط پر ہے، ہمارے بعض شیوخ نے ہمیں اس کی وجہ بتلاتے ہوئے کہا کہ: امام مسلم رحمہ اللہ نے اس باب میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ خود انھیں اچھا لگا، انھوں نے دیکھا کہ ان سندوں کو اکٹھا کرنے کے لیے انھیں کتنی مشقتیں جھیلنی پڑی ہیں؛ چنانچہ انھوں نے درمیان میں اس جملے کو ذکر کردیا؛ تاکہ لوگوں کو بھی اس کا پتہ چلے، اور انھیں معلوم ہو کہ یہ جو کچھ اکٹھا نظر آرہا ہے، اس کے لیے بڑی مشقتیں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں، اور یہ بات واضح ہے، واللہ اعلم بالصواب (۱)۔

یقیناً حدیث کی ان سندوں کو اکٹھا کرنے کے لیے افغانستان سے لے کر نیسا پور، کوفہ، بغداد، رقہ، بصرہ اور مصر جیسے دُور دراز ملکوں کا سفر کرنا اور وہ بھی سفر کے ابتدائی اسباب ووسائل کے ساتھ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے، یہی وہ چیز ہے جس نے امام مسلمؒ کو آمادہ کیا کہ وہ ان روایات کے اخیر میں یحییٰ بن ابی کثیرؒ کا یہ جملہ ذکر کریں: "**لایستطاع العلم براحة الجسد**" کہ علم تن آسانی کے ساتھ نہیں حاصل ہوسکتا، یہ جملہ طالبِ علم کے اس علمی سفر کے لیے بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۱) شرح **إکمال المعلم بفوائد مسلم** ۲: ۵۷۷ اور ان سے نووی نے ۵: ۱۱۳ پر نقل کیا ہے۔

پھر میں نے سیوطی کو دیکھا کہ انھوں نے ''أمالي ثعلب'' سے یحیي بن ابی کثیر کا یہ جملہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے: **"کان یقال: لایدرك العلم براحة الجسد"**(۱) کہا جاتا تھا: کہ علم تن آسانی سے حاصل نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ کبارِ تابعین یا ان سے بھی اوپر کسی سلف کا ہے؛ کیونکہ خود یحیي بن ابی کثیر کی وفات سنہ ۱۳۲ھ میں ہوئی، جو صغار تابعین کا طبقہ ہے۔

ابنِ ابی حاتمؒ کا واقعہ:

اس اہم اور منہجی جملہ کے ساتھ ایک اور واقعہ جُڑا ہوا ہے، جسے امام ذہبیؒ نے امام بن امام عبدالرحمٰن بن ابی حاتم رازیؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ مصر میں سات مہینے رہے، وہاں کبھی شوربہ نہیں کھایا، دن کا سارا وقت ہم نے مختلف شیوخ کے حلقوں کے لیے تقسیم کر رکھا تھا، اور رات میں کتابیں نقل کرتے اور مقارنہ کرتے تھے، ایک روز میں اور میرا ایک ساتھی دونوں ایک شیخ کے پاس گئے، وہاں پتہ چلا کہ شیخ آج بیمار ہیں، ہم واپس ہوگئے، راستے میں ایک اچھی سی مچھلی نظر آئی، ہم نے اسے خرید لیا؛ لیکن جب قیام گاہ پہنچے تو ایک دوسرے شیخ کے حلقے کا وقت ہو چکا تھا، اور اتنا وقت نہیں تھا کہ اس مچھلی کو صاف کر کے پکایا جائے، ہم اسے چھوڑ کر حلقۂ درس میں چلے گئے، اور پھر ایسی مشغولی رہی کہ تین دن یوں ہی گزر گئے، اور ادھر مچھلی میں بھی تغیر آنے لگا تھا، تو ہم نے اسے کچا ہی کھا لیا؛ اتنا موقع بھی نہیں تھا کہ اسے بھنوا لیتے، اس واقعہ کو سنا کر ابنِ ابی حاتمؒ نے یہ جملہ دہرایا: **لایستطاع العلم براحة الجسد** (علم تن آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا)(۱)۔

(۱) ۲:۳۰۲

(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۳:۲۶۶

اس کے ساتھ ابو اسحاق شیرازی کا لوبیا کے سالن والا واقعہ بھی ملا لیجیے، جو آگے صفحہ ۲۵۶ پر آرہا ہے۔)

یحییٰ بن ابی کثیرؒ کا پورا جملہ:

یحییٰ بن ابی کثیرؒ کا پورا جملہ یہ ہے: "**میراث العلم خیر من میراث الذهب، والنفس الصالحة خیر من اللؤلؤ، ولا یستطاع العلم براحة الجسد**" کہ علم کی میراث سونے کی میراث سے بہتر ہے، نفسِ صالحہ موتیوں سے بہتر ہے، اور علم تن آسانی کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا(۱)۔

"**لایستطاع العلم**" کا مطلب یہ ہے کہ جسم کی راحت وخوش حالی، پُرلطف زندگی اور میٹھی نیند کے ساتھ یہ علم انسان کا طوع اور تابع نہیں بن سکتا کہ آدمی جتنا چاہے اس کو حاصل کرلے، اور اس سے احتجاج استدلال کرلے؛ اس کے لیے تو اپنے آپ کو تھکانا پڑتا ہے، مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں، اور گھر بار کو چھوڑ کر پردیس کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

مذکورہ بالا جملہ سے متعلق اسد کا قول:

"**معالم الإیمان في معرفة أهل القیروان**" میں لکھا ہے کہ: اسد کہا کرتے تھے کہ: ہم نے بڑی مشقتوں سے علم حاصل کیا ہے، اونٹوں پر لمبے لمبے سفر کیے، مختلف ملکوں میں مارے مارے پھرے، مختلف علماء کے پاس گئے، تب جاکر یہ مقام حاصل ہوا، اور ان لوگوں نے کچھ بھی نہیں کیا، آرام سے اپنے باپ کے چولہے اور اپنی ماں کی بُنائی مشین کے پیچھے بیٹھ کر علم حاصل کرتے رہے، اور اب چاہ رہے ہیں کہ ہم جیسا مقام حاصل کرلیں!!!(۱)۔

اسد نے بڑا لمبا اور طویل علمی سفر کیا ہے، وہ تونس کے شہر قیروان سے مدینہ منورہ گئے، پھر وہاں سے عراق اور مصر کا طویل سفر کرتے ہوئے واپس اپنے شہر لوٹے، اس دوران انھوں نے حجازی اور عراقی دونوں مکتبۂ فکر کو سمیٹا، اور مغرب لے کر آئے، ان کے سفر کی

---

(۱)تاریخ بغداد ۱۱: ۳۷۵ ترجمة عبد الله بن محمد الرّقاعي

(۲)۱۸:۲ في ترجمة أسد ابن الفرات رحمه الله تعالي

روداد بڑی دلچسپ ہے، ہر طالبِ علم کو سنجیدگی اور تدبر کے ساتھ بڑی کتابوں میں اس سفر کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس میں بڑی عبرت کی چیزیں ملتی ہیں۔

داؤد ظاہریؒ کا قول:

ابن النجار نے ''**ذیل تاریخ بغداد**'' میں ابوبکر محمد بن امام داؤد ظاہریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: جو شخص نہ پردیس کا پانی پیے اور نہ رنج والم کے بازوؤں پر اپنا سر رکھے، وہ اپنے وطن اور اپنی مٹی کے حق کو نہیں جان سکتا، اور نہ اہلِ علم اور مشائخ کے حقوق کو پہچان سکتا ہے[۱]۔

اسلاف کی بلند ہمتی کے واقعات:

عبید بن یعیشؒ کا کھانا کھاتے ہوئے حدیث لکھنا:

خطیبؒ نے عبید بن یعیش کوفی عطار سے نقل کیا ہے، جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے شیوخ میں سے ہیں، اور ثقہ راوی ہیں، وہ اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ: مجھ پر تیس سال ایسے گزرے کہ میں نے رات کا کھانا اپنے ہاتھ سے نہیں کھایا، میں حدیث لکھتا رہتا اور میری بہن مجھے اپنے ہاتھ سے کھلاتی رہتی[۲]۔ یعنی: دن بھر شیوخ کے حلقوں میں انھوں نے جو حدیثیں لکھی ہوتیں انھیں صاف کر رہے ہوتے۔

امام شریف الدین تلمسانیؒ کا حال:

امام شریف الدین تلمسانیؒ (۷۱۰-۷۷۱ھ) کے تذکرے میں ہے[۳] کہ: ایک روز انھوں نے ابوزید بن امامؒ[۴] کے تفسیرِ قرآن کے حلقے میں شرکت کی، شیخ نے جنت کی نعمتوں

(۱) ۱:۲۰۷

(۱) الجامع لاخلاق الراوی (۱۵۹۲)

(۳) **نیل الابتهاج للتُّنبُکتي** ص ۴۳۳

کا تذکرہ کیا، تو شریف نے ان سے پوچھا؛ جو اس وقت بچے ہی تھے: کیا وہاں علم بھی سکھایا جائے گا؟ شیخ نے ایک عمومی جواب دیتے ہوئے فرمایا: **نعم، فيها ما تشتهيه الأنفس وتلذّ الأعين**، وہاں آدمی کو ہر وہ چیز ملے گی، جس کا جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی۔ شریف کہنے لگے: اگر آپ نفی میں جواب دیتے تو میں کہتا کہ: جنت میں پھر کوئی لذت نہیں ہے، شیخ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی اور انھیں پاس بلا کر پیار کیا۔

اس شوقین طالبِ علم نے پھر علم کے حصول کے لیے اَنتھک محنتیں کیں، ایک صاحب کا بیان ہے کہ: مجھے چار مہینے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا؛ لیکن مطالعہ اور بحث و تحقیق میں ان کی مشغولی کا یہ حال تھا کہ اس پورے عرصے کبھی کپڑے اُتارے ہوئے یا عمامہ کھولتے ہوئے نہیں دیکھا، اگر نیند کا غلبہ ہوتا تو یوں ہی تھوڑی دیر سو لیتے، پھر جیسے ہی آنکھ کھلتی اُٹھ جاتے، اور کہتے کہ: نفس کا حق ادا ہو گیا، پھر وضو کرتے، جو ان کے لیے بہت آسان سی چیز تھی، اور دوبارہ مطالعہ میں لگ جاتے، یہی وجہ ہے کہ صرف گیارہ سال کی عمر میں ہی مسندِ تدریس سنبھال لی تھی۔

اور ایک روز وہ بھی آیا جب یہی بچہ اپنے استاذ کے ساتھ ایک دوسرے رنگ میں نظر آیا، تنبکتی کہتے ہیں کہ: ایک روز ابو زید بن امامؒ کے ساتھ کسی مسئلہ میں ان کی بحث ہو گئی، دونوں دیر تک اپنے اپنے دلائل دیتے رہے، آخر کار شاگرد استاذ پر غالب آ گیا، اور استاذ نے یہ شعر پڑھا:

أعلّمه الرماية كل يوم ❖ فلما استدّ ساعده رماني

میں اس کو برابر تیر اندازی سکھاتا رہا، اور جب اس کا نشانہ درست ہو گیا تو اس نے مجھی پر تیر چلا دیا[1]۔

---

(۴) یہ ابو زید عبد الرحمٰن محمد تلمسانیؒ (موفی ۷۴۳ھ) ہیں، ائمۂ مالکیہ میں شمار ہوتے ہیں، ابنِ فرحون نے "الدیباج المذہب (۱/۴۱۶) میں انھیں **الإمام العلامة الأوحد** کے اوصاف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔)

(۱) نیل الابتہاج ص ۴۳۵

اس کا دوسرا شعر یہ ہے:

وکم علّمتُه نظم القوافي ❖ فلما قال قافية هجاني

میں نے اس کو کس قدر محنت کے ساتھ شاعری سکھائی؛ لیکن جب اس نے شعر کہنا شروع کیا تو میری ہی ہجو کر ڈالی۔

امام موصوف کا تذکرہ بیش بہا موتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے، جو ان کی اسی بلند حوصلگی اور علم وفن سے بے پناہ عشق ووارفتگی کا ثمرہ تھا، یہاں تک کہ لوگوں نے انھیں درجۂ اجتہاد کا حامل بھی مانا ہے، ہم سب کو ان کے تذکرے کا سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

بڑھاپے میں فنِ عروض سیکھنا:

حصولِ علم میں بلند ہمتی کا ایک واقعہ علامہ خضر الحسینؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے کہ: ابو صالح ایوب بن سلیمان نے ایک مرتبہ عروض کی ایک کتاب لی، اور یک جُٹ ہو کر اس میں لگ گئے، اور اسے پورا حفظ کر ڈالا، لوگوں نے پوچھا کہ: بڑھاپے میں اس علم پر توجہ دینے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ فرمایا کہ: ایک جگہ میں کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا، وہ لوگ فن عروض کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے، اس وقت مجھے بڑی ذلت محسوس ہوئی کہ علم کا ایک باب ایسا بھی ہے جس کے بارے میں گفتگو نہیں کر سکتا، اور میں نے اس فن کو حاصل کرنے کی ٹھان لی[1]۔

---

(۱) "**رسائل الإصلاح**" (۱/۹۹) میں "**كبر الهمة في العلم**" کے اندر یہ واقعہ موجود ہے، یہ ایوب بن سلیمان معافری ہیں، جو تیسری صدی کے علمائے مالکیہ میں ہیں، ان کی وفات چوتھی صدی کے اوائل سنہ ۳۰۱ھ یا ۳۰۲ھ میں ہوئی، ان کا تذکرہ متعدد کتابوں میں موجود ہے؛ مگر تلاش کے باوجود مجھے یہ واقعہ نہیں مل سکا؛ لیکن شیخ معتبر آدمی ہیں۔

ایک مجلس میں فن عروض سیکھنا:

ایک واقعہ سخاویؒ نے اپنے شیخ حافظ ابنِ حجرؒ کا نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے شروع میں فن عروض پڑھے بغیر ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا، میرے اشعار دیکھ کر ایک شخص میرے پاس آیا اور درخواست کی کہ: میں اسے فن عروض کا کوئی سریع الماخذ مقدمہ پڑھا دوں، میں نے ہاں کر دی، اور دن بھی متعین کر دیا؛ لیکن آتا کچھ نہیں تھا، اسی وقت جی مسجد عمرو بن العاص سے قاہرہ جی الازہر گیا، اور اپنے ساتھی بدر بشتکی سے ملاقات کی اور کہا کہ: مجھے فن عروض کا کوئی آسان سا مقدمہ بتائیے، انھوں نے ایک مقدمہ کی طرف رہنمائی کی، میں نے ان سے وہ مقدمہ لیا، اور اسی وقت ایک نشست میں جتنا ہو سکا ان سے پڑھ لیا، مقدمہ تو ناقص ہی پڑھا؛ البتہ فن کی مکمل واقفیت حاصل کر لی، اور واپس آکر بحمد اللہ اس شخص کو پورا مقدمہ پڑھا دیا، پھر بقیہ مقدمہ مجھے پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی (1)۔

سخاویؒ کہتے ہیں کہ: انھوں نے ہر علم کے اندر خواہ منقولات کا علم ہو یا معقولات کا، بلند حوصلے اور صحیح اور روشن فکر کے ساتھ خوب محنت کی، اور بلندیوں کے آسمان تک پہنچے، بے پناہ ذہانت اور علوم پر کامل دسترس کی وجہ سے ان کی بات ہر جماعت سے تعلق رکھنے والے علماء کے یہاں مقبول ہونے لگی، اور حرفِ آخر سمجھی جانے لگی، اور وہ اس شعر کا مصداق بن گئے:

وكان من العلوم بحيث يُقضى ❖ لـه فـي كـل علـم بـالجميع

علوم کے اندر ان کا یہ حال ہے کہ ان کے نصیب میں ہر علم پورا کا پورا لکھ دیا گیا ہے۔

بارش میں سبق پڑھنا:

سبکیؒ کی ''طبقاتِ شافعیہ'' کے حاشیہ میں ہے (2) کہ: خسرو شاہی، امام فخر رازی کی

(1) الجواہر والدرر 1: 139

عظمت اور جلالتِ شان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: امام اور ان کے شاگردوں نے ایک روز صبح کی تو دن انتہائی سفید اور برف سے بھرا ہوا تھا، بارش کے یاسمین رات سے ہی زمین پر بکھر رہے تھے، برف نے ہر قسم کی چہل پہل کو روک رکھا تھا، اور کیوں نہ روکتا وہ جو کافور ٹھہرا، بادلوں کی داد ودہش پورے شہر میں جاری تھی، جو معمولی زمینوں سے لے کر فصیل کی بلندیوں تک سب کو یکساں سیراب کر رہی تھی؛ اتنی شدید بارش میں بھی ان جیالوں کے حوصلوں کی آگ نہ بجھ سکی، اور ان کے کان امام کی افادات سننے کے لیے پست ہمت نہ ہو سکے، اگرچہ پانی کی کثرت کی وجہ سے زمین تیر رہی تھی، اور آسمان کے بادل دیواروں تک پہنچے ہوئے تھے، ان کے بلند حوصلے اِس بات پر راضی نہ ہوئے کہ امام کے علمی افادات بے کار ہوں، اگرچہ ان کے حواسِ خمسہ بے کار اور شَل ہو جائیں، ان کے دلوں نے گوارا نہ کیا کہ آج وہ امام کے علمی فیض سے غائب رہیں، اگرچہ سورج بادلوں کے پیچھے غائب ہو چکا ہے۔

چنانچہ وہ سب کے سب امام کے روشن دان کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے، اور بارش کے پانی سے بچنے کے لیے اپنے سروں پر چادر تان لی، اور ''محصول''(۱) کتاب کھول کر یکے بعد دیگرے پڑھنے لگے؛ لیکن امام بھی روشن دان سے اپنا سر قریب نہیں کرتے تھے، کسی کا پڑھنا پسند آ جاتا تو قریب ہو جاتے، یہی حال رہا، امام کسی کا جواب دیتے اور کوئی آخر تک یوں ہی

☜ (۲) ۸: ۱۶۲ یہ ''طبقاتِ شافعیہ'' میں عبدالحمید بن عیسی خسروشاہیؒ (متوفی سنہ ۶۵۲ھ) کے ترجمہ میں اضافہ ہے، جو امام فخر رازیؒ کے تلامذہ میں سے تھے، اور ان ہی کی طرح، ان ہی کے نہج پر علمِ عقائد اور علمِ کلام کے عالم تھے، یہ اضافہ سبکیؒ کی ہی ایک دوسری کتاب ''الطبقات الوسطی'' میں موجود ان کے تذکرے سے ماخوذ ہے۔

(۱) یہ کتاب خود امام فخر رازیؒ کی ہے جو شافعیہ کے یہاں متکلمین کے طریقہ پر اُصولِ فقہ کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

پڑھتا رہتا اور امام اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ،صرف اس لیے کہ آداب کی مشق ہو،علم کی قدر ومنزلت سمجھ میں آئے، اور یہ پتہ چلے کہ علم باعزت ہی ہے، اگرچہ کوئی باہمت شخص بڑے بڑے خطرات مول لے،اور یہ سمجھنے لگے کہ اس کے حوصلے آسمان کو چھو رہے ہیں (۱)۔

ایک اچھے جملہ کا اثر افراد سازی میں:

حصولِ علم کے لیے بلند ہمتی کا یہ موضوع طویل گفتگو کا متقاضی ہے، جو اس کتاب کی ایک فصل میں نہیں سما سکتا؛ لیکن پھر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن ہمتوں اور حوصلوں کی کچھ جھلکیاں ضرور دکھادی جائیں، جنھوں نے دنیا کے سامنے محیر العقول کارنامے پیش کیے، اور جن کی بدولت ایسے عجیب وغریب واقعات ظہور پذیر ہوئے جنھیں کرامت اور خرقِ عادت ہی کہا جاسکتا ہے؛ لیکن میں زیادہ دُور تک نہیں جاؤں گا۔

میں سب سے پہلے قارئین سے یہاں نوجوان سند بن علی کا واقعہ پڑھنے کی درخواست کرتا ہوں جو آگے آرہا ہے، اس کے بعد کچھ واقعات ذکر کرتا ہوں (۲)۔

قفال کی بلند ہمتی اور ایک جملہ کا اثر:

ابوبکر عبداللہ بن احمد مروزی قفال صغیر شوافع کے چوٹی کے علماء میں ہیں، سنہ ۴۱۷ھ میں نوے سال کی عمر میں وفات پائی، معجم البلدان میں ان کا واقعہ مذکور ہے، جسے میں یہاں مکمل نقل کرتا ہوں:

یاقوت حمویؒ لکھتے ہیں کہ: اسی مروشاہجہان (۳) کی طرف عبداللہ بن احمد بن عبداللہ

(۱) اس واقعہ کو علموی نے المعید ص ۱۴۱ میں نقل کیا ہے۔

(۲) ص ۱۴۹، اس واقعہ کا ذکر وہیں زیادہ مناسب ہے

(۳) رسم (مرو الشاهِجان)، ان کے ترجمے میں ابن صلاح -نووی اور مزی- کے یہاں طبقات الشافعیہ ۱:۴۹۶ اور طبقات سبکی ۵: ۵۳ کے اندر اس واقعہ کی طرف اشارے موجود ہیں۔

ابو بکر قفال مروزیؒ منسوب ہیں، جو اپنے زمانے میں علم اور فقہ میں یکتائے روزگار تھے، انھوں نے علمی اسفار کیے، کتابیں لکھیں اور ان کے علم کی برکتیں ہر طرف پھیلیں، وہ مسلکِ شافعی کے بنیادی ارکان میں سے تھے، ایک جمِ غفیر نے ان کے پاس فراغت حاصل کی، اور ان کا علم چہار دانگِ عالم میں پھیلا۔

وہ حصولِ علم اور حصولِ فقہ کے اندر کافی عمر گزرنے کے بعد لگے، جس کا واقعہ مرو کے گاؤں ''قنین'' کے بعض فقہاء نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ: قفال شاشی نامی ایک شخص نے ایک تالا اور ایک چابی بنائی، جس کا وزن ایک دانق تھا (یہ قفال کوئی اور ہے، امام موصوف اس سے مراد نہیں ہیں) دانق کا وزن درہم کے چھٹے حصے کے برابر ہوتا ہے، لوگوں کو اس سے بڑی حیرت ہوئی، اور وہ تالا کافی مشہور ہوا، ابو بکر قفال کے کانوں تک بھی یہ خبر پہنچی، انھوں نے بھی ایک تالا اور ایک چابی بنا ڈالی، جس کا وزن صرف ایک طَسّوج یعنی دانق کے بھی چوتھائی وزن کے برابر تھا!![1] لوگوں کو دکھلایا تو لوگوں نے اسے پسند کیا؛ لیکن یہ تالا مشہور نہ ہوسکا، قفال ایک روز اپنے متعلقین میں کسی ہمدرد سے کہنے لگے: دیکھ رہے ہو! ہر چیز میں قسمت کا دخل ہوتا ہے، شاشی نے ایک قفل بنایا جس کا وزن ایک دانق تھا، اور ملک بھر میں اس کا چرچا ہوا، اور میں نے ایک قفل بنایا جو دانق کے بھی چوتھائی وزن کے برابر تھا؛ لیکن مجھے کوئی شہرت نہ مل سکی اور میرا کوئی تذکرہ نہیں، وہ شخص کہنے لگا: ابو بکر! تذکرہ تالوں کی وجہ سے کہاں ہوتا ہے، تذکرہ تو علم کی وجہ سے ہوتا ہے **(إنما الذكر بالعلم لا بالأقفال).**

(۱) پڑھیے اور غور کیجیے کہ مسلمان دستکاری کی مہارت میں کس حد تک پہنچے ہوئے تھے، اور کیسی مہارت انھیں حاصل تھی؟ یہ آج سے تقریباً دس صدی پہلے کی بات ہے، آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس کاری گر سے یہ کیسے ممکن ہوا کہ انھوں نے لوہے کے انتہائی باریک باریک ٹکڑے اپنے ان ہاتھوں میں پکڑے، انھیں جوڑا اور اتنا ہلکا اور اتنے معمولی وزن کا تالا اور چابی بنا ڈالی۔ ☜

یہ بات شیخ کے دل کولگ گئی اور وہ حصولِ علم میں مشغول ہوگئے، اس وقت ان کی عمر چالیس سال ہوچکی تھی، وہ مرو کے اندر ایک شیخ کے پاس گئے اور ان سے پڑھنے کی خواہش

میں آپ کے سامنے اس سے بھی زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز واقعہ بیان کرتا ہو:

دست کاری میں علماء کی مہارت کا ایک ناقابلِ یقین واقعہ:

میں حلب میں ثانویہ شرعیہ کے اندر مرحلہ ثانویہ کے دوسرے سال میں تھا (اللہ تعالیٰ حلب کی اور تمام ہی بلادِ اسلامیہ کی ان فتنوں سے حفاظت فرمائے) فقہ حنفی میں ہمارے استاذ شیخ محمد سلقینیؒ تھے، وہ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے، یہ ان کی وقت کی ہی پابندی تھی کہ وہ طلبہ سے پہلے درسگاہ میں موجود ہوتے تھے، ایک روز ایسا ہوا کہ شیخ درسگاہ نہیں پہنچے، ہم کھڑے ان کا انتظار کرتے رہے، چند منٹ کے بعد ہم نے دیکھا کہ شیخ اساتذہ کے کمرے کی طرف سے آرہے ہیں، اور تاخیر کی تلافی کے لیے بہت تیزی سے آرہے ہیں، درسگاہ پہنچ کر شیخ نے اپنی تاخیر پر معذرت کرتے ہوئے فرمایا:

آج مدرسے میں ایک مہمان آگئے تھے، ہم ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، کہ اتنے میں ان کی نظر شیخ عبدالرحمٰن زین العابدینؒ پر پڑی، جو مرحلہ اعدادیہ کے طلبہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے، وہ ہم سے پوچھنے لگے: یہ شیخ یہاں کیا کررہے ہیں؟ ہم نے کہا: نحو پڑھا رہے ہیں، یہ چیز انھیں اچھی نہیں لگی اور انھیں بڑا قلق ہوا، کہنے لگے: کیا آپ اسے حرام نہیں سمجھتے کہ ایک شخص جو محیر العقول کارنامے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو یہاں پڑا ہوا "ضرب زید عمرًوا" پڑھا رہا ہے،!! ہم نے کہا کہ: آپ نے صحیح فرمایا، یقیناً شیخ کو کئی چیزوں میں مہارت ہے؛ مگر ایسا کیا ہے جسے آپ محیر العقول کہہ رہے ہیں؟ کہنے لگے: یہ انسان تو سوئی جیسی باریک چیز کے اندر لمبائی میں سوراخ کردیتا ہے!! یہ کہہ کر ہمارے استاذ سبق پڑھانے میں لگ گئے۔

چند روز کے بعد میں خود شیخ عبدالرحمٰن زین العابدینؒ کے پاس عشاء کے بعد پہنچا، شیخ کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد آنے والوں سے ملاقات کیا کرتے تھے، کبھی کوئی طالبِ علم آجاتا، کبھی شیخ کا ہی کوئی ساتھی آجاتا، کبھی کوئی اور اجنبی شخص جس نے شیخ کی عبقریت کے بارے میں سن رکھا ہو اور شیخ سے آشنائی چاہتا ہو آکر شرفِ ملاقات کرلیتا۔

میں شیخ کے پاس پہنچا تو شیخ نے خود ہی اپنا واقعہ سنانا شروع کردیا، کہنے لگے:

میں ایک مرتبہ ایک جریدے میں خبر پڑھ رہا تھا کہ دو آدمیوں کے درمیان مقابلہ ہوا،

ظاہر کی، انھوں نے مزنی کی کتاب لے کر شروع کا ایک جملہ "**هٰذا كتاب اختصرته**" انھیں تلقین کرایا، وہ چھت پر گئے، اور عشاء سے لے کر فجر تک اس جملہ کو دہراتے رہے؛ لیکن اتفاق سے فجر کے وقت ان کی آنکھ لگ گئی، اور جب بیدار ہوئے تو بھول گئے کہ کیا یاد کر رہے تھے، بڑے پریشان ہوئے، اور کہنے لگے کہ: میں شیخ سے کیا کہوں گا؟ اسی حال میں گھر سے نکل گئے۔

جن میں ایک امریکی تھا اور دوسرا جاپانی، ان میں سے کسی نے کہا (مجھے یاد نہیں کہ وہ امریکی تھا یا جاپانی) کہ: وہ سوئی کو لمبائی میں سوراخ کر سکتا ہے، تو دوسرے نے کہا کہ: جس ریشہ سے تم سوئی میں سوراخ کرو گے میں اُس ریشہ میں بھی سوراخ کر سکتا ہوں۔

شیخ کہنے لگے کہ: میں نے یہ خبر اپنے ایک مہمان کو پڑھ کر سنائی، جو اس وقت میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے کہا کہ: اگر میں وہاں موجود ہوتا تو اس دوسرے شخص کے ریشہ میں بھی سوراخ کر دیتا، یہ سن کر وہ مہمان ہکا بکا رہ گیا، اور کہنے لگا: شیخ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے کہا: تمھیں یقین نہیں آرہا ہے؟ لاؤ ہاتھ دو، میں اس کا ہاتھ پکڑ کر "غرفة المعمل" (لیبارٹری) میں لے گیا- شیخ نے یہی لفظ غرفة المعمل استعمال کیا تھا، مراد وہ مخصوص کمرہ تھا جس میں صنعت، میکینک، نئی نئی ایجادات کے آلات اور ہر قسم کی چیز رکھی ہوتی تھی- شیخ کہتے ہیں: میں ایک سوئی لایا، اور اس میں سوراخ کرنے کے لیے لوہے کا ایک ریشہ بنایا، پھر میں نے ایک دوسرا ریشہ بنایا، اور اس کے ذریعہ پہلے ریشہ میں سوراخ کیا، پھر ایک تیسرا ریشہ بنایا اور اس سے دوسرے ریشہ میں بھی سوراخ کر دیا!!۔

یہ دیکھ کر وہ شخص اُلٹے پاؤں واپس ہو گیا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اگلے روز اس نے جس سے بھی ملاقات کی ہوگی، یقیناً اس سے یہی بات کی ہوگی، شیخ کہتے ہیں: دوسرے روز ٹھیک اسی وقت دروازہ پر دستک ہوئی، میں نے دروازہ کھولا تو دیکھا وہی شخص سامنے کھڑا ہے، اور ساتھ میں ایک آدمی اور بھی ہے، وہ مجھے دیکھ کر بڑی لجاجت اور فریاد بھرے انداز میں کہنے لگا: استاذ! استاذ! مجھے آپ سے اُمید ہے، مجھے آپ سے اُمید ہے، اللہ کے لیے، اللہ کے لیے، میں نے کہا: خیریت تو ہے، کیا بات ہوگئی؟ کہنے لگا: وہی کام جو کل آپ نے کیا تھا، اسے دوبارہ کر کے دکھا دیجیے! میری اس شخص سے سو شامی لیروں کی شرط لگی ہوئی ہے (جو آج کے دَور میں ایک لاکھ شامی لیرے کے برابر ہوتے ہیں)۔

باہر نکلے تو پڑوس کی ایک عورت کہنے لگی: ابوبکر! تم نے رات بھر ''**هٰذا كتاب اختصرته**'' کی رَٹ لگا لگا کر ہمیں سونے نہیں دیا! یہ سنتے ہی شیخ کو وہ جملہ یاد آ گیا، اور اس عورت سے اس کو یاد کرلیا[1]، اور اپنے استاذ کے پاس پہنچ کر سارا ماجرا سنایا، ان کے استاذ کہنے لگے: گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تم پیچھے مت ہٹو، اگر تم برابر یاد کرتے رہو گے اور اسی طرح لگے رہو گے تو تمھیں اس کی عادت پڑ جائے گی؛ چنانچہ شیخ محنت میں لگ گئے، اور علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، پھر جو کارنامے انجام دیے وہ ساری دنیا نے دیکھے، انھوں نے کل اَسّی (۸۰) سال کی عمر پائی، چالیس سال جہالت میں گزاری اور چالیس سال علم کے اندر[2]۔

یاقوت حموی نے اس کو نقل کرنے کے بعد سمعانی کے حوالے سے وضاحت کی ہے کہ ان کی عمر اَسّی سال نہیں؛ بلکہ نوّے (۹۰) سال ہوئی، اور سنہ ۴۱۷ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

اس واقعہ میں جہاں ایک طرف ایک ایسے شخص کی طرف سے بلند ہمتی کی داستان ہے، جس کی عمر چالیس سال کی ہوچکی ہے، اور ایک عام آدمی ہونے اور عربی زبان سے ناواقف

☜ شیخ کہتے ہیں کہ: میں دوبارہ ان دونوں کو لے کر لیبارٹری میں گیا اور وہ پوری کارروائی کر کے دکھائی۔ یہ واقعہ شیخ نے آج سے باون (۵۲) سال پہلے سنایا تھا، انھیں علومِ عقلیہ، نحو، صرف، تیراندازی اور متعدد صنعتوں میں عبقریت کا مقام حاصل تھا۔

ان کی ولادت سنہ ۱۳۲۶ھ میں ہوئی اور سنہ ۱۴۱۱ھ میں وفات پائی؛ لیکن افسوس کہ اپنے بعد اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑا، نہ انسان کی شکل میں نہ کتاب کی شکل میں۔

(۱) ''**الجواهر المضيئة**'' ۲/۱۷/۳ میں اس عورت کا واقعہ بھی پڑھیے جو امام عبداللہ دامغانی حنفی کو ابتدائے طالبِ علمی میں ان کی غلطی کی تصحیح کراتی تھی، یہ واقعہ بھی بڑا پر لطف ہے۔

(۲) شاید اسی کی طرف فاضل علمویؒ نے اپنی کتاب ''المعید'' میں اشارہ کیا ہے کہ: قفال کی داستان اور بڑی عمر میں ان کے علم میں مشغول ہونے کا واقعہ مشہور و معروف ہے، اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے۔

ہونے کی وجہ سے وہ ضمیر غائب اور ضمیر متکلم یعنی **اختصرتُ** اور **اختصرتَ** کا فرق بھی نہیں جانتا[۱]؛ لیکن اپنے حوصلے اور اپنی بلند ہمتی کی وجہ سے ایسا امام بنتا ہے کہ دنیا اسے رشک بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔

دوسری طرف اس واقعہ میں ان کے ہمدرد دوست اور استاذ دونوں کی طرف سے ایک خاموش پیغام، اور ایک اہم ادب کی طرف توجہ بھی دلائی گئی ہے؛ ان دونوں نے ہی ایک خوبصورت سا جملہ کہا، جو حقیقت میں ایک پُراُمید اور روشن مستقبل کا خواب دیکھنے والے دل سے نکلا تھا، جس دل کے اندر حوصلہ شکنی اور مایوس کرنے کا مرض نہیں تھا، اس جملے کے ذریعہ انھوں نے ایک طرف ان کی توجہ ایسی چیز کی طرف مبذول کی جس میں ان کا تذکرہ ان کی نیک نامی اور اچھا انجام مضمر تھا، اور دوسری طرف مسلسل محنت اور علم میں اشتغال کی ترغیب دے کر ان کے دل سے مایوسی کے بادل ہٹائے، جس کے نتیجہ میں وہ ایسے امام بنے کہ کہنے والے کہنے لگے: "**إنه أحد مفاخر خراسان**" وہ خراسان کی ایک قابلِ فخر اور مایہ ناز شخصیت ہیں، کسی نے کہا: وہ اپنے زمانہ میں فقہ، حافظہ اور زہد و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے، کسی نے کہا: ان کے ہاتھ پر بے شمار لوگوں نے فراغت حاصل کی جو اپنے وقت کے امام بنے۔ کسی نے کہا: "**لم يكن في زمانه أفقه منه ولا يكون بعده مثله، وكنا نقول: إنه ملك في صورة إنسان**" ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی فقیہ نہیں تھا، اور ان کے بعد پھر ان جیسا کوئی نہیں آیا، ہم کہا کرتے تھے کہ: وہ انسان نہیں؛ بلکہ انسان کی شکل میں فرشتہ ہیں۔

ایک جملہ نے امام اعظمؒ بنا دیا:

اس خوبصورت سے جملے اور اس کے اس عظیم اثر نے مجھے کچھ اور خوبصورت جملے یاد دلا دیے، جو ان سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوئے، میں چاہتا ہوں کہ ان کو بھی ذکر کروں۔

(۱) جیسا کہ ابن صلاح نے اپنی طبقات ۱: ۴۹۸ میں کہا ہے

موفق مکیؒ نے اپنی سند سے امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک روز شعبی کے پاس سے گزرا، وہ بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ: تم کس کے پاس آتے جاتے ہو؟ میں نے کہا: میں بازار آتا جاتا ہوں اور اپنے استاذ کا نام بتلایا، وہ کہنے لگے: میں بازار کے بارے میں نہیں پوچھ رہا ہوں، میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ علماء میں سے کس کے پاس آتے جاتے ہو؟ میں نے کہا: میرا علماء کے پاس آنا جانا کم ہوتا ہے، انھوں نے کہا: اس سے غفلت مت برتو، علمی اشتغال اور علماء کی ہم نشینی کو لازم پکڑلو، میں تمہارے اندر ایک بیداری اور حرکت دیکھ رہا ہوں، امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ان کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی، اور میں نے بازار جانا چھوڑ دیا اور ہمہ تن علم میں لگ گیا، ان کی اس بات سے اللہ نے مجھے بہت نفع پہنچایا(۱)۔

ایک جملہ نے امام شافعیؒ بنا دیا:

امام بیہقیؒ نے اپنی سند سے ربیع بن سلیمان مرادیؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے امام شافعیؒ کو سنا، وہ فرمارہے تھے کہ: میں مکہ سے نکلا، اور دیہات جا کر ھذیل کی ملازمت اختیار کرلی، میں وہاں دیہات کی زبان سیکھتا اور اس پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کرتا، وہ عرب کا فصیح ترین قبیلہ تھا، میں ایک مدت تک ان لوگوں کے ساتھ رہا، ان کے ہر سفر اور قیام میں ان کے ساتھ ہوتا، پھر جب مکہ واپس آیا تو اشعار کہنے شروع کیے، جن میں گزشتہ جنگوں کا تذکرہ ہوتا، اسی دوران ایک زہری شخص میرے پاس سے گزرا، اور کہنے لگا: ابوعبداللہ! یہ دیکھ کر بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ تمہاری یہ صلاحیت اور یہ فصاحت وبلاغت حدیث اور فقہ پر نہیں لگ رہی ہے! یہ بات میرے دل کو لگی، میں نے کہا: اچھا بتاؤ، اس وقت کون ایسے عالم ہیں جن سے رجوع کیا سکے؟ اس نے کہا: سیّد المسلمین امام مالک بن انسؒ، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ: بات میرے دل میں بیٹھ چکی تھی، میں گیا،

(۱) مناقب ابی حنیفہ ص ۵۴

اور ایک شخص سے ''موطا'' عاریت پر لے آیا اور اسے یاد کرنے میں لگ گیا الخ(۱)۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ کس طرح نرمی اور ادب کی پوری رعایت کے ساتھ اپنی بات پیش کی جارہی ہے، اور کس طرح حوصلوں کو مہمیز لگائی جارہی ہے؛ امام شعبی اور اس زہری عالم نے چند ہی کلمات کہے جو ایک سطر سے زیادہ نہیں تھے؛ لیکن ان چند کلمات نے مسلمانوں کو ایسے امام عطا کیے، جن کے علم اور فقہ سے استفادہ کرتے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں اور تا قیامت ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا، میں کہتا ہوں کہ: ان کلمات کا وقوع بھی صحیح جگہ ہوا تھا، پہاڑوں جیسے حوصلے ان کے مخاطب تھے، پھر یہ کلمات بذاتِ خود خیر خواہی پر مبنی اور سچائی میں ڈوبے ہوئے تھے، جو سچے دل سے نکلے تھے، جس کی وجہ سے یہ عظیم اثر رونما ہوا۔

اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور تمام علمائے امت سے راضی ہو، اور امام شعبیؒ اور اس زہری عالمؒ کو پوری امت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے، جن کی زبان سے نکلی ہوئی بات اتنے بڑے خیر کا سبب بنی۔

یہ ہر مسلمان کے لیے ایک عبرت آموز سبق ہے، کہ ہمیشہ خیر کی بات کہی جائے، اور ایسی بات کہی جائے جس سے حوصلوں کو مہمیز ملتی ہو، ایسی بات نہ کہی جائے جس سے ہمتیں ٹوٹتی ہوں، اور حوصلے پست ہوتے ہوں۔

آمدم برسرِ مطلب:

میں اب اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، پیچھے میں نے سخت سے سخت حالات میں حصولِ علم کی حرص کے کچھ نمونے پیش کیے تھے(۲)، اب مزید کچھ نمونے پیش کرتا ہوں۔

(۱) مناقب الشافعی ۱: ۱۰۲

(۲) صفحہ ۹۰ و مابعدہا

یحییٰ بن معینؒ کو اِس بات کا ڈر کہ حدیث سننے سے پہلے موت نہ آجائے:

حضرت انسؓ کی ایک حدیث ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُسامہ بن زیدؓ کا سہارا لیے ہوئے نکلے، آپ کے اُوپر ایک قطری(۱) چادر تھی، جسے آپ اوڑھے ہوئے تھے، اور آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے ''عبد بن حمید، عن محمد بن الفضل'' کی سند سے روایت کیا ہے(۲) اور اس کے بعد ایک عجیب وغریب حکایت نقل کی ہے، عبد بن حمید فرماتے ہیں کہ:

محمد بن فضل نے مجھ سے بیان کیا کہ: یحییٰ بن معینؒ جب میرے پاس آئے، تو بیٹھتے ہی مجھ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا، میں نے کہا: یہ حدیث مجھ سے حماد بن سلمہ نے بیان کی ہے، وہ کہنے لگے: اگر آپ یہ حدیث مجھے کتاب سے سنادیں تو کیا ہی اچھا ہو، میں کتاب لانے کے لیے کھڑا ہوا تو انھوں نے میرا دامن پکڑلیا، اور کہنے لگے: پہلے یہ حدیث مجھے زبانی لکھوادیجیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر آپ سے ملاقات نہ ہوسکے؛ چنانچہ میں نے وہ حدیث زبانی لکھوادی، پھر کتاب نکال کرلایا، اور انھیں وہ حدیث پڑھ کر سنائی۔

شارح ترمذی امام فقہ باجوریؒ یحییٰ بن معینؒ کے اس جملے ''کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر آپ سے ملاقات نہ ہوسکے'' کی شرح میں لکھتے ہیں کہ: ''مطلب یہ ہے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، وقت ایک کاٹتی ہوئی تلوار اور کوندتی ہوئی بجلی ہے، اس واقعہ سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ حصولِ علم کا کس قدر شوق ہونا چاہیے، اور لیت ولعل سے کس قدر دُوری اختیار کرنی چاہیے، خاص طور پر نیک کاموں کی طرف سبقت کرنے میں''۔

---

(۱) یہ خلافِ قیاس ملک قطر کی طرف نسبت ہے، یا پھر اس سے یمن کی اُونی چادریں مراد ہیں۔)

(۲) **الشمائل المحمدیة** (۵۹)، فتح المغیث سے لگتا ہے کہ یہ حدیث مسند کی ہے؛ لیکن یہ مسند کی نہیں ہے۔

خطیبؒ نے ''جامع بیان العلم''(۱) میں دو واقعات ذکر کیے ہیں: ایک سفیان ثوریؒ کا اور دوسرا یحییٰ بن معینؒ کا، میں ان دونوں کو یہاں نقل کرتا ہوں۔

حدیث سننے سے پہلے موت نہ آجائے:

محمد بن کثیر عبدی کہتے ہیں: سفیان ثوریؒ نے بصرہ آنے کے بعد جب حماد بن سلمہؒ کو دیکھا تو ان سے کہنے لگے: مجھ سے ابوالعشر اء کی وہ حدیث بیان کردیجیے جو انھوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے: **''لو طعنت في فخذها لأجزأ عنك''**، حماد نے انھیں وہ حدیث سنائی، سفیان ثوری نے جب حدیث سن لی تو انھیں سلام کیا، اور ان سے معانقہ کیا، حماد کہنے لگے: آپ کون ہیں؟ انھوں نے فرمایا: سفیان، پوچھا: ابنِ سعید؟ کہا: ہاں ابنِ سعید۔

-''ثوری؟''

-''ہاں ثوری''

-''ابوعبداللہ؟''

-''ہاں ابوعبداللہ''

حماد بن سلمہ کہنے لگے: تو پھر ایسے کیوں کیا؟ پہلے سلام کلام کرلیتے، پھر حدیث سنتے، سفیان ثوریؒ نے کہا: میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ کا انتقال نہ ہوجائے اور میں یہ حدیث سننے سے رہ جاؤں۔

یحییٰ بن معینؒ کا واقعہ:

ابوجعفر عبداللہ بن محمد نفیلیؒ کہتے ہیں: ہمارے پاس امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین تشریف لائے، یحییٰ بن معین معانقہ کے دوران ہی مجھ سے پوچھنے لگے: ابوجعفر! آپ نے معقل بن عبیداللہ سے وہ اثر سنا ہے جو انھوں نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ: حیض کی اقلِ

(۱) جامع بیان العلم (۱۶۰۲، ۱۶۰۳)

مقدار ایک دن ہے، امام احمد کہنے لگے: آپ اطمینان سے بیٹھ تو جایئے! اس پر یحییٰؒ نے نفیلی کی طرف دیکھ کر فرمایا: مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ آپ اس دنیا سے رحلت فرما جائیں، اور میں یہ حدیث آپ سے نہ سن پاؤں۔

شعبہ بن حجاجؒ کا واقعہ:

ابوعبداللہ حاکمؒ نے اپنی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' کا اختتام شعبہ بن حجاج کے ایک واقعہ سے کیا ہے، جسے بقیہ بن ولید نے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: بغداد کے اندر مجھ سے شعبہ ملے اور کہنے لگے: اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو میں مرجاتا، کیا آپ کے ساتھ بحیر بن سعد کی کتاب ہے؟ میں نے کہا: نہیں، کہنے لگے: جب آپ واپس جائیں تو اس کو لکھ کر اور اس پر مہر لگا کر مجھے بھیج دیں، اس جملے پر غور کیجیے ''اگر تم سے ملاقات نہ ہوتی تو میں مرجاتا''۔

امام بخاری کا رات میں دسیوں مرتبہ اُٹھنا:

خطیبؒ نے امام بخاریؒ کے ترجمہ میں ان کے کاتب محمد بن ابی حاتم سے نقل کیا ہے (کاتب حضرات کے بارے میں آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ سفر وحضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ: دورانِ سفر ہمارا کہیں قیام ہوتا، تو ہم دونوں ایک ہی کمرے میں سوتے، صرف سخت گرمی میں کبھی کبھی الگ سوتے، میں نے ہمیشہ ان کو دیکھا کہ وہ رات بھر میں پندرہ سے بیس مرتبہ اُٹھتے، چقماق کا پتھر لے کر خود اپنے ہاتھ سے آگ سلگاتے، اس سے چراغ جلاتے، پھر کچھ احادیث نکال کر ان پر نشان لگاتے اور لیٹ جاتے، یہ سب کچھ خود ہی کرتے، مجھے کبھی نہیں جگاتے، میں نے عرض کیا کہ: یہ سارا بوجھ آپ اپنے سر پر ہی لے لیتے ہیں، مجھے کیوں نہیں جگاتے؟ وہ فرماتے کہ: تم ابھی جوان ہو، میں نہیں چاہتا کہ تمہاری نیند خراب ہو(۱)۔

(۱) تاریخ بغداد ۲: ۳۲۲

اس کے بعد خطیبؒ نے اگلے صفحہ پر امام بخاریؒ کے شاگردِ خاص اور صحیح بخاری کے راوی محمد بن یوسف فربریؒ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں ایک رات محمد بن اسماعیل بخاریؒ کے گھر میں ٹھہرا، امام بخاریؒ اُٹھتے، چراغ جلاتے اور کچھ چیزیں یاد کر کے ان پر نشان لگاتے، پھر سو جاتے، میں نے شمار کیا تو ایک رات میں انھوں نے اٹھارہ مرتبہ ایسا کیا۔

امام شافعیؒ کا رات میں تیس مرتبہ اُٹھنا:

ابو نعیم نے امام شافعیؒ کی بہن سے نقل کیا ہے، وہ فرماتی ہیں کہ: کبھی ایسا بھی ہوا کہ ہم نے تقریباً تیس مرتبہ امام شافعیؒ کے سامنے چراغ پیش کیا، وہ لیٹتے، غور کرتے، پھر باندی کو آواز دیتے کہ: چراغ لاؤ، وہ چراغ لاتی، اور امام کو جو لکھنا ہوتا لکھتے، پھر چراغ واپس کر دیتے، راویِ قصہ سے پوچھا گیا کہ: چراغ واپس کیوں کر دیتے، وہیں کیوں نہیں رکھ لیتے؟ تو اس نے بتایا کہ: (امام شافعیؒ فرماتے تھے): "**الظلمة أجلى للقلب**" تاریکی دل کو زیادہ روشن کرتی ہے[1]۔

بلکہ ابو ہلال عسکریؒ لکھتے ہیں کہ: ربیع بن سلیمان نے امام شافعیؒ کی بیٹی فاطمہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ: میں نے اپنے والد کے لیے ایک رات میں ستر مرتبہ چراغ جلایا! وہ فرماتے تھے: تاریکی میں دل زیادہ روشن ہوتا ہے[2]۔

ان واقعات کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ ان حضرات کے یہاں صلاۃ اللیل کا بھی اہتمام ہوتا تھا، رات کا ایک اچھا خاصا حصہ اس کے لیے مختص ہوتا تھا، پھر رات چاہے جتنی بھی لمبی ہو بہر حال چھوٹی ہی ہوتی ہے، اس کے باوجود بھی آپ دیکھ رہے

(۱) حلیۃ الاولیاء ۹: ۱۰۴

میں نے بین القوسین میں قال بڑھایا ہے جس کے فاعل امام شافعی ہیں، تا کہ یہ عبارت عسکری کی اس عبارت سے متفق ہو جائے جو آگے آ رہی ہے۔

(۲) **الحث علي طلب العلم** ص ۷۳

ہیں کہ رات کے اتنے مختصر سے حصہ میں مسلمانوں کا یہ امام علمی فائدہ حاصل کرنے یا کسی خیال کو لکھنے کے لیے دسیوں مرتبہ اُٹھتا ہے! بلاشبہ علمی فائدہ راحت وآرام سے زیادہ قیمتی شے ہے۔

ہمارے یہ تمام ائمہ بزبانِ حال یہ شعر پڑھتے تھے، اور اہلِ دنیا پر بجا طور پر فخر کرتے ہوئے پڑھتے تھے:

بصرتُ بالراحة الكبرىٰ فلم أرها ❖ تنال إلا على جسر من التعب

میں نے بڑی راحت کو دیکھا تو مجھے سمجھ میں آیا کہ وہ تھکن کے پُل پر ہی حاصل ہوسکتی ہے (۱)۔

معصوم بچے کی موت کے منہ میں علم کی طلب:

ابونعیم نے محمد بن عبدالرحیم وراق کے تذکرے میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، وراق کہتے ہیں کہ: سلمہ بن شبیب نے ہمیں یہ واقعہ سنایا کہ: ہم لوگ یزید بن ہارون کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ ان کے پاس پڑھنے والوں کی بھیڑ اکٹھا ہوئی، اسی بھیڑ میں ایک بچہ پیروں کے نیچے آگیا، یزید چیخ پڑے: اناللہ! دیکھو بچے کا کیا حال ہے؟ ہم نے دیکھا تو اس کی آنکھ کی پتلیاں اندر دھنس گئی تھیں؛ لیکن وہ اس حال میں بھی کہہ رہا تھا: ابوخالد (یہ یزید بن

(۱) یہ شعر ابوتمامؒ کا ہے، جو فتح عموریہ کے موقع پر کہے گئے قصیدے سے ماخوذ ہے، جس میں اس نے خلیفہ کو مخاطب کیا ہے، جس کا مطلع ہے:

السيف أصدق أنباء من الكتب ❖ في حده الحد بين الجد واللعب

تلوار کی خبریں نجومیوں کی خبروں سے زیادہ سچی ہوتی ہیں، اس کی دھار سنجیدگی اور مذاق کے درمیان فصل کرنے والی ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ اصل شعر خطاب کے صیغہ کے ساتھ ہے:

بصرتَ بالراحة الكبرىٰ فلم ترها ❖ تنال إلا علىٰ جسر من التعب)

ہارون کی کنیت تھی)! اور کچھ سنا دیجیے! یزید کہنے لگے: اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ! اے حدیث کے طالبِ علمو! سوچو تم لوگ کیسی بڑی آفت میں مبتلا ہو، اس بچے سے عبرت حاصل کرو کہ اس پر اتنی بڑی مصیبت نازل ہوئی، پھر بھی اسے علم کی طلب لگی ہوئی ہے (۱)۔

راقم کہتا ہے کہ: یہ بچہ لگتا ہے اپنی ماں کا دودھ پینے کے ساتھ ساتھ علم کا دودھ بھی پیتا تھا، کہ جب اس عمر کو پہنچا تو علم کی حلاوت اس حد تک بڑھی کہ موت کے منہ میں بھی وہ علم طلب کررہا ہے، اگر اس نے کل ہی علم حاصل کرنا شروع کیا ہوتا، تو ہرگز آج علم کا اتنا بڑا عاشق اور اس کی طلب میں اپنے آپ کو فنا کرنے والا نہ بنتا۔

علمی فوائد چھوٹ جانے کے ڈر سے چمڑے وغیرہ پر لکھ لینا:

امام ابوسعد سمعانی کہتے ہیں: اسلاف میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جنھوں نے کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے یا فی الفور دستیاب نہ ہو پانے کی وجہ سے چمڑوں، تختیوں، ٹھیکریوں، ریت

(۱) تاریخ اصبہان (۲/۲۲۹)، سخاویؒ نے فتح المغیث (۳/۲۸۱) میں ''**اداب طالب الحدیث**'' کے شروع میں یحییٰ بن کثیرؒ کا مشہور جملہ ''**لایستطاع العلم براحة الجسد**'' اور حدیث پاک ''**احرص علیٰ ما ینفعك**'' (نفع پہنچانے والی چیزوں کے حریص رہو) نقل کی ہے، اس کے بعد لکھا ہے کہ: اس سلسلے میں سلف سے منقول واقعات میں سب سے حیرت انگیز واقعہ وہ ہے جو سلمہ بن شبیب نے بیان کیا ہے، اور پھر یہ پورا واقعہ نقل کیا ہے۔

واضح رہے کہ اصل ماخذ میں لفظ ''**حرِجت حَدَقتاه**'' ہی ہے کہ اس کی آنکھ کی پتلیاں دھنس گئی تھیں؛ لیکن فتح المغیث میں ''**خرَجت حدقتاه**'' ہے (کہ اس کی آنکھ کی پتلیاں باہر نکل گئیں)، **حرِجت** کے معنیٰ ہیں: **غارت فضاقت علیها منافذ البصر** پتلیاں دھنس گیں اور آنکھ کے سوراخ اس پر تنگ ہوگئے، کما فی اساس البلاغہ، لفظ ''**حرِجت**'' کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس واقعہ میں بچہ کے مرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، جبکہ آنکھ نکل جانے کے بعد تو آدمی مرجاتا ہے؛ البتہ ''**حدقتاه**'' کے الفاظ ''**خرجت**'' کی تائید کرتے ہیں؛ کیونکہ ''**حرجت حدقتاه**'' نہیں کہا جاتا ہے؛ بلکہ ''**خرجت حدقتاه**'' کہا جاتا ہے، واللہ اعلم۔

چپل اور ہتھیلی وغیرہ پر بھی لکھا ہے، اس قسم کے واقعات میں نے اپنی کتاب ''**أدب الطلب**'' میں جمع کر دیے ہیں، **من رامها فليرجع إليه**۔

آگے بیٹھے ہوئے شخص کی پشت پر سبق لکھنا:

سمعانیؒ کہتے ہیں کہ: اس سلسلے میں سب سے عجیب واقعہ جو میری نظر سے گزرا وہ ہے جسے عبید بن عبدالواحد نے بیان کیا ہے (سمعانی نے یہاں پوری سند ذکر کی ہے)، عبید بن عبدالواحد کہتے ہیں کہ: میں نے ایک حلقۂ درس میں شرکت کی، جہاں لوگوں کی بہت بھیڑ تھی، اس دوران مجھے اپنی پشت پر کھجلاہٹ اور حرکت سی محسوس ہوئی، سبق ختم ہونے کے بعد جب میں نے واپس ہونے کا ارادہ کیا تو ایک شخص بٹھانے لگا، میں نے کہا: کیا بات ہے؟ کہنے لگا: ذرا بیٹھ جایئے، میں نے درس کی باتیں آپ کی پشت پر لکھی ہیں، تھوڑا انتظار کر لیجیے؛ تا کہ میں اس کو ملا لوں![1]۔

چابی پر حدیث لکھنا:

میرے خیال میں امام سمعانی نے ''ادب الطلب'' میں ابوزکریا یحییٰ بن محمد بن یحییٰ ذہلیؒ کا وہ واقعہ ضرور ذکر کیا ہوگا جو حاکم کی ''**معرفة علوم الحديث**'' میں مذکور ہے[2]، یہ ابوزکریا مشہور امام حدیث اور امام بخاری کے مشہور استاذ محمد بن یحییٰ ذہلیؒ کے صاحبزادے ہیں، یہ بھی امام تھے[3]، حاکم نے ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں ایک طویل

(۱) یہ واقعہ سمعانی کی دلچسپ کتاب ''**أدب الإملاء والاستملاء**'' کے اخیر میں فقرہ نمبر ۴۹۰ سے پہلے یہ واقعہ مذکور ہے، ان کی دوسری کتاب کا پورا نام ''**طراز الذهب في أدب الطلب**'' ہے۔

(۲) معرفۃ علوم الحدیث (۱۳۹)

(۳) ذہبی نے سیر (۱۲/ ۲۷۳) میں ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے، اور آخر میں (۱۲/ ۲۸۵) پر لکھا ہے: ان کے بعد شہر کی شیاخت حدیث کی مسند ان کے صاحبزادے یحییٰ بن محمد بن یحییٰ ذہلی کی طرف منتقل ہوئی، جو مشہور حافظ اور مجود ہیں۔

حدیث ذکر کی ہے، جس کی سند میں ابوزکریا ذہلی بھی ہیں، جنھوں نے راوی موطا امام یحییٰ بن یحییٰ تمیمی نیساپوری سے یہ حدیث روایت کی ہے، حاکم نے پوری حدیث سند کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: ابوزکریا کہتے تھے: میرا خیال ہے کہ میں نے دورانِ درس اس حدیث کو دکان کی چابی پر لکھا تھا؛ کیونکہ اس وقت میرے پاس (حدیث لکھنے کے لیے) کوئی کاغذ نہیں تھا۔

اسی سلسلے میں کہ کوئی علمی فائدہ چھوٹ نہ جائے: ایک واقعہ ذہبیؒ نے امام بخاریؒ کے استاذ محمد بن سلام یا سلّام بیکندی کے تذکرے میں لکھا ہے[1] کہ: ایک دفعہ کسی استاد کے حلقے میں املاء کے دوران ان کا قلم ٹوٹ گیا، تو انھوں نے آواز لگوائی: ہے کوئی جو ایک دینار میں قلم بیچے، آواز لگتے ہی بہت سارے قلم ان تک پہنچ گئے، ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ: وہ مالدار اور صاحبِ ثروت آدمی تھے، یعنی چونکہ وہ مالدار تھے؛ اس لیے انھوں نے قلم کو ایک دینار میں خرید لیا؛ ورنہ ایک طالبِ علم کے پاس اتنی گنجائش کہاں ہوتی ہے کہ وہ قلم کو ایک دینار میں خرید سکے! علاوہ اس کے ہمیں اس واقعہ میں نظر آتا ہے کہ ان کے اندر اس بات کی کتنی حرص تھی کہ استاذ کے املاء میں سے کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے، یقیناً اگر انھیں دینار میسر نہ ہوتا تو وہ دوسروں کی طرح اپنے کپڑے پر ہی یا سامنے والے کی پشت پر ہی لکھ لیتے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ زرنوجیؒ نے عصام بن یوسف بلخیؒ (متوفی ۲۱۰ھ یا ۲۱۵ھ) کے بارے میں نقل کیا ہے، جو امام صاحب کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، زرنوجیؒ لکھتے ہیں کہ: ''عصام بن یوسف نے ایک مرتبہ حدیث کے حلقے میں ایک قلم ایک دینار کے عوض خریدا، صرف اس غرض سے کہ استاذ کی بات کو فوراً لکھ لیں''[2] کہ کہیں کوئی علمی فائدہ چھوٹ نہ جائے۔

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۰:۶۲۹

(۲) تعلیم المتعلم ص ۹۱

صرف ایک حدیث کے لیے طویل اسفار:

صرف ایک حدیث کے لیے اسلاف کا لمبے لمبے سفر کرنا محتاجِ بیان نہیں ہے، اس سلسلے میں ان سے عجیب وغریب واقعات منقول ہیں، جنھیں پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ یہ دنیا ان کے لیے گھر کے ایک کمرے کی طرح ہوگئی تھی، وہ ملکوں ملکوں کا سفر اس طرح کرتے تھے جیسے کمرے کے اندر ایک گوشے سے دوسرے گوشے میں جارہے ہوں، اس سلسلے میں خطیب بغدادیؒ کی کتاب ''الرحلة في طلب الحديث'' مشہور ہے؛ گرچہ بے شمار واقعات ان سے بھی چھوٹ گئے ہیں۔

آج کہا جاتا ہے کہ: نئی نئی ایجادات کی وجہ سے دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں کی طرح ہوگئی ہے، یہ حضرات اس قدیم زمانے میں بھی دنیا کو اسی نظر سے دیکھتے تھے؛ اور اس کی بنیاد صرف اور صرف اللہ کی طرف سے عطا کردہ وہ بلند ہمتی اور عالی حوصلگی تھی جو ان کے پہلوؤں کے درمیان موجود تھی؛ بلکہ ان کے رَگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھی، نہ آج کی یہ نئی ایجادات تھیں اور نہ اس زمانے کے وسائل تھے!!۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ صرف انہی احادیث کے لیے سفر کرتے ہوں جن سے کسی شرعی حکم پر استدلال وابستہ ہو، وہ تو سلفِ صالحین کے کسی حکمت بھرے نکتہ کی سند حاصل کرنے کے لیے بھی سفر کرلیا کرتے تھے، جو نکتہ انھیں یاد ہوتا، بس سند کی ضرورت ہوتی، اسی طرح وہ ایسی سند کو حاصل کرنے کے لیے بھی سفر کرجاتے تھے جو ان کے پاس موجود کسی سند کے لیے متابع بن سکتی ہو، یا اور کوئی اس قسم کا اسنادی فائدہ اس سے وابستہ ہو۔

صرف ایک اثر کی سند کے لیے پندرہ سو کلومیٹر کا سفر:

چنانچہ ''الرحلة في طلب الحديث''[1] میں ہارون بن مغیرہ بجلی رازیؒ سے

(۱) للخطیب ص۱۵۶

منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: عبداللہ بن مبارکؒ کجاوے پر سوار میرے پاس تشریف لائے، اور مجھ سے حضرت حسن بصریؒ کے قول **"لَاتَشْتَرِ مَوَدَّةَ أَلْفِ رجلٍ بِعداوة رجلٍ واحدٍ"** (کہ ایک آدمی کی دشمنی کے بدلے میں سو آدمیوں کی محبت بھی مل رہی ہو تو مت لو) کے بارے میں دریافت کیا، میں نے سند کے ساتھ انھیں یہ اثر سنایا، تو وہ کہنے لگے: صرف اسی ایک حدیث کی سند کے لیے مرو سے سفر کر کے یہاں آیا ہوں۔

غور کیجیے! رازی: رے کی طرف منسوب ہے، جو آج تہران کہلاتا ہے، وہاں سے عبداللہ ابنِ مبارکؒ کے شہر مرو تک تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) کلومیٹر کی مسافت ہوتی ہے، جیسا کہ اس علاقے کے بعض لوگوں سے مجھے معلوم ہوا ہے! کیا کہنا ہے اس بلند ہمتی کا جس کے سامنے آسمان کی بلندیاں بھی ہیچ ہیں!!۔

میں اور وضاحت کردوں کہ: حضرت حسن بصریؒ کی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی، اور عبداللہ بن مبارکؒ کی پیدائش سنہ ۱۱۸ھ کی ہے، اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان غالباً ایک ہی شخص کا واسطہ رہا ہوگا، جس نے حسن بصریؒ سے سنا ہوگا، اس ایک شخص کا نام جاننے کے لیے ابن المبارکؒ نے پندرہ سو کلومیٹر کا سفر کیا؛ بلکہ آنے جانے کا ملا کر تین ہزار کلومیٹر کا سفر کیا۔

صرف ایک سند کے لیے بڑھاپے کی عمر میں طویل سفر:

امام ابوجعفر احمد بن حمدان حیری نیساپوریؒ (متوفی ۳۱۱ھ) نے صحیح مسلم پر استخراج کا کام کیا ہے، ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی، استخراج کے دوران وہ امام مسلمؒ کی ایک حدیث پر پہنچے، جسے امام مسلمؒ نے **"سوید بن سعید، عن حفص بن میسرة"** کی سند سے روایت کیا تھا[۱] تو اس حدیث کے استخراج کے لیے وہ نیساپور سے سفر کر کے جرجان تشریف لے گئے، اور عمران بن موسیٰ سے سوید بن سعید کی یہ سند حاصل کر کے استخراج کی شرط پوری کی[۲]۔

(۱) ۱:۵۷۳(۱۴)

اسی طرح "محمد بن عباد عن سفیان بن عیینة" کی سند سے مروی ایک حدیث پر پہنچے تو اس کا استخراج مشکل ہوگیا؛ کیونکہ یہ حدیث محمد بن عباد کی سند سے کسی کے پاس بھی نہیں مل رہی تھی، کسی نے بتایا کہ: ابویعلی موصلی کے پاس یہ سند موجود ہے، تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے نیساپور سے سفر کر کے موصل گئے، اور وہاں ابویعلی سے یہ سند حاصل کی (۱)۔

موصل کے سفر کے سلسلے میں ذہبی نے صراحت کی ہے کہ یہ سفر انھوں نے بڑھاپے میں کیا تھا، یعنی انھوں نے نیساپور سے موصل تک کے سفر کی جو مشقتیں اُٹھائیں، جن کے درمیان مسافت بھی طویل تھی اور اس پر ان کا بڑھاپا مستزاد؛ یہ سب کچھ انھوں نے علمِ حدیث کی بس ایک فنی چیز کو حاصل کرنے کے لیے کیا تھا، جس سے کسی ضعیف حدیث کی تصحیح کا تعلق بھی نہیں تھا؛ کیونکہ یہ حدیث تو صحیح مسلم کے اندر موجود ہے، جس کی صحت میں کوئی کلام ہی نہیں۔

جرجان کے سفر کا بھی یہی سبب اور باعث تھا، اللہ ان سے راضی ہو اور انھیں اپنے سے راضی کر دے۔

---

(۲) استخراج کا مطلب یہ ہے کہ کوئی محدث حدیث کی کسی کتاب مثلاً صحیح بخاری کو لے کر اس کی تمام احادیث کو اپنی سند سے روایت کرے، جس میں وہ مصنّف کے شیخ یا شیخ الشیخ میں جا کر مل جائے، پھر آگے کی سند دونوں کی ایک ہی ہو، یہ سند ایسی ہونی چاہیے کہ درمیان میں مصنّف کتاب کا واسطہ نہ آئے؛ بلکہ اس کے شیخ یا شیخ الشیخ میں جا کر سند ملتی ہو، اور اگر مستخرج کے پاس دو سندیں ہوں: ایک مصنّف کے شیخ تک پہنچتی ہو اور دوسری شیخ الشیخ تک، تو پہلی سند سے استخراج ضروری ہے، ہاں اگر کوئی ضرورت ہو، مثلاً: دوسری سند میں اسناد یا متن سے متعلق کوئی فائدہ کی بات ہو، تو اس وقت دوسری سند سے استخراج بھی جائز ہے۔

اس مسئلہ کی تفصیل "تدریب الراوی" میں حدیث صحیح کے مسائل: مسئلہ نمبر ۳ کے اندر موجود ہے۔

(۱) ۳:۵۹ ۱۳ (۷ کے بعد)

جیسا کہ ذہبی نے سیر (۱۴/ ۳۰۰) میں ذکر کیا ہے، ابوجعفر کے یہ دونوں سفر خطیب نے ذکر نہیں کیے۔

صحیح سند کی متابع سند کا حال معلوم کرنے کے لیے ہزاروں میل کا سفر:

ایک اور انوکھا واقعہ میں بیان کرتا ہوں، جو ایک حدیث کی سند کا حال معلوم کرنے کے لیے کیا گیا، جبکہ اس حدیث کی ایک دوسری صحیح سند موجود تھی، یوں تو میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بجائے صرف حدیث اور علومِ حدیث کی کچھ کتابوں کا حوالہ دینے پر بھی اکتفا کرسکتا ہوں؛ لیکن پھر بھی ایک سنت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہوں، اس واقعہ کا ابتدائی حصہ اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ:

امام مسلم نے عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(۱) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

(۱) ۱/۲۰۹ (۱۷) ابوداؤد (۱۷۲) کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ: وہ آسمان کی طرف اپنی نظر اُٹھا کر کہے: **أشهد أن لا إله إلـخ**، اور ترمذی (۵۵) نے عقبہ عن عمر کی سند سے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ: وہ آخر میں یہ دعا پڑھے: **اللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين**، ترمذی نے اس زیادتی کو معلول قرار دیا ہے؛ لیکن یہ زیادتی طبرانی کی ''معجم اوسط'' (۴۸۹۵) کی روایت سے قوی ہوجاتی ہے، طبرانی کی روایت میں سعید بن مرزبان بقال ہے جو ضعیف اور مدلّس راوی ہے۔

حافظ نے **اللّٰهم اجعلني** کی اس زیادتی کو ''**التلخيص الحبير**'' (۱/۱۰۱) میں مطلقاً بزار کی طرف منسوب کرکے یہ وہم دلایا ہے کہ یہ زیادتی ''مسند بزار'' کے اندر موجود ہے، جبکہ ہیثمیؒ نے ''مجمع الزوائد'' (۱/۲۳۹) میں اسے بزار کی طرف سرے سے منسوب ہی نہیں کیا؛ لیکن ابنِ دقیق العید نے ''شرح الالمام'' (۵/۱۷۰) میں اور ان کی اتباع میں ابن الملقن نے ''**البدر المنير**'' (۴/۱۰۶) میں بتلایا ہے کہ اس زیادتی کو بزار نے اپنی ''سنن'' کے اندر ''کتاب الطہارۃ'' میں ذکر کیا ہے۔

مستغفری نے بھی اس زیادتی کو ''دعوات'' کے اندر براء بن عازبؓ سے روایت کیا ہے، اور اسے ''حسن غریب'' قرار دیا ہے، جیسا کہ ''البدر المنیر'' (۴/۹۴) میں مذکور ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ **اللّٰهم اجعلني** کی زیادتی ثابت ہے، اور ''**أشهد أن لا إله وأشهد أن محمداً عبده وسوله**'' کے بعد اس دعا کو پڑھنا بھی مسنون ہے۔

فرمایا: ''جو مسلمان بھی اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر کھڑے ہوکر دو رکعت نماز اس طرح پڑھتا ہے کہ وہ دل اور چہرے سے نماز کی طرف متوجہ رہتا ہے، تو اس کے لیے جنت واجب ہے'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان بھی اچھی طرح مبالغہ کے ساتھ وضو کرتا ہے، پھر کہتا ہے: **أشهد أن لا إلـه إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله** اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں، وہ جس دروازے سے چاہے داخل ہو''(۱)۔

اس صحیح حدیث کی ایک دوسری سند ہے، جس کے ساتھ ایک طویل قصہ جُڑا ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ایک روز شعبہ بن حجاجؒ کے دروازے پر ان کے شاگرد جمع تھے، جن میں سے ایک شخص نصر بن حماد وراق نے یہی حدیث اپنے ساتھیوں کو اس سند کے ساتھ سنائی: **إسرائيل بن يونس عن جده أبي إسحاق السبيعي عن عبد الله بن عطاء عن عقبة بن عامر.**

شعبہ اندر تھے، انھوں نے اس حدیث کے سلسلے میں ایک طویل اور پُر مشقت سفر کیا تھا، جس سے اس سند کی خرابی ان کے سامنے آشکارا ہوئی تھی، جب انھوں نے نصر کو اس سند کے ساتھ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا تو ان سے رہا نہیں گیا، اور وہ بے ساختہ گھر سے باہر نکلے اور نصر کو ایک طمانچہ جڑ دیا، اور واپس ہوگئے، کچھ دیر بعد باہر آئے تو دیکھا کہ نصر رو رہے ہیں، پوچھا: کیا بات ہے؟ یہ کیوں رو رہے ہیں؟ حاضرین میں سے ایک شخص عبداللہ بن ادریس نے کہا کہ: آپ ہی نے تو ان کے ساتھ زیادتی کی ہے! شعبہ نے کہا: تم سن نہیں رہے تھے یہ کیا بیان کر رہے تھے: **إسرائيل عن جدّه أبي إسحاق عن عبدالله بن عطاء عن عقبة بن عامر**، میں نے اس حدیث کے بارے میں

(۱) مسلم کی ایک دوسری روایت میں ''**أشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله**'' کے الفاظ ہیں۔

ابواسحاق سے پوچھا تھا کہ: کیا عبداللہ بن عطاء نے عقبہ سے یہ حدیث سنی ہے، تو انھوں نے انکار کردیا اور غصہ ہوگئے، ان کے پاس مسعر بن کدام بھی بیٹھے ہوئے تھے، وہ بھی غصہ ہوگئے، اور مجھ سے کہنے لگے کہ: آپ نے شیخ کو غصہ دلا دیا، میں نے کہا: یا تو ابواسحاق اس حدیث کو صحیح کریں، اور عبداللہ بن عطاء اور عقبہ کے درمیان کا واسطہ بیان کریں، یا میں ان کی اس حدیث کو ساقط قرار دوں گا۔

مسعر کہنے لگے: عبداللہ بن عطاء تو مکہ میں موجود ہیں (ان سے جا کر معلوم کرلو)، میں وہاں سے اُٹھ گیا، اور مکہ چلا گیا، حج کا کوئی ارادہ نہیں تھا، صرف حدیث کی تحقیق مقصود تھی، مکہ پہنچ کر میں نے عبداللہ بن عطاء سے ملاقات کی، اور ان سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے کہا: اس حدیث کو میں نے عقبہ بن عامر سے نہیں سنا، یہ حدیث مجھ سے سعد بن ابراہیم نے بیان کی ہے، وہاں امام مالکؒ بھی موجود تھے، وہ کہنے لگے: سعد بن ابراہیم اس وقت مدینہ میں ہیں، وہ حج کے لیے نہیں آئے، میں وہاں سے مدینہ گیا، اور سعد بن ابراہیم سے ملاقات کی، اور ان سے دریافت کیا، تو وہ کہنے لگے: یہ حدیث تمہارے ہی یہاں سے آئی ہے، زیاد بن مخراق نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے، میں نے کہا: یہ کیسی عجیب حدیث ہے!! پہلے یہ کوفی تھی، پھر مکی ہوئی، پھر مدنی ہوئی اور اب بصری ہوگئی۔

خیر میں وہاں سے چل کر بصرہ آیا اور زیاد بن مخراق سے ملاقات کی، اور اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے کہا: یہ حدیث تمہارے رتبہ کی نہیں ہے، یعنی: یہ حدیث تمہارے لیے مناسب نہیں ہے، تمہیں یہ اچھی نہیں لگے گی، تم اسے پسند نہیں کروگے؛ کیونکہ یہ جس راوی سے مروی ہے اس کی روایت لینا تم پسند نہیں کرتے ہو، میں نے کہا: کیوں نہیں، میں پسند کروں گا، آپ بیان تو کریں، زیاد نے کہا: تم اس حدیث کو لینا نہیں چاہوگے، میں نے کہا: میں لے لوں گا، وہ کہنے لگے: یہ حدیث مجھ سے شہر بن حوشب نے

''أبو ريحانة عن عقبة'' کی سند سے روایت کی ہے، شعبہ کہتے ہیں کہ: جب انھوں نے حوشب کا نام لیا تو میں نے کہا کہ: اس نے حدیث کو برباد کردیا، کاش یہ حدیث صحیح نکلتی تو یہ مجھے میرے اہل وعیال، میرے مال؛ بلکہ پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہوتی!۔

یہ حدیث دوسری صحیح سند سے موجود ہے جیسا کہ ابھی مسلم کی روایت گزری، میں نے یہ واقعہ صرف اس لیے بیان کیا؛ تاکہ اس کو پڑھ کر ہمارے اندر پورے ذوق وشوق کے ساتھ وضو کے بعد کی اس دعا کو پڑھنے کا داعیہ پیدا ہو؛ کہ جس حدیث کی سند کا حال معلوم کرنے کے لیے امام شعبہ نے اس قدر محنت ومشقت برداشت کی، اس پر عمل کے سلسلے میں کوتاہی اچھی بات نہیں (۱)۔

قارئین! اس واقعہ میں مسعر کے اس جملے پر غور کیجیے جو انھوں نے شعبہ سے کوفہ یا واسط میں کہا کہ: عبداللہ بن عطاء مکہ میں ہیں، وہاں جاکر معلوم کرلو، اور امام مالکؒ کے جملہ پر بھی غور کیجیے، جو انھوں نے شعبہ سے مکہ میں کہا کہ: سعد بن ابراہیم مدینہ میں ہیں وہاں چلے جاؤ، اس وقت ہوائی جہاز یا کار سے سفر نہیں ہوتا تھا!! ان کے یہ جملے بتاتے ہیں کہ ان کی علمی زندگی میں تھکن اور مشقت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، اور واقعی ایک طالبِ علم کی زندگی ان چیزوں سے نامانوس اور ایک طالبِ تحقیق وتفتیش کی لغت ان الفاظ سے ناآشنا ہونی چاہیے، ان حضرات کے سینوں میں جو عزائم پلتے تھے، آج کار اور ہوائی جہاز والوں کے عزائم بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے؛ جہاز اور ہیلی کاپٹر سے اگرچہ بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں؛ لیکن اگر آدمی کے اندر ان کو استعمال کرکے کچھ کر دکھانے کا حوصلہ ہی نہ ہو تو پھر ان کا کوئی فائدہ نہیں، آج کی ہماری صورتحال اس کی واضح اور بین دلیل ہے!!۔

(۱) یہ قصہ متعدد کتابوں میں ہے، جن میں سب سے قدیم کتاب رامہرمزی کی **''المحدث الفاصل''** (ص/ ۳۱۳) ہے۔

جہاں بھی علم کی خبر ملی پہنچ گئے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں ایک گمنام شخص تھے، جن کے نام سے بھی بہت سے طلبہ واقف نہیں ہوتے: اربدہ تمیمیؒ، وہ کہتے ہیں کہ: مجھے جس شہر کے بارے میں بھی پتہ چلا کہ وہاں علم مل سکتا ہے، میں وہاں پہنچ گیا، یہی حال مکحول شامیؒ کا بھی تھا، وہ ایک آزاد کردہ غلام تھے، اور ان کا زمانہ اربدہ سے کچھ بعد کا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے حدیثیں جمع کرنے کے لیے پوری دنیا کا چکر لگایا!!!(۱)۔

حقائق کی چھان بین کے لیے سفر اور اسلاف کی بلند ہمتی:

سنتِ نبویہ کی خدمت کے لیے سفر اور حقائق جاننے کے سلسلے میں اسلاف کی بلند ہمتی کے دلچسپ واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، انہی میں ایک واقعہ امام یحییٰ بن معینؒ کا ہے، جو پیدائش کے اعتبار سے اگرچہ بغدادی تھے؛ لیکن اسفار کی کثرت کی وجہ سے انھیں کسی ایک شہر کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، ہر اسلامی شہر ان کا اپنا شہر تھا۔

وہ ایک مرتبہ حماد بن سلمہ کی کتابوں کی سماعت کے لیے امام عفان بن مسلم صفارؒ کے پاس پہنچے، عفان نے پوچھا: کیا آپ نے کسی سے بھی ان کتابوں کی سماعت نہیں کی؟ انھوں نے کہا: کی ہے، حماد کے سترہ شاگردوں نے مجھ سے ان کتابوں کی روایت کی ہے، عفان کہنے لگے: بخدا! پھر تو میں تم سے ان کتابوں کی روایت بالکل بھی نہیں کروں گا، یحییٰ نے کہا: دیکھیے میرے پاس ایک درہم راستہ کا کرایہ ہے، میں بصرہ چلا جاؤں گا اور موسیٰ بن اسماعیل تبوذکی سے سن لوں گا، عفان نے کہا: تم جانو، اس کے بعد یحییٰ بن معینؒ بصرہ چلے آئے، اور موسیٰ بن اسماعیل کے پاس پہنچے، موسیٰ نے ان سے پوچھا: آپ نے یہ کتابیں کسی سے نہیں سنیں؟ کہا: سترہ لوگوں سے مکمل سنی ہے، آپ اٹھارویں شخص ہیں، انھوں نے

(۱) ''العلل'' للامام احمد (۲۷۲، ۴۲۶۳)

پوچھا: اس کا کیا فائدہ ہے؟ کہنے لگے: دراصل حماد بن سلمہ سے متعدد غلطیاں ہوئی ہیں، میں ان کی غلطیوں کو دوسروں کی غلطیوں سے ممتاز کرنا چاہتا ہوں؛ جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کے تمام شاگرد کسی غلطی پر متفق ہیں تو سمجھ جاتا ہوں کہ یہ غلطی حماد سے ہوئی ہے، اور اگر سب کسی بات پر متفق ہوتے ہیں، کوئی ایک شاگرد ان کی مخالفت کر رہا ہوتا ہے، تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ غلطی اس شاگرد سے ہوئی ہے نہ کہ حماد سے، اس طرح میں امتیاز کر لیتا ہوں کہ کون سی غلطی حماد کی ہے اور کون سی ان کے شاگردوں کی ہے(۱)۔

بلند ہمتی فقر وفاقہ پر غالب آگئی:

اسلاف کی بلند ہمتی کے ان تذکروں، اور ان کے بلند حوصلوں کی ان داستانوں کے بیچ طلب علم کی راہ میں آنے والی ایک بڑی رکاوٹ اور ایک اہم مانع: فقر وفاقہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو اگرچہ بڑی رکاوٹ ہے؛ لیکن اسلاف کے بلند حوصلوں نے اسے بھی زیر کرلیا اور یہ مصیبت ان کی ہمت اور حوصلوں کو نہیں توڑ پائی، اللہ تعالیٰ فقیہ مزجَّد یمنی شافعی (متوفی ۹۳۵ھ) پر رحم فرمائے، وہ کہتے ہیں:

قيل للفقر: أين أنت مقيم؟ ❖ قال لي: في عمائم الفقها

إن بيني وبينهم لإخاءً ❖ وعزيزٌ علي قطع الإخاء

فقر سے کسی نے پوچھا: تمہارا ٹھکانہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: فقہاء کی دستار میں۔

میری تو ان سے دوستی ہے، اور دوستی کو ختم کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

حضرت ابوہریرہؓ کا فقر وفاقہ سے مقابلہ:

اِس باب سے متعلق گفتگو کا آغاز سیّدنا ابوہریرہؓ کی حدیث سے ہونا چاہیے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کو اشکال ہے کہ: ابوہریرہؓ بہت زیادہ حدیثیں بیان کرتے ہیں:

(۱) ''**المجروحين**'' لابن حبان ۱: ۳۲

میرا حال یہ تھا کہ جو کچھ کھانے کو مل جاتا اسی پر قناعت کر کے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر پڑا رہتا تھا، مجھے نہ کھانے کے لیے خمیر کی روٹی ملتی تھی، نہ پہننے کے لیے منقش حبری چادریں، نہ میری کوئی خدمت کرنے والا ہوتا تھا، میں بھوک کی وجہ سے اپنے پیٹ کو زمین سے چمٹا لیتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شخص میرے پاس سے گزرتا تو میں اسے قرآن کی کوئی آیت پڑھانے کے لیے کہتا، وہ آیت مجھے یاد ہوتی، میرا مقصد بس یہ ہوتا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائے اور کھانا کھلا دے (۱)۔

کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ بھوک کی شدت سے نڈھال اور بے حال بھی ہو جاتے تھے، انھوں نے خود اپنا حال بیان کیا ہے، ابنِ سیرینؒ کہتے ہیں کہ: ہم لوگ ابو ہریرہؓ کے پاس تھے، ان کے جسم پر کتان کے دو سرخ کپڑے تھے، جن میں انھوں نے ناک صاف کی، پھر کہنے لگے: کیا کہنے ابو ہریرہ کے! آج کتان کے کپڑے میں ناک صاف کرتا ہے، مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر اور حجرہ کے درمیان میں بے ہوش پڑا ہوتا تھا، اور لوگ مجنون سمجھ کر پاؤں سے گردن دباتے تھے؛ حالانکہ جنون نہیں تھا؛ بلکہ بھوک تھی (۲)۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

لیکن حضرت ابو ہریرہؓ اپنی علمی وارفتگی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی برکت سے اس فقر و فاقہ پر غالب آجاتے تھے، ان کے علم کے حریص ہونے کی گواہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے؛ ایک مرتبہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ: قیامت کے روز آپ کی شفاعت سے سب سے زیادہ نفع اُٹھانے والا کون ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے احادیث پر تمہاری حرص دیکھ کر یہی گمان تھا کہ اِس بات کو تم سے پہلے کوئی دوسرا شخص نہ پوچھے گا، قیامت کے دن میری شفاعت سے سب سے زیادہ نفع اٹھانے والا وہ شخص ہوگا جو اپنے دل کے خلوص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے (۳)۔

(۱) صحیح بخاری (۳۷۰۸) (۲) صحیح بخاری (۷۳۲۴) (۳) صحیح بخاری (۹۹)

فقر کے سلسلے میں ائمہ کے اقوال اور واقعات:

ابنِ عبدالبرؒ نے اپنی سند سے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: تمہیں علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ فقر کا مزہ نہ چکھ لو، اس کے بعد امام مالکؒ نے اپنے استاذ امام ربیعۃ الرائےؒ کا تذکرہ کیا کہ انھوں نے علم کی راہ میں کیسے کیسے فقر و فاقے جھیلے، یہاں تک کہ انھیں اپنے گھر کی شہتیر تک بیچنی پڑی؛ بلکہ مدینہ کے کوڑے خانوں میں پڑے ہوئے کھجور کے شیرے اور سوکھے انگور تک کھانے پڑے!!(۱)۔

اس کے بعد ابنِ عبدالبرؒ نے اپنی سند سے شعبہ بن حجاجؒ کا یہ قول ذکر کیا ہے: "**من طلب الحدیث فقد أفلس**" کہ جو حدیث کی طلب میں لگا وہ فقر کا شکار ہوا، ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک عجیب و غریب آثار ابنِ عبدالبرؒ نے ذکر کیے ہیں، جن میں طالبِ علم پر گزرنے والے احوال کا ذکر ہے، یہ آثار میرے استاذ محترم کی کتاب "**صفحات من صبر العلماء علیٰ شدائد العلم والتحصیل**" میں بھی موجود ہیں، ان کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، ان احوال کے بعد پھر اللہ تعالیٰ خوش حالی بھی عطا فرماتے ہیں۔

فقر و فاقے میں انھیں لذت ملتی تھی:

اگر اسلاف کو یہ فقر و فاقہ اور یہ تنگیاں ناگوار گزرتیں اور ان کو وہ زندگی کے لیے وبال سمجھتے، تو اپنی حیرت انگیز صلاحیتیں جن کے ذریعہ انھوں نے علومِ دینیہ میں عجیب و غریب مہارتیں پیدا کیں، دنیوی علوم میں لگا دیتے، پھر انھیں ان سب پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا؛ لیکن وہ تو ان سختیوں کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے، انھیں تھکن کے اندر راحت ملتی تھی، اور گرمی کی سخت گھڑیوں میں لطف محسوس ہوتا تھا۔

وہ لوگ اپنی بے نیازی و خودداری اور دنیا والوں کی ذلت و خواری کی وجہ سے اپنے

(۱) جامع بیان العلم (۵۹۶)

آپ کو مالدار اور دنیا والوں کو فقیر ومحتاج سمجھتے تھے، اسی مفہوم کو امام حکیم خلیل بن احمد فراہیدیؒ نے اپنے ان چار اشعار میں ادا کیا ہے، جو انھوں نے فارس کے حاکم کے نام لکھے تھے، جن کا آخری شعر ہے:

الفقر في النفس لا في المال نعرفه ❖ ومثل ذاك الغنى في النفس لا المال

ہمارا ماننا ہے کہ فقر کا تعلق دل سے ہے نہ کہ مال سے، اسی طرح مالداری کا تعلق بھی دل سے ہے نہ کہ مال سے۔

انھوں نے یہ بھی کہا تھا:

إن الذي شق فمي ضامن ❖ للرزق حتى يتوفاني

جس نے میرا منہ کھولا ہے اور مجھے حیات عطا کی ہے، وہی موت تک میرے رزق کا بھی ضامن ہے(۱)۔

یہ حضرات فقر و فاقہ کے زور کو صبر وتوکل اور یقین کے ذریعہ مات دیتے تھے، اور اپنی صبح وشام علم ومعرفت کی راحتوں اور عبادت وقربِ خداوندی کی لذتوں میں گزارتے تھے؛ اسی لیے مصائب وآلام کی تکلیفیں ان کے خوددار دلوں اور تعلق مع اللہ کی دولت سے سرفراز روحوں تک نہیں پہنچ پاتی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتے، انھیں تکلیفوں سے نجات دلاتے، اور ان کے لیے اپنے ان بندوں کے دلوں کو جو ان سے غافل ہوتے مسخر کر دیتے تھے۔

فقر اور تنگی کے وقت اللہ تعالیٰ کی مدد کے واقعات

حسن بن سفیان نسویؒ کا حیرت انگیز واقعہ:

اس سلسلے میں ایک واقعہ حافظ ابنِ عساکرؒ نے اپنی تاریخ میں (۲) امام حافظ ابوالعباس

(۱) اس کا واقعہ دیکھیے ''صفحات من صبر العلماء'' ص ۱۶۶

(۲) ۱۳: ۱۰۳-۱۰۴ ابن عساکر کی سند سے ابن العدیم نے بھی ''بغیۃ الطلب فی تاریخ حلب'' ☜

حسن بن سفیان نسویؒ کے تذکرے میں لکھا ہے، نسویؒ ملک خراسان کے شہر نسا کی طرف منسوب ہے، ابوالعباس کی وفات ۳۰۳ھ میں ہوئی، نوے سال یا اس سے کچھ زائد عمر پائی، اور علم کے لیے کافی طویل اسفار کیے۔

ابنِ عساکرؒ نے اپنی سند سے ابوالحسن صفار سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ زہد وتقویٰ کے پیکر امام حسن بن سفیان نسویؒ کے پاس علم حاصل کرتے تھے، ان کے پاس کچھ بڑے گھرانے کے طلبہ بھی جمع تھے، جو دُور دراز کے علاقوں سے چل کر آئے تھے اور ان کے حلقے میں آ کر علم حاصل کرتے اور حدیثیں لکھتے تھے۔

ایک روز وہ اپنے حلقۂ درس میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ: آج میں املاء لکھوانے سے پہلے تم سے کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں:

مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ نعمتوں کے پروردہ اور اہلِ ثروت ہو، تم نے علم حاصل کرنے اور حدیثیں جمع کرنے کے لیے بڑی قربانیاں دیں، اپنے وطن کو چھوڑا، اپنے دیار کو خیر باد کہا اور اپنے متعلقین سے جدائی اختیار کی؛ لیکن ہرگز یہ مت سمجھنا کہ تم نے یہ مشقتیں اُٹھا کر علم کا حق ادا کر دیا، یہ تکلیفیں اور یہ مصائب جھیل کر تم نے اس کا فرض نبھا دیا، سنو میں تمہارے سامنے اپنی ایک داستان سناتا ہوں کہ میں نے علم کے لیے کیسی کیسی پریشانیاں جھیلی اور کیسی کیسی مشقتیں اُٹھائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے علم اور صحیح عقیدے کی برکت سے کس طرح ہماری مدد کی اور ہمیں ان پریشانیوں سے باہر نکالا۔

میں عنفوانِ شباب میں علم حاصل کرنے اور حدیثیں لکھنے کے لیے اپنے وطن سے نکلا، اور مغرب کے کنارے سے گزرتا ہوا مصر پہنچا، میرے ساتھ نو ساتھی تھے، وہ سب علم اور حدیث کی طلب میں نکلے تھے، ہم وہاں ایک شیخ کے پاس جانے لگے جو اس زمانے میں

☜ (۵:۰۷ ۲۳) میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے تاریخ ابن عساکر میں چار کلمات محرف تھے میں نے ان کی تصحیح کر دی ہے۔

علمی مقام و مرتبے کے اعتبار سے سب سے بڑے اور درایت میں سب سے فائق سمجھے جاتے تھے، ان کی اسناد سب سے عالی اور روایتیں سب سے زیادہ صحیح مانی جاتی تھیں۔

لیکن وہ ہمیں روزانہ تھوڑی ہی حدیثیں لکھواتے تھے، جن کی وجہ سے وہاں قیام کی مدت کافی طویل ہوگئی، اور پیسے ختم ہونے لگے، مجبوراً ہمیں اپنے کپڑے بیچ کر کھانے کا انتظام کرنا پڑا، پھر یہ نوبت بھی آئی کہ ہمارے پاس کوئی چیز باقی نہیں رہی، جسے بیچ کر ہم ایک وقت کے کھانے کا انتظام کرسکیں، ہم نے تین دن اور تین راتیں بھوک اور انتہائی پریشانی کے عالم میں گزاریں، اس عرصے میں ہم میں سے کسی نے کچھ بھی نہیں چکھا، چوتھے روز جب ہم نے صبح کی تو بھوک اور کمزوری کی وجہ سے اس قدر نڈھال تھے کہ چلنے پھرنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔

اب ضرورت ہمیں مجبور کررہی تھی کہ ہم شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیں؛ لیکن یہ ہمارے لیے بہت شاق تھا، ہمارا دل کسی بھی صورت اس پر آمادہ نہیں تھا، کوئی بھی ہم میں سے اس کے لیے تیار نہیں ہوا؛ لیکن ضرورت تو بہر حال مجبور کررہی تھی، مانگنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

سب کی رائے ہوئی کہ چٹھی لکھ کر قرعہ اندازی کرلی جائے، جس کے نام بھی قرعہ نکلے، وہ لوگوں سے مانگ کر لائے اور اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے کھانے کا انتظام کرے۔

شومئ قسمت دیکھیے کہ قرعہ میرے ہی نام نکلا، میں بہت پریشان اور دل گرفتہ ہوا، میرا دل بالکل بھی ہاتھ پھیلانے اور اس ذلت کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا، میں مسجد کے ایک کونے میں چلا گیا، اور نماز میں مشغول ہوگیا، میں نے پورے اخلاص کے ساتھ دو طویل رکعتیں پڑھیں، جن کے اندر میں نے اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور بلند کلمات کے ذریعہ خوب دعائیں مانگیں کہ اللہ ہمیں اس پریشانی سے نجات دلادے، اور آسانی کی کوئی صورت پیدا فرمادے۔

ابھی میں نماز ہی میں تھا کہ ایک خوبصورت سا نوجوان صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اور عمدہ خوشبو لگائے ہوئے مسجد میں داخل ہوا، اس کے پیچھے ایک خادم بھی چلا آرہا تھا، جس کے ہاتھ میں ایک رومال تھا، اس نوجوان نے پوچھا تم میں حسن بن سفیان کون ہے؟ میں نے سجدے سے سر اُٹھایا اور پوچھا: کیا بات ہے، میں ہی حسن بن سفیان ہوں؟ کہنے لگا: امیر طولون نے آپ لوگوں کو سلام کہا ہے، وہ معذرت خواہ ہیں کہ آپ لوگوں کی خبر گیری میں غفلت اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوئی، انھوں نے کچھ پیسے بھی بھیجے ہیں جو آپ لوگوں کے خرچ کے لیے کافی ہوجائیں گے، کل امیر محترم بذاتِ خود ملاقات کے لیے تشریف لائیں گے اور خود اپنی زبان سے معذرت پیش کریں گے، یہ کہہ کر اس نوجوان نے ہم میں سے ہر ایک کے سامنے تھیلیاں رکھ دیں جن میں سو سو دینار تھے۔

ہمیں یہ سب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی، ہم نے اس سے پوچھا کہ: قصہ کیا ہے؟ کہنے لگا: میں امیر طولون کے خاص خدام، اور ان کے عزیز و اقارب سے تعلق رکھنے والوں میں ہوں، میرا شمار امیر کے خاص مصاحبین میں ہوتا ہے، میں آج صبح حسبِ معمول دیگر مصاحبین کے ہمراہ امیر کے پاس پہنچا اور سلام کیا تو امیر ہم سے کہنے لگے: آج میں تنہائی چاہتا ہوں، تم لوگ واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔

ہم لوگ واپس ہوگئے، ابھی میں گھر پہنچا ہی تھا اور ٹھیک سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اتنے میں امیر کا قاصد بھاگتا ہوا آیا، اور کہنے لگا کہ: امیر تمھیں فوراً بلا رہے ہیں، میں دوڑتا ہوا امیر کے پاس پہنچا، تو دیکھا کہ وہ ایک کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے ہیں اور شدید درد کی وجہ سے انھوں نے اپنا کولہا پکڑ رکھا ہے، وہ مجھ سے پوچھنے لگے: حسن بن سفیان اور ان کے ساتھیوں کو جانتے ہو؟ میں نے کہا: نہیں، کہنے لگے: فلاں محلّے کی مسجد میں چلے جاؤ اور یہ تھیلیاں لے کر جاؤ، اور اسی وقت سفیان اور ان کے ساتھیوں کے حوالے کردو، وہ تین دن سے بھوکے ہیں اور سخت حالات سے دوچار ہیں، انھیں میری طرف سے عذر پیش کر دینا

اور کہنا کہ: کل صبح میں خود ان کے پاس آؤں گا اور بذاتِ خود معذرت پیش کروں گا۔

نوجوان کہنے لگا: میں نے امیر سے اس کا سبب دریافت کیا، تو وہ کہنے لگے کہ: تم لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد اس کمرے میں آیا، میں تنہا تھا، مجھے تھوڑی دیر آرام کی ضرورت تھی، میں لیٹ گیا، جب میری آنکھ لگی تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص فضا میں گھوڑے پر سوار ہے، اور انداز ایسا ہے جیسے زمین پر چل رہا ہو، اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ بھی ہے، یہ منظر دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا، ابھی میں حیرت واستعجاب کے عالم میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ اس کمرے کے دروازے کے پاس اُتر آیا اور اپنے نیزے کے نچلے حصے کو میرے کولہے پر رکھ دیا، اور کہا: کھڑے ہو جاؤ اور حسن بن سفیان اور اس کے ساتھیوں کے پہنچو، کھڑے ہو جاؤ اور ان کے پاس پہنچو، کھڑے ہو جاؤ اور ان کے پاس پہنچو، کھڑے ہو جاؤ اور ان کے پاس پہنچو، وہ فلاں مسجد میں تین دن سے بھوکے ہیں، میں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ کہنے لگا: میں جنت کا داروغہ رضوان ہوں، امیر نے بتایا کہ: جب سے اس نے میرے کولہے میں نیزہ لگایا ہے، شدید درد ہو رہا ہے، میں حرکت بھی نہیں کر پا رہا ہوں، اس پیسے کو جلد سے جلد پہنچاؤ؛ تا کہ میرا یہ درد ختم ہو۔

حسن کہتے ہیں کہ: اس نوجوان سے یہ کہانی سن کر ہمیں بہت تعجب ہوا اور ہم نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا، اور اپنے احوال درست کیے، پھر ہم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا کہ کل امیر ملاقات کے لیے آئیں گے اور لوگوں کو ہمارے احوال اور ہمارے واقعہ کی اطلاع ہو جائے گی، اور خواہ مخواہ ہمیں بڑا سمجھنے لگیں گے، ہماری شہرت ہوگی، اور ہمارے اندر ایک قسم کی رِیا پیدا ہو جائے گی [1]؛ اس لیے ہم لوگ راتوں رات مصر سے نکل گئے، اور پھر آگے چل کر ہم میں سے ہر ایک علم وفضل کا چمکتا ہوا ستارہ اور یکتائے روزگار بنا۔

(۱) غور کیجیے! اس پریشانی کے وقت بھی کس طرح اپنے نفس کا محاسبہ ہو رہا ہے، اور کیسے اپنے احوال کی نگرانی کی جا رہی ہے! رضی اللہ عنہم وارضاہم۔

اگلے دن صبح امیر طولون ہم لوگوں سے ملاقات کے لیے مسجد پہنچے، اور ہمیں تلاش کروایا، پتہ چلا کہ ہم لوگ نکل چکے ہیں، تو پورے محلّے کو خرید کر اس مسجد اور مسجد میں آنے والے پردیسی مسافرین، اہلِ فضل اور طلبہ پر وقف کردیا کہ اس سے وہ اپنی ضروریات پوری کریں، اور بحسن وخوبی اپنے اُمور کو انجام دیں، اوران پریشانیوں سے دوچار نہ ہوں، جن سے ہم دوچار ہوئے، یہ سب کچھ دین کی قوت اور حسنِ اعتقاد کی برکتیں تھیں، یقیناً اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

اصل ماخذ میں سب جگہ طولون ہی لکھا ہوا ہے، جبکہ صحیح ابنِ طولون ہے[1]۔

---

(۱) یہ پورا واقعہ ابنِ عساکر اور ابنِ عدیم سے منقول ہے، حافظ ذہبیؒ نے بھی سیر (۱۴/۱۶۱) میں تقریباً انھیں الفاظ اور قدرے تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے، وہاں بھی امیر کا نام طولون ہی لکھا ہے، حافظ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ: حافظ عبدالغنی مقدسی نے چوتھی حکایت کے اندر اس واقعہ کو ذکر کیا ہے، اس کی صحت کا حال اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، طولون تو مصر کا حکمراں ہوا ہی نہیں، اور اس کا بیٹا احمد ابنِ طولون حکمراں تو ہوا؛ مگر اس واقعہ کے وقت وہ چھوٹا تھا، اس واقعہ کا ناقل بھی مجھے معلوم نہیں؛ لیکن یہ بات ناممکن بھی نہیں ہے۔

میں کہتا ہو کہ: ابنِ عساکر جیسے حافظ اور امام اِس بات کی تصویب کررہے ہیں کہ یہ ابنِ طولون ہی ہیں، ابنِ عدیم نے بھی ان کی موافقت کی ہے، وہ بھی حافظ ہیں۔

رہا ذہبی کا یہ کہنا کہ: ابنِ طولون اس وقت چھوٹے تھے، تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ابنِ طولون کی پیدائش ۲۱۴ھ میں ہوئی اور ۲۵۴ھ میں حاکم بنے اور ۲۷۰ھ میں انتقال ہوا اور حسن بن سفیان کی وفات ۳۰۳ھ میں نوے سال کی عمر میں ہوئی، اس اعتبار سے ابنِ طولون کے حاکم بننے کے وقت ان کی عمر ۴۱ر سال تھی اور اس عمر میں محدثین اپنے علمی اسفار بند کردیا کرتے ہیں اور حدیث کے درس کے لیے بیٹھ جایا کرتے ہیں اور اس عمر سے پہلے اگر حسن نے سفر کیا ہو تو اس وقت ابنِ طولون امیر نہیں تھے کہ ان کا تذکرہ ہو، اور وہ یہ خواب دیکھیں؛ لیکن اس کے باوجود بھی ذہبیؒ نے یہ کہہ کر کہ ''یہ بات ناممکن بھی نہیں ہے'' اس واقعہ کو صحیح قرار دینے کی بہر حال گنجائش باقی رکھی ہے۔

ابنِ جریرؒ اور ان کے رفقاء کے ساتھ اللہ کی مدد کا واقعہ:

اسلاف کے واقعات میں سے ایک واقعہ: وہ ہے جو تاج سبکی نے اپنی سند سے ابوالعباس بکری سے نقل کیا ہے، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی نسل سے ہیں، فرماتے ہیں کہ: محمد بن جریر طبری، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی اور محمد بن ہارون رویانی یہ سب اپنے علمی اسفار کے دوران مصر پہنچے، اور ساتھ رہنے لگے، وہاں ان سب کا زادِراہ ختم ہوگیا، اور اتنا بھی نہیں بچا کہ ان کی کمر سیدھی رہ سکے، بھوک سے ان کا بڑا نقصان ہونے لگا۔

ایک رات وہ لوگ اس گھر میں جمع ہوئے جہاں وہ قیام پذیر تھے، اور یہ طے کیا کہ قرعہ اندازی کی جائے، اور جس کے نام بھی قرعہ نکلے وہ اپنے ساتھیوں کے لیے کھانا مانگ کر لائے، قرعہ ابنِ خزیمہ کے نام نکلا، وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے: مجھے تھوڑی سی مہلت دو، میں وضو کر کے استخارہ کی نماز پڑھنا چاہتا ہوں اور فوراً نماز میں مشغول ہوگئے، تبھی باہر کچھ مشعلیں نظر آنے لگیں اور ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک خصی شخص دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے جو والیٔ مصر کی طرف سے آیا ہوا ہے، ان لوگوں نے دروازہ کھولا، وہ شخص اپنی سواری پر سے اُترا اور پوچھنے لگا؟ تم میں محمد بن نصر کون ہیں؟ بتایا گیا کہ: یہ ہیں، اس نے ایک تھیلی نکالی جس میں پچاس دینار تھے، اور ان کے سپرد کردیا، پھر محمد بن جریر، محمد بن خزیمہ اور محمد بن ہارون ہر ایک کے بارے میں پوچھا، اور انھیں بھی اتنے ہی دینار دیے جتنے محمد بن نصر کو دیے تھے، پھر کہنے لگا کہ:

گزشتہ کل قیلولہ کے وقت امیر محترم کے خواب میں ایک گھوڑسوار نے آکر بتایا تھا کہ: مَحامد (یعنی چاروں محمد) سخت بھوک کی حالت میں ہیں؛ اس لیے امیر نے آج آپ لوگوں کے پاس دینار کی یہ تھیلیاں بھیجی ہیں، اور قسم دی ہے کہ جب یہ دینار ختم ہوجائیں تو مزید لینے کے لیے ضرور کسی کو بھیج دیں(۱)۔

(۱) طبقات سبکی ۲:۲۵۱

طلبہ کی ذہن سازی کی ضرورت:

الغرض یہ فقر و فاقہ صرف ان ہی لوگوں کے لیے علم کی راہ میں رکاوٹ بن سکا، جن کے پاس اتنے مضبوط حوصلے نہیں تھے کہ وہ اس ابتلاء و آزمائش کا مقابلہ کر سکیں، اب ضروری ہے کہ اساتذہ اور مربی حضرات اپنے طلبہ کو بھی فقر کے اس عارض کی طرف متوجہ کریں؛ تاکہ جب کبھی وہ اس آزمائش سے دوچار ہوں تو ثابت قدم رہ سکیں، اور جان لیں کہ یہ آزمائشیں چند روز کی ہیں، پھر ختم ہو جائیں گی، ان کے سلف صالحین پر بھی اس قسم کی آزمائشیں آ چکی ہیں، جس پر انھوں نے صبر و تحمل سے کام لیا اور جمے رہے، جس کے نتیجہ میں کامیابی و کامرانی نے ان کے قدم چومے۔

خطیب بغدادیؒ نے جلیل القدر امام ابراہیم نخعیؒ کا قول نقل کیا ہے: **"مَنِ ابتغى شيئًا من العلمِ يبتغي به وجهَ الله آتاه الله منه بما يكفيه"**[۱] جو شخص بھی اللہ کی رضا کے لیے علم حاصل کرے، اللہ تعالیٰ اس کو اتنا عطا فرمائیں گے، جو اس کے لیے کافی ہو جائے گا[۲]۔

---

(۱) **"آتاه الله منه بما يكفيه"** کا مطلب ہے **"آتاه الله من فضله ورزقه ما يكفيه"** کہ اللہ تعالیٰ اس کو اتنا رزق عطا فرمائیں گے جو اس کے لیے کافی ہو جائے گا، شاید انھوں نے **"آتی"** کے اندر **"أكرم"** فعل کی تضمین کی ہے؛ اسی لیے باء لے کر آئے، یعنی: **أكرمه الله من فضله بما يكفيه**، یہاں **ما يكفيه** سے رزق مراد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ: خطیب نے اس اثر سے پہلے ایک مرفوع روایت ذکر کی ہے، جو زیاد بن حارث صدائی کی سند سے ہے، اس میں رزق کی صراحت موجود ہے: **"من طلب العلم تكفّل الله رزقه"** جو شخص علم کی طلب میں لگ جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رزق کی کفالت فرماتے ہیں؛ البتہ یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔

(۲) **الجامع لأخلاق الراوي (۷۱)**

خلاصۂ کلام:

یہ تھی ہمارے اسلاف کی ہمت اور حوصلے کی داستان! میں اپنے پیارے قارئین سے کہنا چاہتا ہوں کہ: یہاں ٹھہریے اور غور کیجیے! کیا یہ واقعات او ان جیسے اور بہت سے واقعات محض افسانہ نگاری اور بیداری میں دیکھے جانے والے خواب ہیں، یا حقیقت کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں؟ یقیناً یہ حقیقت کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، یہ ان پاکیزہ ہستیوں کی سچی داستانیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت اور اپنی شریعت کو سیکھنے، سمجھنے اور ہم لوگوں تک پہنچانے کے لیے منتخب کیا تھا، اللہ نے ان کے ذریعہ اپنے دین کو مضبوط کیا اور اپنے دین کے ذریعہ ان کو قوت عطا فرمائی، اب ہمیں اس ربط اور تعلق کو سمجھنے کی ضرورت ہے، جو ان لوگوں کے درمیان اور اللہ کے اس وعدے کے درمیان ہے، جو اس نے اپنی کتاب اور اپنی شریعت کی حفاظت کے تعلق سے کیا ہے، ارشادِ باری ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ (الحجر) (ہم نے ہی قرآن کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) بلاشبہ حفاظت کا یہ وعدہ انہی قدسی صفات لوگوں کے ذریعہ پورا کیا گیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر ہی انھیں بعض ان نعمتوں کا مزہ چکھا دیا جو انھیں آخرت میں ملنے والی تھیں، انہی نعمتوں کی بدولت وہ سب کچھ جھیلتے رہے اور ڈٹے رہے، اگر وہ نہ جانتے کہ ان کے ذمہ اللہ کے کیا حقوق ہیں، اگر انھیں نہ معلوم ہوتا کہ اللہ کے نزدیک انھیں کیسا بلند مقام حاصل ہے، اگر انھیں ان مصائب کے اندر وہ حلاوت اور لذت نہ ملتی جو ان کے ساتھ پیش آنے والی ہولناکیوں کی کڑواہٹ اور تکلیفوں کو یکسر بھلا دیتی تھی، تو ہرگز وہ یہ سب کچھ نہ کر پاتے اور ہرگز ان مصائب کو نہ جھیل پاتے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور اسلام کے تئیں جو روشن خدمات انھوں نے انجام دی ہیں اس کا بہترین بدلہ انھیں عطا فرمائے، آمین۔

یہی لوگ ہر اعتبار سے ابوالعلاء معری کے اِس شعر کے سب سے زیادہ حقدار ہیں:

جمالَ ذي الأرض كانوي في الحياة وهم
بعد الممات جمال الكتب والسير

یہ لوگ زندگی میں زمین کے لیے باعثِ زینت تھے، اور مرنے کے بعد اب تاریخ
اور تذکرے کی کتابوں نے ان سے زینت حاصل کرلی ہے۔

بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صرف اور صرف یہی لوگ اس تشبیہ اور اس مدح سرائی کے مستحق ہیں۔

قارئین! کہاں تک آپ کو سنائیں، یہ داستان ایک طویل داستان ہے، یہ ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے، اور پھر ہمارے ائمہ کی علو ہمت کی داستانیں تو اور بھی طویل اور مزیدار ہیں۔

چھٹی مشعل

علم کے لیے ہر چیز سے یکسوئی

تعلقات اور مخل بننے والی تمام چیزوں سے یکسوئی اس راہ میں کامیابی کے لیے بنیادی شرط ہے، اگر طالبِ علم کے اندر یکسوئی نہ ہو تو وقت کی قدردانی اور علم کی حرص بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اس سلسلے میں چند باتیں عرض ہیں:

الف: اپنی ضروریات کو چھوڑنا

موانع سے بچنے کا نسخہ:

علم کی راہ کی رکاوٹیں اور علمی رسوخ سے باز رکھنے والے موانع بہت زیادہ ہیں، جن کو شمار کرانا مشکل ہے؛ کیونکہ موانع وہی شمار کرائے جاسکتے ہیں جو ذہن میں آئیں، اور ذہن میں وہی موانع آتے ہیں جو خود آدمی کے ساتھ پیش آئے ہوں یا کسی اور کے ساتھ پیش آئے ہوں اور اس نے بتادیا ہو؛ اور آپ جانتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ پیش آنے والے بہت سے واقعات اور حوادث ایسے ہوتے ہیں جن کا کسی کو علم نہیں ہو پاتا؛ اس لیے تمام موانع کا شمار کرانا مشکل ہے؛ البتہ ایک ضابطہ کی طرف طالب علم کی توجہ مبذول کرادینا اس سلسلے میں کافی معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ: طالب علم اپنے آپ پر اور اپنے وقت پر کڑی نگاہ رکھے، اور جو چیز بھی اسے ایسی نظر آئے جس سے اس کی تعلیمی مشاغل اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کسی قسم کا خلل پڑ رہا ہو، تو سمجھ لے کہ یہ چیز علم کے لیے مانع اور

رکاوٹ ہے، اس کو فوراً چھوڑ دے اور اس سے قطع تعلق کر لے اور جان لے کہ اگر اس نے اسے نہ چھوڑا تو اس کے لیے اپنے ہدف کو پانا اور کامیابی تک پہنچنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

یکسوئی کے حوالے سے امام ابو یوسفؒ کا قیمتی ملفوظ:

علم کے لیے یکسوئی کی ضرورت کو امام ابو یوسفؒ نے کیا ہی عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: **العلم شيء لايعطيك بعضه حتى تعطيه كلك وأنت إذا أعطيته كلك: من إعطائه البعض على غَرَر.** [1] علم ایسی چیز ہے جو تمھیں اپنا تھوڑا حصہ بھی نہیں دے سکتی، جب تک کہ تم اپنا کل کا کل اس کے حوالے نہ کر دو، اور کل حوالے کرنے کے بعد بھی دونوں احتمال موجود ہیں: ممکن ہے وہ تمھیں اپنا تھوڑا حصہ دے دے اور ممکن ہے تب بھی کچھ نہ دے (۲)۔

اس کے بعد خطیب نے ابو احمد نصر بن احمد عیاضی فقیہ کا قول نقل کیا ہے کہ: اس علم کو وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو اپنی دکان پر تالا ڈال دے، اپنے باغیچہ کو ویران کر دے، اپنے بھائیوں اور دوستوں کو خیر باد کہہ دے اور قریب ترین رشتہ دار کی موت پر بھی اس کے جنازے میں شریک نہ ہو۔

بیٹے کی تجہیز و تکفین میں شرکت سے انکار:

عیاضی کے حالات تو مجھے نہیں مل سکے؛ لیکن شاید انھوں نے اپنے اس جملے سے کہ

---

(۱) خطیب نے ''جامع'' (۱۵۷۰) میں اپنی سند سے یہ قول نقل کیا ہے

(۲) امام ابو یوسفؒ کی وفات ۱۸۳ھ میں ہوئی، خطیبؒ نے تاریخ بغدادی (۶/ ۶۲۵) کے اندر اس جملے کو جاحظ کی روایت سے ابراہیم نظّام (متوفی ۲۱۳ھ) کی طرف منسوب کیا ہے، اور ابو ہلال عسکریؒ نے اس کو ''**الحث علیٰ طلب العلم**'' (ص/ ۴۲) میں خود جاحظ کی طرف منسوب کیا ہے، جاحظ کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی۔

''قریب ترین رشتہ دار کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو'' امام ابو یوسفؒ کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، جو موفق مکی نے [۱] نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ فرماتے تھے کہ: میرا ایک بیٹا انتقال کر گیا؛ لیکن میں یہ سوچ کر کہ امام صاحب کی کوئی بات چھوٹ جائے گی، تو زندگی بھر اس کی حسرت رہے گی، اپنے بیٹے کی تجہیز وتکفین میں شریک نہیں ہوا اور پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے کہہ دیا کہ وہ اس کا انتظام کر دیں [۲]۔

اسی جیسا واقعہ امام حافظ منذریؒ کا بھی ہے، جب انھوں نے قاہرہ میں دار الحدیث کاملیہ کے اندر اپنے آپ کو محبوس کر لیا تھا، ان کے جواں سال بیٹے محمد کا انتقال ہو گیا، جن کی عمر صرف تیس سال تھی، اور اتنی ہی عمر میں انھوں نے علم کے اندر رُسوخ پیدا کر لیا تھا، منذریؒ نے مدرسے کے احاطے میں ہی ان کی نمازِ جنازہ پڑھی، جنازے کے بعد دروازے تک ساتھ آئے، اور پُرنم آنکھوں سے فرمایا: بیٹا جاؤ اب اللہ کے حوالے، اور وہیں سے رخصت کر کے واپس آ گئے [۳]۔

تقریباً اسی جیسا واقعہ ہمارے حلب کے شیخ علامہ محمد راغب طباخ کا بھی ہے، جو میرے والد ماجد نے ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا تھا کہ: شیخ کے بڑے لڑکے کا انتقال ہو گیا جوان کے کتب خانے (مطبعہ علمیہ) کی دیکھ ریکھ کرتے تھے، انتقال کے اگلے روز ہی شیخ سبق پڑھانے مدرسہ خسرویہ پہنچ گئے، جو حلب کے اندر قدیم دینی ادارہ ہے، طلبہ کو یہ دیکھ بڑی حیرت ہوئی، پہلے تو انھوں نے آپس میں سرگوشیاں کی، اس کے بعد شیخ کے سامنے اپنی

(۱) مناقب الامام ابی حنیفہ ص ۴۷۲

(۲) یہی وجہ تھی کہ خود امام صاحب نے امام ابو یوسفؒ کی شدتِ ملازمت کی گواہی دی؛ چنانچہ موفق مکی نے اپنی سند سے امام صاحب کا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ: جیسی ملازمت میری ابو یوسف نے اختیار کی، کسی نے بھی نہیں کی۔

(۳) طبقات سبکی ۸: ۲۶۰

حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ: حضرت! رات ہی آپ نے اپنے بیٹے کی تدفین کی ہے! اور آج سبق میں تشریف لے آئے، شیخ نے فرمایا کہ: بیٹا تو ہم نے کھو ہی دیا، کیا اب علم کی برکت بھی کھو دیں؟!

یکسوئی کے سلسلے میں برہان زرنوجیؒ کی نصیحت:

میں دوبارہ اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں کہ علم کے لیے تمام دنیوی تعلقات سے انقطاع ضروری ہے، برہان زرنوجیؒ کہتے ہیں: طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ جتنا ہو سکے اپنے دنیوی تعلقات کو کم کرنے کی کوشش کرے، ہمارے اسلاف اسی لیے پردیس کی زندگی اختیار کرتے تھے کہ تعلقات کم سے کم رہیں؛ نیز اس راہ میں طالبِ علم کو مشقتیں بھی جھیلنی پڑتی ہیں، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے علمی سفر کے دوران کہا تھا: ﴿لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ (الکہف) (ہمیں اس سفر میں بڑی تھکن ہوئی ہے)، اس طرح کی بات کسی اور سفر میں ان سے منقول نہیں ہے، انھوں نے بتادیا کہ یہ سفر تھکن اور مشقت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا۔

جو شخص ان مشقتوں پر صبر کرتا ہے، اسے ایسی لذت اور حلاوت نصیب ہوتی ہے جس کے سامنے تمام دنیوی لذتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں؛ اسی لیے امام محمدؒ راتوں میں مطالعہ کرتے ہوئے جب کوئی پیچیدہ مسئلہ حل ہو جاتا، تو بے ساختہ کہہ اُٹھتے تھے: "**أين أبناء الملوك من هٰذه اللذات؟**" شاہزادوں کو یہ لذتیں کہاں نصیب؟

طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ علم کے علاوہ کسی بھی چیز میں مشغول نہ ہو، اور علم کے اندر بطور خاص فقہ سے غفلت نہ برتے، امام محمدؒ فرماتے ہیں: جو شخص ایک گھڑی کے لیے بھی اس کو علم چھوڑنا چاہتا ہو، تو وہ اسی وقت چھوڑ دے اور فوراً علم سے کنارہ کشی اختیار کرلے، یہ علم تو ماں کی گود سے قبر کی آغوش تک مسلسل حاصل کرنے کی چیز ہے(۱)۔

(۱) تعلیم المتعلم ص ۸۳

جب کوئی حق شرعی یکسوئی سے مانع بنے:

اس سلسلے میں ایک اہم چیز کی طرف طالبِ علم کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے، وہ یہ کہ طالبِ علم کے سامنے کبھی ایسی چیز آجاتی ہے، جس میں ایک طرف تو حق شرعی ہوتا ہے، جس کی ادائیگی شرعاً مطلوب ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کو انجام دینے میں یہ خدشہ ہوتا ہے کہ علم کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا ہوجائیں، میں صرف رکاوٹوں کی بات کررہا ہوں، نہ کہ علمی سفر کے لیے بالکلیہ مانع بن جانے کی، کہ وہ تو اور آگے کی چیز ہے، ایسے موقعوں پر طالبِ علم کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیے: سبکیؒ نے اپنی ''طبقات وسطی'' میں[1] امام سلیم بن ایوب رازیؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ: وہ بغداد میں علم حاصل کرنے کے لیے نکلے، لوگ بتاتے ہیں کہ: حصولِ علم کے دوران ان کے گھر سے جو بھی خطوط آتے تھے، وہ ان کو پڑھنے کے بجائے یوں ہی رکھ لیتے تھے، جب پڑھ کر فارغ ہوگئے، تب ان خطوط کو نکال کر پڑھنا شروع کیا، کسی میں لکھا تھا: ماں کا انتقال ہوگیا ہے، کسی میں اور کوئی اندوہناک خبر تھی، کہنے لگے: اگر میں پڑھائی کے دوران ہی ان خطوط کو پڑھتا تو یقیناً یہ مجھے حصولِ علم سے روک دیتے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ میں نے اپنے شہر حلب کے جلیل القدر عالم ربانی شیخ احمد بن عبدالکریم ترمانینی حلبیؒ (۱۲۰۸-۱۲۹۳) کے بارے میں اپنی طالبِ علمی کے ابتدائی زمانے میں سنا تھا، پھر میں نے شیخ راغب طباخؒ کو بھی دیکھا کہ انھوں نے اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو ذکر کررکھا ہے، میں وہیں سے نقل کرکے پیش کرتا ہوں، انھوں نے لکھا ہے کہ: شیخ ترمانینیؒ نے ازہر میں تیرہ سال گزارے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: وہ اس مدت میں علم کے علاوہ کسی بھی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، حتیٰ کہ ان کے گھر سے جو خطوط آتے تھے وہ انھیں بھی نہیں پڑھتے تھے؛ بلکہ اُٹھا کر ایک طاق پر رکھ لیتے، جب پڑھائی مکمل

(۱) جو ''طبقات کبری'' ۴: ۳۸۹ کے حاشیہ میں ہے

ہوگئی اور گھر جانے کا ارادہ کیا، تب ان خطوط کو کھول کر دیکھا، کسی میں شادی کی اطلاع تھی، کسی میں انتقال کی خبر تھی، کسی میں کچھ اور، یہ سب کچھ انھوں نے اس لیے کیا کہ علم سے کوئی بھی چیز غافل نہ کرنے پائے(۱)۔

ان دونوں واقعات اور ان جیسے واقعات کو ذکر کر کے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسے موقعوں پر کبھی طالبِ علم کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ شرعی پہلو یعنی والدین کے حقوق کا لحاظ کرنا چاہیے، اور ان کے احوال کی خبر گیری کرنی چاہیے؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب وہ ان کے احوال معلوم کرتا ہے، اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ والدین پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں، تو وہ پڑھائی چھوڑ کر اپنے والدین کے پاس چلا جاتا ہے، اور اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے؛ اس لیے ایسے مواقع پر فیصلہ کرنے سے قبل ضروری ہے کہ: معاملہ کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ہو، عمومی مصلحت کو خصوصی مصلحت پر ترجیح دینے کا ضابطہ مدنظر رہے، اور اس قسم کی اور دیگر وجوہِ ترجیح میں غور کرلیا جائے، صرف جذبات کو حق شرعی پر ترجیح نہ دی جائے، باقی اللہ بہتر جانتے ہیں۔

(ب): اہل وعیال اور معاش کی فکر:

دنیوی تعلقات اور موانع میں سے ایک اہم چیز اہل وعیال اور معاش کی فکر ہے، خطیب بغدادیؒ نے باب باندھا ہے: **"باب حذف المتفقه العلائق"** (طالبِ فقہ کا ہر چیز سے بے تعلق ہوجانا)، اس کے تحت لکھتے ہیں کہ: بعض فلاسفہ کا معمول تھا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو نہیں پڑھاتے تھے جس کا دنیا کی کسی بھی چیز سے تعلق ہو، اور کہتے تھے کہ: یہ علم کے شایانِ شان نہیں کہ اس کے بجائے کسی اور چیز میں مشغول ہوجائے(۲)۔

(۱) إعلام النبلاء ۷:۳۵۲

(۲) اداب الفقيه والمتفقه ۲:۱۸۴

صیمری نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ: ایک شخص نے امام ابوحنیفہؒ سے دریافت کیا: فقہ کے مسائل کو یاد کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے کیا چیز معین بن سکتی ہے؟ فرمایا: یکسوئی اور دلجمعی، وہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: یکسوئی کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ فرمایا: ہر چیز سے بے تعلق ہو جاؤ، میں نے پوچھا: بے تعلقی پیدا کرنے کا کیا راستہ ہے؟ فرمایا: اشیاء کو بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت ہی استعمال کرو(۱)۔

اِس باب کی ابتداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پاک ارشاد سے ہونی چاہیے، جو متعدد صحابہؓ سے مروی ہے: "**إن هٰذا الولد مبخلة مجبنة مجهلة محزنة**"(۲) یہ بچے بخیل بنانے والے، بزدل بنانے والے، جاہل بنانے والے اور غم میں مبتلا کرنے والے ہوتے ہیں، لفظ "**مجهلة**" یہاں ہمارے موضوع سے متعلق ہے، علامہ مناویؒ اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: بچے جاہل بنانے والے اس لیے ہوتے ہیں کہ بچوں کی وجہ سے آدمی نہ علم کے لیے سفر کر پاتا ہے، نہ علم کے حصول میں محنت کر پاتا ہے؛ کیونکہ ہر وقت ان کے نان ونفقہ کی فکر سوار رہتی ہے(۳)۔

حافظ ابنِ عساکرؒ نے(۴) امام احمد بن فرات رازیؒ (متوفی ۲۵۸ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے، جو کثرتِ حفظ اور محفوظات کے استحضار کے سلسلے میں عجوبۂ روزگار تھے، وہ فرماتے تھے: میں یزید بن ہارونؒ کے حلقۂ درس میں حاضر ہوا، انھوں نے کل تیس حدیثیں

(۱) **أخبار أبي حنيفة وأصحابه** ص ۲۲

(۲) یہ حاکم (۵۲۸۴) کے الفاظ ہیں، جو اسود بن خلف سے مروی ہیں، حافظ عراقی نے "تخریج احادیث احیاء" (۲۶۱/۳) میں اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے، میں نے باغندی کی "مسند عمر بن عبدالعزیز" کی حدیث نمبر ۱۸ پر جو حاشیہ لکھا ہے اسے ضرور پڑھیے۔

(۳) فیض القدیر ۲: ۴۰۳

(۴) اپنی تاریخ ۵: ۱۵۵ میں

املاء کرائیں، میں نے لکھنے کے بجائے انھیں زبانی یاد کرلیا، اور گھر آ کر انھیں لکھنے لگا، ابھی تین حدیثیں لکھی تھیں کہ باندی نے آ کر اطلاع دی کہ: آٹا ختم ہوگیا ہے، بس ساری حدیثیں میرے ذہن سے نکل گئیں، صرف وہی تین حدیثیں محفوظ رہ پائیں (جو لکھ لی تھیں)(۱)۔

اساتذہ اور شیوخ کی زبان سے یہ جملہ بار بار سننے کو ملتا ہے کہ: اگر مجھے پیاز خریدنے کی ذمہ داری دے دی جاتی تو میں ایک مسئلہ بھی نہ سیکھ پاتا، ابنِ بدر جماعہؒ نے اسے **"وما يقال عن الشافعي"** کہہ کر نقل کیا ہے(۲)، کہ یہ جملہ امام شافعیؒ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔

(ج): دوستوں کے ساتھ وقت گزاری اور عوام سے تعلقات ایک بڑی رکاوٹ:

علم کے لیے ایک بہت بڑا مانع دوستوں کے ساتھ وقت گزاری اور لوگوں سے تعلقات بنانا بھی ہے، اس کے نقصانات اور غلط اثرات ان لوگوں کے اعتبار سے کم زیادہ ہوتے ہیں جن سے آپ کے تعلقات ہیں، اگر وہ عمدہ اخلاق اور اچھی صفات کے حامل ہوں، تو ان کے نقصان کا دائرہ محدود رہتا ہے، صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ رہ کر طالبِ علم کا وقت ضائع ہوتا ہے، اور جتنی دیر طالبِ علم ان کے ساتھ لگا رہتا ہے، اس عظیم کام سے غفلت رہتی ہے، جس کے لیے اس نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے؛ لیکن اگر ان

(۱) اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ دورانِ درس استاذ جو زائد باتیں بتاتے ہیں جو کتاب میں لکھی ہوئی نہیں ہوتیں، انھیں ضرور نوٹ کرلینا چاہیے؛ ورنہ آپ نے دیکھا کہ جو حدیثیں انھوں نے لکھ لی تھیں وہ محفوظ رہ گئیں، اور جو نہ لکھ سکے وہ ضائع ہوگئیں، امام غزالیؒ کا ڈاکوؤں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، اس سے بھی یہی سبق ملتا ہے، یہ واقعہ صفحہ ۲۹۹ پر آرہا ہے۔

(۲) **التذكرة** ص ۷۱

کے اخلاق بھی اچھے نہ ہوں، تو پھر طالب علم کا وقت بھی برباد ہوتا ہے، اور علم بھی ضائع ہوجاتا ہے؛ کیونکہ وہ لوگ اپنی طبیعت اور فطرت کی وجہ سے اس عظیم کام پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کے لیے طالبِ علم نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے، اور بزبان حال اسے علم حاصل کرنے سے روکتے ہیں، اور اس طرح وہ ضائع ہوجاتا ہے۔

اسی لیے جن علماء نے علم اور طلبہ واہلِ علم کے آداب بیان کیے ہیں، وہ اس مرض سے بچنے کی بہت تلقین کرتے ہیں، وہ طلبہ کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ آپ اپنے ہی جیسے طلبہ کو دوست اور ساتھی بنائیں، جو آپ کے ساتھ فضول باتوں کے بجائے علمی مذاکرہ کیا کریں۔

اور یہ مقولہ تو زبان زد خاص وعام ہے: **قل لي من تصاحب أقل لك من أنت** "تم مجھے یہ بتادو کہ تم کس کے ساتھ رہتے ہو، میں بتادوں گا کہ تم کیسے آدمی ہو۔

اختلاط کے سلسلے میں امام صاحبؒ کی قیمتی نصیحتیں:

امام صاحبؒ نے امام ابو یوسفؒ کو جو وصیتیں کی تھیں اُن میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ: لوگوں کے ساتھ زیادہ اختلاط مت رکھو، الا یہ کہ وہ خود تمہارے ساتھ رہیں، اور جب ان کے ساتھ رہو تو مسائل کے مذاکرے کیا کرو، اس سے یہ ہوگا کہ جس کے اندر علم کی اہلیت ہوگی وہ علم کی راہ پر لگ جائے گا، اور جس کے اندر اہلیت نہیں ہوگی وہ ناراض ہوئے بغیر تم سے دُور ہوجائے گا، اور تمہارے اِردگرد بھی پھٹکنا گوارا نہیں کرے گا(۱)۔

لوگوں سے یکسو ہونے کا ایک عبرت آموز واقعہ:

میں صرف ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں جس سے آپ کو قطع تعلقات بالخصوص عمومی قسم کے تعلقات قطع کرنے کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، آپ دیکھیں گے کہ اس چیز نے ایک نوجوان کی زندگی میں کیسا عظیم علمی انقلاب پیدا کیا۔

(۱) **مناقب الإمام الأعظم للموفق المكي** ص ۳۷۳

کاتب ابوجعفر احمد بن یوسف بغدادی مصریؒ اپنی کتاب ''المکافات''(۱) میں لکھتے ہیں کہ: شجاع بن اسلم نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ: انھوں نے ایک روز سند بن علی سے دریافت کیا کہ: آپ مامون تک کیسے پہنچے؟ اور ان کے ہم نشینوں میں کیسے شامل ہوئے؟ اس کا سبب کون بنا؟ انھوں نے کہا: یہ ایک لمبا واقعہ ہے:

ہوا یوں کہ میرے والد بادشاہ کے کچھ متعلقین کے ساتھ، جنھیں میرے والد سے بڑی محبت تھی، علمِ نجوم کے ذریعہ پیسے کماتے تھے، ادھر میرے دل ودماغ پر ''اقلیدِس'' پڑھنے کے بعد ''مجسطی'' پڑھنے کا شوق سوار ہوا، اس زمانے میں بازار کے اندر معروف نامی ایک شخص مجسطی کی کتابت کرتا تھا، وہ اس کو لکھتا، اس کی شکلیں بناتا، اور پھر جلد باندھ کر اس کو بیس دینار میں فروخت کرتا تھا، میں نے اپنے والد صاحب سے بتایا کہ: مجھے یہ کتاب خریدنی ہے، انھوں نے کہا: بیٹا! تھوڑا ٹھہر جاؤ، کچھ پیسے ہاتھ آجائیں، یا تو وظیفہ مل جائے یا کچھ عطیہ مل جائے، پھر میں تمھیں خرید کر دے دوں گا۔

میرا ایک بھائی بھی تھا، جسے میری طرح لکھنے پڑھنے کا شوق نہیں تھا، وہ والد صاحب کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاتا اور ان کی دیکھ ریکھ کرتا تھا۔

جب والد صاحب نے میرے مطالبہ کو ٹال دیا، اور وقت کافی گزر گیا، تو ایک روز واقعہ پیش آیا کہ میرے والد صاحب کسی سے ملنے کے لیے گئے، میں بھی ساتھ تھا، والد صاحب اندر گئے، میں باہر سواری تھامے کھڑا تھا، اس وقت میری عمر سترہ سال تھی، کچھ دیر بعد اندر سے کچھ غلام آئے اور کہنے لگے کہ: تم چلے جاؤ، تمہارے والد ہمارے آقا کے پاس ہی ٹھہریں گے، میں نے موقع کو غنیمت جانا، اور جانور کو لے جا کر اس کی زین اور لگام سمیت تیس دینار سے بھی کم میں بیچ دیا، اور معروف کے پاس جا کر بیس دینار میں وہ کتاب خرید لی۔

(۱) صفحہ ۲۱۱، مولف کتاب کی وفات کے متعلق یاقوت حموی نے ''معجم الادباء'' (۲:۵۹۹) میں لکھا ہے: ''**سنة نيف وثلاثين وأظنها سنة أربعين وثلاث مئة**''

گھر میں میرا ایک الگ کمرہ تھا، جہاں میں تنہا مطالعہ کرتا تھا، میں اپنی والدہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ: میں نے ایک جرم کیا ہے! اور انھیں وہ پورا قصہ سنایا، اور ساتھ ہی قسم کھا کر کہا کہ: اگر والد صاحب نے سختی کی اور کتاب کے مطالعہ سے روکا، تو میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر بہت دُور چلا جاؤں گا، میں نے انھیں بچے ہوئے پیسے واپس کیے، اور کہا کہ: اب میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، میں اندر سے دروازہ بند کرلوں گا، مجھے بس ایک روٹی چاہیے، جو مجھے اُوپر سے اسی طرح دے دی جائے جیسے قیدی کو دی جاتی ہے، میں اس وقت تک باہر نہیں نکلوں گا جب تک کہ کتاب نہ پوری کرلوں، میری والدہ نے اطمینان دلایا کہ وہ والد صاحب کا غصہ ٹھنڈا کردیں گی۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور اندر سے دروازہ بند کرلیا، میرا بھائی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، وہ والد صاحب کے پاس گیا، اور جا کر ان کے کان میں سارا واقعہ سنا دیا، والد صاحب نے کچھ نہیں کہا؛ لیکن چہرے کا رنگ بدل گیا، اور زبان لڑکھڑانے لگی، جس پر میزبان نے کہا کہ: آپ کے اس بدلے ہوئے رویے نے ہم سب کو اُلجھن میں ڈال دیا ہے، میں آپ کو اپنے حق کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ: آپ بتایئے کیا بات پیش آگئی ہے؟ والد صاحب نے پورا قصہ سنایا، وہ شخص کہنے لگا: بخدا! آپ کے لڑکے کے اس شوق نے تو ہمیں خوش کردیا، آپ میری بات مانیے اور اس کے ساتھ اچھے سے اچھا برتاؤ کیجیے، یہ کہہ کر اس نے اصطبل سے ایک خوبصورت خچر منگوایا، جو میرے والد کے خچر سے بھی زیادہ خوبصورت تھا، اور ایک زین بھی منگوائی، جو میرے والد کے زین سے زیادہ عمدہ تھی، اور کہا کہ: اس پر سوار ہو جایئے، اور یاد رکھیے آپ اپنے بیٹے سے ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے۔

سند کہتے ہیں کہ: میں اس کمرے میں تین سال تک اس طرح پڑا رہا جیسے ایک دن کا معاملہ ہو، اس عرصے میں میرے والد نے میری صورت تک نہیں دیکھی، میں محنت کرتا رہا، یہاں تک کہ مجسطی پوری پڑھ ڈالی، پھر میں باہر نکلا، میں نے مجسطی کی بہت سی مشکل اور

پیچیدہ شکلیں بنا رکھی تھیں، جن کو میں نے اپنی آستین میں رکھ لیا تھا، باہر نکل کر میں نے معلوم کیا کہ: کوئی ایسی بھی جگہ ہے جہاں جیومیٹری اور حساب کے ماہرین اکٹھا ہوتے ہوں، پتہ چلا کہ: مامون کے ہم جولی عباس بن سعید جوہری کے گھر میں ایک مجلس لگتی ہے، جہاں ہیئت اور جیومیرٹی کے بڑے بڑے ماہرین اکٹھا ہوتے ہیں، میں وہاں گیا تو دیکھا کہ سب کے سب لوگ بڑی عمر کے ہیں، صرف میں ہی ایک نوعمر ہوں، میری عمر اس وقت بیس سال تھی۔

عباس نے پوچھا: تم کون ہو اور تم نے کیا مطالعہ کر رکھا ہے؟ میں نے کہا: میں ایک بچہ ہوں جسے جیومیٹری اور ہیئت سے لگاؤ ہے، انھوں نے پوچھا: تم نے کچھ پڑھا بھی ہے؟ میں نے کہا: اقلیدس اور مجسطی، کہنے لگے: مکمل پڑھا ہے؟ میں نے کہا: مکمل پڑھا ہے، انھوں نے مجھ سے مجسطی کا ایک مشکل مقام پوچھا، جس کی تشریح میری آستین میں پڑے ہوئے اوراق کے اندر موجود تھی، میں نے جواب دے دیا، انھیں بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگے: تمھیں یہ جواب کس نے بتایا؟ میں نے کہا: کسی نے بھی نہیں، میں نے اپنے ذہن سے تیار کیا ہے، یہ اور اس جیسی دوسری شکلیں میرے پاس ایک کاغذ میں موجود ہیں، عباس کہنے لگے: وہ کاغذ دکھاؤ! اور جب کاغذ دیکھا تو پریشان ہو گئے اور غصہ میں آ گئے، اور اپنے سامنے کھڑے غلاموں سے کہنے لگے: صندوق لاؤ، وہ لے آئے، انھوں نے پنی مہر دیکھی تو وہ صحیح سالم تھی، پھر اس کو توڑ کر اپنی کاپی نکالی اور اسے میرے ورق کے ساتھ ملایا، تو پتہ چلا کہ ان کی کاپی کی تشریح میری تشریح سے قدرے مختلف اور عمدہ تھی؛ البتہ مفہوم ایک ہی تھا۔

وہ کہنے لگے: میں نے مجسطی کے اس مقام کی تشریح کر رکھی تھی، جب تم یہ ورق لے کر آئے تو مجھے لگا کہ تم نے چوری کی ہے؛ لیکن جب میں نے دیکھا کہ الفاظ دونوں کے الگ الگ ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہی ہے، تو سمجھ گیا کہ یہ تشریح تمھاری اپنی ہے، پھر انھوں نے میرے لیے قبائیں تیار کروائیں اور سونے کا پٹکا تلاش کرنے کے لیے کہا، یہ سب اسی رات کر دیا گیا، جس کے بعد وہ مجھے لے کر مامون کے پاس پہنچے، اور مجھے ان کی ملازمت

اختیار کرنے کے لیے کہا، اور میرے لیے عطیہ اور بیت المال سے وظیفہ بھی جاری کروادیا، اس طرح میں مامون کا ہم نشین بن گیا۔

واضح رہے کہ یہ وظیفہ چند ہی لوگوں کو مل پاتا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اسے ہر اُس شخص کے لیے جاری کردیا تھا جو یکسوئی کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں لگا ہوا ہو(۱)۔

پھر بعد میں جب بیت المال بند ہوگیا تو لوگوں نے وقف کے راستہ سے اس چیز کو نہایت عمدہ طریقے سے نبھایا، اور اب اس زمانے میں مسلمانوں اور اہلِ خیر حضرات کو چاہیے کہ وہ مدارس کے ہونہار طلبہ کی کفالت اپنے ذمہ لیں، یہ خیر کا ایک عظیم باب ہے، ایک طالبِ علم کی کفالت کا اجر وثواب اور مسلمانوں کے مستقبل پر اس کے بہترین اثرات یتیم کی کفالت سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں، اگرچہ یتیم کی کفالت بجائے خود بڑے اجر کا سبب ہے۔

علماء کی رحلت پر مسلمانوں کا متفکر نہ ہونا:

آج ہر کوئی -خواہ مسلمان ہو یا کافر- اس مسئلہ پر تو گفتگو کرتا ہے کہ سیلاب، آندھی، طوفان اور زلزلوں سے متاثرہ ممالک کی کیسے امداد کی جائے؛ لیکن افسوس کہ علماء یکے بعد دیگرے رخصت ہورہے ہیں، اور امتِ مسلمہ عظیم حادثہ سے دوچار ہے، اور مسلمان اس پر گفتگو کرنے اور اس کے بارے میں سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ اس ناقابلِ تلافی نقصان کا تدارک کیسے کیا جائے!! ضروری ہے کہ اس وقت اپنے ہونہار بچوں کو ہر قسم کے مشاغل سے فارغ کرکے انھیں علمِ شرعی کے حصول میں لگایا جائے، اور جو بھی وسائل بن پڑیں انھیں اپنایا جائے؛ تاکہ اس نقصان کی کچھ تلافی ہوسکے۔

آج علماء کی وفات سے پیدا ہونے والے عظیم خلا کے بارے میں ہمارا خاموش رہنا اور اس حوالے سے فکرمند نہ ہونا یہ بجائے خود ایک بہت بڑا حادثہ ہے **اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ**۔

---

(۱) اس حوالے سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بہت سے واقعات آپ کو باغندی کی ''**مسند عمر بن عبد العزیز**'' پر میرے مقدمے میں مل جائیں گے۔

ساتویں مشعل

اپنے جیسے طلبہ کی صحبت اختیار کرنا

چند صفحات پہلے ہی یہ بات گزری ہے کہ لوگوں کے ساتھ عمومی تعلقات کی کثرت علم کے اس سفر میں ایک اہم مانع اور رکاوٹ ثابت ہوتی ہے؛ لیکن وہ بات عمومی لوگوں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے تھی، یہاں میری گفتگو کا موضوع خاص تعلق اور خاص صحبت ہے، یعنی میری یہ گفتگو ایسے دوستوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ہے، جن کے ساتھ آدمی کا اُٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے اور گہرے تعلقات ہوتے ہیں، اس حوالے سے میں ایک مختصر سی گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ انسان بالخصوص طالبِ علم پر صحبت کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ماحول اور صحبت کے اثرات:

یہ بات کسی بھی عقلمند شخص سے مخفی نہیں ہے کہ انسان اپنے مزاج، اپنے اخلاق، اپنی عادات و اطوار اور اپنے افکار و خیالات میں اپنے ماحول کے تابع ہوتا ہے، یہ تو ممکن ہے کہ آدمی اپنے اختیار سے کچھ عادات اپنا لے؛ لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے ماحول کے اثرات سے نکل جائے، یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ پہاڑوں، صحراؤں اور وادیوں میں رہنے والا عقلمند انسان وہاں کے گونگے بہرے ماحول اور فطرت کی خاموشی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، اسی طرح تر و تازہ اور مترنم فضاؤں اور گھنے باغات کے درمیان زندگی گزارنے والے شخص پر بھی وہاں کے پُرلطف اور رنگین ماحول کے اثرات پڑ کر رہتے ہیں، مثال کے طور پر شعراء کو لے لیجیے، جو شعراء پہلے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں ان

کے الفاظ سخت ہوتے ہیں، اور مزاج میں خشکی ہوتی ہے، جیسا کہ ہم جاہلیت کے شعراء کو دیکھتے ہیں، جبکہ دوسرے ماحول میں زندگی گزارنے والا شاعر اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے، جیسا کہ اندلس کے شعراء ہیں۔

نیز بخاری اور مسلم میں تقریباً ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مروی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إن القسوة وغِلَظ القلوب في الفدّادين عند أصول أذناب الإبل**" کہ شقاوت اور سخت دلی ان لوگوں میں ہوتی ہے جو اونٹوں کی دُموں کی جڑوں کے پاس چِلّاتے رہتے ہیں، اور "**الفخر والخيلاء في أهل الخيل والإبل الفدادين أهل الوبر، والسكينةُ في أهل الغنم**" کہ فخر اور تکبر اونٹ اور گھوڑے والوں کے اندر ہوتا ہے، جو چلّاتے رہتے ہیں، اور سکون وطمانینت بکری والوں کے پاس ہوتی ہے(1)۔

"**الفدادين**" کا مطلب حدیث پاک سے واضح ہے، کہ اس سے مراد وہ دیہاتی ہیں جو اونٹ اور گھوڑے پالتے اور چراتے ہیں، ان کے اندر سخت دلی اور تکبر ہوتا ہے، جو ان ہی جانوروں کا اثر ہوتا ہے جنھیں وہ پالتے اور چراتے ہیں، اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے ان صفات کو اور بکری والوں کے لیے سکون وطمانیت کی صفت کو ثابت کیا ہے۔

پس جب ایک انسان- جو کہ اشرف المخلوقات ہے- قدرتی جمادات اور فطرت کے حسن وجمال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ ان جانوروں تک کا اثر قبول کرلیتا ہے، جن کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے، تو سوچیے علمی، فکری، تہذیبی اور اخلاقی اعتبار سے وہ ان انسانوں سے کس قدر متاثر ہوتا ہوگا جن کے ساتھ وہ اپنی پوری زندگی بتاتا ہے......!۔

---

(١) رواه البخاري عن أبي هريرة (٣٧٠١) وأبي مسعود البدري (٣٧٠٢) ومسلم عن أبي مسعود (٨١) وما بعده عن أبي هريرة رضي الله عنهما

معمولی سی صحبت بھی اثر انداز ہوسکتی ہے:

صحبت کے اندر تو ایک چھوٹا سا عمل بھی اثر انداز ہوسکتا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث پاک میں اس کی طرف توجہ دلائی ہے: "**لاتصاحب إلا مؤمنا ولا يأكل طعامك إلا تقي**"[1] کہ تم صحبت مؤمن کی ہی اختیار کرو، اور تمہارا کھانا کوئی متقی شخص ہی کھائے، دیکھیے اس حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بتلا رہے ہیں کہ باہم کھانے سے بھی ایک کے اثرات دوسرے میں منتقل ہوتے ہیں؛ اس لیے تم متقی شخص کے ساتھ ہی کھایا کرو، پہلے لوگ کہا کرتے تھے: باہم کھانا بھی ایک قسم کی رضاعت ہے۔

صحبت سے متعلق ابنِ جماعہ کی نصیحتیں:

امام بدر بن جماعہؒ نے طالبِ علم کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: دسواں ادب: یہ ہے کہ طالبِ علم لوگوں کے ساتھ اختلاط چھوڑ دے، اور یہ اس کے لیے انتہائی ضروری چیز ہے، خاص طور پر غیر طلبہ کے ساتھ اختلاط بالکل نہ رکھے، بالخصوص ان لوگوں کے ساتھ جو زیادہ تر کھیل کُود میں لگے رہتے ہیں، اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں؛ کیونکہ طبیعتیں بہت جلد اثر قبول کرلیتی ہیں، میل جول کا نقصان یہ ہے کہ بغیر کسی فائدے کے آدمی کی عمر ضائع ہوجاتی ہے، طالبِ علم اپنا تعلق انہی لوگوں کے ساتھ رکھے جن سے کچھ دینی و علمی فائدہ پہنچ سکتا ہو، یا وہ انھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہو، اگر طالبِ علم اپنی جلد بازی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے کسی ایسے شخص کی صحبت میں پھنس جائے جو سوائے ضیاعِ وقت کچھ نہیں کرسکتا، نہ اس کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل

---

(۱) رواه أبوداود (٤٧٩٩) والترمذي (٢٣٩٥) وقال: حسن صحيح، و أخرجه ابن حبان (٥٥٤) من "التقاسيم والانواع" و الحاكم (٧١٦٩) عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه

کرسکتا ہے، اور نہ ہی جس علم میں وہ لگا ہوا ہے اس میں اس کا کچھ تعاون کرسکتا ہے، تو ایسے موقعے پر شروع ہی میں قبل اس کے کہ دوستی گہری ہو حکمت کے ساتھ اس سے دُوری اختیار کرلے ''**فإن الأمور إذا تمكّنت عسُرت إزالتها**'' کہ جب کوئی چیز جڑ پکڑ لیتی ہے تو اس کو ختم کرنا مشکل ہو جاتا ہے، فقہاء اس جملے کو بکثرت دہراتے ہیں: **الدفع أسهل من الرفع** دفع، رفع کی بہ نسبت آسان ہوتا ہے[1]۔

اگر لوگوں کے ساتھ رہنا ضروری ہی ہو تو پھر ایسے شخص کے ساتھ رہے جو نیک، دیندار، متقی، پرہیزگار اور ذہین ہو، شر کی بہ نسبت خیر اس کے اندر زیادہ پایا جاتا ہو، اچھے برتاؤ کا حامل اور لڑائی جھگڑے سے دُور رہتا ہو، اگر یہ طالبِ علم کبھی بھول جائے تو اس کو یاد دلا دے، اور یاد ہو تو تعاون کرے، ضرورت مند ہو تو اس کی غم خواری کرے اور اگر کبھی کبیدہ خاطر دیکھے تو اس کے صبر اور تسلی کا سامان کرے[2]۔

علمائے سلوک و اخلاق (یعنی علمائے تصوف) نے اس سلسلے میں کافی طویل بحثیں کی ہیں، ان کے یہاں صحبت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، وہ نیک اور خیر خواہ شخص کو دوست بنانے کی بہت ترغیب دیتے ہیں، اس سلسلے میں ان سے جو نصیحتیں منقول ہیں ان میں ایک اہم نصیحت صاحب ''حِکَم'' امام حکیمؒ کی ہے کہ: ایسے شخص کے ساتھ مت رہو جس کا فعل تمہارے لیے ترغیب کا باعث نہ ہو، اور جس کا قول تمھیں اللہ کی یاد نہ دلاتا ہو۔

یہ بات عمومی صحبت کے تعلق سے ہے، جہاں تک طالبِ علم کی بات ہے تو اسے ایسے

(۱) یعنی کسی شے کو آپ اپنے پاس آنے ہی نہ دیں یہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ آپ کے پاس آجائے پھر آپ اسے اپنے سے دُور کریں، بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہے کہ سرے سے تعلقات ہی نہ بنانا اور میل جول ہی نہ رکھنا یہ طالبِ علم کے لیے آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ وہ فلاں اور فلاں کے ساتھ رہنا شروع کردے، پھر ان سے تعلقات ختم کرکے ان سے دُور ہونے کی کوشش کرے۔

(۲) تذکرۃ السامع والمتکلم ص ۸۳

شخص کی صحبت اختیار کرنا چاہیے جو علم کے راستے میں اس کے لیے معین ومددگار ثابت ہوسکتا ہو۔

طالبِ علم کو ہر گھڑی یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ امت اس کا انتظار کر رہی ہے، جب ائمۂ کرام نے عالم کے بارے میں یہ کہا ہے۔جس میں طالب علم بھی شامل ہے۔ کہ: اس کا علم کے لیے یکسو ہونا نفل عبادات میں مشغول ہونے سے افضل ہے(۱) تو پھر وہ معمولی سا وقت بھی ان ائمہ کے نزدیک قابلِ مواخذہ کیوں نہیں ہوگا، جو طالبِ علم کسی ایسے بے کار شخص کے ساتھ گزار دیتا ہے، جو نہ کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ کوئی فائدہ پہنچاتا ہے؟! اور پھر ان طویل گھنٹوں کے بارے میں کیا کہا جائے جنھیں طالبِ علم یوں ہی بے کار ضائع کر دیتا ہے، اور ایک دو دن نہیں، کئی کئی دن ضائع کرتا ہے؟ یقیناً یہ طالبِ علم کے لیے بڑا خسارہ ہے۔

بلند مقام تک پہنچنے میں اچھے دوستوں کا کردار:

حافظ سخاویؒ نے اپنے شیخ حافظ ابنِ حجرؒ کے تذکرے میں ان چیزوں کو شمار کرایا ہے، جو علمی رسوخ پیدا کرنے میں ان کی معین ومددگار بنیں، وہ لکھتے ہیں کہ: ان ہی میں سے ایک چیز: ایسے دوستوں کا میسر آنا ہے، جو انتہائی دیندار اور غایت درجہ متواضع تھے، جنھیں حدیث اور علومِ حدیث کے ساتھ گہرا شغف اور لگاؤ تھا، ان میں سے ہر ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کرتا نظر آتا تھا، کبھی لکھنے میں، کبھی پڑھنے میں، کبھی کتاب عاریت پر دینے اور کبھی مذاکرہ کرنے میں (۲)۔

یقیناً ایسے ماحول میں ایک طالبِ علم کو اپنے جیسے طلبہ کے ساتھ ایسی زندگی میسر ہوتی ہے جو سراسر علم اور مذاکروں سے بھری ہوتی ہے، وہ جہاں بھی جاتا ہے اور جدھر بھی رُخ کرتا ہے، طلبہ اس کے مددگار ہوتے، اور وہ خود ان کا مددگار ہوتا ہے، کوئی تعاون کررہا

(۱) جیسا کہ پیچھے ص ۴۵ پر گزرا

(۲) الجواہر والدرر ۱:۱۶۱

ہے، کوئی یاددہانی کرارہاہے، کوئی سیکھ رہاہے، کوئی سکھارہاہے، اور ہرایک دوسرے کے لیے ’’حارث اور ہمام‘‘(۱) بناہواہے۔

اور یہی حال ان کی عبادات اور خیر کے دیگر کاموں کا ہوتا ہے، باہمی تنافس کے ذریعہ ہرایک دوسرے کو اُبھارتا اور آمادہ کرتا ہے کہ: کون صلاۃ اللیل کے لیے سب سے پہلے اُٹھتا ہے؟ کون چاشت کی نماز کا سب سے زیادہ پابند ہے؟ کون قرآن کی تلاوت کا سب سے زیادہ اہتمام کرتا ہے وغیرہ وغیرہ، ہم نے اپنے بعض شیوخ کو اسی حال پر پایا ہے۔

اس تعلق سے شیوخ اور مربی حضرات کی ذمہ داری:

اب شیوخ اور مربی اساتذہ کی یہ اہم ذمہ داری بنتی ہے کہ: وہ طلبہ- بالخصوص مبتدی طلبہ- کو غیر جنس کے ساتھ دوستی کرنے کے نقصانات سے آگاہ کریں یعنی ایسے بچوں کے ساتھ دوستی کرنے سے جو طلبہ نہ ہوں، یا علم میں لگنے سے پہلے ان کے دوست رہے ہوں، اساتذۂ کرام اپنے طلبہ کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پاک ہمیشہ یاد رکھیں، اور اس کے ذریعہ انھیں نصیحت بھی کرتے رہیں کہ: نیک ساتھی اور بُرے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والے اور بھٹی پھونکنے والے کی، کہ مشک بیچنے والے کے پاس سے تمھیں یا تو مشک ملے گا خواہ ہدیۃً ہو یا قیمتاً، یا کم ازکم اس کی خوشبو ملے گی، جبکہ

(۱) یہ لفظ ابوداؤد (۴۹۱۱) کی حدیث میں آیا ہے، جو ابووہب جشمی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں، اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں، حارث کے معنیٰ ہیں: کھیتی کرنے والا اور ہمام کے معنیٰ ہیں: پختہ عزم وارادے والا، ہر انسان حارث بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی دنیا یا آخرت کے لیے کمارہا ہوتا ہے اور کھیتی کررہا ہوتا ہے، اور ہمام بھی ہوتا ہے کہ جو چیز بھی اسے درپیش ہوتی ہے، اور جسے وہ کرنا چاہتا ہے اس کو انجام دینے کا وہ پختہ عزم رکھتا ہے اور اس کی فکر میں لگا رہتا ہے، اور یہاں طالبِ علم کے حارث اور ہمام ہونے سے مراد یہ ہے کہ: ہر طالبِ علم اپنے ساتھی کو طلبِ علم میں خیر پر اُبھارتا ہے اور اس کے عزم میں تحریک پیدا کرتا ہے۔

بھٹی پھونکنے والے کے پاس یا تو تمہارے کپڑے جلیں گے یا پھر غلیظ بدبو میسر ہوگی (۳)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے؛ لہٰذا ہر آدمی کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کے ساتھ دوستی کر رہا ہے (۲)۔

اسی طرح اساتذہ کو ایک اور حدیث کے ذریعہ طلبہ کو نصیحت کرنی چاہیے جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا: یارسول اللہ! کون سا ساتھی اور ہم نشیں بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس کو دیکھ کر تمہیں اللہ کی یاد آجائے، جس کی گفتگو سے تمہارے علم میں اضافہ ہو اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی یاد دلائے (۳)۔

---

(۳) رواہ البخاری (۲۱۰۱، ۵۵۳۴) ومسلم ۴: ۲۰۲۶ (۱۴۶) عن أبی موسی الاشعری رضی اللہ عنہ

(۲) رواہ أبوداود (۴۸۰۰) والترمذی (۲۳۷۸) وقال: حسن غریب

(۳) یہ حدیث عبد بن حمید (۶۳۱) اور ابویعلی (۲۴۳۷) نے روایت کی ہے، بوصیری نے **"اتحاف الخیرۃ"** (۸۱۲۹) میں اس کو عبد بن حمید کی سند سے روایت کرنے کے بعد کہا ہے: **رواتہ ثقات** اس کے تمام روات ثقہ ہیں؛ حالانکہ اس کی سند میں مبارک بن حسان راوی بھی ہیں، جنھیں صرف ابنِ حبان نے "ثقات" (۷/ ۵۰۱) میں ذکر کر کے **یخطئ ویخالف** کہا ہے، باقی جو کچھ منقول ہے وہ جرح ہی کے قبیل سے ہے؛ لیکن امام بخاریؒ نے **"الأدب المفرد"** میں ان سے روایت لی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے یہاں آداب میں ان کی روایت مقبول ہے، اور ہماری یہ حدیث بھی آداب ہی کے قبیل سے ہے، حافظ ابنِ حجرؒ نے "تقریب" میں ان کو **"لین الحدیث"** کہا ہے۔

آٹھویں مشعل

شیوخ سے علم حاصل کرنے کی ضرورت

شیوخ اور علماء سے علم حاصل کرنا علمِ صحیح کی کنجی اور طالبِ علم کی کامیابی وکامرانی کا عنوان ہے، اس شخص کے علم میں کوئی خیر نہیں ہوسکتی جس نے پختہ کار علماء سے علم حاصل نہ کیا ہو، اس سلسلے میں علمِ شرعی کا معاملہ دیگر علوم وفنون کی طرح ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس ڈاکٹر پر بھروسہ نہیں کرتے جس نے ماہر ڈاکٹروں سے یہ فن حاصل نہ کیا ہو، اس سرجن ڈاکٹر پر اطمینان نہیں کیا جاتا جس نے اس فن کے ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا ہو، سیکڑوں فلیٹس پر مشتمل کوئی بڑی عمارت بنانے کے لیے اس انجینئر کو قابلِ بھروسہ نہیں سمجھا جاتا جس نے انجینئرنگ کے اندر نظریاتی اور تطبیقی دونوں طریقوں سے اختصاص نہ کیا ہو، یہی حال ان تمام علوم وفنون کا ہے جو نظریاتی اور تطبیقی ہوتے ہیں۔

اور اللہ کا دین تو سب سے زیادہ اہم اور قیمتی شے ہے؛ یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کوئی بھی شخص اللہ کے دین میں دخل اندازی کرتے ہوئے گفتگو کرنا شروع کردے، چاہے عقائد کا معاملہ ہو، یا عبادات کا، یا معاملات کا، یا کتاب اللہ کی تفسیر کا، یا سنتِ نبویہ کی تشریح وتوضیح کا، یا کسی حدیث کی تصحیح وتضعیف یا کسی اور علمِ شرعی کا، جب تک کہ آدمی ایسے پختہ کار علماء سے اس علم کو حاصل کر کے اس میں پختگی نہ پیدا کرلے، جنھوں نے خود بھی شیوخ کی صحبت میں رہ کر ان سے علم وحکمت کی میراث حاصل کی ہو اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہوا اُوپر تک گیا ہو۔

روزِ اوّل سے تلقی عن الشیوخ کا تسلسل:

اسلام میں طلبۂ علومِ نبوت کا پہلا طبقہ صحابۂ کرام کی مقدس جماعت ہے، جنھوں نے اس علم کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست یا کسی صحابی کے واسطے سے (جیسا کہ مرسل صحابی میں ہوتا ہے) حاصل کیا، جن میں سے بصیرت رکھنے والے بعض حضرات ضرورت کے وقت اپنے اجتہاد سے بھی کوئی کام کر لیتے تھے، جس کے بعد وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علی وسلم سے رجوع کرتے، اور آپؐ انھیں اس عمل پر برقرار رکھتے یا صراحتاً اس عمل کی تصحیح کر دیتے۔

اس کے بعد یہ علمی سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا: تابعین، تبع تابعین، ان کے متبعین، اسی طرح اور آگے تک، پھر باضابطہ علمی مدارس اور مکاتبِ فکر کا ظہور ہونے لگا، ہر بڑے عالم کا ایک مدرسہ اور ایک مکتبِ فکر ہوتا، اور ان کے شاگرد اور بعد کے لوگ ان ہی کی طرف اور ان کے مکتبِ فکر کی طرف منسوب ہوتے، اور وہ عالم ربانی ان کے لیے والد کے درجے میں ہوتے، جن کے علمی منہج، روحانی مشرب اور فکری مدرسہ کی طرف ان کی نسبت کی جاتی۔

علمی سلسلۂ نسب کا آغاز:

اس وقت اہلِ علم کے درمیان یہ عرف بن گیا کہ: شیوخ اور اساتذہ کی حیثیت طالبِ علم کے باپ دادا کی ہے، جن سے اس کا علمی نسب وابستہ ہوگا؛ اگر کسی شخص کے شیوخ نہ ہوں، اور اس نے علماء سے علم حاصل نہ کیا ہو، اور وہ علم کا دعویٰ کرے اور علمی معاملات میں گفتگو کرے، تو وہ غیر معروف اور مجہول النسب ہوگا۔

امام نوویؒ ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں تراجمِ علماء کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: یہ ہمارے ائمہ واسلاف ہیں، یہ ہمارے لیے والدین کی طرح ہیں (۱)۔

(۱) مقدمہ تہذیب الاسماء واللغات ۱:۱۱

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ مسلم بن خالد زنجیؒ کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ: مسلم رضی اللہ عنہ ہمارے اس فقہی سلسلے میں جو ہم سے شروع ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، ہمارے اجداد میں آتے ہیں (۱)۔

اسی طرح اپنی ایک دوسری مایہ ناز کتاب **''المجموع''**(۲) کے- اندر ابوالعباس ابنِ سریج کے حالات میں لکھتے ہیں کہ: یہ فقہی سلسلہ میں ہمارے اجداد میں ہیں۔

ان حضرات کا ماننا تھا کہ شیوخ اور اساتذہ ہمارے روحانی آباء واجداد ہیں؛ جو جسمانی آباء واجداد سے عظیم تر ہیں، وہ ہدایت اور نُور کے حوالے سے ہمارے باپ دادا ہیں؛ لہٰذا ان کا مرتبہ کھانے پینے کے باپ دادا سے بڑھا ہوا ہے۔

امام لقانی ''قضاء الوطر'' میں فرماتے ہیں کہ: شیوخ آباء کے درجے میں ہیں، جس کے شیوخ نہیں اس کے آباء نہیں اور اس کا کوئی نسب نہیں (۳)۔

ابنِ وہبؒ کے ترجمے میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ: ایک شخص نے امام ابنِ وہبؒ کے ساتھ بدسلوکی کی، جس پر ایک عراقی شخص کی غیرت بھڑک اُٹھی، اور اس نے بھی اس شخص پر بڑی سختی کی، اور ابنِ وہبؒ سے مخاطب ہوکر کہا: **''أنت مصباحنا وضیاؤنا''** آپ تو ہمارے چراغ اور ہماری روشنی ہیں (۴) غور کیجیے یہ دونوں الفاظ کس قدر عظیم تر ہیں !!۔

شیخ کی صحبت نہ اٹھانے والوں کی طرف اسلاف کا توجہ نہ دینا:

ہمارے اسلاف ایسے لوگوں کو جنھوں نے کسی شیخ کی صحبت میں رہ کر علمِ دین حاصل نہ کیا ہو، قابلِ اعتناء ہی نہیں سمجھتے تھے، نہ ان کے نزدیک ایسے افراد کے علم کا کوئی اعتبار

(۱) ۲: ۹۴

(۲) ۱: ۲۱۴

(۳) ۱: ۲۳۹

(۴) ترتیب المدارک ۱: ۵۶۴

ہوتا تھا، اور نہ ہی ان کے ساتھ علمی گفتگو روا رکھی جاتی تھی؛ کیونکہ اس قسم کے لوگوں کی باتوں میں لغو باتوں اور غلطیوں کی بھر مار ہوتی ہے۔

قاضی عیاض کی "**الإلماع**" اور ان کے شاگرد ابنِ بشکوال کی "**الصلة**" میں امام ابنِ فرضیؒ سے منقول ہے، وہ اپنی سند سے صالح بن امام احمدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ: میں نے اپنے والد امام احمد بن حنبلؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: کام کے لوگ تو وہی ہیں جو "**حدثنا وأخبرنا**" کہتے ہیں، باقی کسی کے اندر کوئی خیر نہیں ہے، ایک مرتبہ معتصم میرے والد کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ: آپ ابن ابی دوَاد سے بات کرلیجیے، میرے والد نے چہرہ پھیرلیا، اور کہا کہ: میں ایسے آدمی سے کیسے بات کروں جو مجھے کبھی کسی عالم کے دروازے پر نظر نہیں آیا؟!(۱)۔

ابنِ حبان کہتے ہیں: کوئی بھی شخص جو کسی بھی علم میں لگا ہوا ہو وہ اس علم کو ضرور کماحقہٗ حاصل کرسکتا ہے، یا اچھی خاصی مقدار میں حاصل کرسکتا ہے، سوائے حدیث میں اشتغال رکھنے والوں کے کہ وہ اس علم کو کماحقہٗ نہیں حاصل کرسکتے؛ کیونکہ ان میں اکثریت عوام کی ہے، جنھوں نے نہ کبھی کسی عالم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، نہ کسی قاری، کسی فقیہ، نحوی، لغوی، ادیب اور اُصولی کے سامنے، کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا اُٹھتا ہے، کسی کاتب کے پاس جاکر لکھنا سیکھ لیتا ہے، اور پھر اسی جیسا کوئی عامی شخص اس کو لے جاکر حدیث کے حلقوں میں بٹھا دیتا ہے، اور وہ طالبِ حدیث کہلانے لگتا ہے(۲)۔

ابنِ حبان کے اس جملہ پر غور کیجیے کہ: انھوں نے نہ کبھی کسی عالم کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور نہ فلاں اور فلاں کے سامنے، ابنِ حبان نے **لم يتمثل** کا لفظ استعمال کیا ہے: (**لم يتمثل بين يدي عـالم، ولا، ولا**) **تمثل** اور **مثول** کے معنیٰ ہیں: کھڑے ہونا،

(۱) الالماع ص ۲۸، الصلہ ۱: ۲۵۵

(۲) **النكت علي ابن الصلاح للزركشي** ۲: ۴۵-۴۶ (۱۱)

یعنی: یہ لوگ کبھی بھی فقہ، نحو، لغت وغیرہ کے کسی عالم کے سامنے یا ان کے دروازے پر جا کر کھڑے نہیں ہوئے، کہ پہلے ان علوم میں مہارت پیدا کرتے جو حدیث کا پاکیزہ علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں، اس کے بعد علم حدیث میں لگتے، **فإلی اللہ المشتکیٰ.**

شیخ سے علم نہ لینے والے کو بولنے کا حق نہیں:

قاضی عیاض نے ابوجعفر داؤدی اسدی (متوفی ۴۰۲ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: مجھے ان کے متعلق یہ بات پہنچی ہے کہ وہ قیروان کے اپنے معاصر علماء پر مملکت بنی عبید کے اندر قیام کی وجہ سے تنقید کرتے تھے، اور اس سلسلے میں ان کے پاس ایک تحریر بھی بھیجی، تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ: آپ خاموش رہیں، آپ کا کوئی شیخ نہیں![1]۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں کہ: یہ اس لیے کہا؛ کیونکہ ابوجعفر اسدی نے خود اپنے مطالعہ سے علم حاصل کیا تھا، ان کا فقہ کا بیشتر علم ایسا ہی تھا جو انھوں نے کسی مشہور امام کی صحبت میں رہ کر حاصل نہیں کیا تھا، ان کے پاس جو علم تھا وہ ان کے اپنے ادراک اور مطالعہ کی بنیاد پر تھا، ان علماء کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر ان کا کوئی استاذ ہوتا جن کے پاس رہ کر انھوں نے فقہ کی حقیقت اور اس کے مزاج کو سمجھا ہوتا، تو انھیں یہ بات سمجھ میں آجاتی کہ یہاں عام مسلمانوں کے درمیان ہمارا رہنا انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھنے کا سبب، اور ایمان کی ٹمٹماتی روشنی کو یہاں باقی رکھنے کا ذریعہ ہے۔

ان علماء کے جواب پر غور کیجیے، کس قدر بلیغ جواب دیا ہے کہ: ''آپ خاموش رہیں، آپ کا کوئی شیخ نہیں''، اور قاضی عیاض کے اس جملہ پر بھی غور کیجیے کہ: ''اگر ان کا کوئی استاذ ہوتا، جن کے پاس رہ کر وہ فقہ کی حقیقت سمجھتے تو ایسا اور ایسا ہوتا'' میں آپ کو یہی بات سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ شیوخ اور اساتذہ کے پاس رہ کر علم حاصل کرنے سے طالبِ علم کو صاف ستھرا اور صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔

---

(۱) ترتیب المدارک ۳: ۴۰۲

یہ بات متقدمین سے چلی آرہی ہے:

ان علماء نے کوئی نئی بات نہیں کہی، روزِ اوّل سے ہی یہ بات چلی آرہی ہے، اور ہر دَور میں علماء کے دل ودماغ میں رہی ہے، متقدمین میں سے جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کی بات ملتی ہے ان میں ایک اہم نام امام ابوحنیفہؒ کا ہے:

شیخ کے بغیر علمی حلقہ لگانے پر امام ابوحنیفہؒ کی نکیر:

چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے "آداب الفقیه والمتفقه" میں اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ لوگوں نے آکر امام صاحب کو بتایا: کہ مسجد میں کچھ لوگ حلقہ لگائے بیٹھے ہیں اور فقہ کے اندر غور وفکر کررہے ہیں، امام صاحب نے پوچھا: ان کا کوئی بڑا بھی ہے؟ لوگوں نے بتایا: نہیں ہے، فرمایا: یہ لوگ کبھی فقہ حاصل نہیں کرسکتے (۱)۔

ایسے شخص سے علم لینا صحیح نہیں:

سیوطیؒ کی "اسعاف المبطأ" میں (۲) اسحاق بن محمد فرویؒ سے منقول ہے کہ: امام مالکؒ سے کسی نے پوچھا: کیا ایسے شخص سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے، جس نے شیوخ کے پاس جاکر علم حاصل نہ کیا ہو، اور نہ علم کے حلقوں میں طلبہ کی ہم نشینی اختیار کی ہو؟ امام مالکؒ نے فرمایا: نہیں، سائل نے پوچھا: کیا ایسے شخص سے علم حاصل کیا جاسکتا ہے جو صحیح اور ثقہ ہو؛ مگر یاد نہ رکھتا ہو اور سمجھتا نہ ہو؟ فرمایا: حدیثیں صرف ان ہی لوگوں کی لکھی جائیں جو یاد رکھتے ہوں انھوں نے باضابطہ علم حاصل کیا ہو، اور طلبہ کی ہم نشینی اختیار کی ہو، اور سمجھا بھی ہو اور عمل بھی کیا ہو، اور ساتھ ہی ان کے اندر تقویٰ اور پرہیز گاری بھی پائی جاتی ہو۔

ان ہی اقوال کی روشنی میں ابنِ حجر ہیتمیؒ نے یہ بات لکھی ہے کہ: جو شخص محض کتابوں

---

(۱) (۷۹۰)

(۲) ص ۱۸۰

سے علم حاصل کرے وہ ضال اور مضل ہے، امام نوویؒ کا ارشاد ہے: اگر کوئی شخص کسی مسئلہ کو مثال کے طور پر دس کتابوں میں بھی دیکھ لے تب بھی اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں، عین ممکن ہے کہ ان تمام کتابوں میں کسی قولِ ضعیف یا سندِ ضعیف پر اعتماد کیا گیا ہو(۱)۔

کہاں ہے وہ شخص جو اس بات پر اتراتا پھرتا ہے کہ اس نے سوائے ایک شیخ کے کسی سے نہیں پڑھا، اور ان سے بھی صرف اجازت لی ہے، باضابطہ طور پر نہیں پڑھا؟! کیا یہی وہ شخص نہیں ہے جس نے عمل بالکتاب والسنۃ کے نام پر اور ضعیف احادیث کو صحیح احادیث سے ممتاز کرنے کی آڑ میں ایک طرف طلبہ اور نوجوانوں کی صفوں میں اختلاف وانتشار کا طوفان برپا کر رکھا ہے، اور دوسری طرف حدیث کے کتابوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں!!۔

احادیث کو کتابوں میں مدون کر دینے پر افسوس کا اظہار:

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب احادیث کی تدوین عمل میں آئی تو بعض اسلاف نے اس عظیم کارنامے پر بجائے خوشی کے افسوس کا اظہار کیا، کہ اب اس کی وجہ سے شیوخ سے علم حاصل کرنے کا طریقہ کمزور پڑ جائے گا؛ چنانچہ دارمیؒ نے ''سنن'' کے مقدمہ میں اور بیہقیؒ نے ''المدخل'' میں امام اوزاعیؒ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: برابر یہ علم باعزت تھا، لوگ اسے شیوخ کے پاس جا کر حاصل کرتے تے، یہاں تک کہ یہ کتابوں کے اندر آگیا، پھر نااہل لوگ بھی اسے حاصل کرنے لگے، یا فرمایا: اس علم میں گھس آئے(۲)۔

تلقی اور شیوخ سے علم حاصل کرنے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں طالبِ علم کے اندر بے پناہ توجہ، شدید حرص اور حلقہ درس میں جلد پہنچنے کی تڑپ ہوتی ہے، ان ہی صفات کو بعض علماء نے ''مزاحمت بالرکب'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

(۱) الفتاوی الحدیثیہ لابن حجر المکی ص ۲۷

(۲) سنن الدارمی (۴۶۷) المدخل ص ۴۱۰

چنانچہ ابنِ عبدالبرؒ نے اپنی سند کے ساتھ تین جلیل القدر ائمہؒ: امام مالکؒ، سلیمان تیمیؒ، اور سلیمان بن حبیب محاربیؒ سے لقمان حکیم کی یہ نصیحت نقل کی ہے، جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی: **يا بُني: جالس العلماء، وزاحمهم بركبتيك، فإن الله يحيي القلوب بالحكمة كما يحيي الأرض الميتة بوابل السماء،** بیٹے! علماء کی ہم نشینی اختیار کرو، اور ان کے ساتھ مزاحمت بالرکب کرو؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکمت کے ذریعہ قلوب کو اس طرح زندہ کر دیتے ہیں، جیسے مُردہ زمین آسمان کی موسلا دھار بارش سے لہلہا اُٹھتی ہے(۱)۔

شیخ کے حلقہ میں جلد از جلد پہنچنے کی حرص:

علم پر بے پناہ توجہ اور شدید حرص کے تعلق سے تو ہم نے پیچھے کچھ اسلاف کے عجیب وغریب واقعات بیان کیے تھے، اب یہاں تیسری چیز شیخ کے حلقۂ درس میں جلد سے جلد پہنچ کر ان کے قریب اپنی جگہ لینے کے دو عجیب وغریب واقعات نقل کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ:

خطیب بغدادیؒ نے جعفر بن دستوریہ سے سند کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جن دنوں ہم علی بن مدینیؒ سے علم حاصل کرتے تھے، ہم آئندہ کل کی مجلس میں شرکت کے لیے آج ہی عصر کے وقت جگہ پکڑ لیتے تھے، اور رات بھر وہیں بیٹھے رہتے، اس ڈر سے کہ کہیں آئندہ کل مجلس میں سننے کے لیے جگہ نہ ملے، ایک روز میں نے مجلس میں ایک شیخ کو دیکھا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے طیلسان میں پیشاب کر رہے ہیں اور طیلسان کو سمیٹ رہے ہیں، اس ڈر سے کہ اگر پیشاب کے لیے اُٹھے تو جگہ چلی جائے گی!!!(۲)۔

(۱) جامع بیان العلم (۶۷۴-۶۷۷)

(۲) **الجامع لأخلاق الراوي (۱۴۶۵)**

دوسرا واقعہ:

یہ واقعہ امام ابوعلی القالیؒ کا ہے، جو ان کے شاگرد ابونصر ہارون بن موسیٰ بن جندال نحوی نے بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم جامع زہراء قرطبہ میں ابوعلی بغدادی القالیؒ کے پاس ''نوادر'' کے املاء کے وقت حاضر ہوتے تھے، ان دنوں موسم بہار چل رہا تھا، ایک روز میں ان کی مجلس کی طرف جارہا تھا کہ اچانک راستے میں بارش شروع ہوگئی، اور ان کی مجلس میں پہنچتے پہنچتے میرے سب کپڑے بھیگ گئے، میں مجلس میں پہنچا تو ابوعلی کے اردگرد قرطبہ کے بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

انھوں نے مجھے قریب بلایا اور کہنے لگے: ابونصر! افسوس اور رنج مت کرو، یہ تو ایسی تکلیف ہے جو جلد ہی تم سے زائل ہوجائے گی، تم کپڑے بدل لوگے اور یہ تکلیف ختم ہوجائے گی؛ لیکن میرے ساتھ پیش آنے والے حادثہ نے تو میرے جسم پر ایسے نشانات چھوڑے ہیں جو قبر تک میرے ساتھ جائیں گے۔

انھوں نے اپنا واقعہ سنایا کہ: میں امام ابنِ مجاہدؒ کے حلقۂ درس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اس نیت سے کہ مجلس میں جلد پہنچ کر ان کے قریب جگہ حاصل کرلوں، رات ہی میں نکل پڑا؛ لیکن جب اس گلی تک پہنچا جس کو پار کرکے مجھے مجلس کی جگہ پر پہنچنا تھا تو دیکھا وہ بند ہے، اب اس کے کھلنے کا انتظار میرے دشوار تھا، میں دل ہی دل میں کہنے لگا: سبحان اللہ! کیا آج صبح مجھے شیخ کے قریب جگہ نہیں مل پائے گی!۔

اتنے میں مجھے گھر کے برابر ایک پتلی سی نالی نظر آئی، میں اس میں کسی طرح بڑی مشکل سے گھسا اور اسے پار کرگیا، جب باہر نکلا تو حالت یہ تھی کہ کپڑے پھٹ چکے تھے، اور نالی نے میرا گوشت ادھیڑ دیا تھا، یہاں تک کہ ہڈیاں نظر آنے لگی تھی!! لیکن اللہ کے فضل سے میں کسی طرح نکل گیا، اور اسی حال میں شیخ کی مجلس میں پہنچ کر سبق میں شرکت کی!۔

اب بتاؤ ابونصر! میری اس تکلیف سے تمہاری تکلیف کا کیا مقابلہ؟ پھر انھوں نے یہ شعر پڑھا:

دببتَ للمجد والساعون قد بلغوا ❖ جهد النفوس وألقوا دونه الأرزا

تم شرافت وعظمت حاصل کرنے کے لیے رینگتے ہوئے چلے، جبکہ کوشش کرنے والوں نے انتھک محنتیں کر ڈالیں اور اپنی آستینیں چڑھا لیں۔

فكابدوا المجد حتى مل أكثرهم ❖ وعانق المجد من أوفى ومن صبرا

شرافت وعظمت پانے کے لیے انھیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ وہ سب تھک کر بیٹھ گئے، اور وہی لوگ شرافت وعظمت کو گلے لگا سکے، جنھوں نے اپنے عہد کو پورا کیا اور لگے رہے۔

لاتحسب المجد تمرا أنت آكلـه ❖ لن تبلغ المجد حتى تلعق الصبرا

یہ مت سمجھو کہ شرافت وعظمت کوئی میٹھی کھجور ہے جسے تم آسانی سے کھالو گے، جب تک ایلوا نہیں چکھ لو گے شرافت وعظمت حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ اشعار ہم نے اسی وقت لکھ لیے، پھر بعد میں نوادر میں بھی یہ اشعار آئے، شیخ کے اس واقعہ سے مجھے بڑی تسلی ہوئی، اور اپنی تکلیف معمولی دکھائی دینے لگی، پھر میں شیخ کے پاس خوب آنے جانے لگا، اور ان کی وفات تک ان کے ساتھ لگا رہا، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے[1]۔

اساتذہ سے اس طرح شوق وطلب کے ساتھ علم حاصل کر کے جب طالبِ علم کا ہلال

---

(۱) "**الصلة**" لابن بشکوال ٦٥٦ (۱۴۴۱)۔

ابوعلی القالی کی "الامالی" (۱/ ۱۱۳) اور اس کی شرح "**سمط اللآلي**" (۱/ ۳۳۹) میں لکھا ہے کہ: "یہ اشعار حوط بن رئاب اسدی کے ہیں، جو اسلامی شاعر ہیں اور میرا خیال ہے انھوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی پایا ہے" ابونصر ہارون بن موسیٰ کے جملے: "میں ان کے پاس خوب آنے جانے لگا اور ان کی وفات تک ان کے ساتھ لگا رہا" سے ملنے والے سبق اور فائدے پر بھی غور کیجیے۔

بدرِ کامل بن جاتا ہے، تو اس کے اساتذہ اسے تعلیم، افادے، تصنیف اور افتاء وغیرہ کی اجازت دیتے ہیں، پھر جس قدر اس کے علم اور عمر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اپنے شیوخ کی طرف اس کی توجہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، اور ان کے چشمہ فیاض سے سیرابی میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے، بعض ائمہ نے جو حصولِ علم کے لیے ''طولِ زمان'' کی شرط لگائی ہے، اس سے یہی مراد ہے کہ: اساتذہ کی صحبت اور طلبِ علم کا زمانہ طویل سے طویل تر ہو، اور اس درمیان میں کسی قسم کا وقفہ یا انقطاع نہ ہو۔

صحبتِ شیخ کی رعایت فقہی مسئلہ میں:

یہ علمی صفت فقہائے حنفیہ کے یہاں ایک فقہی حکم میں بھی سرایت کرگئی۔

آپ جانتے ہیں کہ نماز کے لیے سب سے افضل جگہ مسجدِ حرام ہے، اس کے بعد مسجدِ نبویؐ ہے اور اس کے بعد مسجدِ اقصیٰ ہے، اس کے آگے فقہاء نے لکھا ہے کہ: مسجد اقصیٰ کے بعد سب سے افضل جگہ مسجدِ قباء ہے، پھر وہ مسجد جو سب سے قدیم ہو، پھر وہ جو سب سے بڑی ہو، پھر وہ جو سب سے قریب تر ہو؛ لیکن اپنے استاذ کی مسجد جس میں درس یا وعظ سننے کے لیے جایا جائے، بالاتفاق سب سے افضل ہے[1]۔

یعنی طالبِ علم کا اپنے شیخ کی مسجد میں نماز پڑھنا یہ اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے، جو سب سے قدیم یا سب سے بڑی یا سب سے قریبی ہو؛ کیونکہ اس میں نہ صرف مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت حاصل ہوتی ہے؛ بلکہ شیخ سے استفادہ یا وعظ سننے کی فضیلت بھی مل جاتی ہے، آپ نے دیکھا کہ فقہائے کرام طالبِ علم کے لیے اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ وہ اپنے استاذ کی مسجد میں نماز پڑھے؛ تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ ملازمت اور صحبت کا موقع مل سکے؛ کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ کبھی اچانک استاذ کسی مناسبت سے کوئی فائدے کی بات بتادیتے ہیں، جس کے لیے سبق میں کوئی مناسب موقع نہیں آپاتا

(۱) الدر المختار بحاشیۃ ابن عابدین ۱: ۴۴۳

اور ایسا بہت ہوتا ہے، اس کا احساس اور ادراک اسی طالبِ علم کو ہوسکتا ہے، جو مسلسل استاذ کی صحبت میں رہتا ہو(۱)۔

حضرت ابنِ عباسؓ اور تلقی عن الشیخ:

ادب کی پوری رعایت کے ساتھ شیوخ کی صحبت اختیار کرنے کے سلسلے میں حضرت ابنِ عباسؓ ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہیں، وہ جن صحابی سے حدیث سننا چاہتے ان کے

(۱) یہ پورا پیراگراف ''یہ علمی صفت فقہائے حنفیہ الخ'' سے لے کر یہاں تک میں نے اپنی کتاب ''ادب الاختلاف'' کے دوسرے ایڈیشن میں بڑھایا ہے، اور اب تیسرے ایڈیشن میں اس کے متعلق ایک واقعہ کا بھی اضافہ کررہا ہوں، جو درحقیقت اس فقہی حکم کی ایک عملی مثال ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ: میں ایک مرتبہ اپنے استاذ سیّدی عبدالفتاح ابوغدہ کے ساتھ مسجد قباء میں تراویح کی نماز پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا، اس وقت مذکورہ کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوچکا تھا، ہم نماز کے انتظار میں بیٹھے تھے، میں شیخ سے ایک مشہور مسئلے: ''مذہبنا صواب یحتمل الخطأ ومذہب غیرنا خطأ یحتمل الصواب'' کے سلسلے میں مذاکرہ کرنے لگا، کہ ہمارا مسلک صواب محتمل خطا اور دوسروں کا مسلک خطا محتمل صواب ہے، شیخ نے اس پر مجھے تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: اس کو یوں تعبیر کرنا بہتر ہے: ''مذہبنا صواب ویحتمل الخطأ ومذہب غیرنا خطأ ویحتمل الصواب'' یعنی واؤ حرفِ عطف کے ساتھ۔

مجھے اس تنبیہ پر بے حد خوشی ہوئی، اور میں نے شیخ کا بہت شکریہ ادا کیا، شیخ نے فرمایا: اسی لیے تو فقہاء نے لکھا ہے: **''ومسجد أستاذه''** (اور اس کے استاذ کی مسجد)۔ میں خاموش ہوکر اس جملے کا مطلب سوچنے لگا، شیخ نے پھر یہی جملہ دہرایا اور فرمایا کہ: فقہاء نے لکھا ہے کہ طالبِ علم کے لیے اس مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے جہاں اس کے استاذ نماز پڑھتے ہوں؛ تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ استاذ کی صحبت مل سکے، اور زیادہ سے زیادہ علمی فوائد حاصل ہوں، اس تنبیہ کے بعد میں نے مذکورہ بالا کتاب میں فقہاء کے اس جملہ کی تشریح کی اور شیخ کی پوری تقریر نقل کی:

بعشرتك الكرامَ تُعَدّ منهم ❖ فلا تُرَينْ لغيرهم ألوفا

بڑے لوگوں کے ساتھ رہنے سے تمہارا شمار بھی بڑے لوگوں میں ہونے لگے گا؛ پس تم ان کے علاوہ کسی اور سے محبت نہ کرو۔

دروازے پر جا کر بیٹھ جاتے، جب وہ صحابی اندر سے نکلتے تو ان کے ساتھ لگ جاتے اور جو کچھ ان سے معلوم کرنا ہوتا دریافت فرماتے، وہ ان کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتے، کہ شاید آرام کر رہے ہوں یا کسی خاص کام میں مشغول ہوں۔

ابن القاسم مالکیؒ کا شیخ کی چوکھٹ پر پڑے رہنا:

ان ہی کی اقتدا میں امام عبدالرحمٰن ابن القاسم العتقیؒ بھی یہی کیا کرتے تھے، جو امام مالکؒ کے سب سے بڑے شاگرد تھے، اور امام مالکؒ کے بعد وہی ان کی مجلس کے جانشین ہوئے، وہ بیان کرتے ہیں کہ: میں امام مالکؒ کے پاس غلس کے وقت آتا تھا اور ان سے دو یا تین یا چار مسئلے جتنے ممکن ہوتے دریافت کرتا؛ کیونکہ اس وقت ان کے اندر انشراح دکھائی دیتا تھا، میں اس کے لیے روزانہ سحر کے وقت ہی پہنچ جاتا، ایک روز اتفاق سے میں ان کی چوکھٹ پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا، اور آنکھ لگ گئی، امام مالکؒ باہر نکلے اور چلے گئے، مجھے پتہ ہی نہیں چلا، ایک باندی نے مجھے ٹھوکر ماری اور کہا کہ: تیرے آقا تو جا چکے ہیں، وہ تیری طرح غافل نہیں ہیں! آج اُنچاس (۴۹) سال ہو چکے ہیں، انھوں نے ہمیشہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی ہے!![1]۔

چونکہ ابن القاسمؒ کثرت سے امام مالکؒ کے ساتھ آتے جاتے تھے، کہ وہ باندی انھیں امام مالکؒ کا غلام سمجھ بیٹھی، اور کہا کہ تیرے آقا تو جا چکے ہیں؛ کیونکہ رات میں گھر کے دروازے پر اس طرح سے غلام ہی بیٹھا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان سے راضی ہو۔

یہ تھی ہمارے اکابر و اسلاف کی طلبِ علم کی داستان، باقی کسی شیخ سے صرف ایک یا دو سال علم حاصل کر کے پھر خود ہی سے پڑھنے اور سمجھنے لگ جانا، اور مطالعہ ہی سے سب کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرنا اور بھی اس قسم کے عجیب و غریب کام جو عجائبات کے اس دَور میں

(۱) ترتیب المدارک ۱: ۳۷۵

نوجوان کررہے ہیں، یہ ہرگز ہرگز ہمارے اسلاف کا طریقۂ کار نہیں ہے[۱]۔

ابنِ عبدالبرؒ نے حکیم ہذہ الامۃ حضرت ابوالدرداءؓ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: یہ آدمی کی سمجھداری کی بات ہے کہ اس کا چلنا پھرنا اور اُٹھنا بیٹھنا اہلِ علم کے ساتھ ہو[۲]۔

جہاں کہیں رہو کسی فقیہ سے اپنا تعلق رکھو:

اسلاف کی نصیحتوں میں سے ہے: **"حیثما کنت فکن قُربَ فقیہ"** جہاں کہیں رہو کسی فقیہ کے قریب رہو۔

اس نصیحت کے ساتھ ایک واقعہ بھی جُڑا ہوا ہے، جو ہمارے اصل موضوع سے متعلق تو نہیں ہے؛ لیکن اس کو یہاں ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ابنِ ابی خیثمہؒ کی "التاریخ الکبیر" میں ہے[۳]: عبداللہ بن ابوموسیٰ تستری بیان کرتے ہیں کہ: مجھے یہ نصیحت کی گئی تھی: **"حیثما کنت فکن قرب فقیہ"** کہ جہاں کہیں رہنا کسی فقیہ کے قریب رہنا؛ چنانچہ میں بیروت میں امام اوزاعیؒ کے پاس آیا، ایک روز وہ مجھ سے میرے حال احوال دریافت کرنے لگے، میں نے انھیں اپنے احوال بتلائے، دراصل یہ عبداللہ تستری پہلے مجوسی تھے، امام اوزاعیؒ نے مجھ سے پوچھا کہ: تمہارے والد باحیات

(۱) انہی عجائبات میں سے – ویسے تو اس زمانے کے عجائبات بےشمار ہیں – ایک یہ بھی ہے کہ بعض مصنفین کے یہاں حقائق بدل چکے ہیں، وہ ایسی چیز کو جو مذمت کے قبیل سے ہوتی ہے اور ایک عالم کی زندگی کا کمزور پہلو ہوتی ہے، مدح اور تعریف کی چیز گردانتے ہیں، جیسا کہ آپ کو بعض مصنفین کی کتابوں میں امام ابن عبدالہادی صاحب "مختصر طبقات علماء الحدیث" کے حالات میں ملے گا، اسی طرح شیخ عبدالقادر بدرانؒ کی حیات پر لکھی گئی سوانح کے اندر بھی آپ کو یہ چیز دیکھنے کو ملے گی۔

(۲) جامع بیان العلم (۸۲۱)

(۳) من القطعة المخطوظة المحفوظة في المكتبة المحمودية بالمدينة المنورة ورقة ۱/۱۷ وهي في السفر الثالث من المطبوع (۴۶۹۸)

ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں! میں انھیں عراق میں چھوڑ کر آیا ہوں وہ مجوسی ہیں، وہ کہنے لگے: کیا تم واپس جا سکتے ہو؟ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ انھیں تمہارے ذریعہ ہدایت عطا فرما دیں، میں نے کہا: اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو میں چلا جاؤں گا، انھوں نے فرمایا: ہاں میں یہی مناسب سمجھتا ہوں۔

میں اپنے والد کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیمار ہیں، انھوں نے مجھ سے پوچھا: بیٹے تم کس کے دین پر ہو؟ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں، انھوں نے کہا: مجھے اپنے دین کے بارے میں کچھ بتاؤ، میں نے انھیں اسلام اور اہلِ اسلام کے بارے میں بتایا، تو وہ کہنے لگے کہ: تم گواہ رہو میں نے اسلام قبول کرلیا ہے، عبداللہ کہتے ہیں کہ: پھر اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا، میں نے ان کی تدفین کی، اور واپس آ کر امام اوزاعیؒ کو پورا واقعہ سنایا۔

دیکھیے اس نصیحت ''حیثما کنت فکن قرب فقیہ'' کا کس قدر اثر اور فائدہ ہوا۔

وصحبة أستاذ و طول زمان:

''استاذ کی صحبت اور زمانہ کا طویل ہونا''

ابنِ حبانؒ نے نعیم بن عبداللہ مجمر تابعیؒ کے تذکرے میں امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ: ''نعیم مجمر حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بیس سال تک آتے رہے''(۱) یعنی: بیس سال تک ان کی صحبت اور ہم نشینی اختیار کی، اور ان کے حلقہ میں آتے رہے۔

اسی طرح حامد بن یحییٰ بلخیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے، جو ثقات اور حفاظ میں سے ہیں کہ: انھوں نے اپنی پوری زندگی ابنِ عیینہ کی ہم نشینی میں گزار دی (۲)۔

جلیل القدر تابعی حضرت ثابت بنانیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ: انھوں نے حضرت انس بن مالکؓ کی صحبت میں چالیس سال گزارے، جیسا کہ ''سیر''(۳) وغیرہ میں موجود ہے۔

---

(۱) الثقات ۵:۶۷۴ (۲) الثقات ۸:۲۱۸ (۳) ۵:۲۲۲

ابو نعیم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ: ایک آدمی دوسرے آدمی کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے تیس سال تک آتا رہا[1]، غالباً اس سے مراد خود امام مالکؒ ہیں۔

اس کے بعد ابو نعیم نے امام مالکؒ کے ایک شاگرد نافع بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے امام مالکؒ کی صحبت میں پینتیس سال یا چالیس سال گزارے، میں روزانہ ان کے پاس جاتا: صبح میں بھی، دوپہر میں بھی اور شام میں بھی۔

"**مناقب أبي حنيفة**"[2] میں ہے کہ: امام حنیفہؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ: آپ کو اتنا فقہ کیسے حاصل ہوا؟ امام صاحب نے فرمایا کہ: میرا شہر علم وفقہ کا معدن ومرکز تھا، میں نے وہاں موجود اہلِ فقہ کی صحبت اختیار کی اور ان میں سے ایک فقیہ حماد بن ابی سلیمان کو لازم پکڑ لیا، اور ان سے خوب فائدہ اُٹھایا، امام صاحب یہ بھی فرماتے تھے کہ: میں نے حمادؒ کے ساتھ ایسی ملازمت اختیار کی کہ میرے علم کے مطابق کسی نے بھی کسی کی ایسی ملازمت اختیار نہیں کی، میں ان سے خوب سوال کرتا، بسا اوقات وہ میرے سوالوں سے تنگ آجاتے، اور کہتے کہ: ابو حنیفہ! تمہارا جواب دیتے دیتے میری پسلیاں پھول گئی ہیں، اور سینہ تنگ ہوگیا ہے۔

امام صاحبؒ کے اس جملے میں کہ "میرا شہر علم وفقہ کا معدن ومرکز تھا، میں نے وہاں اہلِ فقہ کی صحبت اختیار کی" اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علمی ماحول کے اندر رہنا بھی علم کے اندر کمال پیدا کرنے میں معین ومددگار ثابت ہوتا ہے، یہ ماحول گھر کے اندر بنایا جائے، یا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے درمیان؛ ہر طالبِ علم کو اپنے لیے خود سے اپنا ایک علمی ماحول بنانا چاہیے۔

اسی طرح امام صاحبؒ نے اپنے اس جملے سے کہ "میں نے ان میں سے ایک فقیہ کو لازم

(۱) حلیۃ الاولیاء ۶: ۳۲۰

(۱) للموفق المکی ص ۵۲۔ ۵۳

پکڑلیا'' یہ بات بتلائی کہ اپنے کسی ایک استاذ کومنتخب کر کے ان کو اپنا اُسوہ اور آئیڈیل بنالینا اور ان کے ساتھ مکمل ملازمت اختیار کرلینا یہ طالبِ علم کے لیے انتہائی اہم چیز ہے(۱)۔

پھر یہ علمی صفت سلف سے منتقل ہو کر خلف کے اندر آئی، اور یہیں سے علامہ ابنِ نجیمؒ (متوفی ۹۷۰ھ) نے وہ بات کہی، جو ''ادب الاختلاف'' میں گزر چکی ہے کہ: (فقہاء جو ایک جگہ کسی قید کو ذکر کر کے دوسری جگہ چھوڑ دیتے ہیں) اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کے علم کا وہی شخص دعویٰ کرے، جس نے ان کی طویل صحبت اُٹھائی ہو اور یہ بات آشکارا ہو جائے کہ ان کا علم کثرتِ مراجعت، فقہاء کی عبارتوں کی چھان بین اور شیوخ کے پاس جا کر پڑھنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے(۲)۔

اساتذہ کا ادب ضروری ہے:

جس شخص نے علماء سے علم حاصل نہیں کیا، نہ ان کے ساتھ طویل صحبت اُٹھائی اور نہ ان کے آداب واخلاق سے آراستہ ہوا، اس سے کیسے اِس بات کا تصور ہو سکتا ہے کہ وہ علماء کی قدر و قیمت پہچان لے گا؟ اگر ایسے شخص کی زبان وقلم علماء کی شان میں گستاخیاں کریں، اور اختلاف کے آداب پامال کر بیٹھیں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں(۳)۔

نیک اور باعمل علماء کے ساتھ بیٹھنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ دل چاہے یا نہ چاہے وہ ان علماء کا ادب واحترام کریں، حتیٰ کہ اگر کسی کے دل میں ان سے عقیدت ومحبت

---

(۱) یہ دونوں مضامین امام قاضی ابن العربیؒ کی کتاب ''قانون التأويل'' (ص/۴۵۱-۴۵۲) میں اور بھی عمدہ انداز میں موجود ہیں، جہاں انھوں نے امام غزالیؒ کے ساتھ اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔

(۲) ادب الاختلاف فی مسائل العلم والدین ص ۱۴۷

(۳) اِس سلسلے میں ائمۂ سابقین میں سے ابنِ حزم کے اندر ہمارے لیے عبرت کا سامان موجود ہے، جلد ہی ص ۳۲۶ پر ان کے بارے میں امام شاطبیؒ کا کلام آرہا ہے؛ نیز ص ۲۶۷ پر جوجری کا ایک واقعہ بھی آرہا ہے جو شریف یحییٰ مناوی کے ساتھ پیش آیا۔

نہ بھی ہو، تب بھی ان کا ادب واحترام ضروری ہے؛ کہ اللہ کے نزدیک ان کا بڑا مقام ہے، پھر جن کے دلوں میں ان کی عقیدت ومحبت پیوست ہے اور وہ ان کے پاس علم حاصل کرنے اور اپنی زندگی سنوارنے آئے ہوئے ہیں، ان کے لیے ان علماء کا ادب واحترام کتنا ضروری ہوگا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں!۔

استاذ کے ادب کے کچھ واقعات:

ابو محمد حارثی نے امام ابوحنیفہؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے اپنے استاذ حماد بن ابی سلیمانؒ کے احترام میں کبھی ان کے گھر کی طرف پاؤں نہیں پھیلایا؛ حالانکہ میرے اور ان کے گھر کے درمیان سات گلیاں حائل تھیں![1]۔

بیہقیؒ نے **"مناقب الشافعي"**[2] میں امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ: جب میں مدینہ آیا تو میں نے امام مالکؒ کے اندر علم کی بے پناہ تعظیم اور احترام دیکھا، جس سے میرے ادب واحترام میں بھی اضافہ ہوا، یہاں تک کہ بسااوقات میں امام مالکؒ کی مجلس میں ہوتا اور مجھے صفحہ پلٹنے کی ضرورت پڑتی تو میں آہستہ سے صفحہ پلٹتا؛ تاکہ اس کی آواز سے امام مالکؒ کو خلل نہ ہو۔

اس کے بعد بیہقی نے ربیع بن سلیمانؒ سے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ: بخدا! مجھے امام شافعیؒ کی نگاہوں کے سامنے کبھی پانی پینے کی ہمت نہیں ہوئی!![3]۔

ان حضرات کا یہ ادب واحترام شاعر کے اس شعر کی تصدیق کرتا ہے:

ولو أن أهل العلم صانوه صانهم ❖ ولو عظموه في النفوس لعظما

اگر اہلِ علم اس علم کی حفاظت کرتے تو علم بھی ان کی حفاظت کرتا، اگر وہ دلوں میں اس کی عظمت پیدا کرتے تو علم بھی انھیں عظمت عطا کرتا۔

---

(۱) **عقود الجمان في مناقب ابي حنيفة النعمان للعلامه الصالحي** ص ۲۹۳

(۲) ۲:۴:۱۴۴ (۳) المناقب ۲:۱۴۵ا المدخل ص ۳۹۰

یہ ہمارے ائمہ کے ادب واحترام کی ایک جھلک تھی، "**وأدب الإمام إمام الأدب**" اور امام کا ادب: ادب کا امام ہوتا ہے، آج ہم اگر چہ ان آداب سے بہت دُور ہو چکے ہیں؛ لیکن بہر حال ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ جتنا ہو سکے اس کی تلافی کریں، اور ان ائمہ کی مشابہت اختیار کر کے ان کی اقتدا کرنے کی سعی کریں، باقی توفیق دینے والی ذات اللہ کی ہے۔

''الموافقات'' میں شاطبیؒ کی دلچسپ بحث:

امام اسحاق شاطبیؒ نے اپنی کتاب ''الموافقات'' میں [۱] تلقی عن الشیوخ کی اہمیت پر، اور اس مسئلے پر کہ کن لوگوں سے علم حاصل کرنا چاہیے نہایت عمدہ بحث کی ہے، جو کافی طویل ہے، میں اس میں سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

علم کو علماء سے حاصل کرنا ضروری ہے:

''تیرہواں مقدمہ: علم کے اندر رسوخ پیدا کرنے کا انتہائی نفع بخش طریقہ یہ ہے کہ علم کو ان ہی علماء سے حاصل کیا جائے جنھیں علم پر مکمل عبور حاصل ہو [۲]...... علماء کا اِس بات میں اختلاف ہے کہ بغیر استاذ کے علم حاصل کرنا ممکن ہے یا نہیں؟ ممکن تو بہر حال ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا؛ لیکن عملاً عرفِ عام میں یہی دیکھا گیا ہے کہ علم کے حصول کے لیے استاذ کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے، پس یہ چیز (یعنی استاذ کا ضروری ہونا) فی الجملہ متفق علیہ ہے، اگر چہ اس کی بعض جزئیات میں اختلاف ہے...... اور عرفِ عام میں لوگوں کا عملاً اس پر متفق ہو جانا استاذ کے ضروری ہونے کے لیے کافی ہے۔

(۱) ۱:۹۱-۹۹، اس کا کچھ حصہ آگے ص ۲۰۰ پر بھی آرہا ہے

(۲) علم پر عبور رکھنے والے علماء کی علامت کے سلسلے میں شاطبی کی وضاحت ایک صفحہ کے بعد ہی نیز ص ۲۰۱ پر بھی آرہی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ: یہ علم پہلے علماء کے سینوں میں تھا، پھر کتابوں میں منتقل ہوا؛ البتہ اس کی چابیاں علماء کے ہاتھوں میں ہی رہیں[1]، اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ علم کے حصول کے لیے علماء کا ہونا ضروری ہے؛ کیونکہ انھوں نے ان دو چیزوں[2] کے علاوہ کوئی تیسری چیز ذکر نہیں کی۔

اور یہ بات ایک صحیح حدیث سے ماخوذ ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس علم کو اس طرح نہیں اُٹھائیں گے کہ لوگوں کے سینوں سے کھینچ لیں؛ بلکہ علماء کو دنیا سے اُٹھالیں گے، جس سے علم بھی رخصت ہوجائے گا الخ[3] جب معاملہ ایسا ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ علماء ہی علم کی چابیاں ہیں[4]۔

---

(۱) ابنِ رشدؒ نے "**المقدّمات الممهّدات**" (۱/۴۹) میں یہی بات ان الفاظ میں کہی ہے کہ: علم صدرِ اوّل اور صدرِ ثانی میں اہلِ علم کے سینوں میں تھا، پھر بھیڑ کے چمڑوں میں منتقل ہوگیا؛ البتہ اس کی کنجیاں اہلِ علم کے سینوں میں ہی رہیں؛ اس لیے طالبِ علم کے لیے استاذ کا ہونا ضروری ہے، جو اس کے لیے فہمِ صحیح کے دروازے کھولے۔

(۲) (کتاب اور رجال)

(۳) بخاری (۱۰۰)، مسلم ۴: ۲۰۵۸ (۱۳)

(۴) ابنِ مفلح کی "الآداب الشرعیۃ" (۲/۱۲۵) میں مفسر محدث نحوی ابوحیان اندلسی (متوفی ۷۴۵ھ) کا ایک اقتباس منقول ہے، جس کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ: میں نے ایسے لوگوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، اور خود اپنے فہم سے کتابوں کا مطالعہ کرکے علم حاصل کرتے ہیں، کچھ اشعار کہے ہیں:

يظن الغمر أن الكتب تهدي ❖ أخا فهم لأدراك العلوم

اناڑی شخص سمجھتا ہے کہ یہ کتابیں علوم حاصل کرنے میں ذہین آدمی کی رہنمائی کرتی ہیں

وما يدري الجهول بأن فيها ❖ غوامض حيرت عقل الفهيم

اُس پرلے درجے کے جاہل کو یہ نہیں پتہ کہ ان کتابوں میں ایسے پیچیدہ مقامات بھی ہوتے ہیں جو ذہین لوگوں کی عقلوں کو بھی اُلجھا کر رکھ دیتے ہیں۔

راسخ علماء سے علم حاصل کرنا ضروری ہے:

جب یہ بات طے ہوگئی کہ: علم کو علماء سے حاصل کرنا ضروری ہے، تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ علم ایسے علماء سے حاصل کیا جائے جو اس علم پر عبور رکھتے ہوں، اور یہ بات بھی پہلی بات کی طرح بالکل واضح ہے، عقلاء کا بھی اس پر اتفاق ہے؛ کیوں کہ عقلاء نے ایک عالم

إذا رمت العلوم بغير شيخ ❖ ضللت عن الصراط المستقيم

اگر تم بغیر استاذ کے علم حاصل کروگے تو راہِ مستقیم سے بھٹک جاؤ گے

وتلتبس الأمور عليك حتى ❖ تصير أضلّ من توما الحكيم

اور معاملات تم پر مشتبہ ہو جائیں گے یہاں تک کہ تم توما حکیم سے بھی زیادہ گمراہ ہو جاؤ گے

اس آخری شعر کے اندر میں نے ایک شاعر کے شعر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

قال حمار الحكيم توما ❖ لو أنصفوني لكنت أركب

حکیم توما کے گدھے کا کہنا ہے کہ اگر لوگ میرے ساتھ انصاف کرتے تو آج سواری میں کرتا نہ کہ حکیم

لأنني جاهل بسيط ❖ وصاحبي جاهل مركب

کیونکہ میں تو جاہل بسیط ہوں جبکہ میرا مالک جاہل مرکب ہے۔

توما حکیم ایک شخص تھا، جو کتابوں سے علاج کے نسخے سیکھتا اور عجیب وغریب تحریفات کرتا تھا، جن سے بہت سے لوگوں کی موت بھی واقع ہوئی، مثلاً: ایک حدیث شریف ہے: **"الحبة السوداء شفاء من كل داء"** کہ سیاہ دانہ ہر بیماری کا علاج ہے، توما حکیم نے جب اسے پڑھا تو "حبہ" کے بجائے "حیہ" پڑھ لیا، **"الحية السوداء شفاء من كل داء"** کہ سیاہ سانپ ہر بیماری کا علاج ہے (پھر جو کچھ ہوا ہوگا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں)!!۔

اِس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ توما حکیم وہی ہے جس کا حافظ ابنِ حجرؒ نے **"الدرر الكامنة"** کے اندر حرفِ تاء کے اخیر میں تعارف کرایا ہے اور وفات ۷۲۴ھ بتلائی ہے؟

(۱) دیکھیے شاطبی کی ہی ایک دوسری کتاب **"الإفادات والإنشاءات"** (ص/۱۰۷) کے اندر افادہ نمبر ۲۷)۔

کے لیے چاہے وہ کسی بھی علم سے تعلق رکھتا ہو، درجِ ذیل شرائط کو ضروری قرار دیا ہے:

۱- وہ اس علم کے اُصولوں کو جانتا ہو جن پر اس علم کی بنیاد ہے۔

۲- اس علم کے اندر اپنے مقصود کو ادا کرنے پر پوری طرح قادر ہو۔

۳- اس سے جو چیزیں لازم آتی ہوں ان کو بھی جانتا ہو۔

۴- اس علم پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے کی بھی قدرت رکھتا ہو[۱]۔

ان شرائط کی روشنی میں اگر ہم اپنے اسلاف کا جائزہ لیں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ ان کے اندر یہ تمام شرطیں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

واضح رہے کہ ان شرائط کے اندر یہ نہیں ہے کہ وہ عالم ہمیشہ غلطی سے محفوظ رہتا ہو؛ لہٰذا کبھی کبھی غلطی کا سرزد ہو جانا عالم کے لیے قادح نہیں ہے، اور نہ اس سے اس کے امام اور مقتدی ہونے پر کوئی اثر پڑتا ہے؛ البتہ جو شرائط ذکر کی گئی ہیں، ان میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے عالم کے مرتبۂ کمال میں بھی کمی آئے گی، اور جب تک وہ اس کمی کو دُور نہیں کرلے گا، مرتبہ کمال کا مستحق نہیں ہو سکے گا۔

علمائے راسخین کی علامتیں:

فصل: علم پر عبور رکھنے والے عالم کی کچھ علامتیں بھی ہیں جو پیچھے بیان کردہ شرائط کے پورے طور پر موافق ہیں، اگرچہ بظاہر ان سے ربط نظر نہیں آتا، وہ کل تین علامتیں ہیں:

پہلی علامت: اپنے علم پر عمل، کہ اس عالم کے قول وفعل میں یکسانیت پائی جاتی ہو، اگر ایسا نہ ہو اور اس کے قول وفعل میں تعارض ہو، تو وہ اس بات کا اہل نہیں ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے، اور کسی علم میں اس کی اقتدا کی جائے۔

دوسری علامت: یہ ہے کہ اس نے اس علم کو شیوخ سے حاصل کیا ہو، اور ان کی ملازمت اختیار کر کے ان سے تربیت حاصل کی ہو؛ ایسے شخص کے اندر اپنے شیوخ کے

(۱) شاطبی کی ہی ''الافادات والانشادات'' ص ۱۰۷ میں افادہ نمبر ۲۷ بھی دیکھیے۔

اوصاف منتقل ہوجاتے ہیں، ہمارے اسلاف کا یہی حال تھا، وہ شیوخ کے پاس رہ کر ان سے علم اور تربیت حاصل کرتے تھے۔

چنانچہ سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملازمت اختیار کی، وہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو لیتے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو مانتے اور اس پر پورا اعتماد کرتے، آپ چاہے جو بھی فرمائیں اور جن حالات میں بھی فرمائیں (شاطبی نے اس موقع پر حضرت عمرؓ کی صلح حدیبیہ والی پوری حدیث نقل کی ہے، جس میں ان کا وہ جملہ بھی ہے کہ: **"ألسنا علی حق وهم علی باطل"** کیا ہم لوگ حق پر اور یہ لوگ باطل پر نہیں ہیں؟ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

یہ ہے فائدہ علماء کے ساتھ ملازمت، ان کی کامل تابعداری اور اشکال کے ہوتے ہوئے بھی ان کی بات مان لینے کا[1]، یہاں تک کہ (سورۂ فتح کے نزول کے ساتھ) دلیل سامنے آگئی، اسی صلح حدیبیہ کے متعلق سہل بن حنیفؓ نے صفین کے دن کہا تھا: کہ لوگو! اپنی رایوں کو متہم سمجھو، بخدا! میں نے ابوجندل (یعنی صلح حدیبیہ) کے دن دیکھا ہے، میرا تو یہ حال تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو رَد کرنا میرے بس میں ہوتا تو میں رَد کردیتا، یہ اس لیے کہا کہ حدیبیہ کے دن مسلمانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر اطمینان نہیں ہورہا تھا؛ پھر بھی انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو مانا، اور اپنی رائے چھوڑی، تا آنکہ قرآن کی آیتیں نازل ہوئیں اور سارے اشکالات جاتے رہے۔

پھر یہ چیز بعد والوں کے لیے ایک اصل کی حیثیت اختیار کرگئی؛ چنانچہ تابعین نے بھی صحابہؓ کے ساتھ وہی اُسوہ اپنایا جو صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنایا، جس کے نتیجہ میں انھیں دین کی کامل سمجھ عطا ہوئی، اور وہ علومِ شرعیہ میں فضل وکمال کی چوٹیوں

---

(۱) موافقات (۴/۳۲۱) کی وہ فصل بھی ضرور دیکھیے، جس کا آغاز انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ: **"ترك الاعتراض علي الكبراء محمود"** "بڑوں پر اعتراض چھوڑ دینا امر محمود ہے"۔

تک پہنچے، اس اصل اور قاعدے کی صحت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ کسی بھی عالم کو لے لیجیے، جن کی طرف لوگوں کا رجوع ہو، کوئی نہ کوئی شخصیت ان کا اُسوہ اور نمونہ ضرور ملے گی، جو اپنے زمانے میں ان ہی کی طرح لوگوں کا مرجع رہی ہوگی، اور جتنے بھی گمراہ فرقے اور حدیث کی مخالفت کرنے والے افراد ملیں گے، وہ سب اس وصف سے دُور نظر آئیں گے۔

اسی بات کو لے کر تو ابنِ حزم ظاہری پر علماء نے تنقید کی ہے کہ انھوں نے شیوخ کی ملازمت اختیار نہیں کی[1]، اور نہ ان کے آداب اپنائے، جبکہ علمائے راسخین: ائمہ اربعہ وغیرہ کا طریقہ ایسا نہیں تھا۔

تیسری علامت: علم پر عبور رکھنے والے عالم کی تیسری علامت اپنے استاذ کی اقتداء اور ان کے رنگ میں رنگ جانا ہے، جیسا کہ اُوپر صحابہؓ اور تابعینؒ کی اقتداء کے بارے میں گزرا، اسی طرح ہر زمانے کے ائمہ واسلاف کا حال رہا، یہی وہ وصف تھا، جس میں امام مالکؒ اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے، یعنی ان کے اندر یہ وصف زیادہ پایا جاتا تھا ویسے تو سبھی ائمہ کا یہ حال تھا کہ وہ ہدایت کے چراغ تھے، ان سب کے اندر یہ وصف پایا جاتا تھا؛ لیکن امام مالکؒ کے اندر یہ وصف نمایاں طور پر پایا جاتا تھا، جب اس وصف کو چھوڑ دیا گیا اور اس کی طرف سے توجہ ہٹالی گئی تو پھر بدعات نے سر اُٹھایا؛ کیونکہ اَگلوں کی اقتداء چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے نزدیک کوئی چیز پیدا ہوگئی ہے، جو اگلوں سے منتقل ہو کر نہیں آئی؛ بلکہ صرف اس کی اپنی ہوی اور اتباعِ نفس کا نتیجہ ہے۔

---

(۱) شاطبی کے لفظ کو دھیان سے پڑھیے کہ: ''ابنِ حزم نے شیوخ کی ملازمت اختیار نہیں کی'' تاکہ یہ اشکال نہ پیدا ہو کہ ان کے تو بہت سے شیوخ ہیں، وہ ''محلی'' وغیرہ میں تو متعدد شیوخ سے روایت کرتے ہیں؛ کیونکہ روایت لینا اور چیز ہے اور ملازمت اور چیز، ملازمت تو دائمی صحبت اور مجالست کا تقاضہ کرتی ہے جبکہ روایت تو چند مجلسوں میں حدیثیں سن کر بھی حاصل ہوجاتی ہے، یا شیخ سے کسی کتاب کی اجازت لے کر بھی ہوجاتی ہے۔

علماء سے علم حاصل کرنے کا طریقہ:

فصل: جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ علم کو اہلِ علم سے لینا ضروری ہے تو اب اس کے دو طریقے ہیں:

ایک: بالمشافہ لینا، جو سب سے انفع اور اسلم طریقہ ہے، دو وجہوں[1] سے:

پہلی وجہ: یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استاذ اور شاگرد کے درمیان ایک خاص قسم کا معاملہ ہوتا ہے، جس کو ہر وہ شخص محسوس کرتا ہے جو علم اور علماء سے مزاولت رکھتا ہے؛ چنانچہ بارہا دیکھنے میں آتا ہے کہ طالبِ علم اپنی کتاب میں ایک مسئلہ پڑھتا ہے، اس کو یاد کرتا ہے، اس کو بار بار زبانی دہراتا ہے؛ لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا؛ لیکن جب استاذ اس کے سامنے وہی مسئلہ بیان کرتے ہیں تو ایک دم سے سمجھ میں آجاتا ہے، اور فوراً ذہن نشین ہوجاتا ہے؛ کیونکہ استاذ کے سامنے طالبِ علم پر ایسی باتیں کھلتی ہیں جو عام اوقات میں نہیں کھلتیں، اور یہ نور طالبِ علم کے اندر اپنے استاذ کی اتباع واقتدا اور ان کے ادب واحترام کے اعتبار سے بڑھتا چلا جاتا ہے، (شاطبی نے یہاں مسلم شریف کی **"نافق حنظلة"** والی مشہور روایت بھی ذکر کی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تمہارا ہر وقت وہی حال رہے جیسا میرے سامنے اور ذکر کی حالت میں ہوتا ہے، تو فرشتے بستروں اور راستوں پر تم سے مصافحہ کرنے لگیں)[2]۔

دوسرا طریقہ: اہلِ علم سے علم حاصل کرنے کا مصنّفین کی کتابوں کا مطالعہ ہے، یہ بھی نفع بخش طریقہ ہے؛ لیکن دو شرطوں کے ساتھ:

پہلی شرط: یہ کہ طالبِ علم اپنے مطلوبہ علم کی بنیادی باتوں کو اتنا سمجھ چکا ہو، اور اس کی اصطلاحات سے اتنی واقفیت حاصل کر چکا ہو کہ اب وہ ان کتابوں کا مطالعہ کر کے ان سے

---

(۱) صرف ایک ہی وجہ ذکر کی۔

(۲) ۴:۲۱۰۶ (۱۲)

فائدہ اُٹھا سکتا ہو، اور ان مبادیات اور اصطلاحات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے اسے پہلا طریقہ ہی اپنانا پڑے گا، یعنی بالمشافہ علماء سے سیکھنا پڑے گا، (گویا بات گھوم پھر کر شیوخ سے حاصل کرنے پر ہی آ گئی)، یاد رکھیے صرف کتابیں طالبِ علم کو کچھ بھی نفع نہیں پہنچا سکتیں، جب تک کہ علماء اس کے لیے کتاب سے استفادہ کی راہ ہموار نہ کردیں، اور یہ ایک عام بات ہے، جس کا ہم سب مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

دوسری شرط: یہ ہے کہ وہ مطلوبہ علم کے متقدمین کی کتابیں پڑھے؛ کیونکہ متقدمین کو متاخرین سے زیادہ پختگی اور رسوخ حاصل ہوتا ہے(۱)، اور یہ بات تجربہ اور حدیث دونوں سے ثابت ہے۔

جہاں تک تجربہ کی بات ہے: تو ہر علم کے اندر ہم دیکھتے اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ متاخرین کے اندر وہ گہرائی اور گیرائی نہیں پیدا ہو پاتی جو متقدمین کے اندر ہوتی ہے؛ چنانچہ صحابہؓ کے علم میں جو گہرائی و گیرائی تھی، وہ تابعین کے اندر نہیں تھی، اور تابعین کے اندر جو گہرائی و گیرائی تھی وہ تبع تابعین میں نہیں تھی، اسی طرح مسلسل آج تک کمی ہوتی رہی ہے، جو شخص اسلاف کی سوانح اور ان کے اقوال و واقعات کو پڑھے گا اسے اس سلسلے میں حیرت انگیز صورتِ حال دیکھنے کو ملے گی۔

اور جہاں تک حدیث کی بات ہے: تو حدیث کے اندر ہے: **خير الناس قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم** کہ سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں گے، اس میں اِس بات کی طرف صاف اشارہ ہے کہ: ہر زمانے کا حال بعد والے زمانے کے ساتھ ایسا ہی ہوگا،

---

(۱) حافظ ابنِ حجرؒ ''لسان المیزان'' (۳/۳۱۶) میں خالد بن انس کے ترجمے میں لکھتے ہیں کہ: ''متقدمین کے کلام کی طرف دل بہت زیادہ کھنچتا ہے''، وہاں اس قول کا پس منظر بھی دیکھیے، تاکہ اس جملے کا اثر اور زیادہ ہو۔

شاطبیؒ نے یہاں اور بھی کئی احادیث ذکر کی ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

یہیں سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو شخص بھی کسی علم کے اندر احتیاط کا دامن تھامے رہنا چاہتا ہو، خاص طور پر علم شرعی کے اندر، جو انسان کے لیے سب سے مضبوط پناہ گاہ ہے، تو اس کے لیے متقدمین کی تصنیفات ان کے اقوال اور ان کی سوانح کا مطالعہ اس سلسلے میں بے حد مفید ثابت ہوگا، باقی توفیق دینے والی ذات اللہ ہی کی ہے۔

امام شاطبیؒ کا اقتباس پورا ہو گیا۔

صحیفوں کو شیخ بنانے پر سخت تنبیہ:

علم اور علماء کے طبقات اسی نہج پر چلتے رہے، پھر متقدمین میں سے بعض حضرات سے احادیث کی قرأت میں کچھ غلطیاں سرزد ہونے لگیں، اگرچہ یہ غلطیاں شاذ و نادر ہی تھیں؛ لیکن اس دَور کے علماء کی طرف سے مسلسل اِس بات پر تنبیہ ہونے لگی کہ صحیفوں سے علم حاصل نہ کیا جائے، اور اسی کے ساتھ انھوں نے اعراب وغیرہ ضبط کرنے کے لیے مستقل دو علم ایجاد کیے: ایک "**التصحيف والتحريف**" جو عمومی کلام کے لیے تھا، اور دوسرے "**المؤتلف والمختلف**" جو بطور خاص ناموں کے لیے تھا، ان حضرات کی زبانوں پر یہ جملہ مستقل رہتا تھا: "**لا تأخذ القرآن عن مصحفي ولا العلم عن صحفي**" کہ قرآن کو کسی مصحفی سے مت سیکھو، اور نہ علم کسی صحیفہ والے سے حاصل کرو، وہ بکثرت صحیفہ کو شیخ بنا لینے سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔

امام اوزاعیؒ کے تذکرے میں حافظ ذہبیؒ نے صحیفوں سے علم حاصل کرنے پر ائمہ کی اس سخت تنبیہ کا ایک اہم سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے بسا اوقات کلمہ میں ایسی تصحیف ہو جاتی تھی، جس سے معنیٰ ہی بدل جاتے تھے؛ واضح رہے کہ امام اوزاعیؒ کے زمانے میں نقطے اور اعراب لگانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا(۱)۔

(۱) سیر اعلام النبلاء ۷: ۱۱۴

راقم کہتا ہے کہ: بعد میں پھر اس کا رواج ہوا، اور طباعت کے زمانے تک رہا؛ لیکن اب طباعت کے دَور میں ہمیں مطبوعہ کتابوں کے اندر پہلے سے بھی زیادہ سنگین غلطیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اور اس کے تین بنیادی سبب سمجھ میں آتے ہیں، جو کبھی تو اکٹھا ہو جاتے ہیں، اور کبھی ان میں سے ایک یا دو پایا جاتا ہے:

مطبوعہ کتابوں کی غلطیاں اور علماء سے علم حاصل کرنے کی ضرورت:

(۱) طباعت کی کچھ غلطیاں تو وہ ہوتی ہیں جن سے چھٹکارا ممکن نہیں؛ کیونکہ انسان سے بہر حال چوک ہو جاتی ہے، یہ غلطیاں ناشر اور محقق کے پورے اہتمام اور توجہ کے باوجود رہ جاتی ہیں۔

(۲) طباعت کی کچھ غلطیاں ناشر یا محقق کی بے توجہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

(۳) کچھ طباعت کی یا اصل کتاب کی غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو محقق صاحب کی کرم فرمائیوں سے پیدا ہوتی ہیں، جو ایسے علم سے متعلق کسی کتاب کی تحقیق کرنے بیٹھ جاتے ہیں، جس علم کو انھوں نے سرے سے سیکھا ہی نہیں ہوتا، چہ جائے کہ وہ اس کو سیکھتے اور پختگی نہ پیدا کر پاتے! اور بھی اس قسم کی بہت سی نازیبا حرکتیں اس وقت پیش آ رہی ہیں!۔

میں کہتا ہوں کہ: آج مطبوعات کے دَور میں ہمارا یہ صاف ستھرا اور چمکتا ہوا روشن علمی ورثہ اس قسم کے داغوں سے آلودہ ہو چکا ہے، یقیناً اس سے دین اور علمِ دین کو جتنا نقصان پہنچ رہا ہے، وہ مخطوطات کے دَور سے کہیں بڑھ کر ہے۔

ان ہی سب وجوہات کی بنا پر اِس بات کی ضرورت اور شدید ہو جاتی ہے کہ علم کو علماء سے ہی حاصل کیا جائے اور وہ بھی ان علماء سے جن کے پاس یہ علم توارث کے ساتھ طبقۃً بعد طبقۃٍ پہنچا ہے۔

میں ان ہی علماء سے جن کے پاس یہ علم توارث کے ساتھ طبقۃً بعد طبقۃٍ آیا ہے؛ علم حاصل کرنے پر اس لیے زور دے رہا ہوں؛ تاکہ اپنی گفتگو میں موجودہ صورتِ حال کو ذکر

کر کے قارئین کو ان حالات سے متنبہ کر سکوں، جن کے اندر ہم اس وقت گرفتار ہو چکے ہیں؛ بلکہ یوں کہیے کہ اس گڑھے میں گرنے سے روک سکوں جس گڑھے تک ہم پہنچ چکے ہیں۔

جامعات کی تعلیم کے بُرے اثرات-ایک ضمنی بحث(۱):

پہلے علم اس طرح حاصل کیا جاتا تھا کہ طالبِ علم شیوخ کے پاس جا کر ان کی طویل صحبت اُٹھاتا، ان کے دروازے پر کھڑا رہتا، ان سے ہر فن کی متعدد کتابیں پڑھتا، اور ہر علم کی امہات الکتب میں سے مختصرات کو حفظ کرتا، اور حصولِ علم میں تدریج کی راہ اختیار کرتا، جس میں وہ دونوں طریقے اپناتا، تلقی کا طریقہ بھی اور ذاتی محنت اور ذاتی مطالعہ کا بھی، جس کے اندر اگر کہیں کوئی اشکال پیش آتا تو اپنے شیخ سے رجوع کر کے اسے حل بھی کرتا، اس طرح وہ دھیرے دھیرے بتوفیق خداوندی اس مقام تک پہنچ جاتا کہ اسے نئی نسل کی مرجعیت حاصل ہو جاتی، وہ طلبہ کا یا ان عام مسلمانوں کا مرجع بن جاتا جو دینی مسائل میں اس سے رجوع کرتے، اگرچہ وہ اپنے سے اُوپر والی نسل کے بالمقابل کمزور ہوتا؛ مگر یہ سلسلہ تو شروع سے چلا آرہا ہے کہ ہر بعد والی نسل پہلی والی نسل سے بہر حال کمزور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہم جس مرحلے پر پہنچ گئے ہیں وہ انتہائی خطرناک مرحلہ ہے، اور اس مرحلے نے ہمیں ایک اور اس سے بھی زیادہ خطرناک مرحلے تک پہنچا دیا ہے اور اب صورتِ حال بالکل وہی نظر آتی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانے کے فتنوں کے بارے میں بتائی تھی: "**یرقّق بعضها بعضا**"(۲) (کہ ہر بعد والا فتنہ پہلے والے فتنہ سے سنگین ہوگا)۔

---

(۱) یہ ضمنی بحث ص ۱۹۴ کی آخر پر ختم ہوگی

(۲) یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جسے امام مسلم ۳: ۱۴۷۲ (۴۶) نے روایت کیا ہے۔

کلیۃ الشریعہ کی تعلیم اور اس کی تباہ کاریاں

الف: بنیادی علوم کے بغیر عالم بن جانا:

پہلا خطرناک مرحلہ جس سے آج ہم دو چار ہیں، وہ شرعی جامعات میں کلیۃ الشریعہ کی تعلیم کا ہے، جہاں نہ طالبِ علم سے حاضری مطلوب ہوتی ہے اور نہ سبق کی پابندی، وہاں یہ بھی شرط نہیں ہوتی کہ اس طالبِ علم نے مرحلۂ جامعہ میں داخل ہونے سے پہلے کوئی شرعی علم پڑھا بھی ہو، یعنی وہ مدارس کے اندر نہ مرحلہ اعدادیہ پڑھا ہوا ہوتا ہے نہ مرحلۂ ثانیہ؛ اور اس کو کلیۃ الشریعہ میں داخلہ مل جاتا ہے، اگرچہ وہ ابھی عمومی ثانویات کا ہی طالبِ علم رہا ہو، اور اس نے ابھی ابتدائی بنیادی اور ضروری علوم بھی نہ سیکھے ہوں۔

ایسا طالبِ علم مرحلۂ جامعہ میں داخل ہو کر چار سال کلیۃ الشریعہ پڑھتا ہے، اور چار سال بعد نئی نسل کا مدرس اور ان کو دین سکھانے والا بن کر نکلتا ہے، اور جب عام لوگوں کے درمیان بیٹھتا ہے، تو اپنے آپ کو عالم سمجھ کر مجلس کی ضرورت کے مطابق دین کی باتیں کرنے لگتا ہے۔

واضح رہے کہ ہر انسان کو تین قسم کی عمریں ملتی ہیں: ایک زمانی عمر: جو پیدائش کے دن سے شروع ہوتی ہے، دوسرے عقلی عمر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی قوتِ ادراکیہ کے اعتبار سے ہر انسان کے اندر مختلف ہوتی ہے؛ چنانچہ کسی کی عقل اس کی زمانی عمر کے مقابلے میں بڑی ہوتی ہے، کسی کی برابر ہوتی ہے اور کسی کی چھوٹی ہوتی ہے، اور تیسری ہے علمی عمر، جو اس دن سے شروع ہوتی ہے جس دن وہ اپنی پڑھائی کا آغاز کرتا ہے۔

اس اعتبار سے یہ طالبِ علم جس نے کلیۃ الشریعہ میں صرف چار سال گزارے، اور اس سے پہلے وہ عمومی ثانویات کا طالبِ علم تھا، فراغت کے وقت اس کی علمی عمر صرف چار سال ہی ہوئی، اس کے باوجود بھی وہ نئی نسل کو پڑھانے بیٹھ جاتا ہے، اور عوام میں دینی مجلسیں لگاتا پھرتا ہے!۔

اس کے اور اس طالبِ علم کے درمیان جو مرحلۂ اعدادیہ اور ثانویہ میں چھ سال پڑھ کر مرحلہ جامعیہ میں آتا ہے اور یہاں چار سال گزارتا ہے: بڑا فرق ہے، کہ ایک کی علمی عمر تو دس سال کی ہے، جبکہ دوسرے کی صرف چار سال ہے۔

یہ تفاوت تو گنتی کے اعتبار سے ہوا۔

باقی اہمیت کے اعتبار سے تفاوت تو بہت زیادہ ہے؛ کیونکہ یہ طالبِ علم گرچہ صرف چھ سال زائد پڑھتا ہے؛ لیکن یہ چھ سال اثر اور فائدے کے اعتبار سے گنتی میں کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں؛ کیونکہ یہ چھ سال اس کی زندگی کے تمام علمی مراحل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان چھ سالوں میں صحیح نہج اور مطلوبہ تدریج کے ساتھ اس کی علمی ترقی ہوتی ہے، جبکہ پہلا شخص بغیر سیڑھی کے چھت پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے، جو ممکن ہی نہیں۔

ائمۂ مجتہدین کی رائے پر حکم لگانے کا مکلّف بنانا:

اور سب سے خطرناک بیماری، جو ہمارے لیے دوسرا خطرہ بنی ہوئی ہے، یہ ہے کہ: شرعی جامعات کے اساتذہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان طلبہ کے اندر کتنا ضعف ہے، انھیں اخیر سال میں سالانہ امتحان کے اندر؛ بلکہ کبھی تو شروع سال میں ہی جس وقت انھیں فقہ یا آیاتِ احکام، یا احادیثِ احکام کے موضوع پر کسی فقہی مسئلہ پر تحقیق کرنے کے لیے کہتے ہیں تو انھیں اس بات کی جرأت دیتے ہیں کہ وہ ائمہ مجتہدین: امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے رائے اور اجتہاد سے معارضہ کریں، وہ اس طالبِ علم کو جو ابھی علمی عمر کے اعتبار سے صرف ایک سال کا ہے، اس بات کا مکلّف بناتے ہیں کہ وہ ائمہ اربعہ وغیرہ کی رائے ذکر کرنے کے بعد اپنی رائے بھی پیش کرے اور بتائے کہ اس کے نزدیک راجح کیا ہے!!! آپ اس پر حیرت واستعجاب کی جتنی بھی علامتیں بڑھاتے جائیں، کم ہیں۔

متقدمین کی کتابوں سے کاٹ دیا جاتا ہے:

پھر اس طالبِ علم کو اور کمزور بنا دیا جاتا ہے، وہ اس طور پر کہ اس کی علمی نشو ونما ایسی کاپیوں کو پڑھا کر کی جاتی ہے، جن کو یہ اساتذہ خود تیار کرتے ہیں، پھر ان کو چھاپ کر کتاب کی شکل دے دیتے ہیں، اس طرح اس طالبِ علم کا رشتہ ائمہ سابقین کی کتابوں، ان کی اصل معتدل اور قدیم میراث، ان کی پختہ اور ٹھوس علمی عبارتوں اور ان عبارتوں میں موجود ان موروثی اصطلاحات سے جن کا سمجھنا طالبِ علم کے لیے ضروری ہوتا ہے، بالکل ختم ہوجاتا ہے، اور یہی مطبوعہ کاپیاں طالبِ علم کے لیے مستقبل میں مرجع وماخذ بن جاتی ہیں، اور اگر کبھی اس طالبِ علم کو جو کہ اب عالم بن چکا ہے، کسی علمی مسئلہ میں کسی قدیم کتاب کی طرف رجوع کی ضرورت پڑتی ہے، تو یہ کام اس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوجاتا ہے، اس طرح ہم نے نئی نسل کے افراد کو سابق علمائے امت سے کاٹ کے رکھ دیا ہے، یہ بہت بڑا علمی خطرہ ہے، جس کے جال میں بہت سے لوگ خود بھی پھنس رہے ہیں اور دوسروں کو بھی پھنسا رہے ہیں۔

ہمارا کسی فقہی مسئلہ میں یہ کہنا کہ: ائمہ سابقین میں سے فلاں اور فلاں نے فلاں اور فلاں کتاب کے اندر یہ فتویٰ دیا ہے، یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کہا جائے کہ: جامعہ کے اساتذہ میں سے فلاں اور فلاں نے یہ فتویٰ دیا ہے، اسی طرح کسی حدیث کے بارے میں یہ کہنا کہ: ائمۂ سابقین میں سے فلاں اور فلاں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اس سے بہتر ہے کہ کہا جائے کہ: موجودہ علماء میں سے فلاں اور فلاں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے؛ کیونکہ موجودہ دَور کے علماء کا حکم اور فتویٰ یا تو صحیح ہوگا یا غلط، اگر صحیح ہوگا تو وہ حقیقت میں متقدمین کے دسترخوان ہی کا کوئی ریزہ اور ٹکڑا ہوگا، اور اگر غلط ہوگا تو **فلا حاجة بنا إلیٰ خطئهم** ہمیں ان کی غلطیوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

جامعات کی تعلیم کا نقصان فرد کی سطح پر:

اس تعلیم کا نقصان فرد کی سطح پر- جیسا کہ میں نے اُوپر بیان کیا- یہ ہے کہ: اس تعلیم سے نہایت کمزور استعداد کے طلبہ پیدا ہوتے ہیں، جو کسی قابل نہیں ہوتے، اور اس پر غضب یہ ہے کہ وہ بہت سے شذوذ اٹھائے پھرتے ہیں؛ البتہ اگر کسی کے اندر علم حاصل کرنے کی واقعی سچی تڑپ ہوتی ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، اور اسے اس کوتاہی کے تدارک کی توفیق مل جاتی ہے، اور وہ بنیادی علوم حاصل کر کے اہلِ علم کے قافلے میں شامل ہو جاتا ہے؛ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

کمپیوٹر پروگراموں کے بُرے اثرات:

ایک اور چیز جس نے نئی نسل کا رشتہ ائمہ سابقین کی میراث سے کاٹنے میں برابر درجے کا حصہ ادا کیا ہے؛ بلکہ اور زیادہ نمایاں کردار ادا کیا ہے: کمپیوٹر کے وہ پروگرامس ہیں جو آج ہر طرف عام ہو چکے ہیں، اور صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص ان پروگراموں کو استعمال نہیں کرتا، تو اس کے بارے میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ علم وفہم کے میدان میں کمزور، اور علمی ترقی کے نئے قافلے سے بچھڑا ہوا ہے!!۔

یقیناً اِس بات کا کوئی بھی بصارت والا منکر نہیں ہوسکتا، چہ جائے کہ کوئی بصیرت والا منکر ہو کہ: جامعہ کی اس پڑھائی اور کمپیوٹر کے ان پروگراموں کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہے؛ لیکن ان پروگراموں پر انحصار کرنے والے طلبہ پر ان کے نقصانات کا بھی کوئی بصارت والا انکار نہیں کرسکتا، چہ جائے کہ کوئی بصیرت والا انکار کرے، اور جس قدر طالبِ علم کا ان پروگراموں پر انحصار ہوتا ہے، اسی قدر اسے ان کا مادی وروحانی نقصان پہنچتا ہے۔

ان کا ایک مادی نقصان یہ بھی ہے کہ: طالبِ علم اصل مصادر کی طرف کبھی رجوع نہیں کرتا، اور یہ چیز کبھی صحیح نہیں ہوسکتی کہ طالبِ علم ان ہی پروگراموں پر انحصار کرلے اور ان

مصادر کی طرف کبھی رجوع نہ کرے جہاں سے یہ نقل کرتے ہیں، یہ بحث کافی تفصیل طلب ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔

رہا ان پروگراموں کا روحانی نقصان تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ: علمِ شرعی کا معاملہ دوسرے علوم جیسا نہیں ہے، اس میں علم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اصلاح بھی ہوتی ہے، ایک آرکیٹکٹ کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ صرف انجینئرنگ ڈرائنگ کے پروگراموں پر اکتفا کرلے؛ کیونکہ اس کا کام تو صرف جمادات اور پتھروں پر اپنے فن کو استعمال کرنا ہوتا ہے؛ لیکن طالبِ علم تو علم کے ساتھ ساتھ اپنے استاذ سے کردار اور عمل بھی سیکھتا ہے، اب کمپیوٹر کے پروگرامس اسے یہ تو بتا سکتے ہیں کہ مثلاً: نماز فرض ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے؛ لیکن ان پروگراموں کے اندر وہ روحانیت اور نورانیت تو نہیں ہوتی، جسے وہ اپنے سامنے بیٹھے اور پروگراموں کو دیکھ رہے طلبہ کے اندر منتقل کرسکیں، جس طریقے سے امام مالکؒ نے اپنے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری کے اندر منتقل کی تھی، نہ ان کے پاس وہ آنکھیں ہوتی ہیں، جن سے وہ طلبہ کی نگرانی اور حسبِ ضرورت ان کی تربیت کرسکیں، جس طرح امام احمدؒ نے اپنے مہمان طالبِ علم ابوعصمہ بیہقیؒ کی کوتاہی پر ان کی تربیت کی تھی (۱)۔

جامعات کی تعلیم کے نقصانات امت کی سطح پر:

یہ تو اس تعلیم کے شخصی اور فردی نقصانات تھے، امت کے لیے اس کے نقصانات بہت ہی سنگین ہیں؛ کیونکہ اس تعلیم سے امت کے اندر ناقص علماء کی ایک بھیڑ تیار ہو رہی ہے!۔

اگر آپ کسی کلیۃ الشریعہ کو لے کر اس کے پچھلے پچاس سال کے فارغین کا ایک سرسری جائزہ لیں، اور دیکھیں کہ ان میں سے کتنے فارغین فتویٰ دینے کے قابل ہیں، تو اندازہ ہوگا کہ ناقص علماء کی تعداد کس قدر زیادہ ہے؛ جبکہ ان میں ایک تعداد ان فارغین کی بھی ہوگی جن کا جامعہ کے علاوہ مشیخی جذور سے بھی تعلق ہوگا، اور وہ اس جائزے سے خارج ہوں گے،

(۱) یحییٰ بن یحییٰؒ کا قصہ ص ۲۱۲ پر اور امام احمدؒ اور ان مہمان کا قصہ ص ۲۴۰ پر آرہا ہے۔

آپ اس جائزے میں ایک اہم بات یہ بھی دیکھیں گے کہ شروع سالوں میں فارغ ہونے والے طلبہ کی علمی لیاقت اخیر سال میں فارغ ہونے والے طلبہ کی بہ نسبت قدرے مضبوط ہے۔

ان سب کے باوجود بہرحال اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ طلبِ علم کے ان نئے طریقوں میں مذکورہ بالا خرابیوں کے ساتھ کچھ فوائد بھی ضرور ہیں؛ اس لیے طالبِ علم کے لیے کامل درجے کی بات یہ ہے کہ وہ اصلِ قدیم اور مستحکم جدید دونوں خوبیوں کو جمع کرنے کی کوشش کرے۔

ناقص علماء اور مختلف علوم میں ان کے بُرے اثرات:

شریعت کا ضابطہ ہے کہ **"من تطبّب ولم يعلم منه طبّ"**(۱) کہ اگر کوئی شخص ڈاکٹر نہ ہو اور لوگوں کا علاج کرے، اور اس سے کسی مریض کو کوئی جسمانی تکلیف پہنچے تو اسے اس کا تاوان دینا پڑتا ہے، اس اعتبار سے اس شخص پر بدرجہ اولیٰ پابندی لگنی چاہیے، جو لوگوں کو دینی اعتبار سے تکلیف اور نقصان پہنچاتا ہے، کسی نے صحیح کہا ہے: **"أكثر ما يفسد الناس: نصف متكلم ونصف متفقه ونصف متطبب ونصف نحوي، هٰذا يفسد الأديان، وهٰذا يفسد البلدان، وهٰذا يفسد الأبدان، وهٰذا يفسد اللسان"**(۲) کہ دنیا میں زیادہ تر بگاڑ ناقص متکلم (ناقص علمِ کلام جاننے والے)، ناقص عالم، ناقص طبیب اور ناقص نحوی سے پیدا ہوتا ہے، پہلا دین کو خراب کرتا ہے، دوسرا شہروں

(۱) یہ حدیث کے الفاظ ہیں، جسے ابوداود (۴۵۸۶) نسائی (۴۸۳۰، ۴۸۳۰) ابن ماجہ (۳۴۶۶) اور حاکم ۴: ۲۱۲ (۷۴۸۴) نے روایت کیا ہے، حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، اس حدیث کے وصل وارسال میں اختلاف کیا گیا ہے؛ لیکن ائمہ فقہاء نے اپنے مذاہب میں اس پر اعتماد کیا ہے۔

(۲) یہ مقولہ ابنِ تیمیہ کی **"الفتوى الحموية الكبرىٰ"** کے آخر میں موجود ہے، اور آگے کی عبارت **"أدب الاختلاف"** (ص/۶۶) سے نقل کی گئی ہے۔

کو بگاڑتا ہے، تیسرا جسموں کو نقصان پہنچاتا ہے اور چوتھا زبان کو خراب کر دیتا ہے۔

عالمِ ربانی مجاہدِ اسلام علامہ فقیہ شیخ محمد الحامدؒ کا واقعہ ہے کہ جب انھوں نے حلب میں اپنی تعلیم مکمل کر لی، تو اپنے بھائی شاعرِ حمات استاذ بدرالدین الحامد کے پاس گئے، اور ان سے جامع ازہر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کی اجازت چاہی، یہ ان دنوں کی بات ہے، جب ازہر واقعی ازہر تھا، ان کے بھائی نے کہا: کہ میری طرف سے تو کوئی رکاوٹ نہیں؛ البتہ میں تم سے ایک چیز چاہتا ہوں، وہ یہ کہ تم یا تو عالم بن کر آنا یا جاہل بن کر، ناقص طالبِ علم بن کر مت آنا۔

یہ اس لیے کہا کہ عالم اپنے علم کی روشنی میں بات کرتا ہے، اور جاہل کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں جاہل ہوں؛ لہٰذا وہ خاموش رہتا ہے؛ لیکن ناقص مولوی کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جاہل ہے، وہ اپنے آپ کو عالم سمجھ کر بولتا ہے اور خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے، ایسے ہی شخص کو جہل مرکب میں مبتلا جاہل کہا جاتا ہے؛ کہ وہ جاہل ہوتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ جاہل ہے۔

آن لائن جامعات کے ذریعہ تعلیم:

یہ پہلا پُرخطر مرحلہ تھا، جس سے ہم دو چار ہوئے، اس پُرخطر مرحلہ کے ان سنگین نتائج نے ایک دوسرے خطرناک مرحلہ کی راہ ہموار کر دی ہے، جس کا ہم پچھلے چند سالوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں، اور وہ ہے آن لائن جامعات کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا، ان جامعات نے طلبہ کی چار سالہ کی زندگی سے ان چند لمحات کو بھی ختم کر دیا ہے، جن میں وہ اپنے جامعہ کے اساتذہ کے سامنے بیٹھ کر علم حاصل کیا کرتے تھے!۔

تعلیم کے ان دونوں طریقوں کو لوگوں کی نگاہوں میں خوبصورت بنانے کے لیے خوب پروپیگنڈے کیے گئے، ایسے لوگوں کو علمی ڈگریاں دی گئیں، اور معاش اور روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے، جبکہ انھوں نے نہ دوسرے شہروں میں سفر کی مشقتیں برداشت کیں، اور نہ سفر اور پردیس میں رہنے کا خرچ اور نفقہ اُٹھایا، اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اکثر

وبیشتر طلبہ کے گھر والے مالی تنگی کا شکار ہوتے ہیں۔

ان مادی فوائد کا انکار نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن اس حقیقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کر کے ہم نے علم کو اور علم نے ہم کو الوداع کہہ دیا ہے، علمِ شرعی پہلے مرحلے میں نزع کی حالت میں تھا، اور دوسرے مرحلے میں آکر اس نے دم ہی توڑ دیا۔

اسی لیے میں کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں، میں درخواست کرتا ہوں اور پورے اصرار کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ: خدا کے لیے اہلِ علم میں جو بڑے حضرات بچے ہوئے ہیں، وہ تعلیم کی اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کو درست کرنے کی فکر فرمائیں، اور بطورِ خاص تعلیم کے ان پُرانے حلقوں اور حلقوں کے اندر اپنائے جانے والے تعلیم کے ان پُرانے طریقوں کو دوبارہ زندہ کریں، جن کو اپنا کر ہمارے اسلاف کامیاب ہوئے اور جن کے ذریعہ انھوں نے اس علم کو سیکڑوں سال بعد آنے والی نسلوں تک تروتازہ پہنچا دیا۔

ہمیں اللہ کی ذات پر پورا اعتماد اور بھروسہ ہے، جس نے قیامت تک اپنے دین اور شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، کہ وہ ضرور ایسے افراد پیدا فرمائے گا، جو آنے والی نسلوں تک صحیح نہج کے ساتھ اللہ کا یہ دین پہنچائیں گے، اور خود بھی اللہ تعالیٰ کے حفظ وامان میں ہوں گے، ان کے مخالفین ان کو نقصان نہیں پہنچا پائیں گے، جیسا کہ رسول صادق صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات تواتر کے ساتھ ثابت ہے، **صلوات الله وسلاماته عليه وعلىٰ آله وأصحابه، ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين.**

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ قطعی بشارتیں ہمارے نزدیک اٹل ہیں اور ہو کر ہی رہیں گی؛ لیکن ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس ذمہ داری کو اُٹھانے کی سعادت ہمارے حصہ میں آجائے؛ ورنہ تو اللہ تعالیٰ کا صاف ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴾ (محمد) (اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم کو پیدا کر دے گا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے)۔

کتبِ احادیث سرداً پڑھنے کی آفت-ایک ضمنی بحث:

تعلیم کے ان نئے طریقوں پر گفتگو کرتے ہوئے ضرورت محسوس ہورہی ہے کہ آج کل احادیث کی کتابوں کو پڑھنے کا جو ایک نیا طریقہ چل پڑا ہے، اس پر بھی کچھ گفتگو کی جائے، میں اس سلسلے میں نہایت اختصار کے ساتھ کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:

پہلی بات: قرأت اور سماعت کے سلسلے میں اسلاف کا تثبت واحتیاط:

اگر آپ حدیث کی قرأت اور سماعت کے سلسلے میں اصل دَور کے واقعات اور موجودہ دَور کے واقعات کے درمیان ایک سرسری سا بھی مقارنہ اور موازنہ کریں، تو آپ کو حدیث کے میدان میں حالیہ عرصے میں پیدا ہونے والی اس صورتِ حال کے متعلق ایک سچا اور منصفانہ فیصلہ مل جائے گا، اور اندازہ ہوجائے گا کہ یہ صورتِ حال کتنی سنگین ہے۔

سماع اور روایت کے سلسلے میں ائمہ اسلاف کے یہاں کس قدر احتیاط اور تثبت تھا، اس کا اندازہ ان تین واقعات سے ہوتا ہے، جو خطیب بغدادی نے "**الکفایة**" میں ذکر کیے ہیں (۱)۔

علی بن حسن شقیق مروزیؒ کا تثبت واحتیاط:

پہلا واقعہ: عبداللہ بن مبارکؒ کے ایک خاص شاگرد علی بن حسن بن شقیق مروزیؒ کا ہے، جو ثقہ اور حجت ہیں، ان سے کسی نے دریافت کیا کہ: آپ نے ابوحمزہ سکری سے "**کتاب الصلاة**" سنی ہے؟ انھوں نے فرمایا: پوری سنی ہے؛ لیکن ایک روز ایسا ہوا کہ ایک گدھا آواز کرنے لگا، جس کی وجہ سے میں ایک حدیث یا حدیث کا بعض حصہ سن نہیں پایا، اور مجھے یاد نہیں رہا کہ کتاب کی وہ کون سی حدیث ہے؛ اس لیے میں نے پوری کتاب کی روایت ہی چھوڑ دی۔

---

(۱) ص ۲۳۴-۲۳۵

حاتم بن اسماعیل کا تثبت واحتیاط:

دوسرا واقعہ: یحییٰ ابنِ معینؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ہم حاتم بن اسماعیل کے پاس عبید اللہ بن عمر کی کچھ حدیثیں (سماع کے لیے) لے کر آئے، حاتم نے جب ایک حدیث پڑھی تو کہنے لگے: استغفر اللہ! (یہ تو عبید اللہ کی احادیث ہیں)، میں نے عبید اللہ سے ایک کتاب لکھی تھی، جس کی ایک حدیث میں مجھے شک ہو گیا، تو میں نے ان کی تمام حدیثوں کی روایت کرنا چھوڑ دیا، اب میں ان سے کچھ بھی روایت نہیں کرتا ہوں۔

ہثیم بن جمیل بغدادی کا حال:

تیسرا واقعہ: یوسف بن مسلمؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے ہثیم بن جمیل بغدادی انطاکی سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ: میں نے شعبہؒ سے سات سو حدیثیں سنی تھیں، پھر مجھے ان میں ایک حدیث کے سلسلے میں شک ہو گیا تو میں نے تمام حدیثوں کی روایت چھوڑ دی۔

راوی مؤطا یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری کا حال:

سمعانیؒ نے یحییٰ بن یحییٰ تمیمی نیساپوریؒ کے بارے میں نقل کیا ہے، جو امام مالکؒ سے ''موطا'' کی روایت کرنے والوں میں ہیں، کہ انھوں نے ''موطا'' سننے کے بعد امام مالکؒ سے فرمایا کہ: میرا دل اس ساعت سے مطمئن نہیں ہے، امام مالکؒ نے پوچھا: کیوں؟ وہ کہنے لگے: مجھے ڈر ہے کہ اس میں سے کچھ سننے سے رہ گیا ہو، امام مالکؒ نے دوبارہ انھیں پوری کتاب پڑھ کر سنائی، جب پڑھ کر فارغ ہوئے تو یحییٰ نے پھر کہا کہ: میرا دل اب بھی اس ساعت سے مطمئن نہیں ہے، ہو سکتا ہے اب بھی کچھ سننے سے رہ گیا ہو، امام مالکؒ نے پوچھا: پھر تم کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ میں خود پڑھوں اور آپ

سنیں؛ چنانچہ انھوں نے خود پڑھا اور امام مالکؒ نے سنا، اور اس طرح کل تین مرتبہ ''موطا'' کی سماعت کی(۱)۔

ابوقرہ زبیدی کا واقعہ:

حافظ ابنِ حجرؒ نے امام حافظ ابوقرہ زبیدیؒ کے تذکرہ کے آخر میں لکھا ہے کہ: انھوں نے فقہی ابواب کی ترتیب پر ایک سنن لکھی تھی جو ایک جلد میں ہے، میں نے وہ کتاب دیکھی ہے، وہ کسی بھی حدیث میں **''حدثنا''** نہیں کہتے ہیں؛ بلکہ **''ذکر فلان''** کہتے ہیں، امام دارقطنیؒ سے اس کی وجہ پوچھی گئی، تو فرمایا کہ: ان کی کتابوں میں کچھ خرابی آگئی تھی؛ اس لیے وہ بطور احتیاط تحدیث کی صراحت سے گریز کرتے تھے(۲)۔

ابوالعباس اصمؒ کا واقعہ:

زرکشیؒ کہتے ہیں کہ: شیخ ابومحمد الجوینی نے ابوبکر حیری سے نقل کیا ہے، وہ ابوالعباس اصم کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ: کوئی حدیث تھی جو ابوالعباس اصم کے سامنے پڑھی جاتی تو وہ کہتے کہ: میں نے یہ حدیث آدھی سنی ہے اور آدھی نہیں سنی، ان سے اس سلسلے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ: میں نے یہ حدیث شیخ کے سامنے ابھی آدھی ہی پڑھی تھی کہ ایک گدھا آواز کرنے لگا، اب مجھے معلوم نہیں کہ شیخ نے بقیہ حدیث سنی تھی یا نہیں، اس شک کی وجہ سے میں نے اس کو روایت کرنا چھوڑ دیا، اسلاف اسی طرح کیا کرتے تھے(۳)۔

ابوالعباس اصمؒ کی وفات ۳۴۶ھ میں ہوئی ہے، ان کے اس جملہ پر غور کیجیے کہ: اسلاف اسی طرح کیا کرتے تھے! بلاشبہ وہ اسی طرح کیا کرتے تھے، جس کی بیّن دلیل اُوپر کے واقعات ہیں۔

---

(۱) ادب الاملاء والاستملاء (۲۲) (۲) تہذیب التہذیب ۱۰: ۳۵۰

(۳) النکت علی ابن الصلاح ۳: ۱۰۰۸ (۴۷۴)

محمد بن فضل الفراویؒ کے والد کا حال:

امام ابنِ امام ابوعبداللہ محمد بن فضل الفراویؒ کے تذکرے میں ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ: ہم لوگ ابوالقاسم القشیریؒ کے سامنے "مسند ابوعوانہ" کی قرأت کرتے تھے، ایک باوقار اور رعب داب والا شخص بھی مجلس میں آتا تھا اور شیخ کے برابر میں بیٹھتا تھا، کتاب کی قرأت میرے والد ہی کیا کرتے تھے، کتاب کا ایک حصہ ہو چکا تھا، اتفاق سے ایک روز وہ بارعب شخص مجلس میں نہیں آیا، شیخ حسبِ معمول حلقۂ درس میں تشریف لائے، وہ اکثر و بیشتر سیاہ کھردری قمیص پہن کر آتے تھے، اور سر پر ایک معمولی سا عمامہ ہوتا تھا، میں اس وہم میں پڑا ہوا تھا کہ میرے والد کتاب کی قرأت اس بارعب شخص کے سامنے کرتے ہیں (اور وہی ہم لوگوں کے شیخ ہیں)، میرے والد نے قرأت شروع کی، تو میں کہنے لگا: ابا جان! آپ کس کے سامنے قرأت کر رہے ہیں، شیخ تو آئے نہیں؟ میرے والد نے کہا: لگتا ہے تم اس بارعب شخص کو شیخ سمجھتے ہو، میں نے کہا: جی ہاں! میرے والد کو بڑا افسوس ہوا، انھوں نے اناللہ پڑھی، اور شیخ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: بیٹے! شیخ تو یہ بیٹھے ہوئے ہیں، اور پھر میری خاطر پوری کتاب شروع سے دوبارہ پڑھی (۱)۔

راقم کہتا ہے کہ: اس واقعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حدیث لینے کے لیے شیخ کو جاننا بھی ایک اہم چیز ہے کہ کس کے سامنے قرأت کی جا رہی ہے، باقی اس مسئلہ کو علومِ حدیث کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے کہ اس طرح کا تحمل اور سماع صحیح ہے یا نہیں؟

ابنِ دقیق العیدؒ کا واقعہ:

امام ابنِ دقیق العیدؒ کے تذکرہ میں امام حافظ قطب حلبی کا کلام مذکور ہے کہ: ابنِ دقیق العید اتقان اور احتیاط میں عجوبۂ روزگار تھے، میں ان کے پاس ایک جزلے کر آیا، جسے انہوں نے

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۹: ۶۱۸، طبقات السبکی ۶: ۱۶۸، سبکی سے ہی یہاں نقل کیا گیا ہے۔

ایک طبقہ کے ساتھ ابنِ رواج سے سن رکھا تھا، وہ نسخہ ان ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا، وہ کہنے لگے: تھوڑا ٹھہرو، میں پہلے اسے دیکھ لوں، میں چلا آیا، پھر دوبارہ ان کے پاس گیا، تو وہ کہنے لگے کہ: تحریر تو میری ہی ہے؛ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے کہ اس کی سماعت کب ہوئی ہے، اور اس جز کو پڑھانے سے انکار کر دیا(۱)۔

یہ واقعات اور ان جیسے بے شمار واقعات قرأت اور سماعت کے سلسلے میں اصل دَور کی ایک سچی تصویر پیش کرتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسناد واقعی دین کا ایک جز، علومِ اسلامیہ کے لیے سرمایہ امتیاز، اسلامی عبقریت کا ایک عظیم مظہر اور دینِ اسلام پر اعتماد و اطمینان کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔

دوسری بات: اسلاف کے تیز قرأت وسماعت کی حقیقت:

جب حدیث کے تعلق سے تمام اُمور محدثین کی منشا کے مطابق منضبط ہو گئے تو قرأت وسماعت کے اندر دو چیزیں داخل ہونے لگیں:

پہلی چیز: روایت کے حلقوں میں چھوٹے بچوں اور ایسے لوگوں کی شرکت جن کے اندر علم کی اہلیت نہیں ہوتی تھی۔

دوسری چیز: بعض ائمہ کی یہ رغبت کہ فلاں کتاب کی روایت کے سلسلے میں ان کی سند عالی ہو جائے یا اس کی روایت کے طرق کثیر ہو جائیں۔

جہاں تک بچوں اور نااہلوں کو حدیث کی مجلسوں میں لانے کا تعلق ہے، تو بہت سی مرتبہ بچے کے اندر اُمید بر آتی تھی، وہ طلبِ علم میں لگ جاتا، اور آگے چل کر بڑا عالم بن جاتا، لوگ دُور دراز سے سفر کر کے اس کے پاس آتے، اور عالی سند حاصل کرتے، اسی طرح وہ شخص جس کے اندر علم کی اہلیت نہیں ہوتی تھی، وہ بھی کبھی علم کی طرف متوجہ ہو جاتا اور اللہ رب العزت کی عنایت وبرکت اس کے شاملِ حال ہو جاتی، اور وہ علم کے راستے پر

(۱) الدرر الکامنہ ۴: ۹۳

چل پڑتا، اور اہلِ علم میں داخل ہوجاتا، آپ کو اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی؛ لیکن بہت سی مرتبہ ایسا بھی ہوتا کہ یہ نااہل شخص علم کے راستے پر نہ لگ پاتا، اور نہ ہی وہ بچہ لگ پاتا۔ ان دونوں قسموں کے علم کی مجلسوں میں حاضر ہونے کا نقصان یہ ہوا کہ: یہ لوگ بعد میں ان کتابوں کی حدیثیں بھی روایت کرنے لگے، جن کو انھوں نے اس زمانے میں سن رکھا تھا، جب ان کے اندر تحملِ حدیث کی اہلیت نہیں تھی، اب وہ چیز یا تو حدیث کی کوئی مشہور اور متداول کتاب ہوتی، تو اس صورت میں تحمل اگر چہ ضعیف ہوتا؛ لیکن کتاب کے مشہور ومتداول ہونے کی وجہ سے اس تحمل سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، لیکن کبھی وہ اجزائے حدیثیہ میں سے کوئی جز ہوتا جو غیر مشہور اور غیر متداول ہوتا، تو اس صورت میں چونکہ تحمل حدیث کے وقت ان کے اندر پوری اہلیت نہیں تھی؛ اس لیے لازمی طور پر ان احادیث کے تئیں ان کے ضبط واتقان کی کمی کا احتمال پیدا ہوجاتا، جس کی وجہ سے بعد میں آنے والوں کے لیے ان احادیث پر صحت کا حکم لگانا بہت مشکل ہوجاتا(۱)۔

اور جہاں تک علوِ اسناد کے تئیں ائمہ کرام کی رغبت کا تعلق ہے: تو یہ حضرات یقیناً کثرتِ طرق اور علوِ اسناد کی خواہش میں نہایت سرعت کے ساتھ سماعت کرتے تھے؛ لیکن فی الواقع وہ پہلے ان احادیث کی سماعت: روایت ودرایت اور ضبط وتحقیق کی رعایت کے ساتھ بارہا کرچکے ہوتے، پھر اس کے بعد محض کثرتِ طرق اور علو اسناد کی خواہش میں ان احادیث کی سماعت کرتے تھے؛ لہٰذا اس طریقہ سے تحمل کرنے میں اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی جاتی تو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا(۲)۔

---

(۱) یہی مراد ہے حافظ ابنِ صلاح کی، جو انھوں نے حدیث صحیح کے مسئلہ نمبر (۲) میں کہا ہے کہ: جب ہم اجزائے حدیثیہ کے اندر کوئی حدیث پاتے ہیں تو ہم اس پر صحت کا حکم لگانے کی جرأت نہیں کرسکتے، میں نے اس بحث کی پوری تفصیل ''تدریب الراوی'' کے حاشیہ میں لکھی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس حاشیہ کو بسہولت پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

(۲) الجواہر والدرر للسخاوی ۱: ۱۶۲ وما بعدہا

لیکن اگر یہی کمزور سا تحمل پہلا اور آخری تحمل ہو، اور اسی پر آدمی اِتراتا پھرے کہ میں نے کتبِ اُصول کے اندر فلاں اور فلاں کتاب کی سماعت کر رکھی ہے، اور اسے درایت کے قوانین کا کچھ پتہ نہ ہو تو پھر اس سماع اور تحمل کی کیا قیمت ہوگی۔

موجودہ دَور کی قراءت اور سماعت کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہو: آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ایک طالبِ علم میرے پاس آیا، جو مور کی طرح اپنے آپ میں مگن اور اترا رہا تھا، وہ مجھے بتانے لگا کہ: اس نے صحاحِ ستہ میں سے فلاں کتاب کی سماعت فلاں مشہور عالم کے پاس کی ہے، اور فلاں کتاب کی سماعت فلاں مشہور عالم کے پاس کی ہے، اور ترمذی کی سماعت کے بارے میں تو ایک نہایت مشہور عالم کا نام لیا، تو میں نے قصداً کہا: بلافوت! وہ ایک دم چُپ ہوگیا اور سمجھ نہیں پایا کہ میں نے کیا کہا ہے!! بھلا بتایئے کیا حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے **"الإسناد من الدین"** سے یہی اسناد مراد لی تھی؟!۔

معاذ اللہ! حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی مراد تو ویسی اسناد تھی جیسی میں نے ابھی ان کے شاگرد حسن بن شقیقؒ کے حوالے سے بیان کی ہے۔

جدید طریقے کے علمبرداروں کی دو چیزوں سے غفلت:

ایسا لگتا ہے کہ اس طریقے کو رواج دینے والے اور اس کی حمایت کرنے والے حضرات دو چیزوں سے غافل ہیں:

ایک: تو اس فرق سے جس کو میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ ائمہ سابقین پہلے کتبِ حدیث کو پورے تثبت، احتیاط اور اتقان کے ساتھ حاصل کرتے تھے، پھر مذکورہ خواہش کی تکمیل کے لیے اس طریقے سے سرعت کے ساتھ کتابوں کی سماعت کرتے تھے؛ لہٰذا ان متساہلین کا اسلاف کے اس طرزِ عمل سے استدلال اُصولِ فقہ کی اصطلاح کے مطابق ''قیاس مع الفارق'' یا ''قیاسِ فاسد'' ہے۔

دوسرے: وہ لوگ ان حالات سے بھی ناواقف ہیں جن کا آج ہمیں سامنا ہے، آج

مختلف جماعتیں احادیثِ نبویہؐ کے ذخیرے پر حملہ آور ہیں؛ تاکہ لوگوں کے دل ودماغ سے حدیث کی حجیت کو ختم کردیا جائے، ایک طرف اہلِ قرآن کی جماعت ہے، دوسری طرف سیکولرازم کے علمبردار ہیں، تیسری طرف عقلیت پسندوں کا گروپ ہے، اور چوتھی طرف وہ جہلاء ہیں جنھیں علم سے کوئی واسطہ ہی نہیں اور عالم بنے پھرتے ہیں!! یہ لوگ اسی کمزور اتصال کو بنیاد بنا کر سنتِ نبویہؐ پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: اگر تمہارے نبی کی احادیث ان بنیادوں پر قائم ہیں تو یہ بنیادیں انتہائی کمزور اور کھوکھلے کنارے پر واقع ہیں، جو بس گرنے ہی والا ہے۔

بہرکیف حالات کو سمجھنے، پرکھنے اور جو کچھ پڑھ رکھا ہے اس کو موجودہ صورتِ حال پر صحیح انداز میں تطبیق دینے کی ضرورت ہے۔

آمدم برسر مطلب:

میں پھر سے اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، امام غزالیؒ نے ''احیاء''(۱) میں طالبِ علم اور استاذ کی دس ذمہ داریاں بیان کی ہیں، چار ذمہ داریوں کے بعد وہ لکھتے ہیں:

''**پانچویں ذمہ داری:** یہ ہے کہ جتنے بھی علومِ محمودہ ہیں طالبِ علم کو چاہیے کہ اُن کے ہر فن اور ہر نوع پر ایک سرسری نظر ڈالے، جس سے اس کو ان فنون کے مقاصد اور غرض وغایت سے واقفیت ہوجائے، پھر زندگی وفا کرے تو ان سب میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کی کوشش کرے؛ ورنہ جو اہم علوم ہیں، ان کی تحصیل میں لگ جائے، اور ان کو پورے مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ حاصل کرے، اور بقیہ علوم کو تھوڑا بہت حاصل کرلے؛ لیکن حاصل ضرور کرے؛ کیونکہ علوم ایک دوسرے کے مددگار اور ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں، اس سے ایک فائدہ نقد تو یہ ہوگا کہ اب چونکہ کسی بھی علم سے ناواقفیت نہیں رہی؛ اس لیے کسی بھی علم سے عداوت نہیں رہے گی، **فإن الناس أعداء لما جهلوا** کہ لوگ

(۱) ۱:۵۱

جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہوتے ہیں ﴿وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ﴾ (الاحقاف:۱۱) (اور جب ان لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو کہیں گے کہ یہ پُرانا جھوٹ ہے)۔

چھٹی ذمہ داری: یہ ہے کہ طالبِ علم کسی بھی علم کے کسی بھی فن میں ایک دم سے نہ لگ جائے؛ بلکہ ترتیب کی رعایت رکھے اور جو چیز سب سے اہم ہو پہلے اس کو حاصل کرے۔

ساتویں ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ کسی بھی فن میں اس وقت تک نہ لگے، جب تک کہ وہ اس سے پہلے والے فن کو پورے طور پر حاصل نہ کرلے؛ کیونکہ ان علوم کو طالبِ علم کی ضرورت کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے، ایک علم دوسرے علم کی راہ ہموار کرتا ہے؛ لہٰذا جو شخص اس ترتیب اور تدریج کی رعایت رکھے وہ باتوفیق ہے"۔

ہر علم سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضروری ہے:

ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ: فقیہ کو چاہیے کہ وہ ہر علم کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کرے، مثلاً: تاریخ، حدیث، علمِ لغت وغیرہ؛ کیونکہ فقہ میں تمام علوم کی ضرورت پڑتی ہے؛ لہٰذا فقیہ ہر فن کی اہم چیزیں حاصل کرے (۱)۔

پھر آگے چل کر اسی خاطرے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ: "آدمی جس علم میں بھی لگا ہوا ہو اُسے چاہیے کہ وہ باقی علوم میں بھی حصہ لے، اور ان کا بھی کچھ نہ کچھ ضرور مطالعہ کرے؛ کیونکہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہوتا ہے"۔ ابن الجوزیؒ نے ان دونوں اقتباسات کے بیچ میں بعض فقہاء کی عبارتوں سے کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن میں تاریخی تناقضات پائے جاتے ہیں، یہ سب مثالیں صحیح ہیں؛ البتہ ایک مثال میں ان سے غلطی ہوئی ہے، جس پر کتاب کے محقق شیخ علی طنطاوی رحمہ اللہ نے استدراک کیا ہے، جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دیگر علوم میں حصہ لینا اچھی بات ہے؛ مگر یہ کام تحقیق اور باریک بینی کے ساتھ

(۱) صید الخاطر ص ۳۷۳ (۳۳۶)

ہونا چاہیے، مقالہ نگار یا مؤلف کو تنقید و استدراک میں جلدی نہیں کرنا چاہیے (۱)۔

ابن الجوزیؒ نے جس طرح بعض فقہاء کی عبارتوں میں تاریخی اوہام پر تنبیہ کی ہے، اسی طرح علامہ سخاویؒ نے بھی کافی تفصیل کے ساتھ اور بہت سی مثالیں دے کر "**الإعلان بالتوبيخ**" کے شروع میں، اور صفدیؒ نے بھی "**الوافي بالوفيات**" کے مقدمہ میں اس پر بحث کی ہے، علامہ کوثریؒ کے مقالات کے آخر میں بھی اس تعلق سے ایک مقالہ "**بعض أغلاط تاريخية**" موجود ہے، اوران سب کے بعد اس بحث کو بھی دیکھیے جو میں نے "تدریب الراوی" کی اکیسویں نوع "**الحديث الموضوع**" کے حاشیہ میں لکھی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس حاشیہ کو مکمل فرمائے۔

نیز علامہ سیّد محمد عبدالحیٔ کتانیؒ نے بھی اپنی کتاب "**فهرس الفهارس**" کے آخر میں اسی قسم کی ایک بحث کی ہے، جو تاریخ وطبقات میں تحقیق کی ضرورت سے متعلق ہے (۲)۔

❑❖❑

---

(۱) اسی چیز یعنی استدراک میں جلدی نہ کرنے کی عملی تطبیق کے طور پر میں کہتا ہوں کہ: اس مثال پر شیخ طنطاویؒ کا استدراک بھی تثبت اور مراجعت کا محتاج ہے؛ کیونکہ میں نے مراجعت کی تو مجھے کچھ نہیں ملا۔

(۲) ۲:۱۱۵۸۔۱۱۶۰

نویں مشعل

استاذ کا انتخاب

إن هٰذا العلم دين:

اس عنوان پر گفتگو کا آغاز تابعی جلیل امام محمد بن سیرینؒ (۱۱۰ھ) کے وضع کردہ حصولِ علم کے منہج سے ہونا چاہیے، وہ فرماتے ہیں: **"إن هٰذا العلم دين، فانظروا عمن تأخذون دينكم"**(۱) (بلاشبہ یہ علم: دین ہے؛ لہٰذا تم دیکھ لو کہ تم کس سے دین حاصل کر رہے ہو)۔

"هٰذا العلم" سے مراد شرعی علوم ہیں؛ لیکن اس میں علومِ عربیہ اور علومِ آلیہ بھی داخل ہیں؛ کیونکہ وہ علومِ شرعیہ کے لیے خادم اور معاون کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ علامہ مناویؒ نے اس کی وضاحت کی ہے(۲)۔

استاذ کے انتخاب سے پہلے غور وفکر:

خطیب بغدادیؒ نے اپنی سند سے ابراہیم نخعیؒ سے بیان کیا ہے، ابراہیم نخعیؒ کی وفات

(۱) اس اثر کو امام مسلمؒ نے اپنے مقدمہ (۱/ ۱۴) میں پانچویں باب کے شروع میں ذکر کیا ہے، اور اسی پر امام ترمذیؒ نے اپنی ''شمائل'' کو ختم فرمایا ہے، یہ موقوفاً اور مرفوعاً بھی مروی ہے؛ لیکن صحیح نہیں ہے، دیکھیے: خطیب بغدادیؒ کی ''الجامع'' (۷ ۱۳) اور المحدث الفاصل (۷ ۴۳ - ۴۴۵)۔

(۲) فیض القدیر ۲: ۵۴۵

۹۶ھ کی ہے، اس وقت ان کی عمر پچاس سال تھی، اس اعتبار سے وہ پہلی صدی ہجری کے نصف اوّل میں پیدا ہوئے، اور انھوں نے بڑے بڑے حضرات کو دیکھا، وہ فرماتے ہیں کہ: یہ حضرات جب کسی کے پاس علم حاصل کرنے کے لیے جاتے تو پہلے اس کے عمل، اس کی نماز اور اس کے حال واحوال کا جائزہ لیتے، پھر اس سے علم حاصل کرتے تھے[1]۔

رامہرمزیؒ نے اسی طرح کی بات ابوالعالیہ ریاحیؒ سے بھی نقل کی ہے[2]، جو ابراہیم نخعیؒ کے ہی ہم عصر ہیں؛ بلکہ ان سے بھی اعلیٰ طبقہ کے ہیں، ابراہیم نخعیؒ کی طرح ان کے اثر سے بھی یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ صحابہؓ اور کبارِ تابعین ان ہی لوگوں سے علم حاصل کیا کرتے تھے، جن کی سیرت وہ اپنے متوارث علمِ نبویؐ کے مطابق پاتے تھے۔

موجودہ تعلیمی نظام میں استاذ کا انتخاب:

استاذ کا انتخاب طالبِ علم کے لیے نہایت اہم چیز ہے؛ لیکن یہ وہیں ہوسکتا ہے جہاں اس کی گنجائش ہو؛ ورنہ عمومی احوال میں جیسا کہ آج کل ہمارے تعلیمی نظام کا حال ہے طالبِ علم کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہوتی، ایسے موقعوں پر طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ کسی ایک استاذ کو اپنا خاص استاذ بنا کر ان کی ملازمت اختیار کرلے، چاہے وہ ان اساتذہ کے علاوہ ہی کیوں نہ ہوں جن سے وہ سبق پڑھتا ہے؛ اور کسی کو خاص استاذ بنانا نہیں چاہتا۔

استاذ کے انتخاب سے پہلے غور وفکر:

شیخ کو اختیار کرنے سے متعلق علمائے کرام سے متعدد نصیحتیں اور تنبیہات منقول ہیں، بدر بن جماعہؒ کہتے ہیں کہ: پہلے طالبِ علم خوب غور وفکر کرلے اور اللہ تعالیٰ سے استخارہ بھی کرلے کہ اس کو کس سے علم حاصل کرنا ہے، اور کس سے حسنِ اخلاق اور آداب سیکھنے ہیں،

(۱) الجامع لاخلاق الراوی (۱۳۶) الکفایۃ ص ۱۵۷

(۲) المحدث الفاصل (۴۳۰)

اگر ممکن ہو تو وہ اپنا شیخ کسی ایسے شخص کو بنائے جس کے اندر بھرپور اہلیت پائی جاتی ہو، وہ شفقت ومحبت کا پیکر، اخلاق ومروت کا مجسمہ اور عفت وپاکدامنی کا معیار ہو، اس کی تعلیم کا انداز نہایت عمدہ اور سمجھانے کا اسلوب نہایت دلکش ہو، وہ ایسے شخص کو استاذ نہ بنائے جس کے پاس علم تو زیادہ ہو؛ لیکن دینداری یا ورع وتقویٰ یا حسنِ اخلاق میں کمی پائی جاتی ہو، اگر آپ سلف وخلف کے احوال کا جائزہ لیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ بالعموم طالبِ علم کو اسی وقت فائدہ ہوا اور کامیابی اسی وقت اس کے ہم رکاب ہوئی، جب اس کے شیخ ورع وتقویٰ اور طالبِ علم کے تئیں شفقت ومحبت اور خیر خواہی میں اعلیٰ معیار پر رہے۔

طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ ایسا شیخ تلاش کرے جن کو علومِ اسلامیہ پر پوری دسترس حاصل ہو، اور انھوں نے اپنے زمانے کے بڑے مشائخ کے ساتھ خوب مذاکرہ کیا ہو اور ان کے ساتھ خوب اُٹھنا بیٹھنا کیا ہو، وہ کسی ایسے شخص کو ہرگز اپنا شیخ نہ بنائے جس نے ماہر شیوخ کی صحبت میں رہنے کے بجائے صرف کتابوں کے اوراق سے علم حاصل کیا ہو(۱)۔

استاذ کے انتخاب میں غور وفکر کی وجہ:

ابنِ جماعہ نے شیخ کے جو مطلوبہ اوصاف بیان کیے ہیں اُن کے اندر ہمیں ایک ایک کر کے غور کرنے کی ضرورت ہے؛ تاکہ ہمیں اس کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

بالخصوص سلف وخلف کی سیرتوں کا یہ جائزہ تو دیکھیے کہ: طالبِ علم کو نفع اور کامیابی اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے شیخ ورع وتقویٰ کے اعلیٰ معیار پر ہوں (یعنی وہ شیخِ جامع ہوں نہ کہ شیخِ جامعہ)؛ تاکہ ان کا صلاح وتقویٰ طلبہ کے اندر بھی سرایت کر جائے؛ کہ ہم نشین سے آدمی کا متاثر ہونا کسی ذی شعور سے مخفی نہیں۔

پیچھے گزر چکا ہے(۲) کہ اگر انسان کسی حیوان کے ساتھ بھی رہے تو اس کا اثر قبول کرتا

---

(۱) تذكرة السامع والمتكلم ص ۸۵

(۲) ص ۱۵۳۔۱۵۴

ہے اور اسی جیسی سختی یا نرمی اس کے مزاج میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ اپنے ہم جنس کی صحبت سے کس قدر متاثر ہوتا ہوگا! اور اپنے اساتذہ اور مربی حضرات سے کس قدر متاثر ہوتا ہوگا، اور پھر اپنے ان خاص اساتذہ اور مربی حضرات سے کس قدر متاثر ہوتا ہوگا جنھیں وہ اپنا قدوہ اور مربی مانتا ہے، یقیناً ان صحبتوں سے وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو پیچھے ذکر کردہ اقوال واقعات کے اندر صحبت کے عمومی وخصوصی اثرات سے متعلق گزر چکے ہیں۔

امام ذہبیؒ کی مشہور نصیحتوں میں ہے کہ: اسلاف اللہ کے لیے علم حاصل کیا کرتے تھے؛ اس لیے انھیں بلند مرتبے حاصل ہوئے اور وہ پوری امت کے امام اور مقتدیٰ بن گئے، آگے وہ اہلِ علم کی مختلف اقسام جو اس نہج سے ہٹ کر تھے، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: ان کے بعد کچھ لوگ آئے (یعنی ان کے زمانے کے لوگ) جن کی نسبت ظاہری طور پر تو علم کی طرف ہے؛ لیکن انھوں نے علم کے اندر پختگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، تھوڑا بہت علم سیکھا، اور اس وہم میں پڑ گئے کہ وہ باکمال علماء بن چکے ہیں، کبھی ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ اس علم کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل کریں؛ کیونکہ انھوں نے کبھی کسی ایسے شخص کو دیکھا ہی نہیں جن کی علم میں اقتداء کی جاتی ہے، وہ علم وعمل میں بہت گر چکے ہیں، آج ایک مدرس کا منتہائے نظر بس اتنا رہ گیا ہے کہ وہ قیمتی کتابیں حاصل کرے، اور انھیں جمع کر کے رکھ لے، اور کبھی جی چاہے تو ان پر ایک نظر ڈال لے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مدرس جب کچھ بیان کرتا ہے تو خوب تصحیفات کرتا ہے، اور صحیح سے بیان نہیں کر پاتا، اللہ ہمیں معاف فرمائے، کسی نے صحیح کہا ہے کہ: نہ میں عالم ہوں اور نہ میں نے کسی عالم کو دیکھا ہے[1]۔

ان کی اس کمزوری اور کوتاہی کی وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے کبھی کسی عالم ربانی کی صحبت نہیں اُٹھائی کہ جن کا علم اور تقویٰ ان کے اندر منتقل ہوتا اور یہ ان کی اقتداء کرتے۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۷: ۱۵۲-۱۵۳

استاذ کے انتخاب میں کیا صفات ملحوظ ہوں؟

یہ بات محقق اور مسلّم ہے کہ طالبِ علم کے اساتذہ اس کی علمی، فکری، اخلاقی اور روحانی غذا کا سرچشمہ ہوتے ہیں، اور اس کے خاص اساتذہ ان چاروں پہلوؤں سے اس کی تعمیر کا سبب بنتے ہیں، ان کی ذات ان تمام گوشوں میں طالبِ علم کے لیے اُسوہ اور نمونہ ہوتی ہے، اور اس کی نگاہوں میں ان پہلوؤں کی عملی تصویر پیش کرتی ہے؛ بلکہ وہ خاص استاذ اس کے اور اللہ کے درمیان؛ بلکہ بندوں کے درمیان بھی واسطہ ہوتے ہیں کہ لوگ طالبِ علم کو پہلے تو عمومی طور پر اس کے اس علمی مدرسے کی روشنی میں دیکھتے ہیں جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے، پھر خصوصی طور پر اس کے اس خاص استاذ کی روشنی میں دیکھتے ہیں جن کو اس نے اپنا قدوہ بنا رکھا ہے۔

اسی لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ علماء جو اپنے زمانے میں اُسوہ اور نمونہ تھے، ان کے ذریعہ ان صفات کا ہلکا سا تعارف پیش کر دیا جائے جو ایک قابلِ اتباع عالم کے اندر پائی جانی چاہیے۔

علم پر عبور رکھنے والے عالم کی علامات:

امام ابو اسحاق شاطبیؒ نے [۱] راسخ عالم دین کی جنھیں اُسوہ اور نمونہ بنایا جاسکتا ہو متعدد علامات بیان کی ہیں، اور اس سلسلے میں ایک طویل بحث کی ہے، میں اس کے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

”تیرہواں مقدمہ: علم کے اندر رسوخ پیدا کرنے کا انتہائی نفع بخش طریقہ یہ ہے کہ علم کو ایسے اہلِ علم سے حاصل کیا جائے جنھیں علم پر مکمل عبور حاصل ہو“ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: ”علم پر عبور رکھنے والے عالم کی کچھ علامات بھی ہیں (جن کے ذریعہ انھیں پہچانا جاسکتا ہے)،

(۱) الموافقات ۱: ۶۴

یہ علامات پیچھے بیان کردہ شرائط کے پورے طور پر موافق ہیں، اگر چہ بظاہر ان میں اختلاف نظر آتا ہے، وہ کل تین علامتیں ہیں:

پہلی علامت: اپنے علم پر عمل، کہ اس عالم کے قول وفعل میں یکسانیت پائی جاتی ہو، اگر ایسا نہ ہو اور اس کے قول وفعل میں تضاد ہو، تو وہ اس بات کا اہل نہیں ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے اور کسی علم میں اس کی اقتدا کی جائے، اس مضمون کو میں نے پوری تفصیل کے ساتھ کتاب الاجتہاد میں (۱) بیان کیا ہے، وللہ الحمد۔

دوسری علامت: یہ ہے کہ اس نے اس علم کو شیوخ سے حاصل کیا ہو، اور ان کی ملازمت اختیار کر کے ان سے تربیت حاصل کی ہو، جو شخص شیوخ سے تربیت پاتا ہے اس کے اندر اپنے شیوخ کے اوصاف منتقل ہو جاتے ہیں، ہمارے اسلاف کا یہی حال تھا، وہ شیوخ کے پاس رہ کر ان سے علم اور تربیت حاصل کرتے تھے؛ چنانچہ سب سے پہلے صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملازمت اختیار کی، وہ حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو لیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو مانتے اور اس پر پورا اعتماد کرتے، آپ چاہے جو بھی فرمائیں اور جن حالات میں بھی فرمائیں، انھیں آپ کی منشا سمجھ میں آئے یا نہ آئے، یہاں تک کہ وہ جان لیں کہ یہی حق ہے جس سے کوئی چیز متعارض نہیں ہو سکتی ......"۔

آگے لکھتے ہیں: "یہ ہے فائدہ علماء کے ساتھ ملازمت، اُن کی کامل تابعداری اور اشکال کے ہوتے ہوئے بھی ان کی بات مان لینے کا، یہاں تک کہ دلیل سامنے آ گئی ...... پھر یہ چیز بعد والوں کے لیے ایک اصل کی حیثیت اختیار کر گئی؛ چنانچہ تابعین نے بھی صحابہؓ کے ساتھ وہی اُسوہ اپنایا جو صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنایا تھا، جس کے نتیجہ میں انھیں دین کی کامل سمجھ عطا ہوئی، اور وہ علومِ شرعیہ میں فضل وکمال کی چوٹیوں

(۱) اسی کتاب الموافقات ۴: ۱۸۴ میں

تک پہنچے، اس اصل اور قاعدے کی صحت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ کسی بھی عالم کو لے لیجیے، جن کی طرف لوگوں کا رجوع رہا ہو، کوئی نہ کوئی شخصیت ان کا اُسوہ اور نمونہ ضرور ملے گی، جو اپنے زمانے میں انہی کی طرح لوگوں کا مرجع رہی ہوگی، اور جتنے بھی گمراہ فرقے اور حدیث کی مخالفت کرنے والے افراد ملیں گے وہ سب اس وصف سے دُور نظر آئیں گے، اسی بات کو لے کر تو ابنِ حزم ظاہری پر علماء نے تنقید کی ہے کہ انھوں نے شیوخ کی ملازمت اختیار نہیں کی اور نہ ان کے آداب اپنائے (۱) جبکہ علمائے راسخین: ائمہ اربعہؒ وغیرہ کا طرزِ عمل ایسا نہیں تھا''۔

تیسری علامت: علم پر عبور رکھنے والے عالم کی تیسری علامت اپنے استاذ کی اقتداء اور ان کے رنگ میں رنگ جانا ہے، جیسا کہ اُوپر صحابہؓ اور تابعینؒ کی اقتداء کے بارے میں گزرا، اسی طرح ہر زمانے کے ائمہ واسلاف کا حال رہا، یہی وہ وصف تھا جس میں امام مالکؒ اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے، یعنی: وہ اس وصف سے بہت زیادہ متصف تھے؛ ورنہ تو سبھی ائمہ کے اندر یہ وصف پایا جاتا تھا، وہ سب ہدایت کے چراغ تھے؛ لیکن امام مالکؒ کے اندر یہ وصف زیادہ پایا جاتا تھا''۔

یہ نہایت عمدہ اور قیمتی بحث ہے، شاطبیؒ نے اس کتاب میں اور بھی جگہوں پر کافی عمدہ بحث کر رکھی ہے، ان سب کو تلاش کر کے پڑھنا چاہیے۔

متحقق عالم کی مزید نشانیاں:

امام بدر بن جماعہؒ شیخ کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۲) کہ: شیخ کے کل بارہ قسم کے آداب ہیں:

---

(۱) ابنِ حزم کے شیوخِ روایت تو یقیناً بہت ہیں؛ لیکن شاطبیؒ کی گفتگو شیوخِ صحبت اور شیوخِ ملازمت سے متعلق ہے، وہ علمائے محققین کے آداب اپنانے کی بات کر رہے ہیں۔

(۲) تذکرة السامع والمتکلم ص ۱۵

۱-اسے خلوت وجلوت میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا دھیان رہے، اور وہ ہر حرکت وسکون اور ہر قول وفعل میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے؛ کیونکہ یہ علومِ شرعیہ اس کے پاس اللہ کی امانت ہیں۔

۲-وہ اس علم کی اسی طرح حفاظت کرے جیسے اسلاف نے کی تھی، دنیاداروں کے پاس جا کر اس کی توہین نہ کرے۔

۳-دنیا سے زہد اختیار کرے، اور جتنا ممکن ہو دنیا کو اپنے پاس کم سے کم رکھے، بس اتنا ہو کہ اس کو اور اس کے اہل وعیال کو کسی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۴-وہ اپنے علم کو دنیوی اغراض حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ نہ بنائے۔

۵-وہ ایسے ذریعۂ معاش سے کلی اجتناب کرے جو طبعی طور پر حقیر اور گھٹیا سمجھے جاتے ہوں، یا شرعاً اور عرفاً مکروہ وناپسندیدہ خیال کیے جاتے ہوں، اپنے آپ کو تہمت کی جگہوں سے بچائے، اور ہر ایسے کام سے دُور رہے جس سے اس کا وقار جاتا رہے یا جو بظاہر اچھا نہ سمجھا جاتا ہو، اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہو۔

۶-اسلامی شعائر کے قیام اور ظاہری احکام کے نفاذ پر توجہ دے اور احیائے سنت اور بدعات کے خاتمہ کی فکر کرے۔

۷-وہ ان اُمور کی بھی پابندی کرے جو شرعاً مستحب درجے کے ہیں، قولی ہوں یا فعلی، مثلاً: قرآن کی تلاوت، دل اور زبان سے اللہ کا ذکر، ماثور دعاؤں اور اذکار وغیرہ کا اہتمام۔

۸-لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔

۹-اپنے ظاہر وباطن کو اوصافِ ذمیمہ سے پاک کر کے اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کرے، ابنِ جماعہؒ نے چند بُرے اخلاق گنوانے کے بعد لکھا ہے کہ: ان خطرناک بیماریوں کا علاج تفصیل کے ساتھ رقائق کی کتابوں میں موجود ہے، جو شخص بھی ان گندگیوں سے اپنے نفس کو پاک کرنا چاہتا ہو، وہ ان کتابوں کا خوب مطالعہ کرے، اس

سلسلے میں ایک مفید ترین کتاب محاسبی رحمہ اللہ تعالی(۱) کی **"الرعایة"** ہے، جس میں انھوں نے کافی تفصیل سے کلام کیا ہے۔

۱۰- وہ اِس بات کا حریص رہے کہ اس کا علم مسلسل بڑھتا رہے، جس کے لیے وہ پیہم محنت اور جدو جہد میں لگا رہے، عبادات کا اہتمام کرے، اور اپنے اوقات کو علم میں مشغول رکھے: پڑھنے میں، پڑھانے میں، مطالعہ میں، غور وفکر میں، کسی کتاب پر تعلیق لکھنے، یا کسی چیز کو رٹنے اور یاد کرنے میں، یا تصنیف وتالیف، یا بحث وتحقیق میں یا کسی اور چیز میں، وہ اپنی عمر کا کوئی بھی وقت کسی بھی ایسی چیز میں ضائع نہ کرے جس کا تعلق علم وعمل سے نہ ہو، بقدرِ ضرورت ہی اپنا وقت دوسرے کاموں میں لگائے یا کوئی ایسی تکلیف اور رکاوٹ پیش آجائے جس کے ساتھ علم میں اشتغال مشکل ہو تو پھر مجبوری ہے، بعض اسلاف معمولی قسم کے مرض اور تکلیف کے وقت بھی علمی مشغولیت نہیں چھوڑتے تھے؛ بلکہ علم ہی ان کے لیے ان کے مرض کے لیے دوا ثابت ہوتا تھا، جتنا ممکن ہوتا وہ علم میں ہی مشغول رہتے (۲)، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

---

(۱) یہی صحیح ہے، یہاں لفظ "**تعالی**" تحریف ہوکر "**یقال**" ہو گیا ہے، تصحیح کرلی جائے

(۲) خطیب بغدادیؒ نے **"شرف أصحاب الحدیث"** (ص/۸۷) میں امام احمد بن منصور رمادیؒ سے نقل کیا ہے کہ: جب انھیں کسی مرض وغیرہ کی شکایت ہوتی، تو وہ طلبۂ حدیث کو بلاتے اور کہتے کہ: حدیث کی قرأت کرو، مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ (۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ) کا بھی یہی معمول تھا، جب کبھی ان کے مرض میں شدت پیدا ہوتی تو وہ شفا حاصل کرنے کی غرض سے بخاری پڑھانے کی مقدار میں اضافہ فرما دیتے، اور اللہ تعالیٰ انھیں شفا عطا فرما دیتے۔

ایک مرتبہ مرتبہ میں نے اپنے شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ کو فون کیا، مجھے ان سے کچھ پوچھنا تھا، میں نے ان کی آواز میں ضعف سا محسوس کیا، تو معذرت کر کے فون رکھنے لگا کہ بعد میں فون کرلوں گا؛ شیخ اصرار کرنے لگے کہ: نہیں پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے، اور کہنے لگے: پوچھو، پوچھو، اسلاف **"حدثنا"** اور **"أخبرنا"** کے ذریعہ ہی شفا حاصل کرتے تھے۔

إذا مرضنا تداوينا بذكركم ❖ ونترك الذكر أحيانا فننتكس

''جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو تمہاری یاد کے ذریعہ اپنا علاج کرتے ہیں اور کبھی تمہارا ذکر چھوٹ جاتا ہے تو مرض دوبارہ لوٹ آتا ہے''

یہ سب اس لیے ہے کہ علم کا مقام انبیاءؑ کی وراثت کا مقام ہے، جو بغیر اپنے آپ کو کھپائے حاصل نہیں ہوسکتا۔

ربیع بن سلیمانؒ کہتے ہیں کہ: امام شافعیؒ کی تصنیف میں مشغولیت کا یہ حال تھا کہ میں نے ان کو نہ کبھی دن میں کھاتے دیکھا، نہ رات میں سوتے دیکھا۔

۱۱- جو باتیں اسے معلوم نہ ہوں ان کو کسی بھی ایسے شخص سے پوچھنے اور معلوم کرنے میں عار محسوس نہ کرے جو مرتبہ یا نسب یا عمر میں اس سے چھوٹا ہو۔

۱۲- جمع وترتیب اور تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہو، بشرطیکہ اس کے اندر کامل اہلیت اور صلاحیت پائی جاتی ہو، اگر کوئی شخص اہلیت نہ ہونے کے باوجود تصنیف وتالیف میں لگے تو اس پر نکیر کرنی چاہیے؛ ایک تو وہ جہالت کے باوجود لکھ رہا ہے، دوسرے اپنے کتاب کے قارئین کو تباہی کے راستے پر ڈال رہا ہے، تیسرے وہ خود اپنا وقت ایسی چیز میں ضائع کر رہا ہے جس کے اندر اسے پختگی حاصل نہیں ہے۔

تصوف کے شیخ کے لیے بھی یہی صفات مطلوب ہیں:

میں سمجھتا ہوں کہ علم اور تصوف دونوں جگہ اقتداء اور صحبت کے لیے شیخ کے اندر یکساں صفات مطلوب ہیں، صحیح علم اور صحیح تصوف دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب ''**أيها الولد**'' کے اندر شیخِ تصوف کے اوصاف بیان کرتے ہوئے وہی اوصاف ذکر کیے ہیں جو علمی شیخ کے لیے ضروری قرار دیے گئے اور کچھ زائد باتیں بھی ذکر کی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: شیخ بنانے کے قابل وہی شخص ہے جو حبِّ دنیا اور حبِّ جاہ سے دُور بھاگتا ہو، اس نے

کسی ایسے بصیرت والے شخص کی اتباع کی ہو، جس کی اتباع کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو، اس نے اپنے نفس کی خوب ریاضت کی ہو اور شیخ کی اتباع نے اس کو اخلاقِ حسنہ: صبر، نماز، شکر، توکل، یقین، سخاوت، قناعت، اطمینانِ قلب، بردباری، تواضع، علم، صدق، حیاء، وفاء، وقار اور سنجیدگی جیسے اوصاف سے آراستہ کر کے اس کی سیرت کا جز بنا دیا ہو، یہ سب چیزیں اگر شیخ کے اندر پائی جائیں تو پھر وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ مبارکہ کا ایک نُور ہے، جس کی اقتداء واتباع کی جاسکتی ہے[1]۔

اس اقتباس میں نئی چیز یہ ہے کہ: امام غزالیؒ اِس بات پر زور دے رہے ہیں کہ شیخ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا اتباعِ متوارث ہو، جو ایک عالم ربانی سے دوسرے عالمِ ربانی کی طرف اور ایک پیر سے دوسرے پیر کی طرف تسلسل وتوارث کے ساتھ زبانِ قال سے زیادہ زبانِ حال سے منتقل ہوتا ہوا آیا ہو۔

مبتدی طالبِ علم کیا کرے؟

مبتدی طالبِ علم کے لیے عموماً ایسے شیخ کا انتخاب آسان نہیں ہوتا، اس کے لیے یا تو کوئی دوسرا شخص کسی شیخ کا انتخاب کر کے اس کی رہنمائی کردے یا فی الحال اسے چھوڑ دیا جائے؛ تا آنکہ خود ہی اس کے اندر انتخاب کی صلاحیت پیدا ہوجائے؛ البتہ مبتدی طالبِ علم کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے شخص کی طرف اس کی رہنمائی فرمادیں جو اس کو صحیح شیخ کا پتہ بتادے، اللہ تعالیٰ میرا، آپ کا، ہر طالبِ علم وطالبِ اصلاح کا کفیل ہو۔

شیخ کے انتخاب سے متعلق ایک اور اہم مضمون کی طرف آپ کی توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ہماری یہ پوری گفتگو اس شیخ کے بارے میں ہے جن کا انتخاب صحبت اور اقتداء کے لیے ہوتا ہے، ایسے شیخ کے انتخاب پر زور دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ

(۱) أیها الولد ص ۱۲۹

طالبِ علم انہی پر انحصار کرے اور کسی دوسرے سے استفادہ ہی نہ کرے، طالبِ علم کو متعدد شیوخ کے پاس جانا چاہیے؛ تاکہ اس کے علم، تہذیب اور فکر وخیال کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو، ہمارے اسلاف اس کے حریص رہتے تھے اور اس سلسلے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

میں اس بات کو پھر دہراتا ہوں جو میں نے پیچھے بھی کہی ہے کہ روایت کے شیوخ اور صحبت وملازمت اور اقتداء کے شیوخ میں فرق ہوتا ہے۔

شیخ کا انتخاب جلد از جلد ہو:

یہ اللہ رب العزت کی طرف سے بڑی توفیق کی بات ہے کہ کسی کو ابتدائے طالبِ علمی میں ہی کسی باعمل عالم کی صحبت اور ملازمت میسر آجائے اور پھر یہ صحبت ہمیشہ باقی رہے، درمیان میں کوئی وقفہ اور انقطاع نہ آنے پائے؛ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس صحبت، ملازمت، عقیدت اور محبت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنے شیخ کے اخلاق وعادات کا پرتَو ہوجائے، جیسا کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دَور میں ہوا کہ صحابۂ کرامؓ پورے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں ڈھل گئے، زمانے، ہم نشینی اور محبت کے اعتبار سے جس کو جتنی صحبت میسر ہوئی اتنا ہی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں ڈھلتا چلا گیا۔

صحابۂ کرامؓ نے جو سنتِ نبویہؐ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اور عمومی احوال کو زبانی یاد رکھا، اس کا ایک بنیادی سبب یہ ان کی والہانہ محبت بھی تھی، ان یاد کرنے والوں میں حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتِ گرامی بھی ہے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو کہ انھوں نے کتنا بڑا ذخیرہ احادیث کا یاد کیا، ان کے لیے یہ کام اس لیے بھی آسان ہوا کہ وہ پڑھنے کے زمانے میں بھی اور پڑھانے کے زمانے میں بھی مکمل طور پر علم کے لیے یکسو رہے۔

شیخ کا اثر طالبِ علم میں کب منتقل ہوتا ہے:

اس صحبت سے مطلوبہ فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے اور طالبِ علم اپنے شیخ کے اقوال وافعال کے رنگ میں اسی وقت رنگتا ہے جبکہ اس کا تعلق اپنے استاذ سے انتہائی گہرا ہو، یہ تعلق جس قدر مضبوط ہوتا ہے شیخ کی طرف سے توجہ، افادہ اور خیر خواہی اسی قدر بڑھتی جاتی ہے، اور اسی قدر طالبِ علم اپنے علمی وعملی کمالات میں ترقی کرتا جاتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا علم اور ان کا فضل وکمال ہے کہ ان کے فضل وکمال کا سب سے بڑا سبب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی والہانہ محبت ہی تھی، اور اسی چیز نے تو انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء واتباع میں اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ عبادات تو چھوڑیے اُمورِ عادیہ میں بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء واتباع کے حریص رہتے تھے۔

صحابہؓ وتابعینؒ کی محبت کے کچھ واقعات:

میں نے اس سلسلے میں **"حجية أفعال رسول الله صلّى الله عليه وسلم"** میں صحابہؓ اور بعد والوں کے متعدد واقعات ذکر کیے ہیں (۱)، جن میں سے کچھ کی طرف یہاں اشارہ کرتا ہوں۔

ایک واقعہ حضرت علی کا ہے، جب وہ یمن سے لوٹے اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج پر جانے کا علم ہوا، اور وہ بھی مکہ چلے آئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: علی! تم نے کیسا احرام باندھا ہے؟ حضرت علیؓ نے جواب میں فرمایا: جیسا احرام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باندھا ہے، اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے بھی منقول ہے، یہ دونوں واقعات صحیحین میں موجود ہیں۔

---

(۱) ص ۸۳ فما بعدہا، وہیں پر ان آثار کی تخریج بھی ہے

اسی طرح ابوداؤد اور مسند احمد میں معاذ بن جبلؓ کے ایک واقعے میں ان کا یہ جملہ منقول ہے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس حالت پر بھی دیکھتا اپنے آپ کو اس پر لے آتا۔

حضرت انسؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیالے میں کدو تلاش کرتے ہوئے دیکھا، تو خود ان ہی کے بقول: مجھے اسی دن سے کدو سے محبت ہوگئی، پھر وہ اِس بات کے حریص رہنے لگے کہ کھانے میں کدو بنایا جائے۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لہسن والا کھانا نہیں کھایا تو انھوں نے بھی اس کو چھوڑ دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: جس چیز کو آپ ناپسند فرماتے ہیں میں بھی ناپسند کرتا ہوں۔

قرہ بن ایاس مزنی رضی اللہ عنہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت ہورہے تھے، تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہوئی دیکھیں، تو خود ان کی قمیص کے بٹن بھی گرمی اور سردی ہر موسم میں کھلے ہوئے دیکھے گئے، یہی حال ان کے بیٹے کا بھی رہا۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: **كان النبي صلّى الله عليه وسلم يعجبه التيمن في تنعله وترجله وطهوره في شأنه كله** کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جوتا پہننے، کنگھی کرنے، وضو کرنے، غرض تمام احوال میں داہنے جانب کا استعمال پسند فرماتے تھے، غالباً اسی "**في شأنه كله**" کی تعمیم سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے یہ بات سمجھی تھی کہ گفتگو کے دوران اشارہ بھی اسی طرح داہنے ہاتھ سے ہونا چاہیے؛ چنانچہ اپنے بیٹے کے انتقال کے دن جو کسی بھی باپ کے لیے انتہائی سخت دن ہوتا ہے، انھوں نے ایک شخص کو گفتگو کے دوران بائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھا، وہ ابھی قبرستان میں ہی تھے، کہنے لگے: اے میاں! بات کرو تو داہنے ہاتھ

سے اشارہ کیا کرو، بائیں ہاتھ سے مت کیا کرو!! وہ شخص کہتا ہے: واللہ! میں نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا! ایک شخص اپنے عزیز ترین جگر کے ٹکڑے کو دفن کر کے فارغ ہو رہا ہے، اور اسے اِس بات کی پڑی ہے کہ میں دایاں ہاتھ استعمال کروں نہ کہ بایاں!!(۱)۔

میرے علم کے مطابق یہ اس نوع کا سب سے عجیب و غریب واقعہ ہے۔

اِس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ والہانہ محبت انسان کے اندر محبوب کا گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں کہیے! کامل اتباع پیدا کر دیتی ہے، اور ایک طالبِ علم اور اس کے خاص استاذ کے درمیان یہی کامل اتباع مطلوب و مقصود ہے، ہمارے سابق علماء بھی اپنے خاص شیوخ کے ساتھ اسی طرح کا والہانہ تعلق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ علمائے اسلام پر رحم فرمائے اور ہمیں ان کے ساتھ بہترین حالت میں ملا دے۔

(۱) امام احمدؒ کا وہ واقعہ بھی دیکھیے جو آگے ص ۴۱۱ پر آرہا ہے

دسویں مشعل

استاذ کے ساتھ صحبت

طالبِ علم کا تعلق اپنے استاذ کے ساتھ اپنے ساتھیوں اور دیگر متعلقین کے تعلق سے بڑھ کر ہوتا ہے، بایں طور کہ اس کا اپنے استاذ سے شرف تعلق ہی نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ علم، فکر اور اخلاق وکردار جیسے اُمور میں اپنی ڈور اور لگام ان کے سپرد کر دیتا ہے، وہ ان ہی سے علم سیکھتا ہے اور کردار وعمل میں ان ہی کی اقتداء کرتا ہے۔

یہ تو عمومی اساتذہ کا معاملہ ہے، پھر جو خاص استاذ ہوتے ہیں جن سے طالبِ علم کو عقیدت ومحبت ہوتی ہے اور جن کو وہ دوسروں پر ترجیح دے کر اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، ان کا اثر اس طالبِ علم پر اور زیادہ پڑتا ہے اور ان کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا ہے؛ چنانچہ اس طالبِ علم کے ظاہر وباطن پر سب سے پہلے تو ان کی علمی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں، پھر ان کے اخلاق، اقوال، افعال، عادات اور صفات، غرض ہر چیز کا رنگ نظر آنے لگتا ہے، اسی کو عربی میں **''هدي''** اور **''دلّ''** کہتے ہیں۔

''هدي'' اور ''دل'' کی تفسیر:

میں نے اِس مضمون کو **''أدب الاختلاف''** میں بھی چھیڑا ہے[1]، وہیں سے نقل کرتا ہوں:

ابوعبید قاسم بن سلامؒ راوی ہیں: **أن أصحاب ابن مسعود کانوا یرحلون إلی**

(۱) ص ۲۷ فما بعدہا

عمر رضي الله عنهم جميعا فينظرون إلى سمته وهديه ودله فيتشبهون به. حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد حضرت عمرؓ کے پاس سفر کر کے جاتے اور ان کے اخلاق وعادات اور کردار وعمل کا مطالعہ کرتے اور ان کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے(۱)۔

ابنِ اثیرؒ کہتے ہیں کہ: "**دل**"، "**هدي**" اور "**سمت**" انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جو سنجیدگی، وقار، حسنِ سیرت اور ظاہر کی درستگی کا مجموعہ ہو(۲)۔

اسلاف اپنے استاذ سے اخلاق وعادات بھی سیکھتے تھے:

ابنِ سیرینؒ کبارِ تابعین کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ: وہ حضرات جس طرح علم سیکھتے تھے اسی طرح اخلاق وعادات بھی سیکھتے تھے؛ چنانچہ خود ابنِ سیرینؒ نے ایک شخص کو قاسم بن محمد بن ابکر صدیقؒ کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے اخلاق وعادات دیکھ کر آئے؛ کیونکہ قاسم بن محمدؒ کے پاس دادا صدیق اکبرؓ اور پھوپھی عائشہؓ کی طرف سے نبوت اور خاندانِ نبوت کے اخلاق وعادات وراثت میں آئے تھے، غور کیجیے ابنِ سیرین اور قاسم ایک ہی طبقہ کے ہیں؛ لیکن قاسم اس وصف میں ممتاز ہیں۔

زمخشریؒ کی "**ربيع الأبرار**"(۳) میں ہے کہ: جب عبداللہ بن مبارکؒ سفر پر جانے لگے تو ان سے کسی نے پوچھا: کہاں کا قصد ہے؟ فرمایا: بصرہ جارہا ہوں، پوچھا: کس کے پاس جارہے ہیں؟ فرمایا: ابنِ عون کے پاس، مجھے ان سے ان کے اخلاق اور آداب سیکھنے ہیں، اس واقعہ میں اگر یہ پتہ چل جائے کہ اس وقت عبداللہ بن مبارکؒ کس شہر میں تھے، جہاں سے وہ بصرہ جارہے تھے، تو اس واقعہ کی اہمیت اور بڑھ سکتی ہے؛ کیونکہ اگر وہ اپنے شہر مرو میں ہی تھے تو وہاں سے بصرہ ہزاروں کیلومیٹر دُور ہے!!۔

---

(۱) غریب الحدیث: ۳: ۳۸۳

(۲) النہایۃ ۲: ۱۳۱ یہ اصلا ابوعبید کے یہاں ہے۔ (۳) ۱: ۸۱۵

ابنِ عسا کرنے ابنِ عونؒ کے تذکرے میں عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: جتنے لوگوں سے بھی میں نے ملاقات کی، کسی کی جدائیگی پر مجھے اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا افسوس ابنِ عون سے جدا ہوتے وقت ہوا کہ میں اپنی موت تک ان کی ملازمت اختیار نہ کرسکا(۱)۔

اور ایک صفحہ کے بعد ہی ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: میں نے علم کو تلاش کیا تو وہ مجھے مل گیا؛ لیکن ادب تلاش کیا تو وہ صرف مسعر اور ابنِ عون کے پاس ہی ملا۔

حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ: امام احمدؒ کے حلقۂ درس میں کم وبیش پانچ ہزار طلبہ حاضر ہوتے تھے، جن میں صرف پانچ سو کے قریب ہی لکھتے تھے، بقیہ سب ان سے حسنِ ادب اور حسنِ سیرت سیکھتے تھے (۲)۔

شیوخ سے اخلاق وکردار اخذ کرنے کے تعلق سے ایک روایت وہ بھی ہے جو حافظ ذہبیؒ نے حمید بن عبدالرحمٰن الرؤاسی سے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: صحابہؓ میں اخلاق وعادات کے اعتبار سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اندر پائی جاتی تھی، پھر عبداللہ بن مسعودؓ سے سب سے زیادہ مشابہ علقمہ تھے اور علقمہ سے سب سے زیادہ مشابہ ابراہیم نخعی اور ابراہیم نخعی سے سب سے زیادہ مشابہ منصور بن معتمر، اور منصور سے سب سے زیادہ مشابہ ثوری، اور ثوری سے سب سے زیادہ مشابہ وکیع اور وکیع سے سب سے زیادہ مشابہ-بقول محمد بن یونس جمال کے- امام احمد بن حنبلؒ تھے۔

امام مالکؒ کے شاگردوں میں بخاری ومسلم کے شیخ یحییٰ بن یحییٰ نیساپوریؒ (متوفی ۲۲۶ھ) بھی ہیں، امام ابوبکر بن اسحاق صبغیؒ فرماتے ہیں کہ: خراسان میں یحییٰ بن یحییٰ سے زیادہ کوئی سمجھدار نہیں تھا، انھوں نے وہ خصائل امام مالکؒ سے سیکھے تھے، جس کے

(۱) ۳۱:۶ ۳۴۶، ۳۴۷

(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۱:۳۱۶

لیے انھوں نے ''موطا'' کی سماعت سے فراغت کے بعد امام مالکؒ کے یہاں ایک سال قیام کیا تھا؛ چنانچہ ان سے اس قیام کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: میں نے امام مالکؒ کے اخلاق وعادات سے استفادہ کے لیے قیام کیا تھا؛ کیونکہ ان کے اخلاق صحابہؓ وتابعینؒ کے اخلاق کا پرتَو تھے (۱)۔

ابنِ عبدالبرؒ نے امام مالکؒ کے دوسرے شاگرد یحییٰ بن یحییٰ بن کثیر لیثی اندلسیؒ (متوفی ۲۳۴ھ) کے بارے میں لکھا ہے کہ: وہ ثقہ، سمجھدار اور عمدہ سیرت وکردار کے حامل تھے، ان کے اخلاق وکردار کو امام مالکؒ کے اخلاق وکردار سے تشبیہ دی جاتی تھی (۲)۔

امام ابواسحاق شاطبیؒ علم پر عبور رکھنے والے عالم کی علامات بتاتے ہوئے لکھتے ہیں (۳):

علم پر عبور رکھنے والے عالم کی تیسری علامت: اپنے استاذ کی اقتداء اور ان کے رنگ میں رنگ جانا ہے، جیسا کہ اُوپر صحابہؓ اور تابعینؒ کی اقتداء کے بارے میں گزرا، اسی طرح ہر زمانے کے ائمہ واسلاف کا حال رہا، یہی وہ وصف تھا جس میں امام مالکؒ اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے، یعنی ان کے اندر یہ وصف زیادہ پایا جاتا تھا، ویسے تو سبھی ائمہ کا یہ حال تھا کہ وہ ہدایت کے چراغ تھے، ان سب کے اندر یہ وصف پایا جاتا تھا؛ لیکن امام مالکؒ کے اندر یہ وصف نمایاں طور پر پایا جاتا تھا۔

استاذ کا اپنے شاگرد کو ایسے شخص کی صحبت میں بھیجنا جن سے طالبِ علم کو فائدہ پہنچ سکتا ہو:

طالبِ علم کے حق میں انتہائی مفید چیز یہ ہے کہ اس کے کوئی استاذ اس کے لیے کسی

(۱) ترتیب المدارک ۱: ۵۴۴

(۲) الانتقاء ص ۱۰۹

(۳) الموافقات ۱: ۶۷

ایسے عالم کا انتخاب کر کے اس کی رہنمائی کر دیں جن کی صحبت سے طالبِ علم کو علم اور تربیت کے اعتبار سے فائدہ پہنچ سکتا ہو؛ کیونکہ طالبِ علم کے لیے اس کے شیخ کا انتخاب کرنا یقیناً یہ خود طالبِ علم کے انتخاب سے بہتر ہوگا۔

حضرت معاذؓ کا طرزِ عمل:

اس کی ایک مثال حضرت معاذ بن جبلؓ کے ایک طویل اثر میں ملتی ہے[۱]، جس میں ان کے طاعون میں مبتلا ہونے کا ذکر ہے، اس اثر کے اندر ہے کہ: حضرت معاذؓ پر بے ہوشی طاری ہوگئی، جب افاقہ ہوا تو دیکھا کہ ان کے ایک شاگرد[۲] رو رہے ہیں، پوچھا: کیوں رو رہے ہو؟ کہا کہ: اس علم کا سلسلہ فوت ہو جانے پر رو رہا ہوں، جو میں آپ سے حاصل کیا کرتا تھا، حضرت معاذؓ نے فرمایا: مت روؤ؛ علم رخصت نہیں ہوتا، اسے تلاش کرو جس طرح ابراہیم خلیل اللہ نے تلاش کیا تھا، جب میں مر جاؤں تو چار لوگوں کے پاس جا کر علم کو تلاش کرنا: عبداللہ بن سلام، عبداللہ بن مسعود، سلمان فارسی اور عویمر ابوالدرداء رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

امام ابنِ قیمؒ لکھتے ہیں: عمرو بن میمون اودیؒ حضرت معاذ بن جبلؓ کی صحبت میں رہے، اور ان سے خوب علم حاصل کیا، جب حضرت معاذؓ کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے عمرو کو وصیت کی کہ وہ ابنِ مسعودؓ کے پاس جا کر ان کی صحبت اختیار کریں اور ان سے علم حاصل کریں؛ چنانچہ انھوں نے ایسے ہی کیا[۳]۔ ابنِ قیمؒ نے اس روایت کا کوئی حوالہ نہیں ذکر کیا۔

---

(۱) رواه عبد الرزاق (٢٠١٦٤)، والبزار من وجه اخر (٣٠٤٢ من زوائده)

(۲) بزار کی روایت میں ان کا نام حارث بن عمیرہ آیا ہے، اس اثر کو امام بخاریؒ نے بھی ''تاریخ اوسط'' میں انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان کا نام یزید بن عمیر بتایا ہے

(۳) اعلام الموقعین ۱: ۲۵

امام مالکؒ کا طرزِ عمل:

اسی قبیل سے وہ واقعہ بھی ہے جو امام مالکؒ اور ان کے شاگرد اسد بن فرات کے درمیان پیش آیا:

قاضی عیاضؒ لکھتے ہیں کہ: اسد بن فرات نے فرمایا کہ: ابن القاسم وغیرہ مجھے امام مالکؒ سے سوال کرنے پر اکساتے تھے، جب امام مالکؒ میرے سوالوں کا جواب دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ: پوچھو اگر ایسا اور ایسا ہوا تو کیا حکم ہے **(قل له: فإن كان كذا وكذا)**، ایک دن امام مالکؒ تنگ آکر مجھ سے کہنے لگے: **هٰذه سلسة بنت سلسة إن كان كذا وكذا** کہ یہ **"إن كان كذا وكذا"** ایک پیچ در پیچ سلسلہ ہے، اگر تمھیں اس طرح کے مسائل معلوم کرنے ہیں تو عراق چلے جاؤ، امام مالکؒ کو یہ چیز ناپسند تھی کہ مسائل پیش آنے سے پہلے ہی ان کو فرض کرکے ان کا حکم بیان کیا جائے؛ چنانچہ اسد بن فرات عراق چلے گئے اور امام ابو یوسفؒ کی صحبت میں کچھ وقت رہے، پھر امام ابو یوسفؒ نے انھیں اپنے شاگرد محمد بن حسن شیبانیؒ کے حوالے کیا اور فرمایا کہ: انھیں اپنے ساتھ رکھو، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمھیں ان کے ذریعہ دنیا وآخرت میں نفع پہنچائیں، اسد بن فرات کہتے ہیں: میں نے امام محمدؒ کو لازم پکڑ لیا، یہاں تک کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہونے لگا جو ان کی مجلس کے اندر بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے تھے(۱)۔

یہی وہ رہنمائی تھی جس کی برکت سے امام ابو یوسفؒ کی توقع اور اُمید کے عین مطابق اسد بن فرات ایسے امام بنے جنھوں نے اپنے وقت کے دو بڑے مکاتبِ فکر: حجازی اور عراقی مکتبِ فکر کو سمیٹا اور ان سے فقہ حاصل کیا۔

ابو یعلی الفراء حنبلی کے استاذ کا واقعہ:

"الأحكام السلطانية" کے مصنف ابو یعلی الفراء حنبلی اور ان کے بیٹے ابنِ ابی

(۱) ترتیب المدارک ۱: ۶۰۹، ۶۱۰

یعلی حنبلی جو **"طبقات الحنابلة"** کے مصنف ہیں، یہ دونوں حنابلہ کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں، صاحبزادے ابنِ ابی یعلی بتاتے ہیں کہ: جس وقت ان کے دادا کی وفات ہوئی ان کے والد کی عمر بیس سال تھی، اس وقت ان کے وصی جو ''الحربی'' کے نام سے معروف تھے ''دارالقز'' میں رہتے تھے، وہ والد ماجد کو ''باب الطاق'' سے ''شارع دارالقز'' لے آئے، وہاں ایک مسجد تھی، جس میں ایک نیک صفت بزرگ مقری ابنِ مقدحہ امامت کرتے تھے، وہ مسجد میں قرآن بھی پڑھاتے تھے اور اپنے پاس پڑھنے والوں کی ''مختصر الخرقی'' کی عبادات کا متن بھی تلقین کراتے تھے، انھوں نے حسبِ معمول میرے والد کو بھی عبادات کا متن تلقین کرایا، والد ماجد نے مزید آگے پڑھنا چاہا، تو وہ کہنے لگے کہ: مجھے اتنی ہی مقدار اچھی طرح آتی تھی، اگر مزید پڑھنا چاہتے ہو تو شیخ ابوعبداللہ بن حامد کے پاس چلے جاؤ، میرے والد شیخ ابوعبداللہ حامد کے پاس آگئے اور ان کی صحبت میں رہنے لگے، ۴۰۳ھ میں ابنِ حامد کی وفات ہوئی اور اس وقت میرے والد اس کے اندر ماہر ہوچکے تھے (۱)۔

حافظ ابنِ حجرؒ کا طرزِ عمل:

یہ علمی صفت حافظ ابنِ حجرؒ کے اندر نمایاں طور پر پائی جاتی تھی؛ چنانچہ ان کے شاگرد علامہ سخاویؒ نے **"الجواهر والدرر"** میں ایک فصل قائم کی ہے (۲)، جس میں انھوں نے ان بہت سے مواقع کا ذکر کیا ہے جن میں حافظ ابنِ حجرؒ نے اپنے شاگردوں -علامہ سخاویؒ وغیرہ- کو اپنے زمانہ کے مختلف علماء کے پاس بھیجا کہ ان کے پاس جا کر ان سے سماع اور علوِ اسناد حاصل کرو یا جن روایتوں میں وہ منفرد ہیں ان کو حاصل کر کے انھیں عام کرو۔

(۱) **الطبقات** ۳: ۳۶۴

(۲) الجواہر والدرر ۳: ۱۰۲۱-۱۰۲۳

طالبِ علم کے لیے تعددِ شیوخ کی ضرورت:

طالبِ علم کے باکمال بننے میں ایک اور چیز جو اہم کردار ادا کرتی ہے: وہ یہ ہے کہ طالبِ علم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمی اسفار کا موقع مل جائے اور مختلف علماء کے پاس جا کر علم حاصل کرنے کی توفیق میسر ہو جائے، اس سے اس کے نُور اور حکمت میں خوب اضافہ ہوتا ہے، سفر کرنے والا طالبِ علم شہد کی مکھی کی طرح ہوتا ہے، جو ہر پھول اور ہر کلی سے خالص رَس کشید کرتا ہے اور اسے امت کے سامنے لذیذ شہد کی شکل میں پیش کرتا ہے، جس سے شفا حاصل کرنے والوں کو شفا ملتی ہے اور ہدایت کے طلبگاروں کو ہدایت نصیب ہوتی ہے۔

اگر طالبِ علم کو سفر کا موقع نہ مل سکے تو اسے امام قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کی اس نصیحت پر عمل کرنا چاہیے کہ: جس شخص کے لیے جسمانی سفر مشکل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف قلبی سفر کرے (آگے لکھتے ہیں:) تم شہوات کی دنیا سے قربات کی دنیا کی طرف کوچ کرو، محسوسات سے نکل کر معقولات کی طرف چلے جاؤ؛ البتہ یہ بھی دیکھ لو کہ زادِ راہ ہے یا نہیں؛ کیونکہ زادِ راہ کا ہونا ضروری ہے اور راہبر بھی دیکھ لو کہ ہے یا نہیں؛ کیوں کہ راہبر کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، تمہارا راہبر علم ہے، اگر تمھیں کوئی معلّم اور استاذ مل جائے تو اسے نعمت سمجھو، وہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے گا، تمھارے لیے دلائل مرتب کرے گا اور تمھیں بدعات اور دین بیزاری سے بچائے گا(۱)۔

حافظ سخاویؒ نے اپنے شیخ حافظ ابنِ حجرؒ کے تذکرہ میں اشارہ کیا ہے کہ ان کے تبحر علمی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ: انھیں ایسے شیوخ میسر آئے جن کی طرف اُنگلیوں سے اشارہ کیا جاتا تھا اور پیچیدہ مسائل میں جن کی رائے فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی، یہ چیز ان کے ہم عصروں میں کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی، ان کے تمام شیوخ اپنے اپنے فن کے امام اور اس پائے کے تھے کہ ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا تھا(۲)۔

(۱) قانون التاویل ص ۶۴۵ (۲) الجواہر والدرر ۱: ۱۴۰

اس بات کی سب سے پہلی دلیل کہ ہمارے اسلاف بھی تعددشیوخ کی رغبت رکھتے تھے یہ ہے کہ: یہ حضرات دو چیزوں پر بہت زور دیتے تھے: ایک طلبِ علم کے لیے سفر اور دوسرے ہر علم کو اس علم کے ماہرین سے حاصل کرنا اور یہی دو چیزیں تعددِ شیوخ کا بنیادی سبب بنتی ہیں۔

طالبِ علم ہر کسی سے علم حاصل کرے:

تعددِ شیوخ سے ہی متعلق ایک چیز یہ ہے کہ ہمارے اسلاف ہر قسم کے لوگوں سے علم حاصل کرنے پر زور دیتے تھے، وہ جس عمر کے بھی ہوں، جس نسب سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور جس شہر میں بھی رہتے ہوں؛ کیونکہ فائدے کا حصول اور علم میں اضافہ ہی طالبِ علم کا مطلوب ومقصود ہے، لوگوں کے درمیان یہ حدیث مشہور ہے: "**الحكمة ضالّة المؤمن، حيثما وجدها فهو أحقّ بها**"(۱) (کہ حکمت مؤمن کا گمشدہ مال ہے، جہاں بھی وہ اس کو پائے اس کا زیادہ حقدار ہے)۔

امام نوویؒ معلّم اور استاذ کے آداب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: استاذ ان لوگوں سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرے جو عمر یا شہر یا شہرت یا دینداری یا کسی دوسرے علم میں اس سے کمتر ہوں، اسے تو فائدہ کے حصول کی حرص ہونی چاہیے، جس سے بھی حاصل ہو جائے، چاہے ایسے ہی شخص سے کیوں نہ حاصل ہو جو مذکورہ تمام چیزوں میں اس سے کمتر اور گھٹیا ہو(۲)۔

جب استاذ کے اندر یہ صفت مطلوب ہے تو طالبِ علم کے اندر بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہوگی۔

امام ابوحنیفہؒ سے کسی نے پوچھا کہ: آپ نے یہ مقام کیسے پایا؟ فرمایا: **ما بخلت**

---

(۱) یہ حدیث ضعیف ہے، امام ترمذی (۲۶۸۷) نے اس کو روایت کیا ہے اور اس پر ضعف کا حکم لگایا ہے، ابن ماجہ (۴۱۶۹) نے بھی اسے حضرت ابوہریرہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے: "**الكلمة الحكمة: ضالة المؤمن الخ**"

(۲) مقدمۃ المجموع: ۱: ۲۹

بالإفادة، ولم أستنكف عن الاستفادة میں نے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بخل نہیں کیا اور دوسروں سے فائدہ حاصل کرنے میں عار محسوس نہیں کی[1]۔

"**العقد الفرید**"[2] میں ہے کہ: عبدالملک بن مروان کے پاس ایک صاحب آئے، عبدالملک ان سے جو بھی سوال کرتا اُن کے پاس اس کا جواب موجود ہوتا، عبدالملک نے پوچھا: یہ چیز آپ کو کیسے حاصل ہوئی؟ انھوں نے کہا کہ: امیرالمؤمنین! میرا یہ معمول رہا ہے کہ جو علم بھی میں دوسروں کو دے سکتا ہوں اس سے کبھی انکار نہیں کیا اور جو علم بھی مجھے دوسروں سے مل سکتا ہے اس کو کبھی معمولی سمجھ کر نہیں چھوڑا، میں جب بھی کسی سے ملتا تو اس سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کرتا اور کچھ نہ کچھ اس کو ضرور دیتا۔

"ادب الدنیا والدین"[3] میں ہے کہ: خلیل بن احمد فراہیدیؒ سے کسی نے پوچھا کہ: آپ کو یہ علم کیسے حاصل ہوا؟ فرمایا: میں جب بھی کسی عالم سے ملتا کچھ نہ کچھ ان سے ضرور حاصل کرتا اور کچھ نہ کچھ ان کو ضرور دیتا۔ خلیفہ منصور نے قاضی شریکؒ سے دریافت کیا کہ: آپ کو یہ علم کیسے حاصل ہوا؟ فرمایا: اگر کہیں تھوڑا بھی مجھے علم مل سکتا تھا تو میں نے اس سے اعراض نہیں کیا اور بہت زیادہ بھی اگر دوسروں کو دینے کی ضرورت پڑی تو میں نے اس میں بخل نہیں کیا۔

لیکن یہ اس اُصول کے مطابق ہونا چاہیے جو خطیب بغدادیؒ نے امام ابوحاتم رازیؒ سے نقل کیا ہے کہ: "**إذا كتبت فقمش وإذا حدثت ففتش**"[4] جب تم حدیثیں لکھو تو

---

(۱) فتاویٰ سراجیہ لسراج الدین الاوشی ص ۶۱۰، زرنوجیؒ (ص ۴۷) نے اسے امام ابو یوسفؒ کی طرف منسوب کیا ہے۔ (۲) لابن عبدربہ ۲: ۲۲۱ (۳) للماوردی ص ۱۲۴

(۴) الجامع لاخلاق الراوی (۱۷۲۹)، حالانکہ تاریخ بغداد میں اس کو اپنی سند سے ابن معینؒ سے نقل کیا ہے، اس جملہ کا مطلب "**فتح المغيث**" میں ملاحظہ فرمائیں، اسی طرح کا کلام ابن قتیبہ کا بھی ان کی کتاب "**عيون الأخبار**" کے مقدمہ میں موجود ہے۔

سب کچھ لکھ لو اور جب بیان کرنے اور روایت کرنے کا موقع آئے تو چھان پھٹک کر بیان کرو۔

خطیبؒ ہی نے امام وکیع بن جراحؒ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ: آدمی اسی وقت عالم ہوسکتا ہے جب وہ بڑوں سے بھی حدیثیں لکھے، چھوٹوں سے بھی اور برابر درجے کے لوگوں سے بھی (۱)۔

کثرتِ شیوخ کے چند نمونے:

خطیبؒ نے ان ابواب کے خاتمہ میں قاسم بن داؤد بغدادی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ: انھوں نے چھ ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں (۲)۔

یہ صحیح ہے کہ قاسم بغدادیؒ کو حافظ نے **"میزان الاعتدال"** میں ذکر کیا ہے اور **"لسان المیزان"** (۳) میں مزید کچھ نہیں لکھا، جس کی وجہ سے اس قول کی صحت مشکوک ہوجاتی ہے؛ لیکن قاسم کے علاوہ بھی متعدد محدثین کے اتنے ہی؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ شیوخ ہیں؛ چنانچہ حافظ ذہبیؒ نے امام حافظ ابوسعد سمعانیؒ (۵۰۶ - ۵۶۲ھ) کے تذکرے میں ان کے شیوخ کی تعداد سات ہزار بتائی ہے!! وہ ابنِ نجار سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ ابوسعد کے شیوخ کی تعداد سات ہزار تھی، اس تعداد تک کوئی اور نہیں پہنچا (۴)۔

ذہبیؒ نے خود امام حافظ ابنِ نجار (۵۷۸ - ۶۴۳ھ) کے تذکرے میں ابنِ ساعی سے نقل کیا ہے کہ: ابنِ نجار کی مشیخت تین ہزار مرد اور چار سو عورتوں پر مشتمل تھی (۵)۔

---

(۱) (۱۷۱۴)، **وروی نحوہ عن سفیان بن عیینة برقم (۱۷۲۰)، ورُوِي نحوہ عن غیرھما**

(۲) الجامع لاخلاق الراوی (۱۷۳۷)

(۳) المیزان (۶۴۳۱) اللسان (۶۱۱۳)

(۴) سیر اعلام النبلاء ۲۰: ۴۶۲، یہ جملہ ابن ایبک الدمیاطی کی "المستفاد من ذیل تاریخ بغداد" میں موجود ہے، فتح المغیث للسخاوی ۳: ۳۱۰ اور النکت الوفیہ ۲: ۵۷۳ بھی دیکھیے۔

(۵) سیر اعلام النبلاء ۲۳: ۱۳۳

اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب روایت وہ ہے جو "سیر" میں ابنِ مبارکؒ سے منقول ہے کہ: میں نے چار ہزار شیوخ سے حدیثیں حاصل کیں، جن میں سے ایک ہزار شیوخ سے روایت کی(۱)۔ یہ عجیب وغریب اس لیے ہے کہ ابنِ مبارکؒ متقدمین میں سے ہیں، جن کی وفات ۱۸۱ھ میں ہوئی، جبکہ ابن النجار متاخرین میں سے ہیں۔

ان سب کو ذکر کر کے یہی بتلانا مقصود ہے کہ شیوخ کی کثرت امرِ محمود ہے، بشرطیکہ نیت درست ہو؛ ورنہ فخر ومباہات کی نیت سے تو یہ چیز حرام ہے۔

تعددِ شیوخ کے اندر بے دار مغزی کی ضرورت:

شیوخ کی اس کثرت کے دوران طالبِ علم کو ان شیوخ کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں بھی بیدار مغز رہنے کی ضرورت ہے، وہ ان سے صحیح مزاج واخلاق اور درست علمی منہج ہی اخذ کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی لگام ہر ایک کے سپرد کرتا پھرے، یہ بات طالبِ علم کے ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ طبیعتیں ایک دوسرے سے اثر قبول کرتی ہیں، ہر نشست سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، طالبِ علم کو شہد کی مکھی کی طرح ہونا چاہیے، جو پھولوں سے اچھی چیزیں لے لیتی ہے اور بقیہ چیزیں چھوڑ دیتی ہے۔

طالبِ علم؛ بلکہ ہر انسان کو یہی برتاؤ ان اہلِ علم اور اہلِ فکر کے ساتھ بھی رکھنا چاہیے، جن کی وہ ہم نشینی اختیار کرتا ہے اور ہر اس کتاب کے ساتھ بھی جس کو وہ پڑھتا ہے اور ہر اس بولنے والے کے ساتھ بھی جس کو وہ میڈیا پر بولتے ہوئے سنتا ہے؛ میڈیا میں بے کار اور ردّی چیزیں بہ نسبت عمدہ چیزوں کے زیادہ آ گئی ہیں۔

اس احتیاط کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کتاب وسنت کی اتباع، سلفِ صالحین کی سیرت اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی سیرت کی اتباع اس کے پیشِ نظر ہو؛ کیونکہ ہر نئی چیز پھینکنے کے قابل نہیں ہوتی اور نہ ہر قدیم چیز ہر زمانے میں اچھی ہوتی ہے۔

(۱) ۸:۳۹۷

گیارہویں مشعل

طالبِ علم کا ادب کے زیور سے آراستہ ہونا

چند کلمات جن میں پورا اسلام آجاتا ہے:

لفظ ''ادب'' ان چند قلیل اور نادر کلمات میں سے ہے جو پورے اسلام کا مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہیں، ان ہی میں لفظ ''امانت'' بھی ہے، جس کے محدود معنیٰ تو ہیں: ودیعت کو اس کے مالک کے سپرد کرنا؛ لیکن عام معنیٰ کے اعتبار سے پورے اسلام کو شامل ہے اور یہی معنیٰ بظاہر سورۂ احزاب کے آخر میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ﴾ کے اندر مراد ہیں، باقی اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو بہتر جانتے ہیں۔

قرطبیؒ[1] کہتے ہیں کہ: صحیح قول کے مطابق امانت دین کی تمام ذمہ داریوں کو شامل ہے، یہی جمہور کا قول ہے۔

اسی طرح ایک لفظ ''عدل'' بھی ہے، اس کے محدود معنیٰ تو ہیں: فیصلہ کرنے میں انصاف کرنا، جس کی ضد: ظلم اور ناانصافی ہے؛ لیکن یہ اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے پورے اسلام کو شامل ہے، جیسا کہ ابن العربیؒ نے سورۂ نحل کی آیت: ۹۰ ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ کی تفسیر میں کہا ہے[2]۔

---

(۱) اس آیت کی تفسیر میں ۱۴: ۲۵۳

(۲) احکام القرآن ۳: ۱۵۳-۱۵۴

لفظ ''ادب'' پورے اسلام کو سموئے ہوئے ہے:

لفظ ''ادب'' بھی اسی قبیل سے ہے(۱)، اس کے اندر بھی وہ عام مفہوم پایا جاتا ہے جس کے اندر پورا اسلام آجاتا ہے؛ کیونکہ ادب کی بہت ساری صورتیں ہیں: اللہ تعالیٰ کا ادب، اس کی تمام مخلوقات بشمول انبیاء وملائکہ کا ادب، خود اپنی ذات کا ادب اور ان لوگوں کا ادب جن کے ساتھ کوئی تعلق ہو، خواہ گہرا تعلق ہو جیسے: والدین ہیں یا معمولی تعلق ہو جیسے: راہ چلتے ہوئے کبھی کسی سے ملاقات ہو جائے۔

انتہائی اختصار کے ساتھ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ: اگر بندہ صرف اپنے رب کا ادب کر لے، بایں طور کہ اس کی طرف سے آئی ہوئی ہر بات پر ایمان لا کر اس پر عمل پیرا ہو جائے تو پورے اسلام پر عمل ہو جائے گا۔

لفظ ''ادب'' کے اندر اس عام مفہوم کے پائے جانے کے متعدد شواہد ہیں، جن میں حضرت سعید بن مسیّبؒ کا وہ ارشاد بھی ہے جسے امام ابوالقاسم قشیریؒ نے اپنے ''رسالہ'' میں نقل کیا ہے، سعید بن مسیّبؒ فرماتے ہیں: **من لم يعرف ما لله عز وجل عليه في نفسه ولم يتأدب بأمره ونهيه كان من الأدب في عُزلة**(۲) جس شخص نے اپنے اُوپر اللہ کے حقوق کو نہیں جانا اور اس کے اوامر ونواہی کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے اس کا ادب نہیں کیا، تو ایسا شخص ادب سے عاری ہے۔

''ادب'' کے اسی عام مفہوم کے تحت طالبِ علم کے ذمہ ان لوگوں کا ادب واحترام بھی داخل ہے جن کے اس پر حقوق ہیں، جن میں سرفہرست اس کے وہ اساتذہ ومربیان ہیں، جو اس کو علمِ نبویؐ اور عملِ صالح سے آراستہ کر کے جہالت اور گناہوں کی تاریکیوں سے

---

(۱) اسی عام مفہوم میں لفظ ''زکاۃ'' بھی قرآنِ کریم میں ایک جگہ استعمال ہوا ہے، دیکھیے سورۂ فصلت کی پچھلی آیت کی تفسیر: ابنِ کثیر وغیرہ میں۔

(۱) أول باب الأدب ۴:۱۵ بشرحها

نکالتے ہیں، ان کے حقوق طالبِ علم پر اہم ترین حقوق العباد میں سے ہیں، انہی ہستیوں کی بدولت اسے دوسروں کے حقوق کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کے ذمہ اللہ کے، اُس کے رسولوں کے، اس کے فرشتوں کے، والدین کے اور دیگر بندگانِ خدا اور خلق خدا کے کیا حقوق ہیں۔

طالبِ علم جتنا بھی اپنے اساتذہ کا ادب واحترام کرلے وہ ان کے ذریعہ ملنے والے دنیوی فضائل ومکارم کا بھی حق ادا نہیں کرسکتا، چہ جائے کہ اُخروی فضائل ومکارم کا حق ادا کرے؟!۔

استاذ کے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے اس علم کے ادب پر گفتگو کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جس علم کے ذریعہ یہ اساتذہ اس طالبِ علم کی تربیت کرتے ہیں، ان دونوں آداب کے درمیان گہرا ربط ہے، ویسے تو ان دونوں آداب پر گفتگو انتہائی مبسوط اور تفصیل طلب ہے؛ لیکن جو چیز ضروری ہے اس سے چارۂ کار بھی نہیں؛ اس لیے میں مختصر سے چند کلمات میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اگرچہ ادب کے تعلق سے گفتگو ہر گفتگو سے طویل تر ہوتی ہے۔

(۱) استاذ کا ادب:

استاذ کا ادب؛ اور وہ بھی تمام احوال میں، چاہے استاذ سامنے موجود ہوں یا نہ ہوں، یہ سب سے اہم چیز ہے، جسے طالبِ علم کے اندر پیدا کرنے اور اس کی طرف اس کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ ادب طالبِ علم کے لیے کامیابی وکامرانی کا عنوان ہے اور اس کی مطلوبہ صفات میں سب سے افضل واشرف صفت ہے، اس سلسلے میں سلف وخلف کے بڑے حیرت انگیز واقعات منقول ہیں، میں نے کچھ واقعات ''ادب الاختلاف'' میں بھی ذکر کیے ہیں (۱)، جن میں ابنِ عباسؓ اور ابن القاسم کے وہ واقعات بھی ہیں جو پیچھے گزر چکے ہیں (۲)۔

---

(۱) ص ۱۹۰۔۱۹۶

(۲) ص ۲۱۷

بےادبی دیکھ کر پڑھانے سے انکار:

ان ہی میں ایک واقعہ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی ہے، ان کے صاحبزادے عبداللہ بن احمدؒ بیان کرتے ہیں کہ: میں نے اپنے والد سے سنا، کسی نے ان سے دریافت کیا کہ: آپ نے ابراہیم بن سعدؒ سے زیادہ حدیثیں نہیں سنیں، جبکہ وہ دارعمارہ میں آپ کے پڑوس میں مقیم تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ: ہم لوگ ایک مرتبہ ان کی مجلس میں گئے، تو انھوں نے کچھ حدیثیں بیان کیں؛ پھر جب دوسری مجلس لگی اور انھوں نے نوجوانوں کو بوڑھوں سے آگے بیٹھے ہوئے دیکھا، تو انھیں غصہ آ گیا اور قسم کھالی کہ: واللہ! میں تم لوگوں سے ایک سال تک کوئی حدیث نہیں بیان کروں گا! اور پھر واقعی کوئی حدیث نہیں بیان کی اور سال پورا ہونے سے پہلے ہی انتقال فرما گئے (۱)۔

اس واقعہ نے مجھے اس قبیل کے بہت سے واقعات یاد دلا دیے، انہی میں ایک واقعہ وہ ہے جو ابنِ سعد نے ''طبقات'' میں اور خطیب نے ''جامع'' میں مالک بن مغول سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں طلحہ بن مصرف کے ساتھ چل رہا تھا، سامنے ایک تنگ راستہ آ گیا، طلحہ مجھ سے آگے بڑھ کر اس میں داخل ہو گئے اور فرمایا کہ: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے ایک دن بھی بڑے ہو تو میں تم سے آگے نہ ہوتا! (۲)۔

اسی طرح دُوری نے اپنی ''تاریخ'' میں اور خطیب نے ''جامع'' میں بیان کیا ہے (۳) کہ: علی بن صالح بن حی اور حسن بن صالح بن حی دونوں جُڑواں بھائی تھے؛ علی کی پیدائش ایک گھڑی پہلے ہوئی تھی اور حسن بن صالح کی ایک گھڑی بعد؛ اسی ایک گھڑی کی رعایت

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۱: ۳۱۷

(۲) طبقات ابن سعد ۶: ۳۰۸، الجامع لاخلاق الراوی (۲۵۲) الفاظ خطیب کے ہیں

(۳) دوری ۲: ۴۱۸ (۴۷۸۷)، الفاظ ان ہی کے ہیں، خطیب (۲۵۵)، خطیب نے صرف دوسرا جز ذکر کیا ہے، ان کے یہاں اور بھی دلچسپ اور نادر واقعات ہیں۔

میں حسن بن صالح اپنے بھائی کا ادب کرتے تھے اور ان کا تذکرہ کرتے وقت ان کا نام لینے کے بجائے کہتے تھے: ابومحمد یوں فرماتے ہیں، ابومحمد یوں فرماتے ہیں؛ نیز ان کے بھائی جب کہیں بیٹھتے تو وہ اسی ایک گھڑی کی وجہ سے ان کے احترام میں ان کے برابر بیٹھنے کے بجائے ان سے نیچے بیٹھتے تھے!!۔

برہان بقاعیؒ کا پڑھانے سے انکار:

علامہ مناویؒ لکھتے ہیں کہ: برہان بقاعی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ: کسی عجمی شخص نے ان سے حدیث پڑھنے کی درخواست کی، انھوں نے اجازت دے دی، وہ شخص چارزانو بیٹھ گیا، برہان بقاعی نے یہ دیکھ کر پڑھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ: تمھیں اس وقت علم سے زیادہ ادب سیکھنے کی ضرورت ہے۔

بے ادبی پر علامہ مناویؒ کی سخت تنبیہ:

شمس جوجریؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ: جب انھوں نے علم حاصل کرنا شروع کیا تو اپنے ملک کے بڑے بڑے علماء اور محدثین کی مجلس میں پہنچے؛ لیکن اپنی طبعی ذکاوت کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، یہاں تک کہ وہ شیخ الاسلام علامہ یحییٰ مناویؒ کے حلقۂ درس میں پہنچے اور بے دھڑک ان کے سامنے بیٹھ گئے، ان کا خیال تھا کہ علامہ مناوی انھیں اپنے مقرب شاگردوں میں داخل فرمالیں گے؛ لیکن توقع کے برخلاف شیخ الاسلام علامہ مناویؒ نے وہیں سب کے سامنے انھیں ڈانٹ دیا اور کہا کہ: تمہارے اندر ادب کی کمی ہے، اس طرح علمِ دین حاصل نہیں ہوسکتا، اپنے اُوپر کنٹرول کرو اور ادب کے ساتھ رہو! استاذ کی ڈانٹ سن کر شیخ شمس الجوجریؒ پسینہ پسینہ ہوگئے اور دوسروں کو کمتر سمجھنے کی خصلت اسی وقت ان کے دل سے نکل گئی اور پھر انھوں نے شیخ مناویؒ کی مجلسِ درس میں پابندی کے ساتھ حاضری دی، یہاں تک کہ وہ اپنے دَور کی ایک عظیم علمی شخصیت بن کر اُبھرے۔

جب طالبِ علم کا نفس اور اس کے اخلاق ان جیسے آداب کی مشق کر لیتے ہیں تو پھر اس سے اپنے آپ ہی ایسے آداب صادر ہوتے ہیں جو اس کو سکھائے گئے آداب سے بھی اعلیٰ وارفع ہوتے ہیں۔

آپ ان دونوں واقعات کا گزشتہ ان واقعات سے موازنہ کیجیے جن میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور ربیع بن سلیمانؒ کی جانب سے اپنے اساتذہ: حماد بن سلیمان، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے ساتھ غایت درجہ ادب کا ذکر ہے[1]، آپ دیکھیں گے کہ اِن واقعات میں شمس جوجری اور اس عجمی شخص کو باضابطہ آداب سکھانے پڑے، جبکہ اُن ائمہ کرام سے یہ آداب بغیر کسی تنبیہ وتادیب کے فطری طور پر صادر ہوئے۔

دھوپ میں استاذ کے ساتھ چلنے کا ادب:

من جملہ ان آداب کے جو توارث کے ساتھ آج تک منتقل ہوتے آئے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ: اگر طالبِ علم کبھی دھوپ کے وقت اپنے استاذ کے ساتھ ایسے راستے پر چلے جس میں سایہ بھی ہو اور دھوپ بھی، تو خود دھوپ میں چلے اور سایہ کی جگہ استاذ کے لیے چھوڑ دے۔

ایک ادب یہ بھی ہے کہ اگر دھوپ ہی دھوپ ہو تو وہ اِس بات کا خیال رکھے کہ جس طرف استاذ کا سایہ پڑ رہا ہو اس طرف نہ چلے؛ بلکہ دوسری طرف چلے؛ تاکہ استاذ کے سایہ پر اس کے قدم نہ پڑیں۔

(۱) پیچھے ص: ۲۷۱ پر ذکر کردہ واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے اپنے استاذ حماد بن ابی سلیمان کے احترام میں کبھی ان کے گھر کی طرف پاؤں نہیں پھیلایا؛ حالانکہ میرے اور ان کے گھر کے درمیان سات گلیاں حائل تھیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: مجھے صفحہ پلٹنے کی ضرورت پڑتی تو میں آہستہ سے صفحہ پلٹتا؛ تاکہ اس کی آواز سے امام مالکؒ کو خلل نہ ہو۔ اور ربیع بن سلیمانؒ فرماتے ہیں: بخدا! مجھے امام شافعیؒ کی نگاہوں کے سامنے کبھی پانی پینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

استاذ کے ادب کا آنکھوں دیکھا ایک عجیب واقعہ:

میں اس قبیل کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں، جس سے اندازہ ہوگا کہ اربابِ فضل وکمال اپنے شیوخ کا کس قدر ادب واحترام کرتے تھے۔

میں ایک مرتبہ حلب میں شافعیہ کے مفتی اعظم شیخ محمد اسعد عجبیؒ کی مبارک مجلس میں موجود تھا اور ان کے ساتھ میرے انتہائی مؤقر استاذ اور ہر پل ہماری اصلاح وتربیت کے تئیں فکرمند میرے مشفق ومربی شیخ عبداللہ سراج الدینؒ اور مدرسہ شعبانیہ حلب کے ایک اور استاذ تشریف فرما تھے، یہ مجلس مدرسہ کے صحن میں لگی ہوئی تھی، اور موسم بہار کی ایک صبح کا وقت تھا، ہلکی ہلکی دھوپ نکلی ہوئی تھی، اچانک میں نے دیکھا کہ استاذ محترم (شیخ عبداللہ سرج الدین) مدرسہ شعبانیہ کے مذکورہ استاذ کو انگلی سے اشارہ فرما رہے ہیں کہ اپنے قدم پیچھے کرلو، میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ ان کے قدم مفتی شافعیہ شیخ محمد اسعد عجبیؒ کے سائے پر پڑ رہے ہیں، جس کی وجہ سے استاذ محترم انہیں اشارہ کر رہے ہیں کہ اپنے قدم شیخ کے سائے سے پیچھے ہٹالو۔

ایک اور انوکھا واقعہ:

بات سے بات نکلتی ہے، میں ایک مرتبہ گرمی کی چھٹیوں میں اپنے مخلص دوست محبی فی اللہ شیخ عبدالمجید قطان کے ساتھ مدرسہ شعبانیہ حلب پہنچا، اتفاق سے جب ہم مدرسہ میں داخل ہو رہے تھے تو اسی وقت مفتی شافعیہ شیخ محمد اسعد عجبیؒ مدرسہ سے نکل رہے تھے اور ان کو دروازے تک رخصت کرنے کے لیے میرے ہر دل عزیز استاذ اور مربی شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ بھی ساتھ تھے، میرے ساتھی شیخ عبدالمجید نے پہلے شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ سے سلام ومصافحہ کرنا چاہا تو شیخ نے مصافحہ سے انکار فرمادیا اور فرمایا: **الأستاذ أوّل، الأستاذ أوّل** (پہلے استاذ سے، پہلے استاذ سے) چنانچہ شیخ عبدالمجید مفتی صاحب کی طرف سلام ومصافحہ

کے لیے بڑھے، میں نے سوچا کہ: اتنے میں شیخ عبدالمجید اُدھر مفتی صاحب سے سلام ومصافحہ کر کے فارغ ہوں، میں استاذ محترم شیخ عبدالفتاح سے مصافحہ کر لیتا ہوں؛ چنانچہ میں نے شیخ کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو آپ نے مجھ سے بھی مصافحہ کرنے سے انکار فرما دیا اور ذرا سخت لہجے میں کہا: **الأستاذ أوّل، الأستاذ أوّل.**

جس شخص نے ان دونوں واقعات کے وہ حسین لمحات پائے ہوں اور ان تینوں شیوخ (شیخ محمد اسعد عجبیؒ، شیخ عبداللہ سراج الدینؒ اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ) کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، وہی ان آداب کی قیمت سمجھ سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے مشائخ اور مربیوں سے راضی ہو اور انھیں ہماری طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان واقعات کے بعد اب آپ بھی میرے ساتھ یہ سوال دہرائیے کہ: ان حضرات سے اس شخص کو کیا نسبت ہو سکتی ہے جو اساتذہ ومدرسین کے کمرے میں اپنے اساتذہ کے برابر بیٹھ کر کہتا ہے کہ: اب سر برابر ہو گئے اور سب ایک درجے کے ہو گئے!!

یہ آداب طویل ریاضتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں:

ممکن ہے کسی کو ان آداب پر تعجب ہو کہ ایک انسان سے ایسے آداب کا صدور کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ یہ آداب ان حضرات کے اندر اچانک نہیں پیدا ہوئے، ان سے پہلے طویل محنتیں اور مشقتیں اُٹھائی گئیں، بڑے بڑے مجاہدے کیے گئے، تب جا کر یہ آداب صادر ہوئے۔

یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی سادہ مزاج انسان جو جنگل ہی میں پلا بڑھا ہو، اچانک کسی ایسے پُر رونق شہر میں پہنچ جائے جہاں آسمانوں سے باتیں کرتی ہوئی لمبی لمبی عمارتیں موجود ہوں، تو اسے سخت حیرت ہو گی کہ اتنی بڑی بڑی بلڈنگیں کیسے وجود میں آ گئیں؟ لیکن جب اسے سمجھایا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ: اس عظیم بلندی کو وجود میں لانے کے لیے

پہلے پلاننگ، تجربات اور ابتدائی مراحل سے گزرنا پڑا، پھر دھیرے دھیرے بتدریج اسے بلند کیا گیا، تب جا کر یہ بلندی وجود میں آئی، تو اس شخص کو کچھ بات سمجھ میں آئے گی۔

بعینہٖ اسی طرح ان حضرات کے آداب کا حال ہے، پہلے بتدریج پیہم محنتیں ہوئیں، تب جا کر یہ آداب وجود میں آئے۔

بڑوں کا ادب جانوروں میں بھی ودیعت کیا گیا ہے:

اگر میں آپ سے کہوں کہ: بڑوں کا ادب واحترام تو جانوروں میں بھی ودیعت کیا گیا ہے، تو ہوسکتا ہے آپ کو تعجب ہو یا آپ انکار کر بیٹھیں؛ لیکن آپ جلدی نہ کریں، آپ نے یہ آیتیں تو پڑھی ہوں گی: ﴿وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۝ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (النمل)

(اور سلیمان (علیہ السلام) کے لیے ان کا لشکر جمع کیا گیا: جن بھی، انسان بھی اور پرندے بھی اور ان کو روکا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ چیونٹیوں کے ایک میدان میں آئے تو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ: اے چیونٹیو! اپنے اپنے سوراخوں میں جا گھسو، کہیں تم کو سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالیں)۔

چیونٹی جو محض ایک جانور ہے، اس کے اس جملہ پر غور کیجیے: ﴿لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (کہ تمھیں سلیمان اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالیں) وہ سلیمان علیہ السلام کے سپاہیوں کا ادب کر رہی ہے، جو ایک عظیم انسان حضرت سلیمان علیہ السلام کے سپاہی ہونے کی وجہ سے بڑے مرتبے کے حامل ہیں؛ چنانچہ وہ ان کے احترام میں ان کی طرف سے معذرت پیش کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ: اگر ان سے تمھیں کوئی تکلیف پہنچے تو یہ قصداً نہیں؛ بلکہ غیر ارادی ہوگی ﴿وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۝﴾ (وہ بے خبری میں ایسا کریں گے) بڑوں کا ادب اسی طرح کیا جاتا ہے۔

اور جب جانور کے اندر اصحابِ سلیمان علیہ السلام کا اس درجہ ادب ہے تو سوچیے ! ہم انسانوں کو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، دیگر ائمہ واسلاف اور علمائے کرام کا کس قدر ادب کرنا چاہیے؟! اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

استاذ کے ادب کے بارے میں قرآن کی ہدایات:

میں نہیں چاہتا کہ ادب وتادیب کے تعلق سے یہ گفتگو امام فخر رازیؒ کی اس شاندار بحث کے بغیر ہی ختم ہوجائے، جو انھوں نے اپنی ''تفسیر کبیر'' میں حضرت موسیٰ اور خضر علیٰ نبینا وعلیہما الصلاۃ والسلام کے واقعہ کے اندر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ (الکہف) کی تفسیر میں کی ہے (ترجمہ: کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں اس شرط کے ساتھ کہ جو علم مفید آپ کو سکھلایا گیا ہے اس میں سے آپ مجھ کو بھی سکھلا دیں)[1]۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں[2] کہ: ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے علم حاصل کرتے وقت ادب اور تواضع کے اَن گنت پہلوؤں کی رعایت کی:

(۱) انھوں نے اپنے آپ کو خضر علیہ السلام کے تابع بنایا اور فرمایا: ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ﴾ (کیا میں آپ کے تابع بن کر رہ سکتا ہوں؟)۔

---

(۱) یہ تو اس ایک آیت سے متعلق نکات ہوئے، جہاں تک پورے قصے کی بات ہے تو طاہر بن عاشور نے اپنی تفسیر ''التحریر والتنویر'' (۱/۴۲) کے مقدمے میں قاضی ابن العربیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ: انھوں نے موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعے میں آٹھ سو مسئلے لکھوائے۔

(۲) شیوخ کے ادب کی مناسبت سے میں یہاں ایک بات عرض کردوں کہ: ہمیں جو آداب سکھلائے گئے ان میں ایک ادب یہ بھی تھا کہ جب ہم عبارت پڑھیں اور درمیان میں کہیں لفظ ''اعلم'' آجائے تو اسے ''اعلم'' کے بجائے ''لیُعلَم'' پڑھا کریں؛ تاکہ (صورۃً بھی) استاذ سے صیغۂ امر سے خطاب نہ ہو۔

(۲) انھوں نے تابع بننے کے بارے میں اجازت بھی لی اور کہا کہ: کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کا تابع بن کر رہوں؟ یہ تواضع کی انتہا ہے۔

(۳) انھوں نے فرمایا: ﴿عَلَىٰٓ اَنْ تُعَلِّمَنِ﴾ یہ اپنے جہل کا اور اپنے استاذ کے علم کا اعتراف ہے۔

(۴) انھوں نے فرمایا: ﴿مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ صیغہ ''من'' تبعیض کے لیے آتا ہے، یعنی انھوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے علم کا کچھ ہی حصہ سکھانے کی درخواست کی، یہ بھی ان کے تواضع پر دلالت کرتا ہے، گویا انھوں نے یوں کہا کہ: میں آپ سے اس بات کی درخواست نہیں کرتا کہ آپ مجھے علم میں اپنے برابر کردیں؛ میں تو بس اتنی سی درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے علم کا کچھ حصہ ہی عطا کردیں، جس طریقے سے فقیر مالدار سے سوال کرتا ہے کہ آپ مجھے اپنے مال ودولت ایک جز عطا کردیں۔

(۵) ﴿مِمَّا عُلِّمْتَ﴾ یہ اِس بات کا اعتراف تھا کہ حضرت خضر علیہ السلام کو وہ علم اللہ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔

(۶) ﴿رُشْدًا﴾ یہ اپنے استاذ سے رہنمائی اور ہدایت کی درخواست تھی، **اِرشاد** کہتے ہیں اس چیز کو جس کے نہ ملنے پر آدمی گمراہی اور ضلالت کا شکار ہو جائے۔

(۷) ﴿تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ﴾ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ بھی میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں جیسا معاملہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آپ مجھے یہ علم سکھادیں گے تو آپ کی طرف سے مجھ پر ویسا ہی احسان ہوگا جیسا احسان اللہ نے آپ پر کیا ہے؛ اسی لیے کہا گیا ہے: **أنا عبد من تعلمت منه حرفا** میں اس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھادیا۔

(۸) اتباع ومتابعت نام ہے دوسرے کے فعل کی اس بنیاد پر نقل کرنا کہ اس دوسرے شخص نے اس کو انجام دیا ہے، مثلاً ہم اگر لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اور ہم سے پہلے یہود بھی یہ کلمہ

کہا کرتے تھے، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس سلسلے میں یہود کی اتباع کرتے ہیں؛ کیونکہ ہم یہ کلمہ اس وجہ سے نہیں کہتے کہ یہود نے یہ کلمہ کہا تھا، ہم تو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے وجوب پر دلیل موجود ہے، ہاں! ہم جو پانچ نمازیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت میں ادا کرتے ہیں تو وہ صرف اس وجہ سے ادا کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ادا کیا ہے، پس ان پانچ نمازوں میں ہم یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں۔

جب یہ بات واضح ہوگئی، تو اب سمجھیے کہ: موسیٰ علیہ السلام نے جو فرمایا: ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ﴾ (میں آپ کی اتباع کروں گا) تو اس میں انھوں نے بتلادیا کہ وہ جو کام بھی استاذ کو کرتا ہوا دیکھیں گے، آنکھ بند کر کے محض اس وجہ سے کہ استاذ نے اس کو انجام دیا ہے، اس کو انجام دیں گے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ طالبِ علم کو اول وحلہ میں ہی استاذ کی بات مان لینی چاہیے، بحث وتکرار نہیں کرنی چاہیے۔

(۹) ان کا قول ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ﴾ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ ان کی درخواست مطلقاً تمام چیزوں میں اتباع کرنے کی تھی نہ کہ بعض مخصوص چیزوں میں۔

(۱۰) حدیث سے ثابت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے شروع ہی میں پہچان لیا تھا کہ یہ بنی اسرائیل کے نبی موسیٰ ہیں، جن پر توریت نازل ہوئی ہے اور ان سے اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ براہِ راست بات کی ہے اور زبردست معجزات سے نواز رکھا ہے، پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے ان تمام بلند مراتب اور اعلیٰ درجات کو ایک طرف رکھ کر غایت درجہ کی تواضع اختیار کی، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں طلبِ علم کے لیے آئے تھے اور بلاشبہ یہی ان کی شان کے لائق بھی تھا؛ اس لیے کہ جس کو جتنی زیادہ علوم پر دسترس ہوتی ہے اس کو ان علوم کے لطف وسرور اور ان سے ملنے والی سعادتوں کا اندازہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، جس سے اس کے اندر علم کی طلب بھی اتنی ہی شدید ہوجاتی ہے اور اہلِ علم کا ادب واحترام بھی اسی قدر بڑھ جاتا ہے۔

(۱۱) انھوں نے فرمایا: ﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ﴾ یعنی انھوں نے پہلے اپنے آپ کو تابع بتایا، پھر ان سے علم سیکھنے کی درخواست کی، اس طرح انھوں نے پہلے مرحلے میں اپنے آپ کو خدمت کے لیے پیش کیا، ثانیاً ان سے تعلیم کی درخواست کی۔

(۱۲) انھوں نے فرمایا: ﴿هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ﴾ انھوں نے اپنے آپ کو تابع بنانے پر کچھ طلب نہیں کیا، گویا انھوں نے کہا کہ: مجھے آپ سے اس خدمت اور متابعت پر نہ مال کی طلب ہے نہ جاہ کی، میرا مقصد صرف علم کا حصول ہے۔

امام فخر رازیؒ کا کلام پورا ہوا اور ''ادب الاختلاف'' کا اقتباس بھی پورا ہوا۔

استاذ کے ادب کے کچھ نوادرات:

یوں تو یہ ایک نہ ختم ہونے والا طویل موضوع ہے، پیچھے بھی اختصار کے ساتھ کچھ واقعات ذکر کیے جا چکے ہیں اور بھی اس طرح کے بے شمار واقعات اسلاف کے منقول ہیں، چند نمونے مزید ملاحظہ فرمائیں:

خطیب نے ''**هيبة الطالب للمحدث**''[۱] کے عنوان کے تحت متعدد آثار نقل کیے ہیں جن میں مغیرہ بن مقسم کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ: ہم ابراہیم نخعیؒ سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے کوئی بادشاہ سے ڈرتا ہے۔

اسی طرح ایوب سختیانیؒ سے نقل کیا ہے کہ: آدمی حسن بصریؒ کے پاس تین سال تک بیٹھتا تھا؛ لیکن ان کے رعب کی وجہ سے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

عبدالرحمٰن بن حرملہ اسلمی سے نقل کیا ہے کہ: حضرت سعید بن مسیّبؒ کی مجلس میں کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ بلا اجازت کچھ پوچھ لے، اگر پوچھنا ہوتا تو پہلے اجازت لینی پڑتی، جیسے امیر سے بات کرنے کے لیے پہلے اجازت لینی ہوتی ہے۔

(۱) الجامع (۲۹۷-۳۰۳)

ابنِ شہاب زہریؒ سے نقل کیا ہے، کہ: میں سعید بن مسیبؒ کے پاس کئی سال تک گیا، میں ان سے اتنا قریب بیٹھتا تھا کہ میرا گھٹنا ان کے گھٹنے سے لگتا تھا؛ لیکن مجھے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، کچھ پوچھنا ہوتا تو یوں کہتا کہ: آج لوگوں نے یوں اور یوں کہا ہے، پھر سعید بن مسیب اس پر گفتگو فرما دیتے۔

استاذ زادے کا احترام:

زرنوجیؒ نے استاذ کے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: استاذ کے ادب میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کی اولاد اور ان کے متعلقین کا ادب کیا جائے، ہمارے استاذ صاحبِ ہدایہ شیخ الاسلام برہان الدین مرغینانیؒ ہم لوگوں کو یہ واقعہ سناتے تھے کہ بخاری کے ایک بڑے امام جب پڑھانے بیٹھتے تو پڑھاتے پڑھاتے اچانک کھڑے ہوجاتے، لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ: میرے استاذ کا بیٹا گلی میں بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور کھیلتے کھیلتے مسجد کے دروازے پر آجاتا ہے، جب میری نظر پڑتی ہے تو استاذ زادہ ہونے کے احترام میں اس کے لیے کھڑا ہوجاتا ہوں (۱)۔

عصر تا مغرب استاذ کے سامنے کھڑے رہنا:

اس نوع کا سب سے آخری واقعہ وہ ہے جو اسحاق بن ابراہیم بن حبیب بن شہید سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں یحییٰ بن سعید القطان کو دیکھتا تھا وہ عصر کی نماز کے بعد مینار کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے اور علی بن مدینیؒ، شاذ کونیؒ، عمرو فلاسؒ، امام احمدؒ اور ابنِ معینؒ وغیرہ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوجاتے اور ان سے کھڑے کھڑے حدیث کے متعلق مختلف سوالات کرتے اور یہ سلسلہ مغرب تک جاری رہتا، نہ یحییٰ القطان کسی کو بیٹھنے کے لیے کہتے، نہ ان میں سے کوئی ان کے رعب اور احترام میں بیٹھنے کی ہمت کرتا تھا۔

(۱) تعلیم المتعلم ص ۴۸

جب استاذ خود شاگرد بن گئے:

میری دانست میں قرأتِ کتاب کے دوران استاذ کے احترام کا سب سے عجیب وغریب واقعہ- یا کہیے انتہائی عجیب وغریب واقعہ-وہ ہے جو یاقوت حموی نے شریف عزیز الدین اسماعیل بن حسین علوی حسینی مروزی نسابہؒ (۵۷۲ھ تا ۶۳۲ھ تقریباً) کے تذکرے میں نقل کیا ہے(۱) شریف نسابہؒ فرماتے ہیں کہ: جب فخر رازیؒ مرو آئے تو میں حاضرِ خدمت ہوا، امام رازیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ اُن کی جلالتِ قدری، بلندیِ مرتبہ اور ہیبت ورعب کی وجہ سے کسی کو ان کی کسی بات پر اشکال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، نہ ان کے سامنے کوئی سانس لے پاتا تھا، جب وہ مرو آئے تو میں بھی ان کے پاس پڑھنے کی غرض سے جانے لگا، ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگے کہ: میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے ''انساب الطالبین'' (سادات کے نسب نامہ) سے متعلق کوئی مختصر سا کتابچہ لکھ دو، میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں، مجھے یہ گوارا نہیں کہ میں اس علم سے جاہل ہو کر مروں، میں نے پوچھا: شجرہ کی شکل میں لکھوں یا نثر کی شکل میں؟ کہنے لگے کہ: شجرہ کو یاد کرنا تو مشکل ہوتا ہے، کوئی ایسی چیز ہو جس کو میں زبانی یاد کرلوں، میں نے کہا: جیسے آپ کا حکم ہو۔

میں نے ان کے لیے ایک کتاب لکھی، جو ''الفخری'' کے نام سے مشہور ہوئی، میں اسے لے کر ان کی خدمت میں پہنچا، انھیں پتہ چلا تو وہ اپنے گدے سے نیچے اُتر آئے، اور چٹائی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے کہا کہ: تم اس گدے پر بیٹھ جاؤ، یہ چیز میرے لیے بہت بھاری تھی، مجھے ہمت نہیں ہوئی، انھوں نے مجھے بہت زور سے ڈانٹا اور چیخ کر کہا کہ: جہاں کہہ رہا ہوں چُپ چاپ بیٹھ جاؤ، خدا گواہ ہے کہ اس وقت مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے اختیار ان کی مسند پر بیٹھ گیا، پھر وہ میرے سامنے بیٹھ کر مجھے کتاب سنانے لگے، اور جو بات بھی سمجھ میں نہ آتی مجھ سے پوچھتے اور سمجھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ کتاب پوری ہوئی

(۱) معجم الادباء ۲: ۶۵۴

اور انھوں نے کہا: اب جہاں چاہو بیٹھ جاؤ، اس علم میں تم میرے استاذ تھے اور میں تم سے استفادہ کرنے والا تمہارا شاگرد، اور شاگرد کا ادب یہی ہے کہ وہ استاذ کے سامنے بیٹھے۔

میں وہاں سے اُٹھ گیا اور امام موصوف اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے اور میں اپنی پُرانی جگہ جہاں کچھ دیر پہلے امام بیٹھے تھے، آگیا اور ان سے پڑھنے لگا، بخدا! یہ حسنِ ادب کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا اور وہ بھی وقت کی ایک عظیم المرتبت ہستی کی طرف سے، اللہ تعالیٰ تمام ائمہ اسلام پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے جو سراپا ادب کے پیکر تھے (۱)۔

صحبت کے زمانے میں طالبِ علم کے لیے قابلِ توجہ اُمور

۱- جتنا ممکن ہو استفادہ کر لے:

شیخ کی صحبت کے زمانے میں طالبِ علم کو اس بات کا حریص رہنا چاہیے کہ ان کے

(۱) یہ واقعہ ائمہ سابقین کی طرف سے اعلیٰ ترین آداب اپنانے کے سلسلے میں بالکل واضح ہے، اس سے دو چیزیں اور سمجھ میں آتی ہیں، ایک امام فخر رازیؒ کی علم کے سلسلے میں بلند حوصلگی کہ انھیں یہ بات پسند نہیں کہ وہ کسی علم سے جاہل ہو کر مریں، دوسرے یہ کہ شریف نسابہ کی پیدائش ۵۷۲ھ میں ہوئی اور امام رازی کی وفات ۶۰۶ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں، اس اعتبار سے شریف نسابہ کی عمر امام رازیؒ کی وفات کے وقت ۳۴ سال تھی، یعنی وہ ابھی جوان تھے اور جس وقت انھوں نے یہ کتاب لکھی بلاشبہ اس وقت ان کی عمر اور بھی کم رہی ہوگی؛ لہٰذا اس قصہ سے جہاں ایک طرف امام رازی کی بلند ہمتی کا پتہ چلتا ہے، وہیں دوسری طرف ان کی طرف سے ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ سامنے آتا ہے کہ وہ اتنے بلند مقام پر ہونے کے باوجود کہ جہاں ان کے سامنے کسی کو سانس لینے کی بھی ہمت نہیں ہوتی ہے، اپنی اولاد کی عمر کے ایک شخص کے ساتھ اس درجہ تواضع کا معاملہ فرما رہے ہیں۔

اس واقعہ کو لکھنے کے بعد میں نے ڈاکٹر عبدالحکیم انیس کو دیکھا کہ انھوں نے بھی اپنی کتاب ''**أدب المتعلم تجاه المعلم**'' میں علمائے سابقین کے بہت سے واقعات کو جمع کر رکھا ہے، جن میں اس نوع کے متعدد واقعات کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے۔

پاس رہ کر جتنا ہو سکے ان سے استفادہ کر لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت کے عالم میں جدائی کی وہ گھڑی آ جائے جس کے بعد پھر شیوخ سے ملنے کا موقع نہ رہے اور افسوس کرنا پڑے کہ کاش میں شیخ سے یہ بات پوچھ لیتا، کاش میں ان سے استفادہ کر لیتا، مجھ سے تو فلاں چیز کی تحقیق رہ گئی، فلاں پیچیدہ مسئلے کو سمجھنا رہ گیا، شیخ سے پوچھتا تو وہ اس کی گرہوں کو چٹکیوں میں کھول دیتے!! کاش میں ان سے پوچھ لیتا؛ اور اس وقت افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ شیخ سے خوب استفادہ اسی وقت ممکن ہے جب طالبِ علم کے دل میں ان کی عقیدت و محبت روز افزوں ہو، ان کے ادب و احترام میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہو اور ساتھ ہی وہ نہایت حکمت کے ساتھ اِس بات پر بھی نظر رکھتا ہو کہ: آیا اس وقت شیخ سے مذاکرہ و مباحثہ مناسب ہے یا خاموش رہ کر ان کے فوائد و نصائح سننا بہتر ہے، ویسے فائدہ دونوں میں ہے، ان سب چیزوں سے طالبِ علم کے اندر حصولِ علم کی راہ میں صبر و تحمل اور برداشت کا مزاج پیدا ہوتا ہے؛ اگر استاذ و شاگرد کے درمیان پہلے دن سے محبت و انسیت نہ ہو اور روز بروز اس میں اضافہ نہ ہو رہا ہو تو نہ طالبِ علم استاذ سے کوئی استفادہ کر سکتا ہے اور نہ استاذ اس کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے، آگے حضرت ابنِ عباسؓ کا واقعہ پڑھیے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کی وجہ سے کیسا خیرِ عظیم نصیب ہوا۔

۲- استاذ کی رعایت میں خود کو مشقت میں ڈالے:

بیہقیؒ نے لسان الادب و حجۃ العرب امام اصمعیؒ سے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے: کہ جو ایک گھڑی حصولِ علم کی ذلت برداشت نہیں کرتا، اسے ہمیشہ جہالت کی ذلت جھیلنی پڑتی ہے[1]۔

(۱) المدخل الی علم السنن (۱۵۱۴) جو میری تحقیق سے شائع ہوا ہے

اور اس کے بعد اس کی عملی دلیل کے طور پر اسلاف کا ایک نمونہ پیش کیا ہے، وہ اپنی سند سے امام مالکؒ سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعودؒ کا شمار اکابر علماء میں ہوتا ہے، ابنِ شہاب زہری نے بھی ان کی خدمت کی ہے، یہاں تک کہ ان کو ضرورت کی چیزیں وہی اُٹھا کر دیتے تھے، امام مالکؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ابنِ شہاب زہری عبید اللہ بن عبد اللہ کی صحبت میں رہتے تھے اور ان کے لیے کنویں سے پانی بھی کھینچتے تھے، عبید اللہ کا مزاج یہ تھا کہ جب نماز شروع کرتے تو کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، کوئی ان کے لیے بیٹھا بھی ہوتا تو اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، انھیں جتنی لمبی نماز پڑھنی ہوتی اطمینان کے ساتھ پڑھتے اور جیسی نماز عام حالات میں پڑھتے ویسی ہی پڑھتے، کوئی کمی نہیں کرتے تھے، علی بن حسین زین العابدینؒ جو اشراف اور سادات میں سے تھے، وہ بھی عبید اللہ کے پاس آتے تو اسی طرح بیٹھے رہتے، عبید اللہ لمبی نماز پڑھتے اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرماتے، ان سے کہا بھی جاتا کہ: یہ علی بن حسین ہیں!! اور آپ ان کے مقام و مرتبہ سے بخوبی واقف ہیں! تو فرماتے کہ: اس علم کی طلب میں لگنے والے کو تھکن اور مشقتوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے[1]۔

آگے بیہقیؒ نے اپنی سند سے تین بڑے اسلاف کا یہ قول نقل کیا ہے: **"من رقّ وجهُه رقّ علمُه"**[2] جو شخص علم حاصل کرنے میں شرماتا ہے، اس کا علم کمزور رہتا ہے، پہلے ثوریؒ، پھر ابنِ عمرؓ، پھر حضرت عمرؓ سے اس کو نقل کیا ہے، بظاہر یہ جملہ حضرت عمرؓ کا ہے اور بعد والوں نے اسی کو دہرایا ہے۔

---

(۱) اسی قبیل کا ایک واقعہ پیچھے امام فخر رازیؒ کا بھی گزرا ہے، جس وقت طلبہ ان کے پاس "**المحصول**" پڑھنے کے لیے آئے تھے۔

(۲) المدخل (۴۰۶-۴۰۸)، اسے دارمی (۵۵۰) نے ابراہیم نخعی، عامر شعبی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔

خطیب بغدادیؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سری سقطیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: جس شخص کو یہ علم ہوگیا کہ وہ کس چیز کی طلب میں لگا ہوا ہے اس کے لیے ہر مشقت اُٹھانا آسان ہوگیا(۱)۔

اسلاف کے اس نوع کے واقعات بے شمار ہیں جو بتاتے ہیں کہ شیخ کے معمولات اور ان کی راحت وآرام کا خیال رکھنا اور ان سے علم حاصل کرنے کے لیے ادب اور صبر وتحمل سے کام لینا از حد ضروری ہے، ابنِ عبدالبرؒ نے اپنی ''جامع'' میں امام کبیر ابنِ جریج سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے ابنِ عطاء سے جو کچھ حاصل کیا وہ صرف اس وجہ سے ممکن ہوسکا کہ میں ان کے راحت وآرام کا بے حد خیال رکھتا تھا(۲)۔

بعض اسلاف کا دوسرا طرزِ عمل طلبہ کی سہولتوں کا خیال رکھنا:

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُوپر جو کچھ ہم نے بیان کیا سلف وخلف میں سے اکثر کا یہی حال تھا؛ البتہ بعض حضرات کا مزاج خود طلبہ کی رعایت کرنے کا تھا، درحقیقت اسلاف کو جیسے حکمت کا تقاضا محسوس ہوتا اسی کے مطابق کرتے تھے۔

طلبہ کی رعایت کے واقعات:

اس تعلق سے بھی کچھ واقعات ملاحظہ فرمائیں، خطیبؒ نے امام وکیع بن جراحؒ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ: وہ گرمی میں اونٹوں کے قیلولہ کے وقت سقاء قوم کے پاس جاتے اور انھیں حدیثیں سناتے تھے اور فرماتے کہ: یہ لوگ معاش میں لگے ہوئے ہیں، ان کے

(۱) الجامع (۷۸) وینظر منه (۳۸٤ فما بعده) کما ینظر من جامع ابن عبد البر (۸۳۹ فما بعده)

(۲) (٦٢٥) بیہقی نے بھی اس کو ''مناقب شافعی'' ۲:۱۵۱ میں روایت کیا ہے، ان کی سند میں طباعت کی غلطی ہے، جامع ابن عبدالبر سے ملا کر تصحیح کر لی جائے

لیے میرے پاس آ کر پڑھنا ممکن نہیں، یہ ان کی تواضع کی بات تھی(۱)۔

اس کے بعد خطیبؒ نے ولید بن عتبہ اشجعی دمشقی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ: وہ دمشق میں باب الجابیہ کی مسجد میں مصنفات ولید بن مسلم کی قرأت کرتے تھے، ایک شخص روزانہ لیٹ آتا، جس کی وجہ سے اس کی کچھ حدیثیں چھوٹ جاتی تھیں، جنھیں ولید اس کی رعایت میں پھر سے دہراتے، جب متعدد بار ایسا ہوا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ: میاں! تم روزانہ دیر سے کیوں آتے ہو؟ اگر آئندہ تم لوگوں کے ساتھ وقت پر نہیں آئے تو میں دوبارہ حدیثیں نہیں دہراؤں گا، وہ شخص کہنے لگا کہ: جی میں بال بچوں والا آدمی ہوں، بیت لہیا (غوطہ دمشق) میں میری ایک دکان ہے، میں صبح اس کا سامان خرید کر لاتا ہوں اور پھر دکان بند کر کے دوڑتے ہوئے یہاں پہنچتا ہوں، اگر میں صبح سامان نہ خریدوں تو بعد میں ملنا مشکل ہو جائے گا، ولید نے کہا: ٹھیک ہے، پھر آئندہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں، اس کے بعد ولید خود روزانہ بیت لہیا جاتے اور اس شخص کی دکان پر بیٹھ کر اس کے سامنے مجلس کی ساری حدیثیں دہراتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان پاکیزہ نفوس سے راضی ہو، بلاشبہ یہ اخلاقِ محمدیہؐ کے حامل تھے۔

۳- طالبِ علم اپنے شیخ کے رنگ میں رنگ جائے:

اساتذہ کی صحبت کے طویل سفر میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شروع شروع میں طالبِ علم کو بہ تکلف ان کی نصیحت اور ہدایات کی اتباع کرنی پڑتی ہے؛ پر جلد ہی وہ بہ شوق ورغبت ان کی اطاعت کرنے لگتا ہے اور دل سے ان کا تابع ہو جاتا ہے۔

امام غزالیؒ طالبِ علم کا تیسرا ادب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: طالبِ علم اپنی لگام مکمل طور پر ہر چیز میں اپنے استاذ کے سپرد کر دے اور ان کی نصیحتوں پر اس طرح عمل کرے، جیسے ایک جاہل مریض؛ مشفق اور حاذق ڈاکٹر کی نصیحتوں پر عمل کرتا ہے، وہ استاذ

الجامع (۳۶۳)

کے سامنے اپنے آپ کو بچھا دے اور ان کی خدمت کر کے خوب سعادت اور ثواب حاصل کرے...... یقیناً یہ علم تواضع اور کامل توجہ سے ہی حاصل ہوتا ہے، طالبِ علم کو استاذ کے لیے اس نرم زمین کی طرح ہونا چاہیے جس پر خوب بارش ہوئی ہو اور اس کے تمام اجزاء نے پانی کو جذب کرلیا ہو اور مکمل طور پر اس بارش کو قبول کرلیا ہو، اس کو اس کے استاذ طریقۂ علم کے سلسلے میں جو بھی مشورہ دیں اسے بخوشی مان لے اور اپنی رائے چھوڑ دے؛ اس کے مرشد کی غلطی اس کے لیے اپنی درست رائے سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگی (۱)۔

امام غزالیؒ نے اسی سلسلے میں یہ بات بھی کہی ہے کہ: طالبِ علم یا سالک ایسے شیخ کی صحبت اختیار کرے، جو باطنی امراض پر مطلع ہو اور خفیہ آفتوں کو جانتا ہو اور ان کو اپنی ذات کے سلسلے میں حَکَم بنالے اور اپنی محنت اور مجاہدے میں اس کے مشوروں کے تابع رہے، یہی حال مرید کا بھی ہونا چاہیے اور طالبِ علم کا بھی (۲)۔

امام ماوردیؒ نے اپنی کتاب **"أدب الدنيا والدين"** میں جو قیمتی نصیحتیں کی ہیں من جملہ ان میں یہ بھی ہے کہ: اساتذہ جن عمدہ اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ ہوں طالبِ علم بھی ان کو اپنانے کی فکر کرے اور ان کے ہر ہر فعل کی نقل کرے؛ تاکہ اس کے دل میں اپنے اساتذہ کی محبت پیدا ہو اور وہ ان کے پاکیزہ اخلاق وکردار پر پروان چڑھے اور بُرے اخلاق سے محفوظ رہے (۳)۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے **"و من تشبه بقوم فهو منهم"** جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انھیں میں شمار ہوتا ہے۔

(۱) الاحیاء ۱: ۵۰

(۲) الاحياء: كتاب رياضة النفس- بيان الطريق الذي يعرف به الإنسان عيوب نفسه (۳: ٦٤)

(۳) ادب الدنیا والدین ص ۱۱۳

(۲)علم کا ادب:

ہنسی مذاق سے پرہیز:

خطیب بغدادی نے حضرت علیؓ سے سند کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جب تم لوگ علم حاصل کرو تو اس کی حفاظت کرو، ہنسی مذاق اور غلط باتیں مت کرو؛ ورنہ قلوب اس علم سے اباء کرنے لگیں گے(۱)۔

ہشام دستوائی نے ایک شخص کو مجلس حدیث میں ہنستے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ: تم حدیث کے طالبِ علم ہو کر ہنس رہے ہو؟! سفیان نے (معلوم نہیں یہ ثوری ہیں یا ابنِ عیینہ) بیت اللہ کے پاس ایک طالبِ علم کو بنی شیبہ کے ایک آدمی کے ساتھ دل لگی کرتے اور مسکراتے دیکھا، تو فرمایا کہ: تم اس جگہ مسکرا رہے ہو! پہلے آدمی ایک حدیث سن لیتا تھا تو تین دن تک اس کے اخلاق وکردار میں اس کا اثر نظر آتا تھا۔

''الآداب الشرعیہ''(۲) میں امام ترمذیؒ اور ابنِ ماجہؒ کے شیخ ابوجعفر احمد بن بدیل یامیؒ (متوفی ۲۵۸ھ) سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جس وقت ہم لوگ حدیثیں لکھتے تھے تو مجھے یاد ہے کہ پورے مجمع میں صرف قلم کی آواز سنائی دیتی تھی یا پھر رونے کی!۔

ابنِ مبارکؒ نے عبدالاعلیٰ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جس شخص کا علم اسے رونے والا نہ بنائے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ اسے علم نافع نہیں ملا؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی صفت بیان کی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَى عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿١٠٧﴾ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿١٠٨﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ﴿١٠٩﴾﴾ (الاسراء) (جن لوگوں کو قرآن

(۱) الجامع (۲۱۳-۲۱۷)

(۲) لابن مفلح رحمه الله ۱:۱۶۲

سے علم دیا گیا تھا یہ قرآن جب ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں کے بَل گرتے ہیں روتے ہوئے اور یہ قرآن ان کا خشوع اور بڑھا دیتا ہے)(۱)۔

سب سے اہم ادب:

علم کا سب سے اہم ادب یہ ہے کہ طالبِ علم اس پر عمل کرے، اس کے اخلاق سے آراستہ ہو اور اپنے اندر اہلِ علم کی صفات اور خوبیاں پیدا کرے۔

خطیب بغدادیؒ نے امام ابراہیم حربیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ: آدمی جب بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے کوئی ادب سنے تو اس کو مضبوطی سے تھام لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے، نیز حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ: پہلے آدمی علم سیکھتا تھا تو جلد ہی اس کا اثر اس کی عاجزی، اس کی سیرت اس کی زبان، اس کی نگاہ اور اس کے ہاتھوں پر نظر آنے لگتا تھا۔

خطیب بغدادیؒ نے ابوعصمہ بیہقی سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک رات امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں ٹھہرا تو انھوں نے پانی لاکر میرے پاس رکھا، جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ پانی جوں کا توں رکھا ہے، کہنے لگے: سبحان اللہ! ایک آدمی علم سیکھتا ہے اور اس کا رات میں اُٹھنے کا کوئی معمول نہیں!(۲)۔

عقبہ نے ابوعمرو محمد بن ابوجعفر احمد بن حمدان سے روایت کیا ہے، وہ اپنے والد ابوجعفر (فی حدود ۲۴۰-۳۱۱) سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک روز ابوعبداللہ مروزی کی مجلس میں تھا - غالباً ان کی مراد امام محمد بن نصر مروزیؒ (۲۰۲-۲۹۴ھ) ہیں- اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا، ابوعبداللہ نے اذان دی اور میں وضو کے لیے مسجد سے نکلا،

(۱) الزہد (۱۲۵) ان ہی سے قاسم بن سلام نے ''فضائل القرآن'' ص ۶۶ میں روایت کیا ہے، یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ (۳۶۵۰۸) میں بھی ہے۔

(۲) الجامع (۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۲)

ابوعبداللہ کہنے لگے: ابوجعفر! کہاں جارہے ہو؟ میں نے کہا: وضو کرنے، کہنے لگے: میرا گمان تو تمہارے بارے میں کچھ اور تھا، نماز کا وقت آ گیا اور اب تک تم بغیر وضو کے ہو!!۔

میں اِس دَور کے مربی حضرات کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں: داعیٔ کبیر شیخ ڈاکٹر محمد عوضؒ جو مربی کبیر شیخ عبدالکریم رفاعیؒ کے سب سے بڑے شاگرد تھے، انھوں نے خود مجھے یہ واقعہ سنایا کہ: ایک مرتبہ انھوں نے مسجد میں چاشت کی نماز پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد فوراً اُٹھ کر چل دیے، ان کے شیخ (عبدالکریم رفاعیؒ) پیچھے سے انھیں دیکھ رہے تھے، آواز دے کر کہنے لگے کہ: شیخ محمد! ایسا لگتا ہے تم اپنے رب سے بے نیاز ہوئے ہو؟ شاگرد نے گھبرا کر پوچھا: حضور! میں کچھ سمجھا نہیں؟ فرمایا کہ: تم سلام کے فوراً چل دیتے ہو اور اللہ سے کچھ مانگتے نہیں!!۔

علمائے ربانیین اسی طرح اپنے شاگردوں کی نگرانی کیا کرتے ہیں، اب بتایئے کہ وہ شخص جسے ان علمائے ربانیین سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہا ہو، اور نہ ان سے کچھ حاصل کیا ہو، اسے یہ ہدایات اور رہنمائیاں کہاں سے مل سکتی ہیں، وہ ایسی نگرانی کہاں سے پاسکتا ہے اور جب نہیں پاسکتا تو اسے عمدہ صفات اور خوبیوں میں ترقی کیسے نصیب ہوسکتی ہے!!۔

اور پھر تربیت کے راستے کی یہ ترقیات اس شخص کو کہاں سے نصیب ہوسکتی ہیں جو سرے سے شیوخ ہی سے علم حاصل نہیں کرتا، اور اس شخص کو کہاں سے نصیب ہوسکتی ہیں جو محض جامعات میں داخلہ لے کر ڈگریاں حاصل کرلیتا ہے، نہ پابندی نہ شیوخ کی ملازمت، نہ علمی بحث ومباحثہ؟! اور پھر ان ترقیات کی بُو بھی اس شخص کو کیسے مل سکتی ہے جو آن لائن جامعات میں محض برقی آلات کی اسکرینوں کے پیچھے اپنے استاذ سے کہیں دُور بیٹھ کر تعلیم حاصل کرلیتا ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں پالیتا ہے (جو صرف نام اور لقب کی ڈگریاں ہوتی ہیں حقیقت سے ان کا دُور دُور تک واسطہ نہیں ہوتا)؟!!۔

والأجوبة عند المسئول لا السائل.

(۳) کتابوں کا ادب:

باوضو کتابوں کو چھونا:

ہمارے علماء کے یہاں علم کا ایک حسنِ ادب یہ بھی ہے کہ استاذ تو استاذ طالبِ علم بھی علم میں مشغولیت کے وقت باوضو رہے، خواہ درسگاہ میں حاضری کا موقع ہو یا کسی کتاب کے مطالعہ کی مشغولیت ہو، اس تعلق سے اسلاف کے متعدد واقعات ہیں، میں چند ایک پر اکتفا کرتا ہوں: ع

۱- امام ابنِ رشیدؒ نے ابوذر ہروی کے تذکرے میں لکھا ہے- جو امام بخاریؒ کے شاگرد محمد بن یوسف فربری سے صحیح بخاری کے راوی ہیں- کہ ابو اسماعیل ہروی انصاری نے ان سے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی "صفة حجة النبي" والی طویل حدیث کے سلسلے میں ایک مستقل جزء پڑھا تھا، ابو اسماعیل کہتے ہیں کہ: میں نے وہ جزء ان کی طرف بڑھانا چاہا، تو وہ کہنے لگے: اس کو رکھ دو، ابھی میں باوضو نہیں ہوں۔ اور چھونے سے انکار کر دیا[1]۔

۲- حافظ ابنِ عساکرؒ[2] نے امام ابوعثمان صابونی کے تذکرے میں خود انھیں سے نقل کیا ہے کہ: میں کتابوں کے کمرے میں ہمیشہ باوضو داخل ہوا، میں نے بغیر وضو کے نہ کبھی کوئی حدیث بیان کی، نہ کوئی مجلس لگائی، نہ کبھی تدریس کے لیے بیٹھا۔

برہان زرنوجیؒ کہتے ہیں کہ: علم کی تعظیم میں کتابوں کا احترام بھی داخل ہے، طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ کسی بھی کتاب کو بغیر وضو کے نہ چھوئے، امام شمس الائمہ حلوانیؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: مجھے یہ علم تعظیم اور احترام کی بنیاد پر ہی ملا، میں نے کبھی کسی کاغذ کو بغیر وضو کے نہیں چھوا، امام شمس الائمہ سرخسیؒ کو ایک رات پیٹ میں تکلیف تھی اور وہ کتاب

---

(۱) افادة النصيح ص ۴۱

(۲) اپنی تاریخ ۹:۹ میں

دہرار ہے تھے، اس رات انھوں نے سترہ مرتبہ وضو کیا؛ کیونکہ ان کا معمول باوضو کتاب دہرانے کا تھا؛ اس لیے کہ علم ایک نُور ہے اور وضو بھی ایک نُور ہے پس وضو کا نُور علم کے نُور میں اضافہ کا سبب بنے گا(۱)۔

کتاب کے ضروری آداب میں سے یہ بھی ہے کہ طالبِ علم کبھی کسی کتاب کی طرف پیر نہ پھیلائے، تفسیر کی کتاب کو ہمیشہ تمام کتابوں سے اُوپر رکھے اور کتابوں پر کوئی دوسری چیز مثلاً دوات وغیرہ نہ رکھے۔

بات سے بات نکلتی ہے، امام سرخسیؒ کے واقعہ پر یاد آیا کہ شافعیؒ کے مسلک کے بڑے امام ابوالقاسم رافعیؒ نے اپنی کتاب **"التدوين في أخبار قزوين"**(۲) میں امام ابوالحسن علی بن ابراہیم القطانؒ (۲۵۴-۳۴۵ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے، جو امام ابنِ ماجہ سے سنن ابنِ ماجہ کے راوی ہیں کہ: ایک دفعہ ان کو پیٹ کی بیماری لاحق ہوئی، تو انھوں نے ایک دن میں نو سے زائد مرتبہ وضو کیا اور فرمایا کہ: میں ملک الموت سے وضو کی حالت میں ہی ملنا چاہتا ہوں، ان کے تذکرے میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ایک دفعہ انھوں نے کوئی دوا پی، جس کی وجہ سے انھیں تیس سے زائد مرتبہ بیت الخلاء جانا پڑا؛ لیکن ہر مرتبہ انھوں نے قضائے حاجت کے بعد وضو کیا۔

ابنِ عبدالبرؒ نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' میں اس ادب پر ایک مستقل باب باندھا ہے: **"باب ذكر بعض من كان لايتحدث عن رسول الله صلّى الله عليه وسلم إلا وهو علىٰ وضوء"** (ان محدثین کا تذکرہ جو ہمیشہ باوضو حدیث بیان کرنے کا اہتمام کرتے تھے) اور اس کے تحت متعدد آثار ذکر کیے ہیں(۱) خطیب نے بھی اپنی ''جامع'' میں ایک باب باندھا ہے: **"يستحب للقارئ أن يقرأ من أصل**

(۱) **تعليم المتعلم** ص۵۱

(۲) ۳:۳۲۱

المحدث وأن لايمسه إلا على طهارة" قاری کے لیے مستحب ہے کہ وہ حدیث کی قرأت شیخ کی کتاب سے ہی کرے اوراس کا اہتمام کرے کہ وہ کتاب کو بغیر وضو کے نہ چھوئے اور اس کے تحت حضرت قتادہؒ -تابعی- اور فضل بن موسیٰ سینانیؒ - تبع تابعی- کے آثار ذکر کیے ہیں، جن میں یہی مضمون (باوضوحدیث بیان کرنے کا) پایا جاتا ہے[۲]، یہ دونوں اثر ابنِ عبدالبرؒ نے بھی ذکر کیے ہیں، ان میں سے بالخصوص حضرت قتادہؒ کا اثر نہایت اہم ہے؛ وہ تابعین میں سے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: یہ بات مستحب سمجھی جاتی تھی کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث باوضوہی پڑھی جائیں۔

سمعانیؒ نے بھی فضل بن موسیٰؒ کا یہ اثر ذکر کیا ہے اور امام مالکؒ سے متعلق بھی اس قسم کے متعدد آثار ذکر کیے ہیں[۳]۔

راقم الحروف کے ساتھ پیش آئے دو عجیب وغریب واقعات:

کتاب کے ادب کے تعلق سے میرے ساتھ بھی ایک معاملہ پیش آیا، جس کا پہلا حصہ تو نہایت عمدہ ہے اور بیان کرنے کو دل چاہتا ہے؛ لیکن دوسرا حصہ انتہائی دلسوز اور تکلیف دہ ہے اور دل نہیں چاہتا کہ اس کو ذکر کیا جائے اور ان صفحات میں لکھ کر اس کو دوام عطا کیا جائے؛ لیکن بہرحال مجھے اس کو بیان کرنا ہے؛ کیونکہ اس واقعہ کے ذریعہ میں ایک دوسری اہم چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، جس سے اُمید ہے کہ قارئین کو فائدہ ہوگا۔

میں طالبِ علمی کے زمانے میں -ویسے تو الحمدللہ اب بھی طالبِ علم ہی ہوں- ایک مرتبہ مدرسہ شعبانیہ حلب کے صحن میں تھا، میرے پاس ایک کتاب تھی، جسے میں بائیں ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، اتنے میں استاذ محترم فقیہ شافعی، امام نحو، مختلف علوم کے ماہر، عمدہ ذوق اور نادر علمی

(۱)(۲۳۹۷-۲۳۹۰)

(۲)۱:۴۶۶

(۳) ادب الاملاء (۱۲۰-۱۲۳)

ملکہ کے حامل شیخ احمد قلاش جن کی وفات مدینہ منورہ میں بعمر سو سال (۱۳۲۸-۱۴۲۸ھ) ہوئی (**تغمده الله برحمته**) میرے پاس آئے اور کتاب میرے بائیں ہاتھ سے لے کر دائیں ہاتھ میں تھما دی اور فرمایا: **اللّٰهم آتني كتابي بيميني** اے اللہ! مجھے میری کتاب اور میرا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں عطا فرما۔

اس واقعہ کے کچھ ہی عرصے کے بعد ایک دوسرا واقعہ پیش آیا، میں جامعہ دمشق میں کلیۃ الشریعہ کا طالب علم تھا، سال اوّل کا اخیر چل رہا تھا، ہم فقہ کے تقریری امتحان کے لیے انتظار میں کھڑے تھے، امام سمرقندیؒ کی کتاب "**تحفة الفقهاء**" کا امتحان دینا تھا، ایک طالبِ علم کے لیے انتظار دشوار ہو گیا اور وہ کھڑے کھڑے تھک گیا، تو اس نے ہال کی ایک سیڑھی پر بیٹھنا چاہا؛ لیکن فطری طور پر وہ غبار آلود تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ طالبِ علم سیاہ پینٹ پہنے ہوئے تھا، جس پر غبار لگتا تو اور بھی زیادہ صاف نظر آتا، تو اس طالبِ علم نے یہ کیا کہ امام سمرقندی کی وہی کتاب "**تحفة الفقهاء**" سیڑھی پر رکھی اور اسی پر بیٹھ گیا!!۔

بخدا! مجھے یہ واقعہ لکھتے ہوئے بہت تکلیف ہو رہی ہے؛ میں نے صرف اس لیے لکھا تا کہ آپ کے سامنے ایک زندہ اور حقیقی مثال آجائے کہ دونوں منظر ناموں میں کس قدر فرق ہے: ایک طرف ان علمائے عاملین کی تربیت کا نمونہ ہے جن کے اندر خود بھی سنتوں پر عمل کرنے کی تڑپ تھی اور وہ اپنے عزیز طلبہ کو بھی عملی طور پر ان سنتوں کی تلقین کرنے کے حریص رہتے تھے، حتیٰ کہ کتاب کو دائیں یا بائیں ہاتھ میں لینے جیسے معمولی اُمور میں بھی۔ اور دوسری طرف جامعات کی گُونگی اور بہری عمارتوں میں تعلیم کا ایک نمونہ آپ کے سامنے ہے۔

شرعی جامعات میں اب جو اس قسم کے کچھ اساتذہ رہ گئے ہیں، جن کا ''مسجد والے'' علمائے عاملین سے ربط اور تعلق ہے، ان کے لیے طلبہ کے ساتھ اس قسم کے آداب برتنا مشکل ہو گیا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ طلبہ اب ان چیزوں سے بہت دُور ہو چکے ہیں، یا پھر

’’جامعات کی عمارتوں‘‘ کی رعایت میں جو اس علمی روح سے نا آشنا ہیں؛ لیکن اگر صورتِ حال یہی رہی تو ان بچے کچے حضرات کے چلے جانے کے بعد ان نورانی معالم کو مکمل طور پر ختم اور نابود کر دیا جائے گا، **فإلى الله المشتكىٰ وإنا لله وإنا إليه راجعون.**

آمدم برسرِ مطلب:

(استاذ، علم اور کتابوں کے ادب پر گفتگو کے بعد اب) میں پھر سے اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں کہ طالبِ علم کی کامیابی وکامرانی کے لیے ادب کی رعایت بے حد اہم ہے:

ما فاز من فاز إلا بالأدب:

ہمارے مربی حضرات کی زبانوں پر یہ جملہ عام تھا: **ما فاز من فاز إلا بالأدب وما سقط من سقط إلا بسوء الأدب** کہ جو بھی کامیاب ہوا وہ ادب سے ہی کامیاب ہوا اور جو بھی نا کام ہوا وہ بے ادبی سے ہی نا کام ہوا۔

اسی مفہوم کو برہان زرنوجیؒ نے اس طرح تعبیر کیا ہے: **ما وصل من وصل إلا بالحرمة وما سقط من سقط إلا بترك الحرمة**[۱] جو بھی بلندی پر پہنچا وہ ادب واحترام کی وجہ سے ہی پہنچا اور جو بھی گرا وہ ادب واحترام نہ کرنے کی وجہ سے ہی گرا، پھر انھوں نے اس سلسلے میں متعدد واقعات لکھے ہیں، جن کا ہر طالبِ علم کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے؛ نیز ابنِ جماعہ کی **"تذكرة السامع والمتكلم"** اور خطیب بغدادیؒ کی **"الجامع لآداب الراوي وأخلاق السامع"** اسی طرح علومِ حدیث کی کتابوں میں طالبِ علم اور محدث کے آداب کے عنوان کے تحت جو باتیں لکھی گئی ہیں ان سب کا بھی ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمیں ہر خیر کی توفیق عطا فرمائیں۔

(۱) **تعليم المتعلم** ص۴۶

ما سقط من سقط إلا بسوء الأدب کی دلیل:

جہاں تک دوسرے جملہ کی بات ہے (کہ جو بھی ناکام ہوا وہ بے ادبی کی وجہ سے ہی ناکام ہوا) تو اس کی سب سے بڑی دلیل ابلیس کا وہ رویہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سجدے کا حکم دیے جانے کے وقت اختیار کیا تھا، جس کے نتیجے میں اسے رسوائی اور ابدی لعنت کا شکار ہونا پڑا۔

ما فاز من فاز إلا بالأدب کی دلیل:

پہلے جملہ کی دلیل حضرت ابنِ عباسؓ کا غایت درجے کا ادب واحترام ہے، جس کا واقعہ مشہور ہے، جو اجمالی طور پر صحیح بخاری میں خود ان ہی سے منقول ہے[1] کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء میں داخل ہوئے، تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وضو کا پانی لاکر رکھا، اس روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہؓ کے پاس تھے، جب آپ باہر نکلے اور آپ نے پانی دیکھا تو دریافت فرمایا: یہ کس نے رکھا ہے؟ حضرت میمونہؓ نے فرمایا: ابنِ عباسؓ نے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سینے سے چمٹا لیا اور ان کے لیے دعا فرمائی: **اللّٰهم فقّهه في الدين** اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما۔ ایک روایت میں: **اللّٰهم علّمه الحكمة** کے الفاظ ہیں، اور ایک روایت میں: **اللّٰهم علمه الكتاب** کے الفاظ ہیں، اور ابنِ ابی شیبہ کی روایت میں ہے[2]: **اللّٰهم فقهه في الدين وعلّمه التأويل**۔ (ان تمام روایتوں کی تخریج مصنّف میں دیکھیے)۔

ایک دوسری روایت میں ہے جسے ابنِ ابی شیبہ نے مختصراً اور امام احمدؒ نے مطولاً ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے[3] (الفاظ امام احمدؒ کے ہیں) وہ فرماتے ہیں کہ: میں نبی کریم

(۱) صحیح بخاری (۷۵، ۱۴۳، ۳۷۵۶، ۷۲۷۰) (۲) (۳۲۸۸۷)

(۳) مصنف ابن ابی شیبہ (۳۲۸۸۵) مسند احمد ۱: ۳۳۰

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات کے آخری حصہ میں آیا اور آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا، آپ نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر میں کھینچ لیا، جب آپ نماز میں مشغول ہوئے تو میں پھر پیچھے ہو گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا کہ: کیا بات ہے میں تمھیں اپنے برابر کھڑا کرتا ہوں اور تم پیچھے ہو جاتے ہو؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا کسی کے لیے مناسب ہے کہ وہ آپ کے برابر میں نماز پڑھے جبکہ آپ اللہ کے رسول ہیں؟ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا یہ جواب بہت پسند آیا اور آپ نے میرے لیے علم اور فہم میں اضافہ کی دعا فرمائی۔

یہ دونوں الگ الگ واقعے ہیں: ایک وضو کے لیے پانی رکھنے والا واقعہ اور ایک رات کی نماز میں پیچھے ہٹ جانے والا واقعہ، یہ واقعہ اس واقعہ سے الگ ہے جس میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رات گزاری اور رات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ کے بائیں جانب کھڑے ہوئے۔

ترمذی اور نسائی نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے[1] کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے دو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے حکمت کی دعا فرمائی، وہ دو موقعے وہی ہیں جو اُوپر ذکر کیے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا سبب بھی ان واقعات میں واضح طور پر موجود ہے[2] کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ ان کی خدمت کی وجہ سے اور دوسری مرتبہ نبوت کے مقام کا ادب واحترام کرنے کی وجہ سے ان کے لیے دعا فرمائی اور خدمت بھی حقیقت میں ادب ہی کا ایک حصہ ہے۔

---

(۱) ترمذی (۳۸۲۳) نسائی (۸۱۷۸)

(۲) یہ فتح الباری: ۱/۱۷۰ (۷۵) میں حافظ کی اس تشریح سے بہتر ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ: شاید یہ اسی رات کا واقعہ ہے جس میں انھوں نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے یہاں رات گزاری تھی الخ؛ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں واقعے ایک ہی ہیں، جبکہ دونوں واقعے الگ الگ ہیں۔

اسی دعا کی برکت تھی کہ وہ بڑی عمر اور بڑے مرتبہ والے صحابہؓ کے درمیان انتہائی بلند مقام پر پہنچ گئے، یہاں تک کہ حضرت ابنِ مسعودؓ ان کے بارے میں فرماتے تھے کہ: اگر ابنِ عباسؓ ہم لوگوں کی عمر کو پہنچ جاتے تو ہم میں سے کوئی بھی ان کے علم کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچ پاتا، وہ یہ بھی فرماتے تھے: **نعم ترجمان القرآن ابن عباس**، ابنِ عباسؓ قرآن کے بہترین ترجمان ہیں، ان کی وفات کے دن ابن الحنفیہ نے فرمایا کہ: آج عالم ربانی کا انتقال ہوگیا[۱]۔ حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے تھے کہ: وہ قرآن کے سب سے بڑے عالم ہیں[۲]۔ ان کو صحابۂ کرامؓ نے "**حبر الأمة**" اور "**ترجمان القرآن**" کا لقب دیا تھا۔

غرض اس پوری تفصیل سے وہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی، جو پیچھے کہی گئی: کہ جو بھی کامیاب ہوا وہ ادب کی وجہ سے ہی کامیاب ہوا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

---

(۱) رواہ ابن ابی شیبہ (۳۲۸۸۲-۳۲۸۸۴)

(۲) رواه أبوزرعة الدمشقي في "تاريخه" (۱۷۵۸)

بارہویں مشعل

حصولِ علم پر استقامت اور اپنے اندر کمزوری نہ آنے دینا

(الف): حصولِ علم پر جمے رہنا تا آں کہ اللہ تعالیٰ راہیں کھول دیں:

طالبِ علم سے ایک بات تو بطور نصیحت کہی جاتی ہے کہ وہ حصولِ علم کے دوران آنے والے سخت حالات پر صبر سے کام لے اور جما رہے، جلد ہی اللہ تعالیٰ اس کے لیے کشادگی فرما دیں گے اور اس کی پریشانی دُور فرما دیں گے، طالبِ علم کو یہ شعر ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے:

أخلِقْ بذي الصبر أن يحظى بحاجته

ومُـدْمِن القـرع للأبـواب أن يلجـا

صبر کرنے والا اور جمنے والا ضرور اپنی حاجت کو پا کر رہے گا، دروازے کو مسلسل کھٹکھٹانے والا ایک نہ ایک دن اس میں داخل ہو کر رہتا ہے [1]۔

خطیب نے کوفہ کے علومِ عربیہ کے امام احمد بن یحییٰ شیبانیؒ (۲۰۰-۲۹۱ھ) سے نقل کیا ہے، جو ''ثعلب'' کے نام سے مشہور ہیں اور حفاظ اور ثقات میں سے ہیں، وہ فضل بن

(۱) یہ ان چار اشعار میں سے ہے جنھیں صفدی نے ''الوافي للوفيات'' (۲/۲۵۲) محمد بن بشیر حمیری بصری کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ دوسروں نے ان کے والد کا نام ''یسیر'' بتایا ہے، دیکھیے: ''الأعلام'' اور اس کے ذکر کردہ حوالوں میں ''محمد بن یسیر'' کا ترجمہ۔

سعید بن سالم نامی اپنے ایک استاذ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ: ایک شخص علم سیکھ رہا تھا؛ لیکن سیکھ نہیں پا رہا تھا، تو اس نے چھوڑنے کا تہیہ کر لیا اور وہاں سے چل پڑا، راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ پہاڑ کی ایک چوٹی سے پانی بہتا ہوا ایک چٹان پر گر رہا ہے، جس سے اس چٹان میں گڑھا پڑ گیا ہے، وہ شخص کہنے لگا: پانی جیسی لطیف چیز نے چٹان جیسی بھاری اور سخت چیز میں اثر کر دیا، بخدا! میں بھی علم حاصل کر کے رہوں گا، اور اس کے بعد وہ پھر سے حصولِ علم میں لگ گیا اور بڑا مقام پایا(۱)۔

خطیب نے ''جامع'' میں اس واقعہ سے پہلے اور اس واقعہ کے بعد امام ابوالقاسم کے دو اقوال ذکر کیے ہیں: پہلا قول: جس کسی نے بھی کسی بھی چیز کو محنت اور صدق دل سے حاصل کرنے کی کوشش کی، اسے پا ہی لیا، اگر مکمل نہیں پایا تو کچھ حصہ ضرور پایا، دوسرا قول: ہر عمدہ اور جلیل القدر علم کی کنجی محنت اور جدوجہد ہے، اس کے بعد خطیبؒ نے صاحب ''مسند'' امام کبیر ابویعلی موصولی سے اپنی سند کے ساتھ چار اشعار نقل کیے ہیں، جن میں آخری اشعار یہ ہیں:

إني رأيت –وفي الأيام تجربة– ❖ للصبر عاقبةً محمودةَ الأثر

وقلّ من جد في أمر يطالبه ❖ واستصحب الصبرَ إلا فاز بالظفر

(میں نے زمانے کے مختلف تجربات کے درمیان صبر کا انجام ہمیشہ بہتر اور اچھے اثرات لیے ہوئے دیکھا۔ جس کسی نے بھی کسی چیز کو حاصل کرنے میں محنت کی اور صبر و استقامت سے کام لیا تو وہ کامیاب ہو کر ہی رہا)

ہم نے طالبِ علمی کے آغاز میں اپنے اساتذہ سے یہ اشعار یاد کیے تھے:

أطلب العلم ولا تضجرن ❖ فآفة الطالب أن يضجرا

(علم حاصل کرو اور پریشان مت ہو، یہ طالبِ علم کے لیے بڑی آفت ہے کہ وہ پریشان ہو کر بیٹھ جائے۔)

(۱) الجامع (۱۵۹۵)

ألــم تــر الحبــلَ بتكــراره ❖ في الصـخرة الصمّاء قد أثّرا

(کیا تم نہیں دیکھتے کہ رَسّی بار بار رگڑے جانے سے سخت چٹان میں بھی گڑھا کر دیتی ہے)

(ب): طلبِ علم میں کمزوری نہ آنے دینا:

دوسری بات جو طالبِ علم سے کہی جاتی ہے وہ ضروری درجہ کی ہے کہ وہ بلند ہمتی اور تسلسل کے ساتھ برابر علم کے حصول میں لگا رہے، درمیان میں کسی قسم کی کوتاہی اور وقفہ نہ آنے دے؛ کیونکہ بہت سی مرتبہ عارضی طور پر وقفہ آجانے سے صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ حصولِ علم میں کچھ تاخیر ہوجائے یا اگلے درجے میں ترقی نہ ہو پائے؛ بلکہ اس کا انجام پڑھائی چھوڑ دینے تک پہنچ جاتا ہے۔

میں اپنے عزیز طلبہ کو وہ قیمتی جملہ یاد دلانا چاہتا ہوں جو امام بخاریؒ نے اپنے کاتب سے فرمایا تھا: **لا أعلم شيئًا أنفع للحفظ من نَهمة الرجل ومداومة النظر**(۱) کہ حافظہ کے لیے میرے نزدیک علمی پیاس اور دائمی نظر و مطالعہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

زرنوجیؒ کہتے ہیں کہ: حصولِ علم کے درمیان کوئی وقفہ نہیں آنا چاہیے؛ کیونکہ یہ ایک آفت ہے، ہمارے استاذ شیخ امام برہان الدین مرغینانیؒ صاحبِ ''ہدایہ'' کہا کرتے تھے کہ: میں اپنے ساتھیوں سے آگے نکلنے میں اس لیے کامیاب ہوا کہ میں نے حصولِ علم کے درمیان کبھی وقفہ اور انقطاع نہیں آنے دیا(۲)۔

بہت سی مرتبہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لمبی چھٹیوں مثلاً گرمی کی تعطیلات میں طالبِ علم کوئی دنیوی کام شروع کرتا ہے، جس کی وجہ سے پہلے تو عارضی طور پر کچھ وقفہ آتا ہے، پھر یہی سلسلہ

(۱) ص ۹۰-۹۱

(۲) **تعليم المتعلم** ص ۸۰

دراز ہوکر بالکلیہ پڑھائی سے انقطاع کا سبب بن جاتا ہے؛ اسی لیے طالبِ علم- یا طالبِ علم کے گھر والوں کو- اس طرح کے موانع سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

فراغت کے بعد اپنے آپ کو علمی موانع سے بچانا:

جب گفتگو ان موانع کی چل پڑی ہے جو طلبہ کو حصولِ علم کی راہ سے ہٹاتے ہیں، تو میں چاہتا ہوں کہ بعض ان موانع کا بھی ذکر کردوں جو فضلاء کے لیے علمی لائن سے دُور ہونے کا سبب بنتے ہیں، جو رسمی طالبِ علمی سے فارغ ہوکر تدریس کے مرحلہ میں پہنچ جاتے ہیں؛ لیکن وہ کسی انتظامی کام میں ایسے لگ جاتے ہیں کہ پھر دھیرے دھیرے درس وتدریس سے بالکلیہ انقطاع ہوجاتا ہے، اس طرح کے لوگ بہت ہیں، ضرورت ہے کہ ان کا موازنہ کیا جائے اور تلافی کی صورتیں اختیار کی جائیں۔

علمی لائن چھوڑ دینے والوں کی تعداد درس وتدریس میں مستقل لگے رہنے والوں کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ رہی ہے، زمانہ اس پر شاہد عدل ہے؛ لیکن ان چھوڑنے والوں کے تذکرے اس لیے نہیں ہوتے کہ علمی لائن ترک کرنے والے ان کے واقعات پر تکیہ کرکے ان کو اپنے لیے تسلی کا سامان بنالیں؛ بلکہ ان سے عبرت حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔

امام بخاریؒ کے استاذ شعیب بن حربؒ فرماتے ہیں کہ: ہم لوگ جس وقت حدیث پڑھتے تھے تو چار ہزار تھے؛ لیکن ان میں سے چار ہی کچھ بن پائے[1]۔

اس کے بعد خطیب نے امام شعبہ بن حجاجؒ سے روایت کیا ہے کہ: ایک دن وہ اپنے گھر سے نکلے اور اپنے گھر کے دروازے پر موجود حدیث کے طلبہ پر ایک نظر ڈالی اور پھر صاحبِ ''مسند'' امام ابوداؤد طیالسیؒ کے کاندے پر ہاتھ رکھ کر فرمانے لگے: سلیمان! کیا خیال ہے، یہ سب محدث بن کر نکلیں گے؟ میں نے کہا: نہیں! انھوں نے فرمایا: بالکل صحیح کہا،

(۱) الجامع لاخلاق الراوی (۹۳)

ان میں سے پانچ بھی نہیں نکلیں گے، میں نے حیرت سے کہا: پانچ بھی نہیں!! کہنے لگے: ہاں پانچ بھی نہیں، یہ لوگ چھوٹے میں حدیث حاصل کرتے ہیں، اور بڑے ہوکر چھوڑ دیتے ہیں، یہ لوگ چھوٹے میں علم حاصل کرتے ہیں اور بڑے ہوکر فتنے پھیلانے میں مشغول ہوجاتے ہیں، وہ اِس بات کو بار بار دہراتے رہے، ابوداوُدؒ کہتے ہیں کہ: میں نے دیکھا تو واقعی بعد میں ان میں سے پانچ لوگ بھی محدث بن کر نہیں نکلے!!

ابنِ عبدالبرؒ کی ''جامع'' میں ایک واقعہ بغیر سند کے مذکور ہے[1] کہ: کسی نے اعمش سے کہا کہ: اتنی بڑی تعداد آپ سے علم حاصل کررہی ہے، آپ نے تو علم کو زندہ کردیا، وہ کہنے لگے: تعجب مت کرو، ان میں سے ایک تہائی طلبہ تو علمی پختگی پیدا ہونے سے پہلے ہی انتقال کرجائیں گے، ایک تہائی بادشاہ کے درباری بن جائیں گے جو مُردوں سے بھی بدتر ہوں گے اور ایک تہائی جو باقی بچیں گے ان میں سے بھی کچھ ہی لوگ کامیاب ہو پائیں گے۔

کتابوں کے یہ واقعات - اوران جیسے بے شمار واقعات - اس لیے نہیں ہیں کہ ان کا سہارا لے کر وہ لوگ جو دنیا کمانے یا کسی اور مقصد سے علمی لائن چھوڑ دیتے ہیں اپنے آپ کو معذور سمجھنے لگیں، نہیں ہرگز نہیں! یہ واقعات تو اس لیے ہیں کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے، طلبہ بھی ان سے عبرت حاصل کریں کہ علم سے دُور کرنے والی چیزوں اور علم کے موانع سے اپنے آپ کو بچائیں اور والدین اور سرپرست حضرات بھی ان سے عبرت حاصل کریں کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے بچوں کو حصولِ علم میں لگائیں؛ تاکہ ان میں سے کچھ لوگ تو علمی مشغلے کے لیے باقی رہ سکیں اور ان باقی رہنے والوں میں سے پھر کچھ لوگ علم میں گہرائی وگیرائی پیدا کرکے دینی معاملات میں امت کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۱)(۱۱۱۵) یہاں بغیر سند کے ہے، جبکہ خطیب کی جامع (۹۶) میں سند کے ساتھ ہے

انقطاع سے بچنے کی تدبیریں:

ہمارے اسلاف اس غرض سے کہ حصولِ علم میں ان کی مداومت اور پابندی برقرار رہے اور کسی ایک دن بھی ان کے اندر سستی اور کمزوری نہ پیدا ہونے پائے، متعدد حیلے اختیار کرتے تھے، ابو ہلال عسکریؒ نے فقہ حنفی کے امام ابوالحسن کرخیؒ (۲۶۰-۳۴۰) کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: وہ اپنے استاذ قاضی مشہور ابو خازم عبدالحمید بن عبدالعزیزؒ (متوفی ۲۹۲ھ) کی مجلس میں جمعہ کے روز بھی حاضر ہوتے تھے، بایں طور کہ وہ اس جگہ جاتے تھے جہاں مجلس لگتی تھی؛ حالانکہ اس دن سبق نہیں ہوتا تھا، امام کرخیؒ خود بیان فرماتے ہیں کہ: میں ابو خازمؒ کی مجلس میں جمعہ کے دن بھی صبح کے وقت جاتا تھا؛ حالانکہ اس دن سبق نہیں ہوتا تھا، یہ میں اس لیے کرتا تھا؛ تاکہ میرا حاضری کا معمول چھوٹ نہ جائے(۱)۔

میں نے حلب اور دمشق کے بعض علماء کو بھی اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے؛ حلب کے میرے استاذ محترم شیخ عبدالجواد بوادقجیؒ اپنے استاذ عالم ربانی شیخ محمد نجیب سراج الدینؒ کے ساتھ اور دمشق کے فقیہ شیخ عبدالوہاب دبس وزیت اپنے استاذ فقیہ شیخ عطاء اللہ کُسُم کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے تھے، یہ دونوں منگل کے روز بھی اپنے استاذ کے درس کی جگہ جاتے، جو اس زمانے میں چھٹی کا دن ہوا کرتا تھا اور بند دروازے کے کڑے کو پکڑ کر واپس اپنے گھر لوٹ آتے، گرمی سردی ہر موسم میں یہی معمول رہتا تھا، یہ اس لیے کرتے تھے؛ تاکہ اگلے روز بدھ کو درسگاہ میں وقت پر حاضر ہونے میں کوئی سستی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات پر رحم فرمائے، یہ لوگ اپنے نفس کی کڑی نگرانی اور اس کی سستی وکوتاہی سے چوکنا رہ کر اس کی بیماریوں کا خوب علاج کرتے تھے۔

(۱) الحث علی طلب العلم ص ۷۸

تیرہویں مشعل

سبق کا مطالعہ اور اس کو دہرانا

سبق کا مطالعہ استاذ اور طالبِ علم دونوں کی ذمہ داری:

طالبِ علم اور استاذ دونوں کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ جتنی مقدار میں آج سبق ہونا ہے، سبق میں جانے سے پہلے اس کا مطالعہ ضرور کریں، اسی کو پہلے زمانے میں ''سبق'' کہا جاتا تھا۔

جہاں تک استاذ کی ذمہ داری کا معاملہ ہے کہ وہ سبق میں آنے سے پہلے اس سبق کا مطالعہ ضرور کریں: تو اس تعلق سے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، جو فقہ حنفی کے سالِ اوّل میں ہمارے ساتھ پیش آیا، ہمارے استاذ فقیہ شیخ مصطفیٰ مزراب تھے، اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور انھیں بھرپور بدلہ عطا فرمائے۔

شیخ نے ایک روز ایک طالبِ علم کے بارے میں محسوس کیا کہ اس نے سبق کا مطالعہ نہیں کیا، توحسبِ عادت اس کو نرمی کے ساتھ تنبیہ کی اور فرمایا کہ: بچو! ہمارے شیخ ابراہیم ترمانینیؒ (۱۳۰۵-۱۳۷۴ھ) ہم سے کہا کرتے تھے کہ: میں نے ازہر میں بہت سے علوم سیکھے، جن میں چھبیس علوم تو ایسے ہیں جن کے بارے میں مجھ سے کبھی کوئی پوچھتا ہی نہیں؛ پھر بھی میں سبق میں آنے سے پہلے سبق کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں!۔

اور جہاں تک طالبِ علم کی ذمہ داری کی بات ہے کہ وہ سبق میں آنے سے پہلے سبق

کا مطالعہ ضرور کرے: تو اس موضوع پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہی، اس سلسلے میں علماء کے متعدد اقوال اور واقعات موجود ہیں۔

سبق کا مطالعہ ایک ہزار بار ہو:

ان ہی میں زرنوجیؒ کا یہ قول بھی ہے: "**السبق حرف والتکرار ألف**" کہ سبق کا مطالعہ ایک حرف ہو؛ لیکن اس کو دہرانا ہزار بار ہو[۱]مطلب یہ ہے کہ مطالعہ کی مقدار تو تھوڑی ہی ہو؛ لیکن سبق سے پہلے اس کو دہرایا خوب جائے، ایک ہزار دفعہ دہرایا جائے۔

اس کے بعد وہ اس بات کو سمجھانے کے لیے کہ یہ دہرانا سبق کو ذہن نشین کرنے کے لیے کس قدر اہم ہے، لکھا ہے کہ: طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ دہرانے کے لیے اندازہ لگا کر ایک تعداد متعین کر لے؛ کیونکہ جب تک وہ اس تعداد تک نہیں پہنچے گا اس کا مطمئن نہیں ہوگا[۲]۔

سبق کو دہرانے کے تعلق سے اسلاف کے واقعات:

جہاں تک احوال اور واقعات کی بات ہے تو امام ابو اسحاق شیرازیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: کہتے ہیں کہ: انھیں باقلاء کے شوربے سے ثرید کھانے کی خواہش ہوئی؛ لیکن وہ بتاتے ہیں کہ: مجھے سبق میں مشغولیت اور عبارت خوانی کی ذمہ داری لینے کی وجہ سے اس ثرید کو کھانے کا موقع ہی نہیں ملا[۳]، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ہر قیاس کو ایک ہزار مرتبہ دہراتا تھا، جب اس سے فارغ ہو جاتا تو دوسرا قیاس شروع کرتا، اسی طرح ہر سبق کو ایک ہزار مرتبہ دہراتا تھا اور اگر کسی مسئلہ میں کوئی شعر ہوتا جس سے استشہاد کیا گیا ہو تو میں پورا قصیدہ یاد کر ڈالتا![۴]۔

---

(۱) **تعلیم المتعلم** ص۶۹

(۲) ص۷۹

(۳) اس واقعہ کے ساتھ ابن ابی حاتم کا وہ واقعہ بھی ملا لیجیے جو ص ۱۰۵ پر گزر چکا ہے

(۴) طبقات الشافعیۃ الکبری ۴: ۲۱۸

یہی الفاظ سبکیؒ نے بھی نقل کیے ہیں کہ: میں ہر سبق کو ایک ہزار مرتبہ دہراتا تھا، ذہبیؒ کی روایت میں بھی یہی الفاظ ہیں [۱] غور کیجیے کہ! شعر و ادب میں امام موصوف کی فکر کی بلندی کس حد تک پہنچی ہوئی ہے!!۔

سبق کو بار بار دہرانے کے تعلق سے امام قفال شاشیؒ کی ابتدائے تعلیم کا واقعہ بھی پیچھے گزر چکا ہے [۲]۔

اسی طرح سبکیؒ کی ''طبقات'' میں امام ابوالحسن اِلکِیاہرّاسی (۴۵۰-۵۰۴ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے، جو امام الحرمینؒ کے سبق میں امام غزالیؒ کے ہم درس رہ چکے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: مدرسہ سرہنک نیساپور میں ایک نہر تھی، جس میں اُترنے کے لیے ستر (۷۰) سیڑھیاں تھیں، جب پورا سبق یاد ہو جاتا تو میں اس نہر میں اُترتا اور اترتے ہوئے ہر سیڑھی پر ایک مرتبہ پورا سبق دہراتا جاتا، اسی طرح چڑھتے ہوئے بھی کرتا، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایسا ہر سبق میں کرتا تھا [۳]۔

بعض کتابوں میں ہے [۴] کہ: ''وہ اپنے سبق کو مدرسہ نظامیہ نیساپور کے زینہ کی ہر سیڑھی پر سات سات مرتبہ دہراتے تھے، اور کل سیڑھیاں ستر تھیں''۔ اس اعتبار سے ان کے دہرانے کی تعداد کل ۴۹۰ مرتبہ ہوتی ہے!۔

ابن الجوزیؒ نے امام ابوالفضل بکر بن محمد زرنجریؒ متوفی ۵۱۲ھ کا ترجمہ لکھا ہے، جو

(۱) ''سير أعلام النبلاء'' (۴۵۸/۸)، ہوسکتا ہے سبکی نے بھی یہیں سے لیا ہو؛ لیکن ''صفة الصفوة'' (۶۶/۴)، ''تهذيب الأسماء واللغات'' (۱۷۳/۲) اور ''المجموع'' (۱۴/۱) میں سبق کو سو مرتبہ دہرانے کا ذکر ہے نہ کہ ہزار مرتبہ، یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ص ۱۱۱

(۳) ۷:۲۳۲

(۴) یہ ابن الجوزی کی ''المنتظم'' ۱۷:۲۲ کی طرف اشارہ ہے، پوری عبارت سبکی کی ہی ہے۔

حنفیہ کے متبحر امام اور شمس الائمہ سرخسیؒ کے مشہور تلامذہ میں ہیں[1]، امام سمعانیؒ نے اپنے شیوخ میں ان کا بھی تذکرہ کیا ہے[2]، ابن الجوزیؒ نے سمعانیؒ کے ذکر کردہ مواد پر ایک واقعہ کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ بکر بن محمدؒ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا تو وہ فرمانے لگے کہ: میں نے ایک رات بخارا کے قلعہ کے ایک برج میں جا کر اس مسئلہ کو چار سو مرتبہ دہرایا تھا، یہی وجہ ہے کہ ابن الجوزیؒ اور سمعانیؒ دونوں کا کہنا ہے کہ: وہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو یاد رکھنے میں ضرب المثل تھے، جب کوئی فقہ کا طالبِ علم ان سے کوئی سبق پڑھنا چاہتا تو جس جگہ سے بھی وہ پڑھنا چاہتا بغیر مطالعہ اور بغیر کسی کتاب کی مراجعت کیے ہوئے وہ اس کو پڑھا دیتے تھے!!۔

قاضی عیاضؒ نے بعض حضرات سے مالکیہ کے امام ابوبکر ابہریؒ (متوفی ۳۷۵ھ) کے تذکرے میں نقل کیا ہے کہ: انھوں نے ابنِ عبدالحکم کی ''مختصر'' کو پانچ سو (۵۰۰) مرتبہ، ''الاسدیہ'' کو پچھتّر (۷۵) مرتبہ، ''موطا'' کو پینتالیس (۴۵) مرتبہ، برقی کی ''مختصر'' کو ستر (۷۰) مرتبہ اور ''مبسوط'' کو تیس (۳۰) مرتبہ پڑھا تھا[3]۔

قاضی عیاضؒ نے اپنے استاذ امام ناقد غالب بن عبدالرحمٰن ابنِ عطیہ غرناطیؒ (۴۴۱-۵۱۸ھ) کے تذکرے میں لکھا ہے[4] کہ: انھوں نے صحیح بخاری کو از اوّل تا آخر سات سو مرتبہ پڑھا، ان کی عمر کل ۷۷ رسال ہوئی، اس اعتبار سے اگر ساٹھ سال کا حساب لگایا جائے، تو انھوں نے اوسطاً ہر مہینے پوری بخاری شریف ختم کی۔

علامہ محمد بن علی بن علوی خرد تریمیؒ (متوفی ۹۶۰ھ) کی کتاب **''غرر البهاء الضوي''**

---

(۱) ''المنتظم'' ۱۷: ۱۶۵ میں

(۲) **التحبير** ۱: ۱۳۵

(۳) ترتیب المدارک ۳: ۲۲۰

(۴) اپنے مشیخہ ''**الغنية**'' ص ۱۹۰ میں، کتانی کی ''**التنويه والاشادة**'' دیکھیے۔

میں (۱)نوی صدی ہجری کے محقق عالمِ دین فضل بن عبداللہ ابنِ ابی فضل علوی تریمیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ: انھوں نے صحیح بخاری کو از اوّل تا آخر ایک ہزار دفعہ پڑھا، مؤلف کہتے ہیں کہ: ہمارے علم کے مطابق یہ کارنامہ کسی نے بھی انجام نہیں دیا، واللہ اعلم بالصواب۔ مؤلف کا یہ قول مجھے فقیہ شافعی زین آل سمیط حفظہ اللہ نے سنایا تھا۔

امام سیوطیؒ کی ''**المنهاج السوي**'' میں (۲) امام نوویؒ کے تذکرے میں ہے کہ: انھوں نے اپنی کسی کتاب میں امام غزالیؒ کی ''**الوسیط**'' سے کوئی عبارت نقل کی، جس پر ان کے زمانے کے بعض علماء نے اشکال کیا اور کہا کہ: ان سے نقل کرنے میں غلطی ہوئی ہے، تو امام نوویؒ فرمانے لگے کہ: تم لوگ مجھ سے اس کتاب کے بارے میں جھگڑ رہے ہو، میں نے اس کتاب کا چار سو مرتبہ مطالعہ کیا ہے!!۔

اسلاف کی کثرتِ تصانیف کا راز:

یہیں سے ہمیں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ: علمائے سابقین چونکہ اپنے سبق کا بار بار مطالعہ کرتے تھے اور بار بار اس کو دہراتے تھے؛ اس لیے انھیں وہ کتابیں زبانی یاد ہو جاتی تھیں، وہ اپنے اساتذہ سے صرف معتبر اور مستند اُصول ہی پڑھتے تھے (لیکن ان کو بار بار دہرا کر زبانی یاد کر لیتے تھے)، پھر یہی حفظ بعد میں ان کے کام آتا اور ان کے لیے تصنیف و تالیف کا کام بہت آسان ہو جاتا تھا، وہ لوگ حافظے سے ہی عبارتیں لکھ کر ان کے حوالے دے دیا کرتے تھے، انھیں بار بار کتاب کھول کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

ہمارے اساتذہ ہمیں دو چیزوں کی بہت تاکید کیا کرتے تھے: ایک تو سبق میں آنے سے پہلے سبق کا مطالعہ، دوسرے سبق کے بعد اس کو دہرانا، سبق کے مطالعے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ استاذ جو کچھ سبق میں سمجھانے والے ہوتے ہیں؛ طالبِ علم اس کو سمجھنے اور محفوظ

(۱) ص ۴۴۲

(۲) ص ۴۳

کرنے کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہوجاتا ہے، اور سبق کو دہرانے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ استاذ کی تشریح میں ایک مرتبہ پھر غور وفکر کرلیتا ہے کہ کوئی ایسی چیز رہ تو نہیں گئی جو ذہن میں نہ بیٹھی ہو اور صحیح سے سمجھ میں نہ آئی ہو۔

سبق کو دہرانے کے سلسلے میں اہم ہدایات:

زرنوجیؒ نے سبق کو دہرانے کے سلسلے میں دو چیزوں پر متنبہ کیا ہے(۱)، ایک یہ کہ وہ فرماتے ہیں کہ: کل کے سبق کو پانچ مرتبہ دہراؤ اور پرسوں کے سبق کو چار مرتبہ اور اس سے پہلے کا سبق تین مرتبہ اور اس سے پہلے کا دو مرتبہ اور اس سے پہلے کا ایک مرتبہ، اس سے تکرار بھی کئی دفعہ ہوجاتا ہے اور یاد بھی خوب ہوجاتا ہے۔

دوسری بات وہ لکھتے ہیں کہ: سبق کو پست آواز سے دہرانے کی عادت مت ڈالو؛ سبق قوت اور نشاط کے ساتھ دہرانا چاہیے؛ لیکن اتنی تیز آواز سے بھی مت دہراؤ کہ اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دو، پھر یہ ہوگا کہ تھک کر بیچ ہی میں دہرانا چھوڑ دوگے، **خير الأمور أوساطها** بہترین کام درمیانی ہوتا ہے۔

اس دوسری چیز کی طرف ابو ہلال عسکریؒ نے بھی توجہ دلائی ہے، فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم سبق میں اپنی آواز اتنی بلند رکھے کہ خود کو سنائی دے؛ کیونکہ جو چیز کان کو سنائی دیتی ہے وہ دل میں بیٹھتی ہے، مشائخ میں سے کسی سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے نبط کے ایک گاؤں میں ایک نوجوان کو دیکھا جو نہایت فصیح اور شیریں زبان بولتا تھا، میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اتنی فصاحت سے کیسے بولتا ہے؛ حالانکہ اس کے کنبہ والے تو لکنت کا شکار ہیں؟ اس نے بتایا کہ: میں روزانہ جاحظ کی کتابیں لے کر اس کے پچاس ورق بلند آواز سے پڑھتا تھا، جس کی برکت سے تھوڑے ہی دنوں میں میری زبان اچھی ہوگئی، شافعیہ کے امام ابو حامد اسفرائینیؒ سے منقول ہے، وہ اپنے شاگردوں سے

(۱) ص ۸۰

کہتے تھے کہ: جب تم پڑھا کرو تو بلند آواز سے پڑھا کرو، اس سے یاد بھی خوب ہوتا ہے اور نیند بھی نہیں آتی (۱)۔

قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ کی جہراً قراءت کا معمول:

میں بھی طلبہ کو اِس بات کی تاکید کرتا ہوں کہ وہ کتابوں کو بلند آواز سے دہرایا کریں؛ لیکن اسی کے ساتھ ایک اور بات بھی کہتا ہوں کہ وہ قرآنِ کریم کا اپنا روزانہ کا معمول بھی جہراً پڑھا کریں، اسی طرح حدیث کی کوئی بااعراب کتاب لے کر یومیہ ایک مقدار متعین کرکے اس کو بھی جہراً پڑھا کریں، خواہ وہ کتاب سند کے ساتھ ہو جیسے: بخاری شریف، یا بغیر سند کے ہو جیسے: ریاض الصالحین؛ اس سے ایک تو احادیث سے واقفیت ہوگی، دوسرے زبان صحیح اعراب کے ساتھ عبارتوں کو پڑھنے کی عادی ہوگی۔ یاد رکھیے! صرف کتابوں کو پڑھ لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنا اہم ہے۔

پھر جب زبان صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنے کی عادی ہوجائے تو داعیِ کبیر مولانا یوسف کاندھلویؒ کی ''**حياة الصحابة**'' کے ایک دو صفحے یومیہ پڑھا کریں۔

اسی کے ساتھ طلبہ کو اس بات کی بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ کاتب اسلامی، ادیب العلماء، عالم الادباء شیخ علی طنطاویؒ کی ''**رجال من التاريخ**'' اور ''**قصص من التاريخ**'' کو بھی ان کے اسلوبِ بیان اور اسلوبِ تحریر کو اخذ کرنے کی غرض سے پڑھا کریں؛ ان کی تحریریں ''سہل ممتنع'' ہوتی ہیں۔

زیرِ درس کتاب سے اُونچی کتاب کا مطالعہ:

میں ایک اور نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور اس کے تعلق سے ایک واقعہ بھی سنانا چاہتا ہوں۔
نصیحت یہ ہے کہ: طالبِ علم اپنے اندر خود ہی حوصلہ پیدا کرے یا اس کے استاذ اس

---

(۱) الحث علی طلب العلم ص ۷۲

کے اندر یہ حوصلہ پیدا کریں کہ وہ اگلے سبق کے مطالعہ کے لیے اپنی کتاب سے اُونچی کتاب کا مطالعہ کیا کرے، اس سے اس کی صلاحیت بھی مضبوط ہوگی اور ساتھ ہی اس کے اساتذہ کی توجہ بھی اس کی طرف مبذول ہوگی اور وہ ان کی عنایات اور توجہات کا مرکز بن جائے گا، یہ انتہائی اہم چیز ہے، مستقبل میں ان شاء اللہ اس کے بہت اچھے نتائج ظاہر ہوں گے۔

جہاں تک قصہ کی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ: میرے استاذ فقیہ حنفی شیخ محمد سلقینیؒ کو ایک مرتبہ کہیں مختصر سے سفر پر جانا تھا، تو انھوں نے مدرسہ خسرویہ (ثانویہ شرعیہ) حلب میں اپنے اسباق کی ذمہ داری اپنے شاگرد اور میرے استاذ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کے سپرد کی، شیخ نے سبق پڑھایا تو طلبہ کو بہت پسند آیا اور وہ شیخ سے بڑے متاثر ہوئے، جب شیخ محمد سلقینیؒ اپنے سفر سے واپس آئے، تو طلبہ کہنے لگے: حضرت! یہ شیخ عبدالفتاح آپ کے شاگرد ہیں؟ شیخ سلقینیؒ تو سراپا تواضع کا پیکر تھے، کہنے لگے: ہاں! لیکن اب میں ان کے شاگردوں میں ہوں، میں ان کو پڑھانے کے لیے ''آجرومیہ'' کا متن مطالعہ کرتا تھا اور وہ ''آجرومیہ'' پڑھنے کے لیے ''مغنی اللبیب'' کا مطالعہ کیا کرتے تھے!، راقم کہتا ہے کہ: اسی چیز نے شیخ کو علومِ شرعیہ کے ساتھ ساتھ علومِ عربیہ (نحو، صرف وغیرہ) میں بھی حجت بنا دیا تھا۔

چودھویں مشعل

علم کے مذاکرے کی اہمیت

مذاکرے کا مطلب:

طالبِ علم کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے ساتھ، اپنے ساتھیوں کے ساتھ، اپنے اساتذہ کے ساتھ یا جس کے ساتھ بھی موقع مل جائے علم کے مذاکرے کیا کرے، مذاکرے کا مطلب ہے: باہم بحث ومباحثہ، سوال وجواب، مناقشہ، مناظرہ، چاہے جس طریقے پر بھی ہو اور جس اسلوب کے ساتھ بھی ہو؛ البتہ اس میں کسی رائے یا کسی مکتبِ فکر وغیرہ کو لے کر لڑائی جھگڑا اور عصبیت کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔

جہاں تک علمی اشتغال کی بات ہے تو وہ انفرادی طور پر بھی ہو جاتا ہے، جیسے: مطالعہ ہے یا تصنیفی کام ہے؛ لیکن ''مذاکرہ'' دوسروں کی شرکت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اسی شرکت سے فہم پیدا ہوتی ہے اور ذہن پر مسئلہ کی مختلف صورتیں، مختلف جوابات اور مختلف احتمالات کھلتے ہیں، ہمارے مشائخ کی زبانوں پر یہ جملہ بطور کہاوت عام تھا: **''ذُبح العلم بين اثنين''** کہ علم دو لوگوں کے درمیان ذبح کر دیا گیا، مطلب یہ ہے کہ دو لوگوں کے مذاکرے سے علم کی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔

مذاکرے کے فوائد:

مذاکرے کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ: یہ آپ کو مذاکرے سے پہلے ان مسائل

کو یاد کرنے پر مجبور کرتا ہے جن کا آپ کو دوسروں کے ساتھ مذاکرہ کرنا ہے، دوسرا فائدہ ہے کہ: آپ جس مسئلہ کا بھی تکرار و مذاکرہ کرتے ہیں وہ مسئلہ آپ کے ذہن میں خوب اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے اور دیر تک باقی رہتا ہے، تیسرا فائدہ یہ ہے کہ: مذاکرے کے ذریعہ آپ کو بہت سی باتیں دوسروں سے معلوم ہوتی ہیں اور بہت سی چیزیں دوسروں سے سمجھ میں آتی ہیں جو خود اپنے مطالعہ سے معلوم نہیں ہوتیں اور اپنے ذہن سے سمجھ میں نہیں آتیں، یہ بھی کوئی کم فائدہ نہیں ہے۔

مذاکرے کی اہمیت اسلاف کے نزدیک:

مذاکرے کی اہمیت کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ اس کی اہمیت کو حضرت علی، حضرت ابنِ مسعود، حضرت ابنِ عباس اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ اور حضرت علقمہ، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت ابنِ شہاب زہری اور حضرت عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ وغیرہ جیسے کبار تابعین نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ اُجاگر کیا ہے۔

ان آثار کو مختلف کبار محدثین نے جمع کیا ہے: سب سے پہلے ابنِ ابی شیبہ نے اپنے ''مصنَّف'' (۲۶۶۵۷-۲۶۶۶۴) میں اور دارمی نے اپنی ''سنن'' (۵۹۵-۶۲۷) میں ان آثار کو جمع کیا، ان کے بعد رامہرمزی نے ''المحدث الفاصل'' (۷۲۱-۷۳۲) میں ان کے تعلق سے ایک مستقل نوع لکھی، پھر حاکم نے بھی ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں تینتیسویں نوع لکھی، پھر خطیب نے ''آداب الفقیہ'' (۹۵۳-۹۵۷) اور ''جامع'' (۱۸۷۵-۱۹۱۲) میں اور ابنِ عبدالبر نے ''جامع بیان العلم وفضلہ'' (۹۴، ۶۲۳-۶۵۱) میں اور بیہقی نے ''المدخل'' (۴۱۸-۴۵۱) میں ان آثار کو جمع کیا، ان میں بہت سے آثار تو ایسے ہیں جو سب کے یہاں مشترک ہیں اور بعض کے یہاں کچھ زائد آثار بھی ہیں، جو دوسروں کے یہاں نہیں ہیں، بہر کیف ان آثار میں بڑی خیر اور حکمت کی باتیں ملتی ہیں۔

مذاکرے کے سلسلے میں اکابر کا ایک نمونہ: یعقوب بن سفیانؒ نے ''المعرفۃ والتاریخ''

میں (۱)فضیل بن غزوان سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابنِ شبرمہ، مغیرہ بن مقسم ضبی، حارث عُکلی اور قعقاع بن یزید وغیرہ رات میں فقہ کا مذاکرہ کیا کرتے تھے، اور بسا اوقات فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔

یہ وہ حضرات ہیں جو عراق کے اندر اپنے وقت کے امام تھے، بظاہر ان کے نزدیک یہ عمل احیائے لیل اور عبادت میں مشغول رہنے سے افضل تھا، میں نے پیچھے حضرت عمرؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے(۲) کہ یہ دونوں حضرات علم کے مذاکرے کو نماز کے برابر سمجھتے تھے۔

مذاکرہ نہ کرنے والے کو فتویٰ دینے کا حق نہیں:

ایک اور جملہ ہے جو مذاکرے کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے، جسے امام برزلیؒ نے (۳)نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: ابوالحسن قابسی قیروانی سے کسی نے پوچھا کہ: اگر کوئی ''مدوَّنہ'' حفظ کرلے تو کیا اس کے لیے فتویٰ دینا جائز ہے؟ انھوں نے فرمایا: اگر اس نے شیوخ سے مذاکرہ کیا ہو اور ان سے فقہ کی سمجھ بوجھ حاصل کی ہو تو جائز ہے؛ ورنہ اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے، غور کیجیے کسی بھی علم میں مقتدی بننے کے لیے طالبِ علم کے لیے اپنے اساتذہ کے ساتھ مذاکرے کرنا کس قدر اہم ہے۔

اساتذہ کے ساتھ یہ مذاکرے تلقی عن الشیوخ کا ایک جز ہیں، اور جب ایک جز اتنا اہم ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہا جائے جس نے شیوخ سے سرے سے علم ہی حاصل نہیں کیا؟! اور اس شخص کو کیا نام دیا جائے جو ایسے شخص کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ مانتا ہے؟!

(۱) ۲: ۶۱۴ اور ان ہی کے طریق سے خطیب نے ''آداب الفقیہ والمتفقہ'' میں ذکر کیا ہے، حارث عکلی کا ترجمہ ''طبقات'' ابن سعد میں دیکھیے۔

(۲) ص ۴۸

(۳) اپنے فتاوی ۱: ۶۳ میں

حقیقت میں یہ لوگ علم اور علم کی سمجھ اور گہرائی و گیرائی سے کوسوں دُور ہیں!۔

مذاکرے کی اہمیت کو سنت و شریعت کے جلیل القدر امام: امام احمد بن حنبلؒ کا وہ موقف بھی اُجاگر کرتا ہے جس کا تذکرہ پیچھے آچکا ہے(۱) کہ: جب ابوزرعہؒ بغداد آئے اور امام احمدؒ کے یہاں مہمان ٹھہرے، تو امام احمدؒ خود فرماتے ہیں کہ: میں نے اس عرصے میں فرائض کے سوا سب کچھ چھوڑ دیا اور ان کے ساتھ مذاکرے کو نوافل پر ترجیح دی! یہ وہی امام احمد ہیں جو دن رات میں ۳۰۰ رکعات نفل پڑھتے تھے اور آزمائش سے گزرنے کے بعد جب کمزور ہو گئے تو ۱۵۰/رکعتیں پڑھا کرتے تھے(۲)۔

مذاکرہ نہ کرنے والے کی مثال:

خطیب بغدادیؒ نے ایک طویل کلام کسی کا نقل کیا ہے، جس کا نام انھوں نے ذکر نہیں کیا، میں اس کی چند سطریں یہاں بطور اقتباس نقل کرنا چاہتا ہوں، فرماتے ہیں کہ: اگر علم کا استعمال نہ ہو اور اس کا مذاکرہ نہ کیا جائے تو یوں سمجھو کہ: اس کی مثال مشک جیسی ہے کہ برتن میں جب مشک کو زیادہ دن گزر جاتے ہیں تو اس کی خوشبو ختم ہو جاتی ہے، یا یوں سمجھو کہ: اس کی مثال صاف وشفاف پانی جیسی ہے کہ صاف وشفاف پانی اگر زیادہ عرصہ تک ٹھہرا رہتا ہے تو لوگ برتنوں میں لے لے کر اس کو خشک کر دیتے ہیں اور اس میں تغیر پیدا کر دیتے ہیں، یا تو پورا ہی پانی یا اکثر پانی لے کر چلے جاتے ہیں اور اس کی بُو اور مزہ بھی بدل جاتا ہے یا یوں سمجھو کہ: اس کی مثال اس کنویں جیسی ہے جس کو کھودا جائے تو اس سے چشمہ اُبل پڑے، اب اگر اس کو پھیلنے کے لیے کوئی راستہ مل جائے، تو وہ نہر کی شکل اختیار کر لے گا اور خوب بڑھے گا اور لوگوں کو نفع پہنچائے گا اور اس کے ذریعہ آس پڑوس کے لوگ بھی فائدہ اُٹھائیں گے اور اگر اس کو بہنے سے روک دیا جائے اور یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو اس کا نفع

(۱) ص ۷۴

(۲) جیسا کہ ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء ۹:۱۸۱ میں روایت کیا ہے

کم ہوجائے گا اور ہوسکتا ہے کہ پانی واپس زمین کے اندر چلا جائے، بالکل یہی حال اس علم کا ہوتا ہے جس کا مذاکرہ نہ کیا جائے اور بحث ومباحثہ نہ کیا جائے؛ لیکن اگر علم کا مذاکرہ کیا جائے اور اس کو پھیلایا جائے، تو وہ اس جاری نہر کی طرح ہوجائے گا جس میں پانی بھی خوب ہوتا ہے اور اس کا نفع بھی دائمی ہوتا ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کہیں پانی کم بھی ہوجاتا ہے تو آگے چل کر پھر بڑھ جاتا ہے اور اگر کسی خرابی کی وجہ سے گدلا بھی ہوجاتا ہے تو اگلے ہی مرحلہ میں صاف ہوجاتا ہے اور زمینوں، کھیتوں اور جانوروں کی زندگی کے لیے سہارا بن جاتا ہے(۱)۔

مذاکرہ کیسے کیا جائے؟

مذاکرے کے سلسلے میں کچھ اہم نصیحتیں زرنوجیؒ نے بھی اجمالاً بیان کی ہیں، فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم کے لیے مذاکرہ، مناقشہ اور بحث ومباحثہ ضروری ہے؛ لیکن یہ مذاکرہ سنجیدگی، انصاف اور غور وفکر کے ساتھ ہونا چاہیے، شور وشغب اور غصہ کا اظہار نہ ہو؛ کیونکہ مذاکرہ اور مناقشہ یہ ایک طرح کا مشورہ ہے اور مشورہ درست رائے تک پہنچنے کے لیے کیا جاتا ہے، جو غور وفکر، سنجیدگی اور انصاف کے بغیر ممکن نہیں، اگر مذاکرہ کرنے والے کی نیت محض خصم کو الزام دینے اور اس کو مغلوب کرنے کی ہو تو ایسے شخص کے لیے مذاکرہ جائز نہیں، مذاکرہ تو اسی وقت جائز ہے جبکہ اظہارِ حق مقصود ہو(۲)۔

سبق کو خود اکیلے دہرا لینے میں وہ فائدہ نہیں جو مذاکرے اور تکرار میں ہے؛ کیونکہ مذاکرے میں سبق کا دہرانا بھی پایا جاتا ہے اور ساتھ میں دوسرے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، کہا گیا ہے کہ: ایک گھڑی کا مذاکرہ ایک مہینہ تنہا دہرانے سے بہتر ہے؛ البتہ کسی ایسے شخص کے

(۱) آداب الفقیه والمتفقه ۲:۱۰ (٦١٦ کا آخر)

(۲) تعليم المتعلم ص ۲۷

ساتھ مذاکرہ مت کرو جو ضدی اور ہٹ دھرم ہو اور مزاج میں کج روی رکھتا ہو؛ کیونکہ طبیعتیں بہت جلد اثر قبول کرتی ہیں اور تبدیل ہو جاتی ہیں، اخلاق کا ایک دوسرے میں تعدیہ ایک مشاہد چیز ہے، محض کسی کے پاس بیٹھنے سے بھی اس کے اثرات منتقل ہو جاتے ہیں۔

مذاکرے کی صورتیں:

مذاکرہ کبھی تو خود اپنے ساتھ کیا جاتا ہے: اپنے حافظے کے ساتھ، یا مطالعے کے ذریعہ اپنی ذات کے ساتھ اور کبھی دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے: یا تو اپنے سے اُوپر والوں کے ساتھ، یا برابر والوں کے ساتھ، یا نیچے والوں کے ساتھ، ان تمام صورتوں کو خطیب نے اپنی ''جامع'' میں ذکر کیا ہے[1]، جن کا آغاز حضرت ابوہریرہؓ کی ذاتِ گرامی سے کیا ہے، اور سب سے پہلے ان کا یہ اثر ذکر کیا ہے کہ: میں نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے، ایک حصہ میں نماز پڑھتا ہوں، ایک حصہ میں سوتا ہوں اور ایک حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یاد کرتا ہوں، پھر اسی طرح کی بات حضرت عمرو بن دینارؒ سے بھی سند کے ساتھ بیان کی ہے اور تقریباً اسی طرح کی بات امام ثوریؒ سے بھی نقل کی ہے۔

کچھ اور واقعات:

مذاکرے کی اہمیت سے متعلق امام ابوحنیفہؒ اور خلیفہ عبدالملک بن مروان کے پاس آنے والے شخص کے وہ آثار بھی ہیں جو پیچھے گزر چکے ہیں، جن میں آپ نے دیکھا کہ ان مذاکروں نے کس طرح ان حضرات کو بلند مقام تک پہنچا دیا تھا[2]۔

تاریخ ابنِ عساکر میں[3] امام ابی حاتم رازیؒ کے تذکرے میں لکھا ہے کہ: عبدالرحمٰن

---

(۱) الجامع (۱۸۶۹ فما بعدہ)

(۲) ص ۲۱۷-۲۱۸

(۳) ۳۵:۳۶۰

ابن ابی حاتم پر اللہ تعالیٰ کا ایک بڑا فضل یہ تھا کہ انھوں نے علم اور روایات کے ذخیروں کے درمیان آنکھیں کھولیں اور اپنے والد ابو حاتم رازیؒ اور ابو زرعہ رازیؒ کے ساتھ مذاکرے کرتے ہوئے بڑے ہوئے، یہ دونوں حضرات انھیں اسی طرح علم چُگاتے تھے جس طرح چڑیا اپنے بچے کو دانہ چُگاتی ہے، انھیں ان دونوں حضرات کی خوب توجہات حاصل رہیں۔

ایک اور بات ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے کہ مثلاً امام ابنِ شہاب زہریؒ ہیں، یہ دیہاتیوں کے ساتھ یا اپنی خادمہ باندی کے ساتھ حدیث کا مذاکرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا مثلاً اسماعیل بن رجاء زبیدیؒ ہیں، یہ مکتب کے بچوں کے ساتھ مذاکرہ کرتے ہوئے ملتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کے دلوں میں علم کی کس قدر عظمت تھی اور یہ لوگ احادیث کو بھول جانے یا صحیح سے یاد نہ رکھ پانے کے حوالے سے کس قدر ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی کلمہ یا کوئی حرف بدل نہ جائے اور روایات میں اختلاف نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو، یہ لوگ علم کے کس قدر حریص تھے اور اللہ کے دین کے تعلق سے ان میں کس قدر امانت پائی جاتی تھی۔

ماہرِ فن کے ساتھ ایک گھڑی مذاکرہ کئی دن کے تنہا مطالعہ سے بہتر ہے:

مذاکرے کی اہمیت کے تعلق سے امام نوویؒ کا ایک اقتباس بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں انھوں نے پیچھے ذکر کردہ باتوں کے علاوہ ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے، میں اسی نکتہ کے پیشِ نظر ان کے کلام کو یہاں نقل کرتا ہوں، وہ علمِ حدیث کو حاصل کرنے کا راستہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس علم سے مقصود یہ ہے کہ تحقیق وتفتیش پر توجہ دی جائے اور متون واسانید میں چھپے ہوئے معانی کو تلاش کیا جائے...... (آگے لکھتے ہیں:) طالبِ علم کو چاہیے کہ اس نے جو کچھ مطالعہ کے دوران نوٹ کیا ہے اس کا برابر مطالعہ کرتا رہے اور اس فن سے لگے ہوئے لوگوں کے ساتھ اپنی محفوظات کا مذاکرہ بھی کرتا رہے، خواہ اس کے برابر درجے کے ہوں یا اس سے اُوپر درجے کے یا اس سے نیچے درجے کے، مذاکرے سے محفوظ

کی ہوئی چیزیں پائیدار، منقح، مضبوط اور ذہن نشین ہوجاتی ہیں اور ان میں اضافہ ہوجاتا ہے، جتنا زیادہ مذاکرہ ہوتا ہے اسی قدر یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں، یقیناً کسی ماہرفن کے ساتھ ایک گھڑی مذاکرہ کرلینا کئی گھنٹے؛ بلکہ کئی دن کے مطالعہ اور حفظ سے بہتر ہے، طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ اپنے مذاکرے میں انصاف کا متلاشی ہو، اس کا مقصود صرف افادہ واستفادہ ہو، وہ اپنے ساتھی پر اپنی بڑائی نہ جتلائے، نہ تو اپنے دل سے، نہ اپنی زبان سے اور نہ ہی کسی اور حرکت سے، اسی کے ساتھ اس کی گفتگو کا لہجہ بھی نرم اور شیریں ہو، اس طرح کرنے سے اس کا علم بڑھے گا، اور اس کے محفوظات میں اضافہ ہوتا جائے گا(۱)۔

راقم کہتا ہے کہ: امام نوویؒ کے اس اقتباس سے بطریق اولیٰ یہ بات نکلتی ہے کہ: جب کسی ماہرفن کے ساتھ مذاکرہ طالبِ علم کے لیے کئی گھنٹوں؛ بلکہ کئی دنوں کے تنہا مطالعہ سے افضل ہے، تو پھر کسی ماہر اور مصلح استاذ سے سالہا سال علم حاصل کرنے اور سالہا سال ان کی صحبت میں رہنے سے کس قدر نفع ہوگا اس کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟!! دو صفحوں کے بعد آرہے ابنِ جماعہؒ کے اس ارشاد کا انتظار کیجیے جس میں انھوں نے اس قسم کے لوگوں سے علم حاصل کرنے سے منع کیا ہے جنھوں نے ماہرینِ فن سے علم حاصل نہ کیا ہو۔

باقی وہ شخص جس نے صحیفوں اور کتابوں کو ہی اپنا شیخ بنالیا اور پھر صحیفوں نے اسے اُٹھا کر لوگوں کا شیخ بنادیا، وہ علم کی گہرائی وگیرائی سے کس قدر دُور ہوگا، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں، خاص طور پر جبکہ اس کے اندر یہ بات بھی پیدا ہوگئی ہو کہ وہ اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگا ہو اور اسے کوئی بھی اس قابل نظر نہ آتا ہو جن سے وہ علم حاصل کرسکے، اللہ تعالیٰ ہمیں عافیت اور سلامت روی عطا فرمائے اور حسنِ توفیق ہمارے شاملِ حال فرمائے۔

(۱) مقدمۂ مسلم کی شرح کی ابتداء میں ۱: ۴۷-۴۸

پندرہویں مشعل

خوب پوچھنے والی زبان کی اہمیت

طالبِ علم کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: جو باتیں وہ نہیں جانتا اور علم کی جو گتھیاں اس سے نہیں سلجھتیں ان کے بارے میں پوچھنے اور سوال کرنے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے، حضرت ابنِ عباسؓ کا جملہ مشہور ہے کہ جب ان سے کسی نے پوچھا کہ: آپ کو یہ علم کیسے حاصل ہوا؟ تو فرمایا: "**بلسان سؤول وقلب عقول**" بہت زیادہ پوچھنے والی زبان اور خوب سمجھنے والے دل کی بدولت (۱)۔

یہی جواب دَغفل بن حنظلہ شیبانی نے بھی - جو مخضرمین میں سے ہیں- حضرت معاویہؓ کو دیا تھا، حضرت معاویہؓ نے ان سے علومِ عربیہ، علمِ نسب اور علمِ نجوم سے متعلق کئی باتیں پوچھیں، حضرت دغفل نے سب کا جواب دیا، جس پر حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ: دغفل! تمہیں یہ سب باتیں کہاں سے معلوم ہوئیں؟ انھوں نے فرمایا کہ: یہ سب

(۱) بیہقیؒ نے اس کو "المدخل" (۴۲۷) میں **جریر عن المغیرة عن ابن عباس** کے طریق سے روایت کیا ہے اور رافعی نے "**التدوین**" (۸۹/۳) میں **جریر عن المغیرة عن إبراهیم النخعي** کے طریق سے روایت کیا ہے، ابراہیم نخعیؒ کا حضرت ابنِ عباسؓ سے لقاء ثابت نہیں ہے؛ لیکن ان کے مراسیل صحیح ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے ان کے مراسیل پر ضعف کا حکم لگایا ہے، انھوں نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔

ابن القیمؒ نے اسے "**أعلام الموقعین**" (۱۹/۱) میں مکحول عن ابنِ عباسؓ کے طریق سے روایت کیا ہے؛ لیکن مکحول کا بھی ابنِ عباسؓ سے لقاء ثابت نہیں ہے۔

باتیں مجھے خوب سمجھنے والے ذہن اور خوب پوچھنے والی زبان کے ذریعہ حاصل ہوئیں اور فرمایا کہ: نسیان علم کے لیے ایک آفت ہے(۱)۔

یہ اس لیے کہ ”**العلم خزائن ومفاتيحها السؤال**“(۲) علم خزانوں کا ایک ڈھیر ہے، اور اس کی کنجیاں سوال ہیں، ”**شفاء العي السؤال**“(۳) جہالت کا علاج سوال کرنے ہے؛ لیکن یاد رہے کہ اس کنجی اور اس دوا کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے، وہب بن منبہؒ، سلیمان بن یسارؒ اور میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ: حسنِ سوال اور سلیقہ سے پوچھنا بھی نصف علم ہے(۴)۔

طالبِ علم کا نام ”ما تقول“ تھا:

زرنوجیؒ نے ایک نادر قسم کا تاریخی فائدہ بیان کیا ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسلاف کے زمانے میں طالبِ علم کو ایک عجیب وغریب نام سے پکارا جاتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم کو ”**ما تقول**“ کہا جاتا تھا؛ کیونکہ پہلے طالبِ علم بکثرت یہ سوال کرتا تھا: ”**ما تقولون في هذه المسألة**“ کہ آپ لوگوں کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟(۵)۔

(۱) رواہ ابن عبدالبر فی ”الجامع“ (۵۳۱)، و ”الاستیعاب“ ۲: ۴۶۲، والبیہقی فی ”المدخل“ (۴۲۸)

(۲) یہ ایک انتہائی ضعیف حدیث کا ٹکڑا ہے، جسے ابونعیم نے ”حلیہ“ (۳/ ۱۹۲) میں روایت کیا ہے، سخاویؒ نے ”مقاصدِ حسنہ“ (۷۰۴) میں اور زرقانیؒ نے ”مختصر“ (۶۵۴) میں اس کو ضعیف کہنے پر اکتفاء کیا ہے۔

(۳) یہ ایک ثابت اور مضبوط حدیث کا ٹکڑا ہے جسے ابوداؤد (۳۳۷) اور ابنِ ماجہ (۵۷۲) اور دوسرے بہت سے لوگوں نے روایت کیا ہے اور ”عي“ سے مراد یہاں پر جہالت ہے۔

(۴) جامع ابن عبدالبر (۵۴۴)، آداب الفقیہ والمتفقہ (۷۰۰)، یہ مرفوعاً بھی مروی ہے، ”المقاصد الحسنہ“ میں اس کی تخریج دیکھیے، جس کا خلاصہ علامہ زرقانی نے مختصر المقاصد میں **حسن لغیرہ** نکالا ہے، ادب الدنیا والدین ص ۱۱۷ بھی دیکھیے

(۵) **تعليم المتعلم** ص ۷۴-۷۵

معلوم ہوا کہ باہم سوال کرنا طالبِ علم کی عادت، صفت اور اس کا اوڑھنا بچھونا ہے اور یہ مذاکرے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ بھی ہے، ہم جلد ہی مذاکرے کے بارے میں گفتگو کریں گے اور بتائیں گے کہ ائمہ سلف: صحابہؓ وتابعینؒ اور بعد کے لوگوں نے اس کی بہت ترغیب دی ہے اور اس پر توجہ دینے کی بہت تاکید کی ہے۔

امام زہریؒ کا ہر کسی سے سوال کرنا:

رامہرمزیؒ نے **"المحدث الفاصل"** میں ایک روایت نقل کی ہے، جس میں ابنِ شہاب زہریؒ کے حصولِ علم کی لگن اور شوق کا حال بیان کیا ہے کہ: انھیں مجلس کے اندر جو بھی نوعمر یا جوان یا اَدھیڑ عمر ملتا، اس سے سوال کرتے، وہ انصار کے احاطوں میں سے کسی احاطے میں چلے جاتے اور وہاں بھی ہر ایک سے پوچھتے پھرتے، کسی کو نہیں چھوڑتے تھے، چاہے وہ نوعمر ہو، یا ادھیڑ عمر ہو، یا جوان ہو یا کوئی ضعیف عورت ہو یا کوئی اَدھیڑ عمر عورت ہو، حتیٰ کہ وہ **"ربّات الحجال"**(۱) یعنی نئی نویلی دلہنوں سے بھی پوچھنے کی کوشش کرتے تھے(۲)۔

ابنِ شہابؒ کے تعلق سے یہ اثر ہماری اِس مشعل سے بھی تعلق رکھتا ہے اور آنے والی مشعل: مذاکرے کی اہمیت سے بھی تعلق رکھتا ہے؛ کیونکہ اس میں **"ساءِل"** کا لفظ

(۱) **حجال: حجلة** کی جمع ہے، **حجلة** کہتے ہیں: اس کمرے کو جسے دُلہن کے لیے پَردوں سے آراستہ کیا گیا ہو، پس **ربات الحجال** کا مطلب ہے: دوشیزہ دلہنیں، عام طور پر لوگ اس طرح کی دلہنوں سے قریب ہونے اور بات کرنے سے احتراز کرتے ہیں، بوڑھی یا اَدھیڑ عمر عورتوں کے سلسلے میں تو تسامح کر لیتے ہیں؛ لیکن ان دلہنوں کے سلسلے میں نہیں کرتے؛ لیکن زہریؒ کا شوق انھیں ان دلہنوں سے بھی دریافت کرنے پر اُبھارتا تھا؛ مگر پھر حیاء مانع بن جاتی تھی۔

(۲) المحدث الفاصل (۳۰۷)

استعمال ہوا ہے (**لايبقى في المجلس شابا إلا سـاءله**) اور **ساءل** بابِ مفاعلت سے ہے جس میں شرکت کے معنیٰ پائے جاتے ہیں؛ یعنی مساءلت میں دونوں طرف سے سوال وجواب اور گفتگو ہوتی ہے (اور یہی مذاکرہ کہلاتا ہے) واللہ اعلم۔

شبہ والا سوال:

جہاں تک طالبِ علم کے سوالات کا تعلق ہے تو وہ فطری طور پر یا تو مسئول عنہ سے ناواقفیت کی بنا پر ہوتے ہیں جس کو ''سوالِ جاہل'' کہا جاتا ہے یا کسی ایسے امر شرعی سے متعلق ہوتے ہیں، جس کو وہ جانتا ہے؛ لیکن اس کی صورت اس کے لیے واضح نہیں ہوتی یا پھر کوئی مغلق عبارت ہوتی ہے، جو اس سے حل نہیں ہو پاتی اور وہ اس کے متعلق سوال کرتا ہے، اس طرح کے سوال کو ''سوالِ مسترشد'' اور ''سوالِ مستفسر'' کہا جاتا ہے۔

لیکن طالبِ علم کے ذہن میں پیدا ہونے والے کچھ سوالات ایسے بھی ہوتے ہیں جو شبہات کی بنیاد پر ہوتے ہیں، جو یا تو خود طالبِ علم کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں یا کوئی دوسرا شخص اپنے مفادات کے حصول کے لیے اس کے ذہن میں ڈالتا ہے، یہ دونوں قسم کے شبہات طالبِ علم کے لیے نہایت نقصان دہ ہیں۔

ایسے موقعے پر طالبِ علم کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اسے جس استاذ پر بھی اس متعلقہ فن میں اعتماد ہو، فوراً ان کے پاس جا کر اس شبہ کو بیان کرے؛ تا کہ اس کے استاذ اس کے دل سے اس شبہ کا زہر ختم کر سکیں، اس شبہ پر باقی رہنا اور اس کے حل اور علاج سے بے توجہی برتنا اس کے لیے جائز نہیں۔

شبہ کی تعریف:

ہر وہ دلیل جس کی مراد غیر واضح ہو، شبہ کہلاتی ہے؛ کیونکہ اس کے اندر باطل کا حق کے ساتھ یا خطا کا ثواب کے ساتھ اشتباہ ہو جاتا ہے، باطل حق نظر آنے لگتا ہے اور خطا صواب

دکھائی دینے لگتی ہے، ایسے موقعوں پر امتیاز پیدا کرنے کے لیے قوتِ بیان، قوتِ استدلال اور قوتِ استنباط کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس موقع پر مربی اساتذہ کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مبتدی طلبہ کے سوالات اور اعتراضات کے تعلق سے بیدار رہیں، ان کی بنیادوں کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کریں۔

ابنِ قیمؒ نے شبہات کے اثرات، نقصانات اور ان کے دفعیہ کے سلسلے میں نہایت قیمتی بحث کی ہے، جو قدرے طویل ہے، بحث تو پوری ہی اہم ہے؛ لیکن مجھے اس میں ایک نصیحت نہایت اہم محسوس ہوئی، وہ فرماتے ہیں کہ: جب میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ سے پے در پے سوالات کرنے لگا تو انھوں نے مجھے نصیحت کی کہ: تم اپنے دل کو اعتراضات اور شبہات کے لیے اسپنج مت بنادو کہ وہ ہر شبہ کو اپنے اندر جذب کرتا جائے اور پھر اس سے ہمیشہ شبہات ہی ٹپکیں، اسے اس شیشے اور بوتل کی طرح بناؤ جس کو اچھی طرح بند کردیا گیا ہو، کہ شبہات اس کے اُوپر اُوپر سے گزر جائیں، اندر نہ جانے پائیں، دل اپنی صفائی کی وجہ سے ان شبہات کو دیکھ لے؛ لیکن اپنی سختی کی وجہ سے ان کو اندر نہ آنے دے؛ اگر تم دل پر گزرنے والے ہر شبہ کو اپنے دل میں جگہ دیتے رہو گے تو وہ شبہات کا مسکن بن جائے گا او کما قال، (ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ:) میں نہیں جانتا کہ شبہات کو دفع کرنے کے سلسلے میں مجھے کسی نصیحت سے اتنا نفع ہوا ہو جتنا شیخ الاسلامؒ کی اس نصیحت سے نفع ہوا۔ بلاشبہ اللہ ہی سیدھے راستے کی طرف ہدایت دینے والے ہیں[1]۔

(۱) مفتاح دار السعادۃ ۱: ۱۴۰

تیسرا باب

مربی استاذ کی اہمیت اور اُن کے اثرات

طالبِ علم استاذ کا گمشدہ مال ہے:

مربی علمائے ربانیین کا مقولہ ہے کہ: فاسق ہر داعی الی اللہ کا گمشدہ مال ہوتا ہے، میں اسی طرح عالم استاذ کے بارے میں کہتا ہوں کہ: جاہل ہر عالم استاذ کا گمشدہ مال ہوتا ہے، جس کو تلاش کرنا اس عالم کی ذمہ داری ہوتی ہے؛ اور اگر وہ جاہل خود ہی طالب بن کر اس کے پاس آجائے اور یہ اس کا مطلوب بن جائے تو کس قدر خوش نصیبی کی بات ہے؛ اس لیے استاذ کو چاہیے کہ وہ پوری کشادہ قلبی، محبت، شفقت، نرمی اور بشاشت کے ساتھ اس طالبِ علم کا استقبال کرے، اسے اپنا وقت اور اپنا علم دے، امام ابوحنیفہؒ نے اپنے شاگرد امام ابویوسفؒ سے اپنی طویل نصیحت میں فرمایا تھا کہ: تم طلبہ پر اس طرح توجہ دو جیسے تم نے ان میں سے ہر ایک کو اپنا بیٹا بنالیا ہے؛ تاکہ تم ان کے اندر علم کا شوق بڑھا سکو(۱)۔

استاذ کو چاہیے کہ وہ طالبِ علم کو اس نظر سے دیکھے جیسے وہ کوئی خدائی تحفہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اس تک پہنچایا ہے، بالخصوص اِس زمانے میں جبکہ قدم قدم پر علم کی راہ سے ہٹانے والے اسباب بکھرے پڑے ہیں؛ اس کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے؛ تاکہ وہ اس طالبِ علم کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ اپنا علم اور میراثِ نبویؐ دے سکے اور آنے والی نسلیں اس کو یکے بعد دیگرے منتقل کرتی رہیں، حافظ مغرب ابنِ عبدالبرؒ(۲) فرماتے ہیں کہ: لوگ اس وقت تک برابر خیر کے ساتھ رہیں گے جب تک کہ پہلا شخص ان کے درمیان اس وقت تک باقی رہے، جب تک بعد والا اس سے علم حاصل نہ کرلے، (راقم کہتا ہے کہ:) علم کا یہ سلسلہ ان شاءاللہ مسلسل باقی رہے گا، کبھی ختم نہیں ہوگا، ہمتیں کتنی بھی پست ہوجائیں اور عزائم کتنے بھی کمزور پڑجائیں۔

---

(۱) یہ پوری نصیحت مناقب الموفق المکی ص ۳۷۳ میں موجود ہے

(۲) جامع بیان العلم کے مقدمے کے اخیر میں ۱:۱۲ رقم (۱۳)

امام بدر بن جماعہؒ فرماتے ہیں کہ: نیک طالب علم سے استاذ کو دنیا اور آخرت میں جتنی بھلائیاں ملتی ہیں اپنے قریب ترین عزیز اور رشتہ دار سے بھی نہیں ملتیں؛ اسی لیے ہمارے اسلاف جن کے سینوں میں اللہ اور اللہ کے دین کے تئیں خیر خواہی کا جذبہ موجزن ہوتا تھا، اپنی محنت کے جال ڈال کر ایسے طلبہ کا شکار کیا کرتے تھے، جن سے لوگ ان کی زندگی میں بھی فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانے کے بعد بھی، بلاشبہ اگر کسی عالم کو ایک طالبِ علم بھی ایسا میسر آجائے جس کے علم، عمل، سیرت، کردار اور وعظ و نصیحت سے لوگ فائدہ اُٹھانے لگیں تو وہی ایک طالبِ علم اس کے لیے اللہ کے نزدیک کافی ہو جائے گا؛ کیونکہ جب بھی اس طالبِ علم کا علم کسی کے پاس پہنچے گا اور وہ اس علم سے فائدہ اُٹھائے گا تو اس کا اجر اس عالم کو بھی ملے گا(۱)۔

امام غزالیؒ کی ذات کو اُسوہ بنائیے:

اگر اللہ تعالیٰ کسی عالم کو ایسا کوئی طالبِ علم عطا فرما دیں، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کرے جو امام غزالیؒ نے ابن العربیؒ کے ساتھ اختیار کیا تھا، جسے خود ابن العربیؒ نے بیان کیا ہے؛ چونکہ وہ قدرے طویل ہے؛ اس لیے میں اصل ماخذ کی طرف محول کرتے ہوئے صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ: مجھے یوں لگتا تھا جیسے امام غزالیؒ نے میرے لیے اپنے آپ کو فارغ کر لیا ہو، مجھے ان سے جتنا استفادہ کرنا ہو استفادہ کر لوں، انھوں نے میرے لیے اپنی جگہ مباح کر دی تھی - یعنی مجھے اپنے رہنے کی جگہ بتلا دی تھی اور وہاں آنے کی اجازت دے دی تھی - چنانچہ میں ان کے پاس صبح بھی جاتا، شام میں بھی، دوپہر میں بھی جاتا اور رات میں بھی، وہ اپنے معمول کے کپڑے میں ہوں یا پُرانے کپڑے میں ہوں۔ یعنی جس حالت میں بھی ہوتے میں چلا جاتا، اندازہ لگائیے: امام غزالیؒ نے ان کے لیے اپنے سینے کو کس قدر کشادہ کر لیا تھا(۲)۔

(۱) تذکرۃ السامع ص ۶۳

(۲) قانون التاویل ص ۴۵۰۔ ۴۵۲

ہمیں ان حضرات کے پاس اور ان جیسے دوسرے حضرات کے پاس اس قسم کی جو باتیں ملتی ہیں وہ بنیادی طور پر دو چیزوں کے اردگرد گھومتی ہیں، جن کا تذکرہ ہم پیچھے بھی کر چکے ہیں:

ایک یہ کہ: استاذ اپنے دل میں یہ بات جاگزیں کرلے کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ ہے۔

دوسرے یہ کہ: وہ اپنے آپ کو سمجھائے اور اپنے طلبہ کو بھی اس کا احساس دلائے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک مشفق اور خیر خواہ باپ کے درجے میں ہے، خواہ تربیت اور دیکھ بھال کے ذریعہ ہو، یا اس کی کتاب کی تصحیح وتقدیم کے ذریعہ۔

غرض ان دونوں خوبیوں سے آراستہ شخص سے جو باتیں صادر ہوتی ہیں، ہر مربی استاذ کو چاہیے کہ وہ ان سے آراستہ ہو اور ان کو اپنانے کی فکر کرے۔

مربی استاذ کے قوم وملّت پر اثرات:

جہاں تک مربی استاذ کے اثرات کی بات ہے: تو وہ اپنی امت کے افراد کے درمیان ان کی روح اور اخلاق وکردار کو سنوارنے والا ایک مربی ہوتا ہے، وہ اپنی قوم کا اخلاقی قائد، ان کا مصلح اور فکری پیشوا ہوتا ہے، قوم کے افراد اس کے تابع اور اس کے لشکر ہوتے ہیں اور وہ بغیر ہتھیار اور اقتدار کے ان کے دل ودماغ پر حکومت کرنے والا ایک پُرشکوہ بادشاہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ سب اسی وقت ہے جبکہ استاذ کے اندر اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور وہ اسے صحیح طور پر انجام دیتا ہو۔

منصبِ تدریس کی نازکی:

داعیِ کبیر عالمِ ربانی شیخ ابوالحسن ندویؒ نے آج سے تقریباً پچاس سال پہلے ایک

محاضرہ دیا تھا، جس کا عنوان تھا: "**كيف تُوجَّه المعارفُ في الأقطار الإسلامية؟**" (اسلامی خطوں میں تعلیم کو کس طرح عام کیا جائے) بعد میں اسے سعودی عرب کے دارالافتاء نے اپنے یہاں سے شائع کروایا تھا، اس محاضرے کے اخیر میں شیخ ندویؒ معلّم کے اثرات اور اس کام کے لیے معلّم کے انتخاب کی ضرورت واہمیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

معلّمین کے انتخاب کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بہت سے تعلیم کے داعی حضرات سمجھتے ہیں، اس انتخاب کی بنیاد محض علم، تدریسی صلاحیت اور علمی لیاقت نہیں ہوا کرتی؛ بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس انتخاب میں معلّم کی سیرت، اخلاق وکردار، اُصول واہداف اور ایمان وعقیدے کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور ان ہی کو بنیاد بنایا جائے۔

معلم کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سینے میں یہ عقیدہ اس قدر جوش مار رہا ہو کہ اس کے فکر وخیالات اور اس کے احساسات پر حاوی ہو، وہ اس کو ایک ایسا پُرجوش داعی بنا دے جس کے اندر تعب اور تھکن کا نام ونشان تک نہ ہو، ایک ایسا پختہ مؤمن جس کے دل میں شک وشبہ کا کوئی گزر نہ ہو، یہی وہ معلّم ہے جس سے نظامِ تعلیم سنورتا ہے اور اس سے متعلقہ تمام اُمور بحسن وخوبی انجام پاتے ہیں۔

میرے علم کے مطابق تعلیم سے زیادہ بڑی ذمہ داری کی حامل، اس سے زیادہ پُرخطر اور امت کے مستقبل اور اس کی زندگی کے تئیں اس سے زیادہ گہرے اثرات رکھنے والی کوئی امانت نہیں، تعلیم کے اندر پیدا ہونے والی ایک لغزش پوری امت کو گڑھے میں گراسکتی ہے؛ بلکہ اخلاق، معاشرت، سیاست، تعلیم، لادینیت اور الحاد کے اندر اضمحلال، تشتت اور انتشار تک پہنچا سکتی ہے؛ دوسری طرف یہی تعلیم اس بات کی بھی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ تنِ تنہا انسانی نفوس وعقول کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دے اور امت کی نشأۃِ ثانیہ کرکے اسے ایک روشن مستقبل عطا کرے۔

یہ کمال اور مردانگی نہیں کہ شرف ومنزلت عطا کرنے والی اس ذمہ داری سے بھاگا جائے، کمال اور مردانگی اور بلند ہمتی تو یہ ہے کہ اُس ذمہ داری کو ادا کرنے کا بیڑا اُٹھایا جائے، جو امت کی طرف سے اس تعلیم کے کاندھوں پر ڈالی گئی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ تعلیم امت کی بیداری میں بڑا کردار ادا کرے؛ بلکہ کہہ لیجیے بیداری کی بنیاد رکھے، جس پر آگے چل کر ان شاء اللہ معاشرے کی عمارت قائم ہوگی۔

معلم کے اسی مقام، ان ہی اثرات اور ان ہی ذمہ داریوں کی وجہ سے ﴿وَ أُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹) کی تفسیر میں علمائے کرام: امراء وحکام کے مماثل ہو گئے ہیں کہ یہ زبان کے اعتبار سے ''اولوالامر'' ہیں اور وہ تلوار کے اعتبار سے، اور دونوں ہی چیزیں ضروری ہیں۔

علمائے کرام نے معلّم کی ذمہ داریوں کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؛ تاکہ معلّم کا نفع اور اس کے اثرات زیادہ سے زیادہ عام اور تام ہوسکیں، میں ان میں سے کچھ ذمہ داریوں کو آنے والے معلّم میں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کررہا ہوں، واللہ ولی التوفیق۔

پہلی مشعل

مربی استاذ کی اہم ذمہ داریاں

استاذ کی اہم ذمہ داریاں یہ ہیں:

ا۔ آخرت مقصود ہو:

استاذ اپنے پڑھانے اور تربیت کرنے میں مخلص ہو(۱)۔

۲۔ علم پر عمل:

وہ جو کچھ طلبہ کو سکھائے اور جن چیزوں کا بھی انھیں خُوگر بنائے، خود بھی ان پر عمل کرے۔

ان دونوں باتوں کو اختصار کے ساتھ حافظ ابنِ رجبؒ نے حدیثِ پاک "**إنّ الأنبياء لم يورّثوا دينارا ولا درهمًا إنما ورثوا العلم**" (کہ انبیاءؑ دینار اور درہم کا وارث نہیں بناتے؛ بلکہ علم کا وارث بناتے ہیں) کی تشریح میں ذکر کیا ہے، یہ حضرت ابوالدرداءؓ کی حدیث کا ایک ٹکڑا ہے، جس کا آغاز "**من سلك طريقا يلتمس فيه علما**" سے ہوتا ہے، حافظ ابنِ رجبؒ فرماتے ہیں(۲) کہ:

اس حدیث میں دو چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ایک یہ کہ عالم جو حقیقت میں

(۱) اسی سے ملتی جلتی گفتگو طالبِ علم کے اخلاص کے تعلق سے ہے جو پیچھے پہلے معلم میں ص ۶۵ پر گزر چکی ہے۔

(۲) ص ۵۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث ہوتا ہے؛ کیونکہ اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم وراثت میں لیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ دوسروں کو بھی اس علم کا وارث بنائے، جیسا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسروں کو اس علم کا وارث بنایا اور علم کا وارث بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تعلیم، تصنیف یا کسی اور طریقے سے جس سے لوگ اس کے علم سے فائدہ اُٹھاتے رہیں، اس علم کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جائے۔

صحیح حدیث میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ: جب انسان مرجاتا ہے تو اس سے اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے تین چیزوں کے: یا تو کوئی صدقۂ جاریہ ہو یا ایسا علم ہو جس سے لوگ نفع اُٹھائیں یا کوئی نیک لڑکا ہو جو اس کے لیے دعا کرے(۱)۔

پس جب کوئی عالم کسی شخص کو پڑھاتا ہے، جو اس کے بعد اس علم کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، تو وہ اپنے پیچھے علمِ نافع بھی چھوڑ جاتا ہے، اور صدقۂ جاریہ بھی؛ کیونکہ علم سکھانا بھی ایک طرح کا صدقہ ہے، پھر جن لوگوں کو سکھاتا ہے وہ نیک اولاد کے درجے میں ہوتے ہیں، جو اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اس طرح اپنے پیچھے علم چھوڑ کر جانے والے کو تینوں چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں۔

دوسری بات: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل درجے کی میراث یہ ہے کہ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے کوئی دنیا نہیں چھوڑی، عالم بھی اپنے پیچھے دنیا کا مال ودولت نہ چھوڑے، دنیا سے زہد، دنیا کو کم سے کم جمع کرنا اور تھوڑے پر اکتفا کرنا یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کی اتباع میں داخل ہے۔

اس کے بعد حافظ ابنِ رجبؒ نے حسبِ عادت دنیا سے زہد کے سلسلے میں اسلاف کے متعدد اقوال وافعال کو ذکر کیا ہے۔

---

(۱) مسلم ۳: ۱۲۵۵ (۱۴)

۳۔ ہر قول وعمل کو اخلاص سے مزین کرنا:

استاذ کے اندر جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ وہ اب امت کے لیے مقتدی بن چکا ہے، تو اس کی ذمہ داری ہے کہ اس احساس کے ساتھ اس کے اندر اخلاص بھی پیدا ہو، وہ مقتدی ہو کر جو کچھ کہے اور جو کچھ کرے اس کو اخلاص کے ساتھ مزین کرنے کی فکر کرے، بلا شبہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کو جاننے والے ہیں۔

اخلاص کے کچھ واقعات:

میں اس موقع پر نقب لگانے والے شخص کا وہ واقعہ یاد دلانا چاہوں گا جو پیچھے کہیں گزرا ہے[1]۔

نیز اس موقع پر ایک اور واقعہ ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ابنِ ابی شیبہؒ نے میمون بن ابی شبیبؒ (۸۳ھ) سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، میرے ذہن میں ایک ایسی بات آئی، جسے اگر میں اپنی کتاب میں لکھ دیتا تو میری کتاب میں چار چاند لگ جاتے؛ لیکن میں جھوٹ بولنے والا ہوتا اور اگر چھوڑ دیتا تو کتاب میں نقص رہ جاتا؛ لیکن میں سچ بولنے والا ہوتا، میں تردد میں پڑ گیا کہ کیا کروں، ایک مرتبہ دل کہتا کہ لکھ دو اور دوسری مرتبہ کہتا کہ: مت لکھو، بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ نہیں لکھنا ہے اور اسے چھوڑ دیا، کہتے ہیں کہ: اسی وقت بیت اللہ کی طرف سے -شاید قبلہ کی طرف سے مراد ہے- ایک آواز آئی ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ (ابراہیم: ۲۷) (اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات یعنی کلمہ طیبہ کی برکت سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے)[2]۔

---

(۱) ص ۶۵

(۲) مصنف (۵۴۴۵)

امام اکمل بابرتیؒ نے اپنی شرح ''عنایہ'' کے مقدمے میں اور امام عینیؒ نے ''بنایہ'' میں تحریر فرمایا ہے کہ: صاحبِ ہدایہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی یہ کتاب تیرہ سال میں مکمل کی، اس طویل عرصہ میں وہ ہمیشہ روزہ سے رہے، کبھی ناغہ نہیں کیا، وہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کے روزے کی کسی کو خبر نہ ہو؛ چنانچہ خادم جب کھانا لے کر آتا تو اس سے کہتے کہ: اس کو رکھ کر چلے جاؤ اور اس کے جانے کے بعد وہ کھانا طلبہ وغیرہ کو کھلا دیتے، اسی زہد وورع کی وجہ سے ان کی کتاب علماء کے درمیان نہایت مقبول ہوئی[1]۔

استاذ کو چاہیے کہ جب وہ پڑھانے بیٹھے تو اپنے دل کو اس حالت پر رکھنے کی کوشش کرے جس حالت پر امام مالکؒ کے شاگرد اور ان کے جانشین امام ربانی عبدالرحمٰن بن القاسم العتقیؒ رکھا کرتے تھے، ''ترتیب المدارک''[2] میں ہے کہ: جب تک ان کے سامنے حدیث کی قرأت ہوتی رہتی، وہ برابر اپنی اُنگلی اُوپر اُٹھائے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ رہتے اور توفیق اور سلامتی کی دعا کرتے رہتے، توفیق کی دعا پڑھنے اور پڑھانے کے سلسلے میں اور سلامتی کی دعا لغزش سے بچنے کے لیے، اپنے لیے بھی اور طلبہ کے لیے بھی؛ کیونکہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہیں۔

استاذ اپنے ذہن میں ہرگز یہ بات نہ آنے دے کہ تعلیم بھی دیگر پیشوں کی طرح ایک پیشہ ہے، تعلیم تو عظیم ترین عبادت ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ: تعلیم ہی وہ اصل اور بنیاد ہے جس پر دین کی بقا ٹکی ہوئی ہے، اسی سے علم مٹنے سے محفوظ رہ سکتا ہے، وہ دین کے اہم ترین اُمور اور عظیم ترین عبادات میں سے ہے اور انتہائی مؤکد فرضِ کفایہ ہے[3]۔ اس کے بعد انھوں نے اس پر قرآن وسنت کے دلائل بھی پیش کیے ہیں، ان کا یہ پورا کلام نہایت ہی اہم اور نفیس ہے، اس کے ہر جملہ میں ایک سبق اور ایک ذمہ داری ملتی ہے۔

---

(۱) بابرتی ۱:۸ عینی ۱:۵۱ (۲) ۱:۵۷۷

(۳) مقدمہ ''مجموع'' ۱:۳۰

۴۔اللہ ورسولؐ کی جانشینی کا احساس:

تعلیم کے اس مقام پر استاذ کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے دل کو اِس بات کا احساس دلائے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانشینی کے مقام پر ہے، وہ لوگوں تک اللہ کی شریعت اور اس کے رسولؐ کی سنت پہنچا رہا ہے، وہ فتویٰ دیتے وقت اپنی طرف سے نہیں؛ بلکہ اللہ کی طرف سے دستخط کر رہا ہے، جیسا کہ ہم نے اس بحث کے آغاز میں بیان کیا(۱)۔

۵۔طلبہ کے لیے اُسوہ ہونے کا احساس:

استاذ کے ذمہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تعلیم کے اس مقام پر اپنے آپ کو اِس بات کا بھی احساس دلائے کہ وہ اپنے طلبہ کے سامنے قدوہ اور اُسوہ کے مقام پر ہے، اُس کے ہر عمل اور ہر حرکت کے اندر اس کی زبانِ حال طلبہ کو یہ بتلاتی ہے کہ: یہ چیز صحیح ہے اور یہ چیز غلط ہے، یہ چیز درست ہے اور یہ چیز جائز ہے وغیرہ وغیرہ، یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ وہ اپنے قول وعمل اور اپنی تعلیم وتلقین میں اپنے اُوپر کڑی نظر رکھے۔

استاذ کو چاہیے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی وہ حدیث یاد دلاتا رہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا، جس سے اس کے پیٹ کی انتڑیاں باہر آجائیں گی اور وہ ان کو لے کر ایسے گھومے گا جیسے گدھا چکی کو لے کر گھومتا ہے، یہ منظر دیکھ کر اہلِ جہنم اس کے پاس جمع ہو جائیں گے اور کہیں گے: اے فلاں! تجھے کیا ہو گیا؟ کیا تو لوگوں کو بھلائی کا حکم نہیں دیتا تھا؟ کیا تُو بُرائی سے نہیں روکتا تھا؟ وہ کہے گا: ہاں! میں بھلائی کا حکم دیتا تھا؛ لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا اور بُرائی سے روکتا تھا؛ لیکن خود نہیں بچتا تھا(۲)۔

(۱) ص ۴۷

(۲) بخاری (۳۲۶۷) مسلم ۴: ۲۲۹۰ (۵۱)

۶۔ دین کو پہنچانے کی حرص ہو:

استاذ کو چاہیے کہ وہ بالعموم تمام لوگوں تک اور بالخصوص ان طلبہ تک جو اس سے استفادے کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، دین پہنچانے کا حریص ہو اور اس سلسلے میں حضرت ابوذر غفاریؓ کے اس جملے کو اپنا امام اور قدوہ بنالے کہ: اگر تم لوگ اس پر۔ یعنی میری گردن پر۔ تیز تلوار رکھ دو اور مجھے توقع ہو کہ کوئی بات جو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے تمہارے گردن اُڑانے سے پہلے اس کو بیان کرسکتا ہوں، تو ضرور بیان کر کے رہوں گا(۱)۔

ابنِ ابی العوامؒ نے امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا ہے، وہ اپنے بعض شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے کہ: اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اس علم کا جو میرے پاس ہے اور میرے دل میں ہے، تم سے بٹوارا کرلیتا(۲)۔

امام سبکیؒ نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنے شاگرد ربیع بن سلیمان مرادی سے فرمایا کہ: ربیع! اگر میرے بس میں ہوتا تو تمہیں یہ علم کھانے کی طرح لقمہ بنا کے کھلا دیتا(۳)۔

اسد بن فراتؒ کہتے ہیں کہ: میں ابن القاسمؒ سے جب بھی رخصت ہوا۔ یعنی کسی سفر پر گیا۔ تو انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ: میں تمھیں اللہ سے ڈرنے، قرآنِ کریم کو لازم پکڑنے اور اس علم کو پھیلانے کی وصیت کرتا ہوں(۴)۔

---

(۱) اس اثر کو امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' کے شروع ۱: ۱۶۰ (باب ۱۰ کتاب العلم) میں تعلیقاً روایت کیا ہے۔

(۲) مناقب الامام ابی حنیفۃ ص ۳۱۲

(۳) طبقات ۲: ۱۳۴

(۴) ترتیب المدارک ۱: ۶۰۹

۷۔ طلبہ کو ان کے معیار کے مطابق علم دینا:

استاذ اِس بات کی پوری کوشش کرے کہ وہ طلبہ تک زیادہ سے زیادہ مقدار میں علم پہنچائے؛ جس سے انھیں اپنی استعداد اور اپنے متعلقہ مضمون میں فائدہ پہنچے، طلبہ کو ان کے ذہن اور ان کے معیار سے زیادہ عطا کرنا بھی نقصان دہ ہے اور ان کے حق سے کم دینا بھی ناپ تول میں کمی کی طرح ناجائز ہے۔

۸۔ مشق اور تجربہ:

مشق، تجربہ اور تدریسی صلاحیت بھی اہم چیز ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ جس استاذ کو پڑھاتے ہوئے کئی سال گزر جاتے ہیں ان کے لیے نئی اور مشکل معلومات طلبہ کے ذہنوں تک پہنچانا آسان ہوتا ہے، برخلاف نئے استاذ کے، کہ ان کو دقتیں پیش آتی ہیں۔

استاذ کی اس خوبی کی طرف امام ابوحنیفہؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے، وہ اپنے استاذ حماد بن ابی سلیمانؒ سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: میں حماد بن ابی سلیمان کے پاس آیا، تو انھیں ایک باوقار اور بردبار استاذ پایا، میں نے دیکھا کہ وہ سمجھتے بھی خوب ہیں اور سمجھاتے بھی خوب ہیں، میں نے ان کو لازم پکڑ لیا اور ان کے پاس ہر وہ چیز پائی جس کی مجھے ضرورت ہوئی، تا آں کہ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگے کہ: ابوحنیفہ! تم نے مجھے بالکل چُوس لیا(۱)۔

۹۔ طلبہ و اساتذہ میں باہمی محبت:

استاذ کے ذمہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اور طلبہ کے درمیان باہمی محبت پیدا کرنے کی کوشش کرے؛ تا کہ استاذ اور شاگرد دونوں کو ان کے مطلوبہ فوائد مل سکیں، استاذ کو اجر وثواب، صدقۂ جاریہ اور مقبولیت حاصل ہو اور طلبہ استاذ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں اور استفادہ کرسکیں۔

---

(۱) مناقب ابی حنیفہ للموفق المکی ص ۵۸

۱۰۔ طلبہ کی حوصلہ افزائی:

طلبہ کے ساتھ اس محبت کو پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ استاذ ان پر سختی نہ کرے، نہ ان کے حوصلے پست کرے؛ بلکہ ان کو ہمت دلائے، انھیں خوش خبریاں سنائے کہ آگے چل کر وہی لوگ علماء اور امت کے قائد بننے والے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ابنِ ابی العوامؒ نے حسن بن زیاد لؤلؤیؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں امام زفرؒ[1] اور امام ابو یوسفؒ دونوں کے پاس فقہ حاصل کرنے جاتا تھا، امام ابو یوسفؒ پڑھانے میں امام زفرؒ سے زیادہ کشادہ دل تھے، میں پہلے امام زفرؒ کے پاس جاتا اور جو مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آتا میں ان سے پوچھتا، وہ مجھے سمجھاتے؛ لیکن میری سمجھ میں نہ آتا، جب وہ سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتے تو فرماتے: تمہارا ناس ہو، تمہارے پاس کوئی دنیوی تجارت اور پیشہ نہیں ہے؟ جاؤ وہی کرلو؟ میں نہیں سمجھتا کہ تم کبھی کچھ بن پاؤ گے! میں وہاں سے شکستہ دل اور مغموم ہوکر نکلتا، پھر امام ابو یوسفؒ کے پاس آتا اور ان سے مسئلہ سمجھنے کی کوشش کرتا، وہ مجھے سمجھاتے، اگر سمجھ میں نہ آتا تو فرماتے: کوئی بات نہیں گھبراؤ مت، کچھ دیر بعد پھر پوچھتے کہ: کیا اب بھی وہی حال ہے جو شروع میں تھا؟ میں کہتا کہ: نہیں! اب کچھ باتیں سمجھ میں آ گئی ہیں؛ لیکن اب بھی جتنا سمجھنا چاہ رہا تھا نہیں سمجھ پایا، وہ فرماتے: کوئی بات نہیں، جو چیز کسی وقت ناقص رہتی ہے وہ کامل ہو ہی جاتی ہے، صبر کرو، مجھے اُمید ہے کہ تم جتنا سمجھنا چاہ

---

(۱) یہ امام ابو حنیفہؒ کے ایک جلیل القدر شاگرد امام زفر بن ہذیل عنبریؒ ہیں۔

زفر کے معنی: عربی میں شیر بہادر اور سمندر کے ہیں، امام فیروز آبادیؒ نے اپنی ''قاموس'' کے مقدمے میں کتاب کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: وہ اس قاموس کے اندر اپنی ایک دوسری بڑی کتاب ''**اللامع المُعْلَم العُجاب**'' کا اختصار کرنا چاہتے تھے، آگے لکھتے ہیں: ''**جعلت بتوفيق الله زُفَرًا في زافر**'' کہ میں نے اللہ کے فضل سے سمندر کو مٹکے میں سمو دیا، زافر کے معنیٰ مٹکے کے ہیں، یعنی کتاب کو اتنا مختصر کردیا گویا وہ دریا بکوزہ ہوگئی۔

رہے تھے سمجھ جاؤ گے، مجھے ان کے اس صبر وتحمل پر بڑی حیرت ہوتی (۱)۔

حافظ ابوطاہر سلفی نے اپنی سند سے امام قدوریؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابوجعفر طحاویؒ امام مزنیؒ کے پاس پڑھتے تھے، ایک روز امام مزنیؒ نے ان سے کہہ دیا کہ: بخدا! تم کبھی کامیاب نہیں ہوسکو گے، اس پر امام طحاویؒ کو غصہ آگیا اور وہاں سے چلے آئے اور آکر امام ابوحنیفہؒ سے فقہ حاصل کیا اور مسلکِ حنفی کے امام بنے، یہی وجہ ہے کہ امام طحاویؒ جب سبق پڑھاتے یا کوئی پیچیدہ مسئلہ حل کرتے تو فرماتے: اللہ تعالیٰ ابوابراہیم مزنیؒ پر رحم فرمائے، اگر وہ آج زندہ ہوتے اور مجھے دیکھتے تو انھیں اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا (۲)۔

۱۱۔طلبہ کی خبر گیری:

طلبہ کے ساتھ باہمی محبت پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ: جب ان میں سے کوئی غائب ہو تو اس کے ساتھیوں سے اس کے بارے میں دریافت کرے، اس پر توجہ دے، اگر بیمار ہو تو عیادت کرے اور ان چیزوں کا ان سے اظہار بھی کرے، اسی طرح ان کی مالی ضروریات اور دوسرے نجی معاملات کی خبر گیری کرے اور اہم موقعوں پر ان کے قریبی متعلقین مثلاً والدین بھائی وغیرہ کے حال احوال بھی دریافت کرے۔

اسلاف کا ہونہار طلبہ پر توجہ دینا

ابوبکر رازیؒ کا واقعہ:

قاضی محمد بن محمد بن حسین بن محمد ابن ابی یعلی الفراء حنبلیؒ (۳) فرماتے ہیں کہ: میرے دادا حسین بن محمد نے امام ابوبکر رازیؒ سے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک پڑھا تھا، امام ابوبکر رازیؒ

(۱) مناقب الامام ابی حنیفہ (۶۷۳)

(۲) معجم السفر ص ۵ (ترجمہ: ۷)

(۳) طبقات ۳: ۶۴ ۱۳ اپنے والد کے ترجمے میں

کا مقام و مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں، مطیع اللہ اور معز الدولہ دونوں نے انہیں قاضی القضات بننے کی پیش کش کی تھی، جسے انھوں نے ٹھکرا دیا تھا؛ لیکن میرے دادا ابو عبداللہ کو وہ اتنا مانتے تھے کہ ایک مرتبہ میرے دادا سو (۱۰۰) دن تک بیمار رہے، تو اس عرصے میں امام رازی پچاس مرتبہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے، جس کے لیے وہ کرخ کے مغربی علاقے درب عبدہ سے چل کر مشرقی علاقے باب الطاق تک آتے تھے، جب میرے دادا ٹھیک ہو گئے اور مجلس میں حاضر ہوئے، تو امام موصوف نے فرمایا کہ: ابو عبداللہ! تم سو دن بیمار رہے، جس میں ہم نے پچاس مرتبہ تمہاری عیادت کی؛ لیکن یہ بھی تمہارے حق میں کم ہے[1]۔

اللہ تعالیٰ رحمتیں نازل فرمائے ان نفوسِ قدسیہ پر جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے ذریعہ مصفی ومجلیٰ کر دیا تھا۔

شاگرد کی خبر گیری کرنے سے کبھی کبھی اپنی توجہ کا احساس دلانے کے علاوہ کوئی علمی فائدہ بھی ہو جاتا ہے؛ چنانچہ خطیب بغدادیؒ نے ابراہیم نخعیؒ کے شاگرد مغیرہ بن مقسم ضبیؒ سے سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ: مغیرہ نے ایک روز ابراہیم نخعیؒ کے یہاں پہنچنے میں تاخیر کردی، ابراہیم نخعیؒ نے ان سے دریافت فرمایا کہ: مغیرہ! کیا بات ہے تاخیر کیسے ہوگئی؟ مغیرہ نے فرمایا کہ: ہمارے پاس ایک شیخ -یعنی حدیث کے ایک راوی- آ گئے، تو ہم ان سے احادیث لکھنے لگے، ابراہیم نخعیؒ فرمانے لگے کہ: ہمارا حال تو یہ تھا کہ ہم ان ہی لوگوں سے احادیث لکھتے تھے، جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام سے امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جبکہ تم شیخ -یعنی غیر عالم راوی- کو دیکھو گے کہ وہ حدیث بیان کرے گا تو حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے گا اور اسے اس کی خبر بھی نہیں ہوگی (۲)۔ اس طرح امام نخعیؒ نے

---

(۱) اس خبر کے اعتبار سے امام ابنِ عبدالبرؒ کا ''الاستغناء'' (۱/ ۵۷۲) میں یہ کہنا کہ: ''عام طور پر حنابلہ امام ابوحنیفہؒ کی مذمت پر ہیں'' محل نظر ہے۔

(۱) الکفایہ ص ۱۶۹

نہ صرف مغیرہ کی خبر گیری کی؛ بلکہ ان کے لیے اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کے لیے زندگی بھر کے علمی سفر کے واسطے ایک سبق اور ایک علمی و عملی منہج متعین کر دیا۔

مریض کی عیادت تو ویسے بھی سنتِ نبویؐ ہے، اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی طلبہ کی خبر گیری کے واقعات اسلاف سے منقول ہیں، جن میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے امام ابو یوسفؒ کی مادی ضروریات کی خبر گیری کا واقعہ بھی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا اپنے شاگرد پر توجہ دینا:

امام صیمریؒ نے اپنی سند سے امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں حدیث اور فقہ حاصل کر رہا تھا، میں ایک تنگ دست اور پراگندہ حال طالبِ علم تھا، ایک روز میں امام ابوحنیفہؒ کے حلقۂ درس میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے والد مجھے لینے کے لیے آئے، میں والد صاحب کے ساتھ چلا گیا، والد صاحب کہنے لگے: بیٹا! ابوحنیفہؒ کے ساتھ اپنے پیر مت پھیلاؤ، ابوحنیفہ تو بھنی ہوئی روٹی کھاتے ہیں اور تمھیں معاش کی سخت ضرورت ہے، میں نے والد صاحب کی خواہش کو ترجیح دی اور حصولِ علم میں کمی کر دی، ادھر امام ابوحنیفہؒ نے مجھے تلاش کیا اور میرے حال احوال دریافت کیے، جس کے بعد میں پھر سے ان کی مجلس میں جانے لگا، جس روز میں ناغوں کے بعد پہلے دن ان کی مجلس میں پہنچا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ: تم کیوں نہیں آ رہے تھے؟ میں نے کہا: معاش کی مشغولیت اور والد صاحب کی اطاعت کی وجہ سے، یہ کہہ کر میں حلقۂ درس میں بیٹھ گیا، سبق کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو امام صاحب نے مجھے ایک تھیلی پکڑائی، اور فرمایا کہ: لو اس سے خرچ کرو، میں نے دیکھا تو اس میں سو درہم تھے، انھوں نے فرمایا کہ: اب حلقۂ درس کو لازم پکڑ لو اور جب یہ درہم ختم ہو جائیں تو مجھے بتا دینا، میں نے ان کے حلقۂ درس کو لازم پکڑ لیا، کچھ دنوں کے بعد انھوں نے دوبارہ مجھے سو درہم عطا کیے، اور اس کے بعد وہ برابر میرا خیال رکھتے رہے، میں نے انھیں کبھی کسی ضرورت کے بارے میں نہیں بتایا، نہ کسی چیز کے ختم ہونے کی

خبر دی؛ لیکن ایسا لگتا تھا وہ خود ہی بھانپ جاتے تھے، بالآخر وہ وقت بھی آیا جب میں مالدار ہو گیا اور مجھے ان دراہم کی ضرورت نہیں رہی(۱)۔

امام محمدؒ کا واقعہ:

امام اسد بن فراتؒ اپنے عراق کے سفر کے دوران امام محمدؒ کے یہاں قیام کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ: امام محمدؒ نے ایک روز مجھے ماء السبیل (راستے کا پانی) پیتے ہوئے دیکھا، تو فرمانے لگے: تم یہ پانی پی رہے ہو؟! میں نے کہا: جی! میں ابنِ سبیل (تنگدست مسافر) ہوں، جب رات ہوئی تو امام محمدؒ نے میرے پاس اَسّی (۸۰) درہم بھجوائے اور فرمایا کہ: مجھے پتہ نہیں تھا کہ تم ابنِ سبیل ہو، پھر جب اسد نے افریقہ جانے کا ارادہ کیا تو ان کے پاس اتنا مال نہیں تھا جس سے وہ افریقہ کا سفر کر سکیں، انھوں نے امام محمدؒ سے اس کا تذکرہ کیا، امام صاحبؒ نے فرمایا: ٹھیک ہے میں ولی عہد سے تمہارا تذکرہ کرتا ہوں؛ چنانچہ امام محمدؒ نے ولی عہد سے ملاقات کی اور اسد کے بارے میں ان سے گفتگو کی(۲)۔ آگے طویل قصہ ہے، جس میں ہے کہ: ولی عہد نے اسد کے لیے دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا۔

سعید بن مسیّب کا عبرت آموز واقعہ:

شاگردوں کے تفقدِ احوال کے سلسلے میں سیّد التابعین سعید بن مسیّبؒ کا اپنے شاگرد کثیر بن عبدالمطّلب کے ساتھ قصہ مشہور ہے، ان کے شاگرد کثیر بیان کرتے ہیں(۳) کہ: میں سعید بن مسیّب کے یہاں جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ انھوں نے چند روز تک مجھے غائب

(۱) **أخبار أبي حنيفة** ص ۹۲، ان ہی سے خطیب نے تاریخِ بغداد میں روایت کیا ہے۔

(۲) ترتیب المدارک ۱: ۶۱۰

(۳) حلیۃ الاولیاء ۲: ۱۶۷۔۱۶۸

پایا، جب میں حاضر ہوا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ: تم کہاں تھے؟ میں نے کہا کہ: اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا، اسی میں مشغول تھا، کہنے لگے کہ: بتایا کیوں نہیں؟ ہم بھی جنازے میں شریک ہو جاتے، پھر جب میں وہاں سے آنے لگا تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ: کوئی نئی عورت دیکھی ہے؟ میں نے کہا: اللہ آپ پر رحم فرمائے، مجھے اپنی بیٹی دینے کے لیے کون تیار ہو گا، میرے پاس اس وقت صرف دو تین درہم ہیں، کہنے لگے: میں دُوں گا، میں نے حیرت سے کہا: آپ دیں گے؟ انھوں نے فرمایا: ہاں! پھر وہیں خطبہ پڑھا اور دو یا تین درہموں پر اپنی بیٹی سے میرا نکاح کر دیا۔

کثیرؒ فرماتے ہیں کہ: میں وہاں سے اُٹھ کر باہر آیا، خوشی سے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، میں نے گھر کا رُخ کیا اور سوچنے لگا کہ کس سے پیسے مانگوں، کس سے قرض لُوں، اسی حال میں مغرب کی نماز پڑھ کر گھر آ گیا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا، میں تنہا تھا اور روزے سے بھی تھا، میں نے افطار کے لیے رات کا کھانا اُٹھایا، جس میں ایک روٹی تھی اور تھوڑا سا تیل تھا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی، میں نے پوچھا: کون؟ جواب ملا: سعید، میرے ذہن میں سعید نام کے تمام لوگ آئے؛ سوائے سعید بن مسیّب کے؛ کیونکہ چالیس سال سے وہ صرف گھر اور مسجد کے درمیان ہی دیکھے گئے تھے، میں کھڑا ہوا اور باہر نکلا تو دیکھا سعید بن مسیبؒ کھڑے ہیں، میرے ذہن میں خیال پیدا ہوا کہ: شاید انھیں اپنے فیصلہ میں غلطی کا احساس ہو گیا ہے، میں نے کہا: ابو محمد! آپ نے مجھے ہی کیوں نہ بلوا لیا، میں خود ہی حاضر خدمت ہو جاتا؟ وہ کہنے لگے: نہیں! مجھے ہی تمہارے پاس آنا چاہیے تھا۔

میں نے کہا: میرے لیے کیا حکم ہے؟ کہنے لگے کہ: تم بغیر عورت کے تھے، پھر تم نے شادی کی، مجھے اچھا نہیں لگا کہ تم تنہا رات گزارو، یہ لو یہ تمہاری بیوی ہے، میں نے دیکھا تو وہ ٹھیک ان کے پیچھے کھڑی تھی، انھوں نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور دروازے کے اندر کر کے

دروازہ بند کردیا، وہ لڑکی مارے شرم کے نیچے گر پڑی، میں نے دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور اسے لے کر اس پیالے کے پاس آیا جس میں تیل اور روٹی رکھی تھی؛ لیکن اسے چراغ کے سائے میں رکھ دیا؛ تاکہ وہ دیکھ نہ پائے۔

اس کے بعد میں چھت پر چڑھ کر پڑوسیوں کو بلانے لگا، وہ لوگ میرے پاس آئے اور کہنے لگے: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: ارے کم بختو! سعید بن مسیّبؒ نے آج اپنی صاحبزادی سے میرا نکاح کردیا ہے اور بغیر بتائے اسے گھر بھی لے آئے ہیں، وہ لوگ حیرت سے کہنے لگے: سعید بن مسیّبؒ نے نکاح کردیا ہے؟! میں نے کہا: ہاں! دیکھو وہ گھر میں موجود ہے، وہ سب اُتر کر نیچے آئے، میری والدہ کو بھی خبر پہنچ گئی، وہ بھی آگئیں، کہنے لگیں: دیکھو میرا چہرا تمہارے چہرے سے حرام ہے، اگر تم نے اسے تین دن سے پہلے چھولیا، پہلے میں اس کو تین دن تک تیار کروں گی، کثیر کہتے ہیں کہ: پھر میں تین دن ٹھہرا رہا اور تین دن کے بعد اس کے پاس گیا، تو دیکھا انتہائی خوبصورت اور حسین وجمیل لڑکی ہے، قرآن کی سب سے بڑی حافظہ، حدیث وسنت کا سب سے زیادہ علم رکھنے والی اور شوہر کے حقوق سے سب سے زیادہ واقف کار۔

اسلاف کے اس نوع کے واقعات بے شمار ہیں اور ان سے ملنے والے پیغام اور عبرت آمیز باتیں اور بھی کہیں زیادہ ہیں، بلاشبہ یہ لوگ عملی اسلام کے چراغ اور حق اور صراطِ مستقیم کے منارۂ نُور تھے۔

مربی حضرات کی دیگر ذمہ داریوں سے متعلق اربابِ سلوک کے اقوال

امام غزالیؒ نے طالب علم کے تئیں استاذ کی کچھ ذمہ داریاں بیان کی ہیں، جن کی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے[1]، امام بدر بن جماعہؒ نے انھیں چودہ تک پہنچایا ہے[2]، جن میں سے بعض چیزیں تو دونوں کے یہاں ایک ہی ہیں اور بعض چیزیں نئی ہیں، جو دوسرے کے پاس نہیں ہیں، اس سلسلے میں امام نوویؒ نے بھی نہایت تفصیل کے ساتھ کافی عمدہ کلام کیا ہے[3] میں اس موقع پر صرف امام غزالیؒ کے عناوین نقل کرتا ہوں۔

امام غزالیؒ کی بیان کردہ ذمہ داریاں:

وہ فرماتے ہیں:

پہلی ذمہ داری: یہ ہے کہ استاذ اپنے طلبہ کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے اور انھیں اپنی اولاد کی طرح سمجھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**إنما أنا لكم بمنزلة الوالد**"[4] میں تم لوگوں کے لیے باپ کے درجے میں ہوں، وہ اپنے طلبہ کو آخرت کی

(۱) احیاء العلوم ۵۵۔۵۸

(۲) تذکرۃ السامع والمتکلم ۴۷-۶۶

(۳) المجموع ۱: ۲۸۔۳۵، اس کا سب سے اہم حصہ ص ۳۰ سے "**ومن آدابه: آداب تعليمه**" کے عنوان سے شروع ہوتا ہے، اس کو غور وتدبر کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

آگ سے نجات دلانے کی فکر کرے، جس طرح والدین اپنی اولاد کو دنیا کی آگ سے بچانے کی فکر کرتے ہیں، اور آخرت کی آگ سے بچانا تو کہیں زیادہ اہم ہے۔

دوسری ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرتے ہوئے علمی افادے پر کوئی اُجرت طلب نہ کرے اور نہ اس پر کسی بدلے یا شکریے کا طلبگار ہو، اس کا پڑھانا صرف اور صرف اللہ کے لیے ہو (اس ذمہ داری کو امام موصوف نے تفصیل سے بیان کیا ہے)۔

تیسری ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ طالبِ علم کی نصیحت اور خیر خواہی میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑے، وہ اس کو استحقاق سے پہلے کسی مرتبے اور منصب کے درپے ہونے سے روکے اور علمِ جلی سے فراغت سے قبل علمِ خفی میں مشغول ہونے سے باز رکھے؛ وہ اس کو بتائے کہ حصولِ علم کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب ہونا چاہیے۔

چوتھی ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ طالبِ علم کو بُرے اخلاق وعادات سے باز رکھے؛ البتہ یہ روکنا حتی المقدور اشارے، کنایے اور نرمی کے ساتھ ہو، صراحۃً اور ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ نہ ہو۔

پانچویں ذمہ داری: یہ ہے کہ کسی بھی علم کو پڑھانے والا استاذ طالبِ علم کے سامنے دوسرے علوم کی بُرائی نہ کرے، جیسا کہ زبان ولغت کے استاذ کی عادت ہوتی ہے کہ وہ علمِ فقہ کی بُرائی کرتا ہے اور فقہ کا استاذ علمِ حدیث اور علمِ تفسیر کی بُرائی کرتا ہے۔

چھٹی ذمہ داری: یہ ہے کہ وہ طالبِ علم کے ساتھ اس کی فہم کے اعتبار سے اعتدال کا راستہ اختیار کرے، ایسی باتیں نہ بتائے جو اس کے ذہنی سطح سے اُونچی ہوں، اس سے وہ

☜ (۴) یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے جو ابو داود (۸)، سنن صغریٰ للنسائی (۴۰)، ابن ماجہ (۳۱۳)، التقاسیم والانواع لابن حبان (۱۵۲۳) مسند احمد ۲: ۲۴۷، ۲۵۰ میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، اور اس کی اصل صحیح مسلم ۱: ۲۲۳ (۵۷) میں ہے۔

متنفر ہو جائے گا یا اس کی عقل خبط ہو کر رہ جائے گی، یہ مناسب نہیں ہے کہ عالم اپنی ہر جانی ہوئی بات ہر ایک سے بیان کرتا پھرے۔

ساتویں ذمہ داری: یہ ہے کہ کم فہم طالبِ علم کے سامنے اس کے مناسب بالکل واضح باتیں ہی بیان کی جائیں۔

آٹھویں ذمہ داری: یہ ہے کہ استاذ اپنے علم پر عامل ہو، اس کے عمل سے اس کے قول کی تکذیب نہ ہوتی ہو، جب عمل علم کے مخالف ہوتا ہے تو وہ ہدایت سے مانع بن جاتا ہے اور جب کوئی شخص کسی چیز کو خود کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ: اس کو مت کرو، تو وہ ہلاکت خیز زہر ثابت ہوتا ہے، لوگ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں، اس کو متہم کرتے ہیں اور جس چیز سے انھیں روکا گیا ہے اس کے اور زیادہ حریص ہو جاتے ہیں کہ: یہ چیز اگر انتہائی لذیذ اور انتہائی عمدہ نہ ہوتی تو یہ شخص اس کو اپنے لیے کیوں پسند کرتا۔

اس ذمہ داری کو اور ساتھ ہی اس باب کو امام غزالیؒ نے حضرت علیؓ کے اس ارشاد پر ختم کیا ہے کہ: دو آدمیوں نے میری کمر توڑ کر رکھ دی ہے: ایک آوارہ اور بے عمل عالم نے اور دوسرے عبادت گزار جاہل نے، جاہل اپنی بناوٹی عبادت کے ذریعہ لوگوں کو دھوکا دیتا ہے اور عالم اپنی غلط کاریوں کی وجہ سے لوگوں کو غلط راہ پر ڈالتا ہے۔

امام غزالیؒ نے اس موضوع پر کافی وضاحت کے ساتھ تشفی بخش گفتگو کی ہے، امام بدر بن جماعہؒ کے کلام میں بھی ایسی جزئیات ملتی ہیں جو طالبِ علم کے لیے نہایت اہم اور غفلت کو دُور کرنے والی ثابت ہو سکتی ہیں، وہ طالبِ علم کو ایسی چیزوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ اگر وہ ان کو اپنا لے تو ایک بیدار عالم بن سکتا ہے؛ اس لیے میں علم کے حریص طالبِ علم کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان دونوں بحثوں کا ضرور مطالعہ کرے۔

امام ماوردیؒ کی بیان کردہ ذمہ داریاں:

امام ماوردیؒ نے بھی اس موضوع سے متعلق کچھ باتیں کہی ہیں اور کچھ اہم چیزوں کی

طرف توجہ دلائی ہے، میں ان کے چند جملے بطور اقتباس نقل کرتا ہوں، جن میں سے بعض میں تو پچھلی باتیں ہی ہیں اور بعض میں نئے مضامین ہیں، وہ فرماتے ہیں (۱) کہ:

علماء کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ: وہ جس علم میں بھی ماہر ہوں اس کو سکھانے اور پڑھانے میں بخل نہ کریں، وہ جو بات بھی جانتے ہوں اس کو بتانے سے انکار نہ کریں؛ کیونکہ علم میں بخل کرنا کمینگی اور اس سے انکار حسد اور گناہ ہے، بھلا اس چیز میں بخل کیسے روا ہوسکتا ہے جو ان کو بغیر بخل کے پوری سخاوت کے ساتھ ملی ہے اور بغیر کچھ خرچ کیے مفت میں ہاتھ آئی ہے، اگر یہی رویہ گزشتہ لوگ بھی اپناتے تو کیا یہ علم ان تک پہنچ پاتا؟ ہرگز نہیں! یہ علم تو اگلوں کے ساتھ ہی رخصت ہوجاتا...... حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے اس وقت تک علم سیکھنے کا عہد نہیں لیا جب تک کہ اہلِ علم سے سکھانے کا عہد نہیں لیا (۲)۔

---

(۱) ادب الدنیا والدین ص ۱۳۰

(۲) یہ اثر خطیب بغدادیؒ نے بھی ''**آداب الفقیه والمتفقه**'' (۱۶۷) میں اپنی سند سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے: **ما أخذ الله میثاقا من أهل الجهل بطلب العلم حتى أخذ من أهله ببیان العلم للجهال؛ لأن العلم كان قبل الجهل** اس کی سند میں ایک راوی متروک اور متہم ہے؛ لیکن خود خطیب نے اپنی ''جامع'' میں چند عناوین اور ابواب قائم کرنے کے بعد ایک باب باندھا ہے: **باب ما لایفتقر كتبه إلى إسناد** (ان چیزوں کا بیان جن کو لکھنے کے لیے سند کی ضرورت نہیں) اور اس کے تحت لکھتے ہیں کہ: ۱۷۰۲- پیچھے جو باتیں بھی لکھنے کے لیے کہیں گئی ہیں اُن کے لیے سند کا ہونا ضروری ہے، اگر ان کی سندیں ساقط کردی جائیں اور صرف متن پر انحصار کرلیا جائے تو ان کا معاملہ خراب ہوجائے گا، ان کی صحت مخدوش ہوجائے گی اور ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہو پائے گا؛ کیونکہ ان کی صحت کے لیے اور ان پر عمل کے لزوم کے لیے سندِ متصل شرط ہے۔

آگے لکھتے ہیں: ۱۷۰۵- جہاں تک نیک لوگوں کے واقعات، اولیاءِ کرام کی حکایات، فصحاء کے مواعظ اور ادباء کی حکمت بھری باتوں کا معاملہ ہے، تو ان کے لیے سند صرف زینت کا درجہ رکھتی ہے، ان کی ادائیگی کے لیے سند کا ہونا شرط نہیں ہے، آگے (رقم ۱۷۰۷) پر بھی انھوں نے کچھ باتیں ☜

آ گے لکھتے ہیں (۱) کہ:

عالم کے اندر فراست بھی ہونی چاہیے جس سے وہ طالبِ علم کو تاڑ جائے: کہ اس کے اندر کتنی استطاعت ہے اور کتنا استحقاق ہے؛ تا کہ اسے پتہ چل سکے کہ جو بات وہ اس کو بتانے جا رہا ہے وہ اسے اپنی ذہانت سے برداشت کر سکے گا یا اپنی کند ذہنی کی بنا پر اسے سمجھنے سے قاصر رہے گا، اس سے استاذ کو بھی راحت رہتی ہے اور طالبِ علم بھی کامیاب بن کر نکلتا ہے...... جس استاذ کے اندر یہ صفت ہوتی ہے اس کی محنت و مشقت ضائع نہیں ہوتی اور اس کے ہاتھ پر کوئی شاگرد ناکام نہیں ہوتا۔

آ گے لکھتے ہیں (۲) کہ:

علماء کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: وہ طلبہ کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ کریں، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آئیں، ان کے لیے علم کا راستہ آسان سے آسان تر بنائیں اور ان کی مدد اور تعاون کی بھرپور کوشش کریں، ان سے ان کو خوب اجر و ثواب ملے گا، شہرت اور مقبولیت بھی حاصل ہوگی، ان کے علوم بھی خوب عام ہوں گے اور علم میں رسوخ و گہرائی بھی پیدا ہوگی۔

ایک ادب یہ بھی ہے کہ: وہ کسی شاگرد پر سختی نہ کریں اور نہ کسی مبتدی طالبِ علم کو معمولی سمجھیں، اس سے طلبہ ان کی طرف خوب کھنچیں گے، خوب متوجہ ہوں گے، اور ان کے اندر اپنے اساتذہ کے علم کو حاصل کرنے کا خوب شوق پیدا ہوگا۔

☜ کہی ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک امامِ ناقد ہونے کے باوجود انھوں نے حضرت علیؓ وغیرہ کے مذکورہ آثار کو ذکر کیا ہے؛ حالانکہ ان کی سندوں کا حال وہ خوب جانتے ہیں، پس آج جو معاصر محققین کی طرف سے ان آثار کے دراسہ کی مہم چلی ہوئی ہے وہ تکلف اور غلو کے سوا کچھ نہیں۔

(۱) ص ۱۳۴-۱۳۵

(۲) ص ۱۳۸-۱۳۹

ایک ادب یہ بھی ہے کہ: وہ کسی بھی طالبِ علم کو منع نہ کریں، کسی بھی شوق رکھنے والے کو متنفر نہ کریں اور کسی بھی طالبِ علم کو مایوس نہ کریں؛ کیونکہ اس سے ان کے اندر اپنے اساتذہ کی طرف رغبت ختم ہو جائے اور اپنے اساتذہ کے علم کو حاصل کرنے کا شوق ماند پڑ جائے گا اور اگر ایسا مسلسل ہوتا رہا تو پھر ان علماء کا علم ان کے ساتھ ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔

دوسری مشعل

طلبہ کو علمی طور پر کام آنے والی چیزوں کو حفظ کرنے کی ترغیب دینا

قرآن، حدیث، معتبر متون اور ادبی شواہد کا حفظ:

طالبِ علم کو بنانے سنوارنے اور اس کی تربیت کرنے کے سلسلے میں استاذ کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ: وہ طالبِ علم کو ایسی چیزیں یاد کرنے کی ترغیب دیں جو آئندہ علمی اُمور میں اس کے کام آنے والی ہوں، مثلاً قرآنِ کریم، احادیثِ مبارکہ اور معتبر علمی متون وغیرہ کا حفظ، طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ ہر فن کا ایک معتبر متن یاد کرلے، اسی طرح ادبی شواہد بھی یاد کرے جو اس کے کام آسکتے ہوں، امام ابو اسحاق شیرازیؒ کا قول پیچھے گزر چکا ہے[1] کہ: اگر کسی مسئلہ میں کوئی شعر ہوتا جس سے استشہاد کیا گیا ہو تو میں اس کے لیے پورا قصیدہ یاد کرڈالتا!۔

یوں تو طلبہ کی ایک معتد بہ تعداد قرآنِ کریم کا حفظ کرلیتی ہے؛ لیکن ایسا کوئی نہیں ہے جو حدیثیں بھی یاد کرے، گو "ریاض الصالحین" ہی کیوں نہ ہو، یہ ایک مصیبت ہے جس کا طلبہ شکار ہیں، میں شرعی اداروں اور وہاں کے نصابہائے تعلیم کے ذمہ دار علمائے کرام کو بطورِ خاص ترغیب دینا چاہتا ہوں کہ: وہ اپنے اساتذہ کے ذریعہ طلبہ کو اس طرف متوجہ

(۱) ص ۲۵۶

کروائیں کہ وہ اپنی چھٹیوں کے اوقات میں زیادہ سے زیادہ احادیث کا حفظ کریں، اگرچہ خصوصی کورس کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، اس کے لیے ترغیب، معاوضہ اور انعام کا راستہ بھی اختیار کریں۔

میرے استاذ علامہ حافظ شیخ عبداللہ سراج الدینؒ کی وفات علمی طبقے کے لیے ایک زبردست خسارہ تھی، جس کی متعدد وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ: احادیث حفظ کرنے کے سلسلے میں مجھے ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آیا **تغمده الله برحمته،** انھیں جب بھی کوئی حدیث ایسی ملتی جو انھوں نے پہلے یاد نہ کر رکھی ہو تو کثرتِ محفوظات کے باوجود اسے فوراً یاد کرتے، کسی حدیث کے اندر کوئی ایسی زیادتی نظر آجاتی جو کسی نئے معنیٰ پر دلالت کرتی ہو، اگرچہ وہ ایک کلمہ ہی کیوں نہ ہو، تو اس کو بھی یاد کرنے میں سستی نہیں کرتے، اپنی اسی عادت کے مطابق جو انھوں نے اپنی تمام محفوظات کے سلسلے میں اپنائی تھی کہ وہ روایت کو اس کے الفاظ اور زیادتیوں کے ساتھ بیان کرتے تھے، اور ساتھ ہی اس کی بھی صراحت کرتے کہ وہ کس صحابیؓ سے مروی ہے اور کس امام نے اس کی تخریج کی ہے۔

سب سے پہلے قرآنِ کریم اور احادیث کا حفظ ہو:

خطیب بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم سب سے پہلے قرآنِ کریم یاد کرے؛ کیونکہ وہ سب سے جلیل القدر اور سب سے پہلے وجود میں آنے والا علم ہے(۱)۔ انھوں نے امام اوزاعیؒ اور یحییٰ بن یمانؒ سے بھی اس طرح کی باتیں نقل کی ہیں، جن سے اس معنیٰ کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں (۲) کہ: پھر قرآن کے بعد جس علم کا مقام و مرتبہ ہے وہ ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کی سنتِ مطہرہ کا علم؛ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس علم کو بھی حاصل کریں؛ کیونکہ احادیثِ مبارکہ شریعت کی اصل اور بنیاد ہیں۔

(۱) الجامع (۷۹)   (۲)(۸۹)

آگے چل کر انھوں نے ایک باب باندھا ہے[۱]: **"باب حفظ الحدیث ونفاذ البصیرۃ فیہ"** (حدیث کو یاد کرنا اور اس میں بصیرت پیدا کرنا) اس کے تحت لکھتے ہیں کہ: جب طالبِ علم اپنے گھر واپس آجائے اور سفر اور پردیس کی زندگی سے اس کی علمی خواہشات پوری ہوجائیں، تو اسے چاہیے کہ اس نے جو کچھ اس عرصے میں لکھا ہے اور جتنا کچھ علم حاصل کیا ہے ان کے مطالعے اور غور وفکر میں لگ جائے۔

اس کے بعد انھوں نے امام عبدالرزاق صنعانیؒ اور اصمعیؒ سے نقل کیا ہے[۲]، وہ دونوں فرماتے ہیں کہ: جو علم آدمی کے ساتھ حمام میں نہ جاسکے اسے تم علم مت شمار کرو، مطلب یہ ہے کہ جو علم یاد نہ ہو وہ علم ہی نہیں ہے۔

امام ابنِ عبدالبرؒ نے **"باب الطلب وکشف المذھب"** (طلبِ علم کے مراحل اور اس کے راستے کی تعیین) کے تحت نہایت قیمتی گفتگو کی ہے[۳]، جس میں انھوں نے طالبِ علم کو اپنا علمی سفر طے کرنے کے لیے ایک صحیح اور معتدل منہج عطا کیا ہے، باب کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں کہ: حصولِ علم کے ان مراحل سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، اگر کوئی شخص ان مراحل سے تجاوز کرتا ہے تو وہ حقیقت میں اسلاف کے طریقے سے تجاوز کرنے والا ہے اور اسلاف کے طریقے سے تجاوز کرنے والا اگر جان بوجھ کر تجاوز کرتا ہے تو گمراہ ہوتا ہے اور اگر اپنے اجتہاد کی بنیاد پر تجاوز کرتا ہے تو لغزش کھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ امام ابنِ عبدالبرؒ سے راضی ہو، اُن کا یہ ایک فقرہ ہی طالبِ علم کے لیے اس کے علمی سفر کا منہج بننے کے لیے کافی ہے، طالبِ علم اس فقرہ کو اپنے سینے سے لگالے اور اس سے سرِ مو انحراف نہ کرے۔

---

(۱)(۱۸۱۳)

(۲)(۱۸۱۸، ۱۸۱۹)

(۳) جامع بیان العلم ۲: ۱۱۲۹-۱۱۳۹

انھوں نے طویل گفتگو کرنے کے بعد نصف صفحہ میں اس پوری گفتگو کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے، ہر طالبِ علم کو گہرائی اور بصیرت کے ساتھ اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے (۱)۔

ابنِ جماعہؒ کی بیش قیمت ہدایات:

امام بدر بن جماعہؒ نے بھی کچھ نصیحتیں اور ہدایات ذکر کی ہیں، جن پر عمل کرنا طالبِ علم کے لیے بے حد ضروری ہے، میں ان میں سے چند جملے نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں (۲) کہ:

طالبِ علم سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف متوجہ ہو، اور اس کو خوب اچھی طرح حفظ کرے اور کبھی اس کو بھولنے نہ دے، اس کے بعد ہر فن کا کوئی ایک مختصر متن حفظ کرے، جس میں دونوں پہلوؤں مثلاً: حدیث اور علومِ حدیث، اُصولِ دین (توحید) اور اُصولِ فقہ، نحو اور صرف دونوں کو جمع کر دیا گیا ہو، پھر وہ مشائخ سے ان محفوظات کو سمجھنے میں مشغول ہو جائے۔

اور سمجھنے کے لیے کتابوں پر اعتماد نہ کرے؛ بلکہ ایسے اساتذہ پر اعتماد کرے جنھیں پڑھانے کا سلیقہ بھی خوب ہو اور متعلقہ فن پر دسترس بھی خوب حاصل ہو اور ان سب سے بھی پہلے ان کے اندر دینداری اور صالحیت کا پہلو بھی نمایاں ہو...... آگے لکھتے ہیں کہ: وہ جس کتاب کو بھی پڑھے یا جس فن کو بھی حاصل کرے اپنے آپ کو مکمل اس میں لگا دے؛ تا آں کہ اس کتاب اور اس فن میں پختگی حاصل ہو جائے۔

اسی طرح وہ بلا وجہ ایک کتاب کو چھوڑ کر دوسری کتاب اور دوسری سے تیسری کتاب کی طرف منتقل نہ ہو، پھر جب اہلیت پیدا ہو جائے اور علم میں پختگی آجائے، تو جتنے بھی علومِ شرعیہ ہیں ان میں سے کسی بھی علم اور کسی بھی فن کو نہ چھوڑے، ہر ایک پر نظر ڈالے اور

(۱) فقرہ نمبر (۷۔۲۲۳) کے آخر میں ''**فعليك يا أخي بحفظ الأصول والعناية بها**'' سے آخر تک پڑھیے۔

(۲) تذکرۃ السامع ص ۱۱۲۔۱۲۰

ہر ایک کے اندر اس فن کی اہم چیزوں پر توجہ دے، اور ان سب کے ساتھ عمل کے تعلق سے کوئی غفلت نہ برتے کہ عمل ہی علم سے اصل مقصود ہے۔

امام ابنِ جماعہؒ نے اگر طلبہ کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ علومِ شرعیہ میں سے ہر علم اور ہر فن پر نظر ڈالیں، تو امام ذہبیؒ کے بیان کے مطابق خود ان کا بھی یہی حال تھا، انھیں بہت سے علوم پر دسترس حاصل تھی، امام ذہبیؒ ان کی کافی مدح سرائی کے بعد لکھتے ہیں کہ: وہ علوم کا ایک باغ تھے، اور ہر فن میں حصہ لیتے تھے (۱)۔

حفظ کے تعلق سے ایک اہم ہدایت:

اس کے بعد ابنِ جماعہؒ نے ایک اہم چیز کی طرف توجہ دلائی ہے، جو پچھلی بات سے ہی متعلق ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم کسی بھی چیز کو حفظ کرنے سے پہلے عبارت کی تصحیح اچھی طرح کر لے یا تو شیخ کے پاس جا کر یا کسی اور کے پاس جا کر، جو اسکی تصحیح کرا سکے، تصحیح ہو جانے کے بعد پھر اس کو اچھی طرح یاد کرے اور یاد کر لینے کے بعد اس کی حفاظت بھی کرے، اسے بھول نہ جائے، طالبِ علم کوئی بھی چیز بغیر تصحیح کے حفظ نہ کرے؛ ورنہ اس سے تحریفات اور تصحیفات واقع ہوں گی اور پیچھے یہ بات گزر چکی ہے کہ ایسا شخص شیخ بنائے جانے کے قابل نہیں جس نے صرف کتابوں سے علم حاصل کیا ہو اور کبھی ماہر شیوخ کی صحبت نہ اُٹھائی ہو اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ علم کتابوں سے حاصل نہیں کیا جاتا، یہ ایک خطرناک بیماری ہے (۲)۔

حفظ کے تعلق سے دو اقتباسات:

میں دوبارہ بدر بن جماعہؒ کی اس نصیحت کی طرف آتا ہوں جو انھوں نے ہر علم اور فن کا ایک

(۱) ذیل تاریخ الاسلام ص ۳۶۷

(۲) تذکرۃ السامع ص ۸۷

متن حفظ کرنے کے تعلق سے کہی ہے، میں اس مضمون سے متعلق دو اقتباسات اور نقل کرتا ہوں، جن میں سے ایک اقتباس تو قولی اور نظری ہے اور دوسرا اقتباس فعلی اور پیش آمدہ واقعہ ہے۔

پہلا اقتباس:

پہلا اقتباس: امام ابن الجوزیؒ کی ایک وصیت ہے، جو انھوں نے اپنے بیٹے کو کی تھی کہ: بیٹے! تم حفظ کو لازم پکڑلو؛ کیونکہ حفظ راس المال ہے اور اسی میں تصرف کر کے منافع حاصل کیے جاتے ہیں (۱)۔ اس کے حاشیہ پر جو کچھ لکھا ہے آپ اس پر توجہ نہ دیں، اس کے محشی کے ساتھ میرا ایک واقعہ پیش آچکا ہے، جس میں ان کی طرف سے حفظ کی اہمیت کا انکار غلط ثابت ہوا ہے، محشی کا ایک موقف تھا، جس کو سراہا نہیں جاسکتا، میں نہیں چاہتا کہ اس واقعہ کو ذکر کر کے اپنے موضوع سے دُور نکل جاؤں۔

مشائخ اور طلبہ کی ایک جماعت کے پاس ہمیشہ سے **"مجموع مهمات المتون"** نامی ایک کتاب رہی ہے، اس کتاب کے متعدد ایڈیشن ہیں، جن میں متون کی تعداد بھی مختلف ہے، یہ کتاب ہر فن کے معتبر اور اہم متون پر مشتمل ہے، اخیر کے ایڈیشنوں میں ساٹھ سے زائد متن اس میں شامل ہیں، شرعی ادارے خاص طور پر ازہر کے ادارے ان متون کا کچھ حصہ طلبہ کو حفظ کرانے کی کوشش کرتے تھے، یہ کتاب ڈاکٹر محمود طناحیؒ کے دیے ہوئے نام کے مطابق واقعی **"جیل المتون"** (متون کی نسل) (۱) کی تصویر پیش کرتی ہے۔

حفظ کے کچھ حیرت انگیز نمونے:

مجھے امام محمد انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انھیں منظوم علمی متون کے پچیس (۲۵) ہزار اشعار یاد تھے اور غیر منظوم متون ان کے علاوہ تھے!۔

(۱) **لفتة الكبد** ص ۲۰

(۲) اپنے مقالات ا: ۱۴۰ وما بعد میں

ہمارے بعض شافعی طلبہ واساتذہ ''البهجة الوردية'' نامی ایک کتاب حفظ کرتے تھے، جس میں امام ابن الوردی فقیہ شافعیؒ (متوفی ۷۴۹ھ) نے ابنِ یونسؒ کی ''الحاوي الصغير'' کو جمع کیا ہے، اس میں پانچ ہزار سے زائد کل (۵۲۸۶) اشعار ہیں اور اسی پر بس نہیں؛ بلکہ وہ لوگ سیرت کے اندر ''ألفية العراقي'' یا ''بدء الأمالي'' اور ان جیسے اور دیگر متون بھی یاد کرتے تھے۔

لیکن نہ جانے کہاں سے تعلیمِ جدید کے ذمہ داروں کے دماغ میں یہ بات گھسی اور ان ہی سے بعض طلبہ کے ذہنوں میں منتقل ہوئی کہ حفظ کرنا جدید تعلیمی نظریات کے مطابق علم کے لیے نقصان دہ ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حفظ ضائع ہو گیا اور پھر فہم بھی جاتا رہا!۔

دوسرا اقتباس: امام غزالیؒ کا واقعہ:

جہاں تک دوسرے اقتباس کی بات ہے، تو وہ ایک حادثہ ہے، جو قدیم وجدید سبھی اہلِ علم کے درمیان مشہور ہے، میں اسے سبکیؒ کی کتاب سے نقل کرتا ہوں، انھوں نے امام غزالیؒ کے تذکرے کے شروع میں امام اسعد میہنیؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: میں نے امام غزالیؒ سے یہ واقعہ سنا کہ: ایک مرتبہ ہمارے قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور میرے پاس جو کچھ بھی تھا سب لُوٹ لیا، میں ان کے پیچھے دوڑنے لگا، تو ان کا سردار میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا: واپس چلا جا؛ ورنہ مارا جائے گا، میں نے کہا: میں تمھیں اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس سے تم سلامتی کی اُمید رکھتے ہو، تم مجھے صرف میرے لکھے ہوئے نوٹس واپس کر دو، وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو تمہارے کام آسکے، اس نے پوچھا: یہ نوٹس کیا چیز ہے؟ میں نے کہا: اس تھیلے میں کچھ کتابیں ہیں، جن کو سننے اور لکھنے کے لیے اور جن کا علم حاصل کرنے کے لیے میں نے گھر بار چھوڑا ہے، وہ ہنسنے لگا اور کہا کہ: تم کیسے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ تم نے ان کا علم حاصل کر لیا ہے، ہم نے یہ کتابیں تم سے چھین لیں، تو تم ان کے علم سے خالی ہو گئے اور اب تمہارے پاس علم نہیں رہا! یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا اور اس نے تھیلا واپس کر دیا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: یہ بات اس نے خود نہیں کہی؛ بلکہ اس سے کہلوائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ بات کہلوائی ہے؛ تاکہ اس کے ذریعہ میری رہنمائی فرمائیں؛ چنانچہ جب میں طوس پہنچا تو ان نوٹس کو یاد کرنے میں لگ گیا اور تین سال کے اندر وہ تمام نوٹس یاد کر ڈالے، اب میرا یہ حال تھا کہ اگر ڈاکو مجھ پر حملہ کر کے میرے نوٹس چھین لے جاتے تو میں علم سے خالی نہ ہوتا(۱)۔

حفظ کے تعلق سے ضرب المثل جملے:

قدیم زمانے سے ہی یہ جملہ علماء ومشائخ کی زبانوں پر عام ہے: "**من حفظ المتون نال الفنون**" کہ جس نے متون کو حفظ کرلیا اس نے فنون حاصل کر لیے، اسی طرح: "**حِفْظ حرفين خير من سماع وِقْرين، وفَهْم حرفين خير من حفظ وقرين وحرف في قلبك خير من ألف في كتبك**" کہ دو حرف یاد کرنا دو تھیلے سننے سے بہتر ہے اور دو حرف سمجھ لینا دو تھیلے یاد کرنے سے بہتر ہے اور ایک حرف جو ذہن میں ہو ان ہزار حروف سے بہتر ہے جو کتاب کے اندر ہوں --یعنی جن کو یاد نہ کیا گیا ہو--، اسی طرح: "**لا خير في علم لايعبر بك الوادي ولايعمر بك النادي**" اس علم میں کوئی خیر نہیں جو تمہارے ساتھ وادی عبور نہ کر سکے اور نہ تمہاری مجلس آباد کر سکے(۲)۔

"ما كُتِب قرَّ وما حُفِظ فرَّ" کا مطلب:

رہا ان کا یہ جملہ "**ما كُتِب قرّ وما حُفِظ فرّ**" کہ جو بات لکھ دی گئی وہ ٹھہر گئی

(۱) طبقات سبکی ۶:۱۹۵

(۲) ماوردی ص ۹۸، زرنوجی ص ۷۰، بلوغ أقصی المرام للطربناطی الفاسی ص ۴۵۳، ''**نادی**'' سے مراد علمی مجلسیں ہیں، یعنی اس علم میں کوئی خیر نہیں جو تمہاری علمی مجالس کے اندر تمھیں مستحضر نہ ہو اور تم اس کے ذریعہ اپنی مجلسوں کو آباد نہ کر سکو۔

اور جس کو یاد کیا گیا وہ غائب ہوگئی، تو اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حفظ کے اندر مرورِ زمانہ اور کبر سنی کی بنا پر نسیان کا خطرہ لگا رہتا ہے؛ اس لیے اس کو لکھنا ضروری ہے؛ تا کہ وہ باقی رہے اور ٹھہر جائے، اس سے ان کا مقصد حفظ کے معاملے کو ہلکا بتلانا نہیں ہے۔

مختصر لفظوں میں یہ کہ: یاد کرنا اور حفظ کرنا جبکہ سمجھ کر ہو علم کا ستون اور عالم کے لیے زادِ راہ ہے؛ البتہ علم کے دوام اور علم کو صدیوں تک امت میں باقی رکھنے کے لیے تدوین وکتابت ضروری ہے۔

حفظ کے تعلق سے اپنے مشائخ کے کچھ نمونے:

اس موقع پر میں اپنے مشائخ کے کچھ نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وہ امہات المتون کے حفظ کا کس قدر اہتمام کرتے تھے: مفتی حلب حکیم ڈاکٹر شیخ ابراہیم سلقینیؒ (۱۳۵۴-۱۴۳۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ: ان کے دادا شیخ ابراہیم سلقینیؒ (۱۲۷۰-۱۳۶۷ھ کا اوائل) انھیں نحو کے اندر "الفیہ ابنِ مالکؒ" زبانی حفظ کراتے تھے، اس وقت دادا کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور پوتے ابھی اپنی عمر کے دسویں سال میں ہی تھے۔

اسی زمانے میں علماء ومفتیانِ حلب میں ایک فقیہ شیخ احمد حجی کردیؒ (۱۲۹۹-۱۳۷۳ھ) تھے، ان کے پاس جب کوئی مستفتی جاتا تو وہ تنہا بیٹھے اپنے محفوظات "الفیہ ابنِ مالکؒ" وغیرہ کو دہرا رہے ہوتے۔

مکہ مکرمہ میں میری ملاقات علمائے ازہر میں سے مربی کبیر فقیہ شیخ محمود عبد الدائمؒ (۱۳۱۴-۱۴۱۲ھ) سے ہوئی، وہ اُونچی جماعت کے طلبہ کو کتاب کی عبارت پڑھاتے، جب کوئی طالبِ علم عبارت میں غلطی کرتا تو نہ صرف اس کی تصحیح کرتے، اسے کلمہ کا اعراب ووجہِ اعراب بتاتے؛ بلکہ اس پر "الفیہ ابنِ مالک" سے زبانی شاہد بھی پیش فرماتے تھے۔

اللہ تعالیٰ امام ابنِ مالکؒ سے راضی ہو، وہ اپنے الفیہ میں کس قدر مخلص تھے کہ اللہ

نے ان کی کتاب کو ایسا دوام وخلود عطا کیا، صدیاں بیت گئیں؛ لیکن ان کی کتاب سے استفادہ برابر جاری ہے!!

مجھے ایک مرتبہ خواہش ہوئی تھی کہ ہر فن کی کچھ ایسی کتابوں کے نام لکھ دوں، جنھیں مبتدی طالبِ علم پڑھ کر زبانی یاد کرنے کا التزام کرے، گویا اس چیز کی تفصیل ہو جائے جس کو بدر ابنِ جماعہؒ نے پیچھے اپنے کلام میں اجمالاً ذکر کیا ہے؛ پھر میں نے دیکھا کہ مختلف شہروں میں الگ الگ کتابیں رائج ہیں، ہر شہر کے علماء الگ الگ کتابوں سے متعارف ہیں؛ اس لیے میں نے پھر ارادہ ترک کر دیا۔

ابتدائی عمر میں ''شمائل محمدیہ'' پڑھائی اور یاد کرائی جائے:

البتہ ایک بات کی میں تاکیداً نصیحت کرتا ہوں کہ عمر کے ابتدائی حصہ میں امام ترمذیؒ کی ''شمائلِ محمدیہ'' پڑھانے کا ضرور اہتمام کیا جائے کہ اس سے طالبِ علم کے اخلاق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل وعادات پر ڈھالنے میں بہت مدد ملتی ہے؛ اس لیے کہ یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں بچے کے اخلاق وعادات کو جس سانچے میں بھی ڈھال دیا جائے ڈھل جائیں اور جس رُخ پر بھی ڈالا جائے گا اس رُخ پر پڑ جائیں گے۔

ایک اہم تنبیہ:

ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، جو معلوم اور مسلّم ہی ہے کہ: ہر فن کی تمام کتابیں یکساں نہیں ہوتیں، ان میں اختصار وتفصیل کے اعتبار سے تفاوت ہوتا ہے، اسی طرح مجموعی طور پر اعتماد واستدراک کے اعتبار سے بھی تفاوت ہوتا ہے۔

جہاں تک اختصار وتفصیل کے اعتبار سے تفاوت کی بات ہے: تو یہ آپ کو ہر علم کی کتابوں کے اندر ملے گا، فقہ شافعی میں امام غزالیؒ کی ''الوجیز'' بھی ہے ''الوسیط'' بھی اور ''البسیط'' بھی، ابن الاکفانیؒ (متوفی ۷۴۹ھ) نے اپنی کتاب ''ارشاد القاصد'' میں علومِ

شرعیہ، علومِ عربیہ، علومِ طبعیہ، علومِ ریاضیہ اور علومِ فلسفہ وغیرہ تقریباً ترسٹھ (۶۳) علوم پر گفتگو کی ہے، جن میں ہر علم کی مختصر، متوسط اور مبسوط کتابوں کو الگ الگ شمار کرایا ہے۔

اور جہاں تک اعتماد و استدراک کے اعتبار سے تفاوت ہے تو: یہ بھی آپ کو ہر فن کی کتابوں ملے گا، پھر یہ استدراکات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، کبھی مؤلف کی آراء کی تردید و تضعیف ہوتی ہے، کبھی کتاب کی تعریفات کی تکمیل، کبھی اس کی انواع کی تقسیم، کبھی اس کی مجمل باتوں کی تفصیل اور کبھی اس کی مغلق عبارتوں کی توضیح وغیرہ وغیرہ۔ **والله ولي السداد والتوفيق**

تیسری مشعل

تعلیم میں تدریج

تدریج کے شعبے:

تعلیم میں تدریج اختیار کرنے سے متعلق گفتگو تین شعبوں پر مشتمل ہے، ان پر گفتگو کے وقت تینوں کو الگ الگ کرنا ضروری ہے۔

پہلا شعبہ: استاذ کا طلبہ کو الاہم فالاہم کے اعتبار سے علوم پڑھانا (یعنی ابتدائی علوم سے آغاز کرنا)۔

دوسرا شعبہ: سال بہ سال ایک کے بعد دوسرا علم سکھانا۔

تیسرا شعبہ: ہر علم میں بڑے مسائل سے پہلے اس علم کے چھوٹے مسائل بتانا۔

تعلیم میں تدریج اللہ اور اس کے رسول کا منہج ہے:

ان تینوں شعبوں پر گفتگو کرنے سے پہلے میں ایک بات تمہیداً عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ:

تعلیم میں تدریج یہ ربانی منہج ہے، اسی منہج کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ احکامات کا پابند بنایا ہے؛ چنانچہ ان کے لیے سب سے پہلے مکی زندگی میں اسلامی عقیدے اور اس کے متعلقات نازل کیے اور ایک بنیاد رکھی، پھر ضرورت اور حوادث کے اعتبار سے ارکانِ اسلام اور شرائعِ اسلام تھوڑے تھوڑے

کر کے نازل کرنے شروع کیے، نہ یکبارگی نماز کے تمام احکام نازل کیے اور نہ زکات کے تمام احکام یکبارگی اُتارے، یہاں تک کہ جہاد کی تشریع بھی تین مرحلوں میں نازل کی -اور وہ بھی صرف تشریع نہ کہ تفصیلی احکام- اسی طرح خاندان اور معاملات وغیرہ کے احکام کا بھی معاملہ رہا۔

یہی منہج آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا، جس کی ایک مشہور مثال حضرت ابنِ عباسؓ کی وہ حدیث ہے جس میں حضرت معاذؓ کو یمن بھیجے جانے کا تذکرہ ہے، جسے بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت معاذؓ سے فرمایا کہ: تم اہلِ کتاب کی ایک قوم کے پاس جارہے ہو، انھیں سب سے پہلے اس بات کی دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، اگر وہ اِس کو مان لیں، تو انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو پھر انھیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو دی جائے گی[1]۔

اس تدریج کی برکت سے طالبِ علم چند ہی دنوں میں دیکھے گا کہ -اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے اخلاص اور محنت کی بدولت- اس کے سینے میں علم کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، اور وہ ابن النحاس حلبی مصریؒ (۶۲۷-۶۹۸ھ) کے ان اشعار کا مصداق بن چکا ہے:

اليوم شيءٌ وغدًا مثلُه ❖ من نُخَب العلم التي تُلتقط

''علم کے ان منتخب موتیوں میں سے جن کو چنا جاتا ہے آج ایک موتی ملا ہے اور کل اسی کے مثل ایک ملے گا''۔

---

(۱)رواه البخاري في مواضع من ''صحيحه'' أولها (۱۳۹۵)، ومسلم ۱: ۵۰ (۲۹) واللفظ له

يحصِّل المرء بها حكمةً ❖ وإنما السيل اجتماع النُّقط

''آدمی ان ہی موتیوں کے ذریعہ حکمت حاصل کر لیتا ہے، یقیناً قطروں کے اجتماع سے ہی سیلاب بنتا ہے''۔

تدریج کا یہ بہترین نتیجہ جن لوگوں کو بھرپور طریقے سے نصیب ہوا ان میں ایک نمایاں نام امام ابوحنیفہؒ کا ہے، وہ جب اپنے شیخ حماد بن ابی سلیمانؒ کے حلقے میں پہنچے تو انھوں نے فرمایا کہ: تم روزانہ صرف تین مسئلے یاد کرو، اس سے زیادہ مت یاد کرنا، تا آنکہ تم پر علم کی کچھ باتیں کھل جائیں؛ چنانچہ امام صاحب نے ایسا ہی کیا اور حلقہ کو لازم پکڑ لیا، پھر ایک وقت آیا کہ وہ فقیہ بنے اور لوگ ان کی طرف اُنگلیوں سے اشارے کرنے لگے۔

پہلا شعبہ: ابتدائی علوم سے آغاز:

پہلے شعبہ کے تعلق سے گفتگو کا آغاز مَیں امام ماوردیؒ کے ایک اقتباس سے کرنا چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں کہ: تمام علوم محترم اور فضیلت کے حامل ہیں؛ لیکن سب کو حاصل کرنا انسان کے بس میں نہیں، اور جب سب کو حاصل کرنے کا کوئی راستہ نہیں، تو ضروری ہے کہ جو علوم اہم ہیں اُن کی طرف توجہ دی جائے اور اوّل و افضل علوم میں لگا جائے اور سب سے افضل اور سب سے بہتر علم، دین کا علم ہے؛ کیونکہ اس کو حاصل کر کے لوگ ہدایت کی راہ پر چل پڑتے ہیں اور اس سے ناواقفیت پر گمراہی مقدر بنتی ہے[1]۔

آگے فرماتے ہیں: واضح رہے کہ علوم کے اندر کچھ اوائل ہوتے ہیں، جن کو حاصل کر کے اواخر تک پہنچا جاتا ہے اور کچھ مدخل ہوتے ہیں جن سے گزر کر حقائق تک پہنچا جاتا ہے؛ لہٰذا طالبِ علم کو اوائل سے آغاز کرنا چاہیے؛ تا کہ اواخر تک پہنچ سکے اور مدخل سے شروع کرنا چاہیے؛ تا کہ حقائق کو پا سکے، وہ اوّل کو حاصل کیے بغیر آخر کو اور مدخل سے گزرے بغیر حقیقت کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے؛ ورنہ اس کو آخری علوم بھی نہ

(۱) ادب الدنیا الدین ص ۶۶-۶۷

ملیں گے اور حقائق بھی حاصل نہ ہوں گے؛ کیونکہ بنیاد رکھے بغیر عمارت کی تعمیر نہیں ہوتی اور بغیر درخت لگائے پھل ہاتھ نہیں آتے (۱)۔

دو باتیں:

مجھے ان کے اس بیان کردہ منہج کے پاس رک کر دو باتیں عرض کرنی ہیں:

۱-سفیان بن عیینہ کا واقعہ:

میں آپ کو ایک بڑے امام کا ایک دلچسپ واقعہ سنانا چاہتا ہوں، جس میں انھوں نے اپنے شاگرد کو یہی بات سکھائی اور سمجھائی کہ وہ علم کے اندر اس کے راستے اور اس کی ابتداء سے داخل ہو؛ چنانچہ رامہرمزیؒ بیان کرتے ہیں (۲) کہ: ایک شخص نے امام سفیان بن عیینہؒ سے پوچھا کہ: آپ نے امام زہریؒ سے کتنی احادیث سنی ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ: لوگوں کے ساتھ حلقۂ درس میں تو بے شمار حدیثیں سنی ہیں؛ اور تنہا صرف ایک حدیث سنی ہے، میں نے پوچھا: وہ کون سی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ: ایک روز میں بابِ بنی شیبہ کی طرف مسجدِ حرام میں داخل ہو رہا تھا، تو دیکھا کہ امام زہریؒ مسجد کے ایک ستون سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں، میں نے اپنے دل میں کہا کہ: یہ ابوبکر–یعنی ابنِ شہاب زہریؒ– بیٹھے ہوئے ہیں، یہ اس قدر تنہائی میں شاید پھر کبھی نہ مل سکیں، میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ان سے عرض کیا کہ: مجھے ایک دو حدیثیں سنا دیجیے؟ انھوں نے فرمایا: جو حدیث سننا چاہو سن لو، میں نے کہا: وہ مخزومیہ والی حدیث سنا دیجیے، جس کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کاٹا تھا، ابنِ شہابؒ نے یہ سن کر کنکری اُٹھائی اور میرے چہرے پر دے ماری اور کہا کہ: کھڑے ہو جاؤ، خدا تمھیں کبھی کھڑا نہ کرے! ہمیشہ کوئی نہ کوئی غلام آکر نامعقول حرکتیں کر جاتا ہے اور طبیعت مکدر ہو جاتی ہے!۔

---

(۱) ادب الدنیا والدین ص ۸۴

(۲) المحدث الفاصل (۷۲)

سفیانؒ کہتے ہیں کہ: میں نادم اور شکستہ دل اُٹھ کھڑا ہوا اور قریب ہی ایک جگہ جا کر بیٹھ گیا، اسی دوران ایک شخص وہاں سے گزرا، اس سے ابنِ شہاب کو کچھ کام تھا، انھوں نے تسبیح پڑھ کر اسے متوجہ کیا؛ لیکن وہ سن نہیں پایا، انھوں نے کنکری پھینک کر ماری؛ لیکن وہ بھی نہ پہنچ سکی، بالآخر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ: جاؤ اس کو بلا لاؤ، میں بلا کر لے آیا، ابنِ شہابؒ کو اس سے جو کام تھا وہ انھوں نے پورا کیا اور میں واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا، ابنِ شہابؒ نے میری طرف دیکھا اور اپنے پاس بلایا اور مجھے ایک حدیث سنائی: **أخبرني سعيد بن المسيب وأبو سلمة بن عبد الرحمٰن جميعا عن أبي هريرة أن رسول الله صلّى الله عليه وسلم قال: "العجماء جبار، والبئر جبار، والمعدن جبار، وفي الركاز الخمس"** (چوپایہ رائیگاں ہے، کنواں رائیگاں ہے، کان رائیگاں ہے اور رکاز میں خمس واجب ہے)[1] اور فرمایا کہ: یہ حدیث تمہارے لیے اس حدیث سے بہتر ہے جو تم پوچھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ ہمارے ائمہ سے راضی ہو، وہ اپنے شاگردوں کو علم بھی سکھاتے تھے اور علم کے ساتھ عقل اور حکمت بھی سکھاتے تھے۔

(۱) رواه البخاري (۱۴۹۹) ومسلم ۳: ۱۳۳۴ (۴۵) من طريق الزهري عن سعيد وأبي سلمة عن أبي هريرة۔ عجماء" آدمی کے علاوہ ہر جاندار کو کہتے ہیں، **"جبار"** کے معنیٰ ہیں: رائیگاں، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ: اگر کوئی چوپایہ کسی چیز کو تلف کر دے، خواہ دن میں ہو یا رات میں اور اس میں اس کے مالک کی طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہوئی ہو، تو وہ نقصان رائیگاں ہوگا اور اس کی وجہ سے اس پر کوئی ضمان نہیں آئے گا، اسی طرح کوئی شخص اگر اپنی مملوکہ زمین میں کنواں کھودے اور اس میں کوئی انسان گر کر ہلاک ہو جائے تو اس سے کنویں والے پر کوئی ضمان نہیں آئے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص کان نکالنے کے لیے زمین کی کھدائی کرے اور کھدائی کے دوران وہ کان اس پر گر پڑے یا کوئی انسان اس میں گر پڑے تو اس پر بھی کوئی ضمان نہیں آئے گا، **"رکاز"** کہتے ہیں: دفن کیے ہوئے خزانہ کو، یا زمین سے نکلنے والی عام کانوں کو، اس میں بیت المال کے لیے خمس واجب ہوتا ہے اور بقیہ سارا پانے والا کا ہوتا ہے۔

۲-بغیر درخت بوئے پھل ہاتھ نہیں آتے:

دوسرے مجھے امام ماوردیؒ کے اخیر کے جملہ کی طرف توجہ دلانی ہے کہ: ''بغیر درخت بوئے پھل ہاتھ نہیں آتے''، یہ ایک بلیغ تشبیہ ہے، اگر کوئی غور کرے اور موجودہ صورتِ حال پر اس کو منطبق کر کے دیکھے، تو اسے اس جملہ سے بہت کچھ سبق ملے گا، ہمارے زمانے میں کتنے ایسے نام نہاد اور ''**المتشبع بما لم يعط**'' کے مصداق علماء ہیں جو بغیر سیڑھی کے چھت پر چڑھ گئے؟! پکنے سے پہلے منقی بن گئے؟! خالی ہاتھ اور خالی جیب ہیں؛ لیکن مالدار بن بیٹھے؟! یہ اس لیے کہ ان کی تربیت ہی کچھ اس طرح ہوئی کہ وہ اتنے پر بھی راضی نہ ہوئے کہ وہ اللہ کے دین میں بحیثیت محدث یا اُصولی یا فقیہ اجتہاد کا دعویٰ کریں؛ بلکہ انھوں نے اپنے آپ کو ائمہ مجتہدین پر حکم بنالیا اور ان کے بارے میں فیصلے کرنے لگے کہ: یہ بات انھوں نے صحیح کہی اور یہ بات غلط کہی؛ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنے تحقیقی کام کے دوران کتاب کے مقدمے میں خود مؤلفِ کتاب ہی کے عقائد کا دراسہ کر بیٹھے، جس مؤلف کے کتابی دسترخوان کے ریزوں پر خود ان کا گزارا چل رہا ہے اور ان کو بدعتی اور گمراہ بتلانے لگے!! یہ صرف اس لیے کہ ان کی تربیت ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جن کے حصولِ علم کا خود کچھ اَتہ پتہ نہیں!! اور یہ لوگ ایسے ہو گئے جیسے بغیر درخت بوئے پھل حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں؟! ان لوگوں نے اپنے آپ کو علم کے اندر سویں (۱۰۰) مرتبہ پر پہنچالیا؛ جبکہ ابھی وہ پہلے اور دوسرے درجے پر بھی نہیں چڑھے، کاش کوئی شاہی تلوار ہوتی جس کے ذریعہ دین اور علمِ دین کے احاطے کی حفاظت کی جاتی!۔

آگے امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم کو چاہیے کہ وہ حصولِ علم کا آغاز ابتداء سے کرے اور علم کے اندر اس کے مدخل سے آئے، وہ ایسی چیزوں کو حاصل کرنے میں مشغول نہ ہو جن سے ناواقفیت مضر نہیں؛ کیونکہ ہر علم کے اندر مقصود سے ہٹانے والی کچھ زائد چیزیں اور ذہن کو مشغول کرنے والی کچھ موتیاں بھی ہوتی ہیں، اگر طالبِ علم ان میں

لگے گا تو جو چیزیں اس کے لیے زیادہ اہم ہیں ان سے دُور ہو جائے گا، حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ: علوم بے شمار ہیں؛ لہٰذا ہر شئے میں سے اچھی چیز لے لو(۱)۔

سب سے پہلے کن علوم کو حاصل کیا جائے؟

طالبِ علم کو سب سے پہلے جس علم میں مشغول ہونا چاہیے، وہ دو علوم ہیں:

ایک: علومِ عربیہ یعنی علمِ نحو، علمِ صرف، علمِ لغت اور علمِ بلاغت (یعنی معانی، بیان اور بدیع)۔

اور دوسرے: اپنے مسلک کے فقہ کا علم، جس کو بتدریج حاصل کیا جائے کہ طالبِ علم پہلے متون اور مختصرات کو پڑھ کر ان میں مضبوطی پیدا کرے اور بنیاد ڈالے، پھر آگے بڑھے۔

علومِ عربیہ کی تعلیم کی اہمیت:

اس کی اہمیت کا اندازہ ان آثار سے ہوتا ہے جو خطیب بغدادیؒ نے اپنی ''جامع'' میں ذکر کیے ہیں، ان ہی میں حماد بن سلمہؒ کا یہ ارشاد بھی ہے جو انھوں نے کسی شخص سے کہا تھا کہ: اگر تم میری حدیث میں اعرابی غلطی کرو گے تو تم مجھ پر جھوٹ گڑھنے والے ہو گے؛ کیونکہ میں اعراب میں غلطی نہیں کرتا(۲)۔ ان کا یہ جملہ گویا ان کے شاگرد اصمعیؒ کے اس قول کے لیے بطور دلیل ہے، جو انھوں نے حدیث کے اندر اعرابی غلطی کرنے والوں کے بارے میں کہا ہے کہ: انھیں ڈر ہے کہ وہ لوگ حدیث پاک **''من كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النار''** کے تحت داخل نہ ہو جائیں۔

اعراب کی تصحیح اور زبان کو صحیح کرنے کی کیا اہمیت ہے، اس کے لیے میں آپ کو ایک بڑے امام کا جملہ سناتا ہوں، اس جملہ سے ہمارے ائمہ کے عجیب وغریب احوال کا بھی پتہ

(۱) ادب الدنیا والدین ص ۸۸

(۲) الجامع (۱۰۷۳، ۱۰۹۷)

چلتا ہے، یہ جملہ ابو بکر مالکیؒ (جن کی وفات پانچویں صدی ہجری کے ربع اخیر میں ہوئی) کی کتاب ""**رياض النفوس**"" میں مذکور ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: امام کبیر سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ: کبھی کبھی قاری میرے سامنے حدیث کی قرأت کرتا ہے اور پڑھنے میں غلطی کرتا ہے، تو مجھ سے نہ کھانا کھایا جاتا ہے اور نہ نیند آپاتی ہے!!(۱)۔

ہم نے اپنے علماء و مشائخ کو دیکھا ہے کہ وہ عربی زبان میں بھی مرجع ہوا کرتے تھے؛ لیکن اب علماء اس کی حفاظت سے غافل ہو گئے اور ان کے نیچے سے یہ بستر کھینچ لیا گیا!۔

فقہ کی اہمیت:

جہاں تک فقہ کی بات ہے تو اس کی اہمیت کا کیا پوچھنا، وہ تو عین اسلام ہے اور شہادتین اور بنیادی عقائد کے بعد سب سے پہلے اسی کی ضرورت پڑتی ہے، خود طالبِ علم اپنے لیے بھی سب سے پہلے اس علم کا محتاج ہوتا ہے، اور دیگر لوگ بھی اس سے سب سے پہلے اسی علم کے محتاج ہوتے ہیں؛ کیونکہ وہ اس سے فقہی مسائل یعنی عبادات اور معاملات کے متعلق ہی پوچھتے ہیں۔

خطیب بغدادیؒ نے امام احمدؒ کے جلیل القدر شاگرد امام ابراہیم حربیؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جس نے عربی زبان پر دسترس حاصل کیے بغیر فقہ کے اندر گفتگو کی، اس نے کوتاہ زبان سے گفتگو کی (۲)۔

فقیہ حنبلی امام ابنِ مفلحؒ نے اپنی انتہائی گراں قدر کتاب ""**الآداب الشرعية**"" میں (۳) ایک باب باندھا ہے: ""**فضل في فضل الجمع بين الحديث وفقهه**""

(۱) عبداللہ بن عمر بن غانم ۱: ۲۱۶ کے ترجمہ میں

(۲) **آداب الفقيه والمتفقه** (٦٦٣)

(۳) ۲: ۱۲۱

(حدیث اور فقہ کو جمع کرنے کی فضیلت کا بیان) اس باب کے تحت انھوں نے بے شمار فوائد جمع کیے ہیں، انہی میں حنفیہؒ کے امام صاحب ''محیط'' کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ: جمہور کے نزدیک اُصول وعقائد اور یقین کا علم جاننے کے بعد سب سے افضل علم: فقہ اور حلال وحرام بتانے والے احکامِ شرعیہ کا جاننا ہے۔

علمِ فقہ کی اہمیت کے سلسلے میں ابوالفرج ابن الجوزیؒ نے بھی ایک قیمتی جملہ کہا ہے، جو انھوں نے ''خاطرہ نمبر ۱۳۳۱'' کے تحت لکھا ہے، اس خاطرے کا عنوان ہے: **''ما ذا یجب أن یدرس طالب العلم؟''** (طالبِ علم کو کیا پڑھنا چاہیے؟) اس خاطرے کے تحت وہ لکھتے ہیں کہ: جو شخص باہمت اور اپنی ذات کا خیر خواہ ہو، اسے چاہیے کہ وہ ہر علم کی اہم چیزوں کو حاصل کرنے میں لگ جائے اور زیادہ تر فقہ کے اندر ہی مشغول رہے؛ کیونکہ وہ سب سے اہم اور سب سے عظیم علم ہے[1]۔

انھوں نے ایک مختصر سا فقرہ اور کہا ہے، جس میں انھوں نے دونوں علموں (علومِ عربیہ اور علمِ فقہ) کی اہمیت کو جمع کر دیا ہے، فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم کے لیے اتنا نحو حاصل کرنا ضروری ہے جس سے وہ اپنی زبان کو درست کر سکے اور عربی زبان سے اتنی واقفیت ضروری ہے جتنی عامۃً استعمال ہوتی ہے اور فقہ تو تمام علوم کی اصل ہے[2]۔

امام نوویؒ ''مجموع''[3] کے مقدمے میں فرماتے ہیں کہ: طالبِ علم سب سے پہلے قرآن پاک کا حفظ کرے......، قرآن پاک یاد کر لینے کے بعد ہر فن کا ایک مختصر متن یاد کرے اور اس کے لیے پہلے اہم علوم کو لے، اہم علوم میں: سب سے پہلے فقہ اور نحو ہے، اس کے بعد حدیث اور اُصول کا علم ہے اور پھر اس کے بعد حسبِ سہولت بقیہ علوم ہیں۔

(۱) صید الخاطر ص ۳۶۶

(۲) **لفتة الکبد** ص ۱۰

(۳) ۱: ۳۸

مدارس میں مذکورہ علوم کی تعلیم کا منہج:

ہمارے دینی مدارس میں تو بحمد اللہ یہ دونوں علوم اور ان کے علاوہ دیگر علوم بھی اسی منہج کے ساتھ پڑھائے جاتے ہیں، میں تو اس شخص کو یہ ترتیب بتا رہا ہوں، جس نے مدارس میں علم حاصل نہ کیا ہو۔

بلاشبہ ان مدارس میں اس طرح تدریجاً علم حاصل کرنے کی برکت سے طالبِ علم کے اندر علومِ شرعیہ کی معلومات سال بہ سال بڑھتی چلی جاتی ہیں، جس کے بعد اسے یہ آزادی بھی حاصل ہوتی ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک علم کو اختیار کر کے اس میں اختصاص پیدا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے؛ بلکہ تمام علوم سے اجمالی طور پر واقفیت کا ایسا ملکہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ مستقبل میں جب کبھی اسے ان علوم کے اندر کسی بحث کی ضرورت پڑتی ہے، وہ اس کو تلاش کر کے اس بحث تک پہنچ جاتا ہے۔

یہی نہیں؛ بلکہ جب اسے کسی بحث کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اپنا میدان وسیع کر کے اس بحث کے اصل مصادر کی طرف رجوع کرتا ہے، اور چند سال نہیں گزرتے کہ اس کی گرفت ان تمام فنون پر مضبوط ہو جاتی ہے، یاد رکھیے! تمام علومِ شرعیہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے؛ اس لیے ان تمام علوم پر مضبوط گرفت ضروری ہے؛ تاکہ آپ کے لگائے ہوئے احکام اور آپ کی لکھی ہوئی تحریریں قوت اور پختگی کے ساتھ متصف ہوں۔

مدارس میں رائج نصاب پر توجہ-ایک ضمنی تنبیہ:

چونکہ مدارس کے نصاب میں داخل درسی کتابوں کا ذکر چل پڑا ہے، جن پر سالہا سال سے اساتذہ نسلاً بعد نسلٍ اعتماد کرتے اور اپنے طلبہ کو پڑھاتے چلے آئے ہیں؛ اس لیے میں موقع کی مناسبت سے کہنا چاہوں گا کہ: ان درسی کتابوں سے طالبِ علم کے ذہن میں علومِ

شرعیہ کی ایک مضبوط بنیاد پڑ جاتی ہے؛ اس لیے ہمارے عزیز طلبہ ان کتابوں کو یاد کرنے کی فکر کریں، ان کے تکرار کی پابندی کریں، ان پر توجہ دیں اوران پر اپنے دینی علوم اور معلومات کی بنیاد رکھیں، یہ کتابیں اس وقت بھی اور مستقبل میں بھی آپ کے لیے زادِراہ ثابت ہوں گی، آپ ان کو ہلکے میں نہ لیں اور نہ دوسری کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی خواہش کریں؛ اس سے مستقبل میں آپ کی بنیاد کمزور پڑ جائے گی۔

دوسرا شعبہ: سال بہ سال ایک کے بعد دوسرا علم پڑھانا:

جہاں تک دوسرے شعبہ کی بات ہے، تو قاضی ابن المالکیؒ فرماتے ہیں[1] کہ: عقول کے اندر اگرچہ معلومات کو قبول کرنے اور حقائق کا امتیاز کرنے کی استعداد رکھی گئی ہے؛ لیکن وہ تمام علوم کا بالکلیہ احاطہ نہیں کرسکتے[2]؛ کیونکہ احاطہ تو وہی چیز کرسکتی ہے جو خود محیط ہو اور یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے...... آگے لکھتے ہیں کہ: آدمی کے لیے تمام علوم کا احاطہ ممکن نہیں؛ طویل عمریں بھی اس کی گنجائش نہیں رکھتیں، چہ جائے کہ ہماری یہ چھوٹی عمریں، ہاں یہ ممکن ہے کہ علوم سے اجمالی طور پر واقفیت حاصل کرلی جائے اوران کے بنیادی مسائل پر نگاہ ڈال لی جائے، باقی تفصیلات چھوڑ دی جائیں۔

"**الحث علیٰ طلب العلم**"[3] میں ہے- جو غالباً نظّام کا مقولہ ہے- کہ: اگر کوئی شخص تمام علوم کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے، تو اس کے گھر والوں کو اس کا ذہنی علاج کرانا چاہیے، یہ خیال اس کے ذہن میں اسی لیے آیا ہے کہ اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے یعنی اس کو جنون لاحق ہوگیا ہے۔

---

(۱) قانون التاویل ص ۵۰۴-۵۰۶

(۲) جی ہاں؛ بلکہ ابوحیان اندلسیؒ تو کہتے ہیں کہ: عقلاء کے مطابق علوم کا ازحام ذہنوں کو گمراہ کردیتا ہے۔

(۳) لابی ہلال العسکری ص ۶۹

بتدریج علوم کی مقدار میں اضافہ کیا جائے:

لیکن وہ ایک صفحہ کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں کہ: امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ: آدمی جب علم حاصل کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا دل گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی ہوتا ہے۔ یعنی چھوٹا اور تنگ ہوتا ہے۔ لیکن جلد ہی وہ ایک وادی بن جاتا ہے کہ اس میں جو چیز بھی رکھی جاتی ہے وہ اسے چٹ کر جاتا ہے۔

امام عسکریؒ اس مقولے کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: امام زہریؒ کی مراد یہ ہے کہ آدمی کے لیے شروع شروع میں یاد کرنا اور علوم کو محفوظ کرنا بھاری پڑتا ہے؛ لیکن جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر آسان ہو جاتا ہے، اس قسم کا مضمون حارث بن ابی اُسامہؒ کے ایک اثر میں بھی موجود ہے، جو شیخ ابو احمد عسکری عن الصولی کی سند سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: علماء کہا کرتے تھے کہ: اور برتنوں کا حال تو یہ ہے کہ جب اس میں کچھ ڈالو تو وہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس میں گنجائش کم ہوتی چلی جاتی ہے؛ لیکن دل ایک ایسا برتن ہے کہ اس میں جتنا بھی ڈالو کشادہ ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہی تشریح امام زہریؒ کی اس وصیت کی بھی ہونی چاہیے جو انھوں نے اپنے شاگرد یونس بن یزید ایلیؒ کو کی تھی(۱) کہ: یونس! علم کے سامنے بڑائی مت دکھاؤ؛ کیونکہ علم کی بے شمار وادیاں ہیں، تم کسی ایک وادی میں بھی جاؤ گے، تو تمہارا سفر ختم ہو جائے گا؛ اور تم اس وادی کو عبور نہیں کر پاؤ گے؛ اس لیے علم کو اطمینان سے تھوڑا تھوڑا حاصل کرو، ایک دم سے سب کو حاصل کرنے کی کوشش مت کرو؛ کیونکہ جو شخص سارا علم یک بارگی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے سارا علم یک بارگی چلا بھی جاتا ہے؛ اس لیے تھوڑا تھوڑا کر کے یکے بعد دیگرے اطمینان سے حاصل کرو۔

---

(۱) جامع بیان العلم (۶۵۲)

تیسرا شعبہ: بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل بتانا:

تیسرا شعبہ یہ ہے کہ: استاذ پہلے اور دوسرے مرحلہ میں طلبہ کے ساتھ اس طرح تدریجی پہلو اختیار کرے کہ پہلے ان کو ہر علم کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور موٹی موٹی باتیں بتائے، پھر دقیق مسائل سمجھائے، ہمارے اسلاف کا معاملہ اپنے طلبہ کے ساتھ ایسا ہوتا تھا جیسے ایک مشفق ماں کا اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ ہوتا ہے، جو ہر وقت اس فکر میں رہتی ہے کہ کس طرح وہ اپنے بچہ کی نشوونما، اس کی غذا اور اس کی حرکات وسکنات کو بتدریج آگے بڑھائے، جس طرح اس ماں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے چند روزہ بچے کو وہ چیزیں کھلائے جو ایک سال کے بچے کو کھلائی جاتی ہیں، اسی طرح استاد کے لیے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ مبتدی طالبِ علم کو ایسے مسائل، ایسے اختلافات اور ایسے دلائل بتائے جو فن پر قابو رکھنے والے طلبہ کو بتائے جاتے ہیں۔

عالمِ ربانی کی تفسیر یہی ہے:

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے شروع میں ”کتاب العلم“ کے دسویں باب میں لکھا ہے کہ: بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: ربانی وہ عالم ہے جو لوگوں کو بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل بتا کر ان کی تربیت طرح کرے۔

مجدالدین ابنِ اثیرؒ کہتے ہیں: بعض حضرات نے کہا ہے: ربانی ”رب“ بمعنی تربیت سے مشتق ہے، اسلاف طلبہ کی اس طرح تربیت کرتے تھے کہ پہلے ان کو علم کے چھوٹے چھوٹے مسائل بتاتے تھے، پھر بڑے مسائل کی طرف متوجہ کرتے تھے (۱)۔

امام بیضاویؒ اپنی تفسیر کے شروع میں ”رب“ کی تشریحات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: رب کی اصل تربیت سے ہے اور تربیت کہتے ہیں: کسی شے کو آہستہ آہستہ بتدریج کمال تک

(۱) النہایۃ ۲: ۱۸۱

پہنچانا، میں کہتا ہوں کہ: استاذ بھی اپنے طلبہ کا مربی ہوتا ہے؛ اس لیے وہ ان کو بتدریج تھوڑا تھوڑا علم دیتا ہے، یہاں تک کہ باذنِ الٰہی انھیں درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے(۱)۔

امام شاطبیؒ نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے، وہ اپنے اس قول پر کہ: ''اپنی جانی ہوئی ہر صحیح بات دوسروں تک نہیں پہنچانا چاہیے'' کی مثالیں دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ان ہی میں سے ایک مثال یہ ہے کہ: مبتدی طالبِ علم کے سامنے وہ باتیں ذکر نہ کی جائیں جو منتہی طالبِ علم کا حصہ ہیں، انھیں پہلے چھوٹے چھوٹے مسائل بتائے جائیں، پھر بڑے مسائل سمجھائے جائیں(۲)۔

آگے وہ عالم متمکن کے احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں(۳) کہ: اس مرتبہ کے حامل شخص کو ربانی، حکیم، راسخ فی العلم، عالم، فقیہ اور عاقل جیسے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے؛ کیونکہ وہ بڑے مسائل سے پہلے چھوٹے مسائل سکھا کر لوگوں کی تربیت کرتا ہے اور ہر ایک کو اس کے حال اور مرتبہ کے مناسب اس کا حق دیتا ہے۔

متون لکھنے کا رواج:

یہیں سے مختصر کتابچے لکھنے کا خیال پیدا ہوا، جنھیں ہم اور آپ ''متون'' کہتے ہیں؛ چنانچہ مبتدی طلبہ کے لیے مختصر کتابچے لکھے گئے(۴)؛ تاکہ وہ پہلے ان کو قابو میں کریں، پھر ان سے بڑی کتابوں کی طرف منتقل ہوں، پھر اور بڑی کتابوں کی طرف، اس طرح بتدریج یہ سلسلہ چلتا جائے۔

ان علمی متون اور مختصرات کو لکھنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں تھا کہ احکام کو دلائل سے خالی

---

(۱) آداب الفقیہ والمتفقہ ۱: ۱۸۴ (۱۷۶) ضرور دیکھیے

(۲) الموافقات ۴: ۱۹۰

(۳) ۴: ۲۳۲

(۴) ''اثر الحدیث الشریف'' ص ۱۹۰ کے حاشیہ میں ابن زرقون اور امیر عبدالمومن کا واقعہ بھی دیکھیے

کر دیا جائے، اور لوگ کتاب وسنت سے کٹ کر زندگی گزارنے لگیں۔

چونکہ یہ متون اسی مقصد سے لکھے گئے تھے؛ اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں صرف وہی مسائل بیان کیے گئے جنھیں ''رؤوس المسائل'' (بنیادی مسائل) کہا جاتا ہے، اور بہت سے فروعی مسائل، اپنے ائمہ کے مختلف اقوال اور دوسرے مسلک کے ائمہ کی آراء وغیرہ کو چھوڑ دیا گیا، دلیل اور مناقشہ سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا گیا اور مضامین کو بھی نہایت آسان اور واضح عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔

ان متون پر جب طالبِ علم قابو پالے، تو ان کی شروحات کی طرف منتقل ہو، وہاں اسے مختلف اقوال، مقارنے، دلائل، مناقشات اور مضبوط و پختہ عبارتیں ملیں گی۔

ہم پہلے سمجھتے تھے کہ یہ شروحات متن کی تشریح اور متن کو سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہیں؛ اس لیے ہم متن کی تشریح کے لیے ان شروحات کی طرف لپکتے تھے؛ لیکن وہاں ہمیں دشواریاں اور پیچیدگیاں ہی نظر آتی تھیں؛ کیونکہ وہ کسی اور مقصد سے لکھی گئی تھیں، وہ تو اس لیے لکھی گئی تھیں کہ متن میں مذکور مسائل کے دلائل دیے جائیں، مزید نئی باتیں بیان کی جائیں اور طالبِ علم کو متن کے معیار سے اُونچے معیار کی طرف لایا جائے۔

علوم اور تعلیم میں تدریج کے فوائد:

طلبہ کی تعلیم کے لیے یہ مذکورہ تدریجی طریقے نہایت اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، ان ہی سے طلبہ کے علم میں گہرائی، گیرائی اور بصیرت پیدا ہوتی ہے، پھر تدریج کی یہ خصلت ایک دوسری خصلت کے ساتھ مربوط ہے، جس کو ہم پیچھے بھی بیان کر چکے ہیں کہ: علم کو اساتذہ کے پاس جا کر حاصل کرنا چاہیے، جس کسی کو بھی اللہ تعالیٰ یہ دونوں خصلتیں مہیا فرمادیں وہ ان شاء اللہ صحیح فکر کا متبحر عالم بن کر نکلے گا اور جو ان دونوں خصلتوں سے محروم رہ جائے، تو پھر چاہے جس قدر بھی اس کا ستارہ بلند ہو جائے اور جتنی بھی شہرت و مقبولیت اسے حاصل ہو جائے اس کی بنیاد گرنے والے کھوکھلے کنارے پر ہی ہوگی۔

شذوذ وتفردات کا طوفان اور اس کا سبب:

یہ علمی شذوذ جس کا آج ہمارے دَور میں سیلاب آیا ہوا ہے، اسی وجہ سے ہے کہ علمی موضوعات پر گفتگو کرنے والے لوگ ان دونوں خصلتوں سے دُور ہیں، نہ علم حاصل کرنے کے لیے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں اور نہ حصولِ علم میں تدریج کی راہ اپناتے ہیں۔

چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک مہذب اور دیندار نوجوان سب سے پہلے جس کتاب کو اُٹھاتا ہے، وہ "**سبل السلام**" ہوتی ہے، اور اگلے روز ہی وہ ترقی کر کے "**نيل الأوطار**" تک پہنچ جاتا ہے اور تیسرے روز "**المحلي**" اُٹھالیتا ہے، اب آپ بتایئے اس شخص کو علم اور علم کے امہات المصادر سے کیا واسطہ رہ گیا؟! اور اس کے اندر مخالفین کا ادب واحترام کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے، جب وہ "**المحلی**" کے ہر صفحہ پر ائمہ کرام کی شان میں تنقیص اور ان پر سب وشتم دیکھتا ہے؟! وہ بھی کتاب اللہ اور صحیح احادیث پر عمل کے نام پر!! اس شخص کو چار امام بلکہ چالیس اماموں کے مذہب سے بھی خروج پر کیونکر کوئی ڈر ہوسکتا ہے، جب وہ ''نیل الاوطار'' میں قدم قدم پر اجماع اور اجماع کے قائلین پر لعن طعن پڑھتا ہے؟! اور بھی نہ جانے کتنے شاذ اقوال کی تائید وغیرہ ان تینوں کتابوں میں پڑھتا رہتا ہے۔

تدریج کے فقدان پر حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

اس موقع پر ترجمان القرآن، اصابتِ رائے کے مالک، دُوررَس نگاہ کے حامل، الامام الحبر البحر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا وہ حکیمانہ موقف پڑھنے کے قابل ہے، جس پر خلیفہ راشد ملہم من اللہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی موافقت کی تھی۔

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ نے اپنے ''مصنَّف'' میں "**الخصومة في القرآن**" کے عنوان

کے تحت حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ: حضرت عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا، حضرت عمرؓ اس سے لوگوں کے حال احوال دریافت کرنے لگے، اس نے بتایا کہ: امیر المومنین! ان میں سے پڑھنے والے قرآن کو ایسے اور ایسے پڑھ رہے ہیں، حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے یہ سن کر کہا: بخدا! مجھے یہ پسند نہیں کہ لوگ اس طرح آج قرآن میں تیزی دکھائیں، اس پر حضرت عمرؓ نے مجھے جھڑک دیا اور فرمایا: خاموش ہو جاؤ، حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ: میں رنجیدہ اور غمزدہ حالت میں اپنے گھر کی طرف چل پڑا، میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ: ان کے (یعنی حضرت عمر کے) نزدیک میرا ایک مقام تھا؛ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ ان کی نگاہوں میں میری کوئی حیثیت نہیں رہی، میں اپنے گھر لوٹا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا، گھر کی عورتوں نے بیمار سمجھ کر میری عیادت بھی کی؛ حالانکہ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ تو بس اسی حادثہ کا اثر تھا، جو حضرت عمرؓ کے ساتھ پیش آیا۔

اسی اثناء میں ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا: امیر المومنین بلا رہے ہیں، میں باہر نکلا تو دیکھا امیر المومنین کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور تنہائی میں لے گئے اور فرمایا: تمہیں اس شخص کی اس بات پر ناگواری کیوں ہوئی تھی؟ میں نے کہا: امیر المومنین! اگر مجھ سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو میں اللہ سے معافی طلب کرتا ہوں، اور آئندہ میں اپنے آپ کو اسی حد تک رکھوں گا جتنا آپ چاہیں گے، انھوں نے فرمایا: نہیں! تم مجھے ضرور بتاؤ گے کہ تمہیں اس شخص کی بات پر ناگواری کیوں ہوئی؟ میں نے کہا: امیر المومنین! اگر لوگ اس طرح تیزی دکھائیں گے تو ہر ایک اپنے آپ کو حق پر سمجھے گا، اور جب ہر ایک خود کو حق پر سمجھے گا تو باہم خصومتیں ہوں گی اور جب خصومتیں ہوں گی تو اختلافات پیدا ہوں گے اور جب اختلافات پیدا ہوں گے تو نوبت قتل وقتال تک پہنچے گی، حضرت عمرؓ فرمانے لگے: بخدا! میرے دل میں بھی یہی بات

تھی، جسے میں لوگوں سے چھپا رہا تھا اور آج تم نے وہی بات کہہ دی(۱)۔

اللہ تعالیٰ عالمِ ربانی، مربی فاضل، شیخ عبدالکریم رفاعیؒ (متوفی ۱۳۹۳ھ) پر رحمتیں نازل فرمائے، وہ کہا کرتے تھے کہ: بڑوں کی غذا چھوٹوں کے لیے زہر ثابت ہوتی ہے۔

علامہ شیخ محمد سعید بانی دمشقیؒ (متوفی ۱۳۵۱ھ) نے ''عمدۃ التحقیق''(۲) میں اپنا واقعہ بیان کیا ہے کہ: جس وقت میں اپنے استاذ علامہ شیخ عبدالحکیم افغانی نوراللہ مرقدہٗ سے اُصولِ فقہ پڑھ رہا تھا، میں نے ان سے دریافت کیا کہ: اس علم کا کیا فائدہ؟ انھوں نے جھٹ سے کہا کہ: اس کا فائدہ اجتہاد ہے، میں نے کہا: لوگ تو کہتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے؟ انھوں نے استفہامِ انکاری کے طور پر تیز لہجے میں پوچھا: کس نے بند کیا ہے؟ اللہ تمہارے احوال درست فرمائے، ہاں! البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ تمہارے دیار میں لوگ ''نورالایضاح'' بھی نہیں پڑھتے اور اجتہاد کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔

میں کہتا ہوں: اللہ تعالیٰ شیخ پر رحم فرمائے! اگر وہ ہمارا زمانہ دیکھ لیتے تو کہتے، ہم تو جاہلوں اور بچوں کو بھی اجتہاد کی جرأت دیتے ہیں اور سچے اور حقیقی مجتہدین کی شان میں تنقیص، ائمۂ سلف پر زبان درازی اور طعن وتشنیع کے تیر برسانے کا بھرپور موقع فراہم کرتے ہیں، وہ بھی ایک ایسی چیز کی آڑ میں کہ اگر ہم اس میں واقعی سچے ہوتے تو وہ ہمارے لیے کیا ہی عزت وشرف کی چیز ہوتی! یعنی کتاب وسنت اور سلفِ صالحین کی اتباع کی آڑ میں۔

---

(۱) مصنف عبدالرزاق (۲۰۳۶۸)، یہ حدیث **المعرفة والتاریخ** ۱:۵۱۶-۵۱۷ میں مصنف جیسی سند سے مروی ہے، مستدرک ۳: ۵۴۰، ۵۴۱ (۶۳۰۱، ۶۳۰۲) میں حاکم نے اسے دو طریق سے روایت کیا ہے، جن میں سے ایک کو شیخین کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے اور ذہبیؒ نے ان کی موافقت کی ہے، ذہبی نے سیر ۳: ۳۴۸ میں اسے عبدالرزاق کی طریق سے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات سے راضی ہو، کس قدر دُور رَس نگاہیں تھیں ان کی، یہی وہ بات ہے جس کا ہمیں شکوہ ہے۔

(۲) ص ۶۳

تدریجی منہج اور دو ضروری چیزیں:

اس تنبیہ سے جڑی ہوئی ایک اور انتہائی اہم تنبیہ ہے، وہ یہ کہ طالبِ علم ہر مسئلے کے متعلق دو چیزوں کا اہتمام والتزام کرے اور استاذ کو بھی چاہیے کہ اس پر طالبِ علم کی مدد کریں:

۱- ہر لفظ کی پوری تحقیق ہو:

طالبِ علم ہر لفظ کو اس کی تمام وجوہ کے ساتھ ضبط کرے اور یاد کرے، مثلاً کوئی لغوی کلمہ ہو تو اس کی لغوی اور صرفی تحقیق کرے، اگر فقہ یا اُصولِ فقہ وغیرہ کی کوئی اصطلاح ہو تو اس کے مصادر سے رجوع کر کے اس کو سمجھے اور اگر کوئی علَم ہو تو اس کا بھی صحیح اعراب ضبط کرے؛ تاکہ اس کا صحیح تلفظ کر سکے، یہ سب چیزیں چاہے تو اپنے استاذ سے معلوم کرے یا خود ہی تلاش کرے۔

۲- کسی بھی مسئلے سے بے توجہی نہ برتے:

طالبِ علم کسی بھی علمی مسئلے کو ہلکے میں نہ لے اور یہ نہ کہے کہ: یہ تو ثانوی درجے کا مسئلہ ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں یا اس کے بارے میں کوئی پوچھے گا نہیں، یا یہ نادر الوقوع مسئلہ ہے یا اور کوئی اس طرح کی ٹال مٹول والی بات نہ کہے!۔

بلکہ وہ اپنی درسی کتاب میں آنے والے ہر مسئلے کو خوب اچھی طرح سمجھے، اس کو حل کرے، اس کو یاد کرے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ اور احتمال باقی نہ رہنے دے، ان شاء اللہ وہ مستقبل میں اس کا بہت فائدہ دیکھے گا، اسے علمی مسائل کے اندر ذہن اور طبیعت کی صفائی نصیب ہوگی اور اس کے طے کردہ پیمانے اور علمی مناقشات بالکل صحیح ہوں گے۔

ان دونوں باتوں کو امام شافعیؒ نے ایک مختصر اور جامع قاعدے کی شکل میں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: "**من تعلّم علمًا فليُدقّق فيه، لئلا يَضيع دقيق العلم**" کہ

جب کوئی شخص علم حاصل کرے تو اس میں خوب تدقیق اور باریک بینی سے کام لے؛ تا کہ اس سے علم کے دقیق اور پیچیدہ مسائل ضائع نہ ہوں(۱)۔

ہماری یہ تنبیہ درحقیقت امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معینؒ کے ایک قصہ سے ماخوذ ہے، جسے خطیب بغدادیؒ نے نقل کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ: امام احمدؒ نے ایک مرتبہ یحییٰ بن معینؒ کو دیکھا کہ وہ ''صنعاء'' کے اندر ایک گوشے میں بیٹھ کر "**معمر، عن أبان، عن أنس**" والا صحیفہ نقل کر رہے ہیں، اور جب کسی کی آہٹ محسوس ہوتی ہے تو اسے چھپا دیتے ہیں، امام احمدؒ نے ان سے دریافت کیا کہ: آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ صحیفہ موضوع ہے اسے کیوں نقل کر رہے ہیں؟! یحییٰ بن معینؒ نے فرمایا: ابوعبداللہ! اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے، میں اس کو نقل کر کے مکمل یاد کروں گا؛ کیونکہ مجھے اس کے موضوع ہونے کا علم ہے؛ تا کہ اگر کوئی انسان ان روایات کے اندر ''**أبان**'' کو بدل کر ''**ثابت**'' کر دے اور "**معمر عن ثابت عن أنس**" کی سند سے روایت کرے، تو میں اس سے کہہ سکوں کہ: تم جھوٹ کہہ رہے ہو، یہ تو "**معمر عن أبان عن أنس**" کی سند سے مروی ہے(۲)۔

اس کے بعد خطیب نے ان دونوں کے ہم عصر امام اسحاق بن راہویہؒ سے نقل کیا ہے(۳)، وہ فرماتے ہیں کہ: مجھے ایک لاکھ حدیثوں کا اس طرح علم ہے جیسے میں ان کو دیکھ رہا ہوں اور ان میں سے ستر ہزار صحیح حدیثیں تو مجھے زبانی یاد ہیں اور چار ہزار موضوع حدیثیں یاد ہیں، کسی نے پوچھا کہ: موضوع احادیث یاد کرنے کا کیا فائدہ؟ انھوں نے فرمایا کہ: جب صحیح احادیث کے درمیان کوئی موضوع حدیث آجاتی ہے تو میں اس کو فوراً پکڑ لیتا ہوں اور چھانٹ کر الگ کر دیتا ہوں۔

(۱) بیہقی نے اس کو ''مناقب شافعی'' ۲: ۱۴۲ میں اپنی سند سے روایت کیا ہے۔

(۲) الجامع (۱۶۳۸)

(۳) (۱۸۳۴)

اس سے معلوم ہوا کہ طالب علم کو ہر جزیئے پر توجہ دینی چاہیے، کیا پتہ کہیں اچانک کوئی ناگہانی بات پیش آجائے اور جزیے کی ضرورت پڑ جائے۔

کتابوں کو جمع کرنے میں تدریج:

قبل اس کے کہ میں اس دوسری مشعل یعنی تعلیم میں تدریجی پہلو سے متعلق گفتگو کو ختم کروں، ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اور تدریجی پہلو کی طرف متنبہ کردوں اور وہ ہے طلبہ کے لیے مختلف افکار وعلوم پر مشتمل کتب خانے تیار کروانے میں استاذ کا تدریج اختیار کرنا، میں چاہتا ہوں کہ اس پر بھی کچھ کلمات عرض کروں:

قارئین کرام! کتاب طالبِ علم کے بدن کے خلیوں کا ایک جزء، اس کی علمی، فکری اور روحانی نشوونما کا سرچشمہ اور مستقبل قریب میں ایک عالی شان علمی محل تعمیر ہونے کے لیے بنیاد کا پتھر ہے؛ اس لیے طالبِ علم کو بالالتزام کتب خانوں کی وقتاً فوقتاً چھان بین کرتے رہنا چاہیے؛ البتہ ابتدائی سالوں میں وہ صرف درسی کتابیں ہی خریدے، غیر درسی کتاب یا تو اپنے کسی استاذ کے کہنے پر یا ان سے مشورہ کرکے خریدے، اس عمر میں خود اپنی رائے سے کتاب خریدنا، جبکہ ابھی کتابوں اور مصادرِ علم کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں، بالکل مناسب نہیں۔

ذرائعِ ابلاغ سے بچنے کی ضرورت:

ہمارے اس زمانے میں طالبِ علم کو اس بات سے روکنے اور ڈرانے کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے کہ وہ ثقافتی چیزوں کی طرف اپنے ہاتھ نہ بڑھائے، خواہ وہ کتابوں کی شکل میں ہوں یا وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے انتہائی نقصان دہ ذرائع ابلاغ کی شکل میں، یہ ذرائع ابلاغ آج ہمارے اُوپر نفع سے کہیں زیادہ نقصانات، مصائب اور خطرات لیے ہوئے اُمڈ پڑے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، طالبِ علم کو ان

سب سے بچنے اور دُور رہنے کی ضرورت ہے، مربی حضرات کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو ان چیزوں سے ڈرائیں؛ بلکہ ان کی نگرانی رکھیں اور ان کی طرف سے کیے جانے والے سوالات اور شبہات کے اندر ان کو جانچنے کی کوشش کریں (کہ آیا وہ ان نئے وسائل کی طرف متوجہ تو نہیں ہو رہے ہیں)۔

کتابوں کے سلسلے میں رہنمائی کا طریقہ:

استاذ کو چاہیے کہ اگر انھیں کسی طالبِ علم کے اندر کتابیں جمع کرنے کا شوق نظر آئے، تو اس کو ایسی کتابوں کی طرف رہنمائی کریں جو فی الحال اس کی پڑھائی میں معاون ثابت ہو سکتی ہوں، یا مستقبل میں اس کے کام آنے والی ہوں اور اس میں تدریج کی پوری رعایت کریں جس میں وہ ان علوم کو پیشِ نظر رکھیں جن میں- ان کی رائے یا ان کے انتخاب کے مطابق- اس طالبِ علم کو آگے چل کر اختصاص کرنا ہے اور ایسا بھی کیا جا سکتا ہے کہ استاذ اپنے شہر اور اپنے دیار کی مصلحت کو پیشِ نظر رکھ کر کتابوں کی رہنمائی کریں۔

اس طالبِ علم کے اندر کیا خیر ہو سکتی ہے جسے اپنے علمی اور روحانی زادِ راہ کو جمع کرنے، اس کو اکٹھا کرنے اور اس سے اپنی پیاس بجھانے کی کوئی فکر نہ ہو، جیسا کہ مدارس کے بعض طلبہ کا حال ہوتا ہے، جو کہلاتے تو طالبِ علم ہیں؛ لیکن جب فارغ ہو کر جاتے ہیں تو ان کے پاس اپنی درسی کتابیں بھی نہیں ہوتیں!!۔

ایسے طلبہ کے لیے اپنے اسباق صحیح طریقے سے دہرانا اور صحیح ڈھنگ سے مطالعہ کرنا کیسے ممکن ہوتا ہوگا، جب ان کے پاس علم کی بنیادی کتابیں ہی نہیں ہوتیں، نہ عمومی کتابیں ہوتی ہیں اور نہ ہر علم کی خصوصی کتابیں۔

عمومی بنیادی کتابوں سے میری مراد **"المصباح المنیر"** اور **"القاموس المحیط"** جیسی کتابیں ہیں، کہ جب بھی طالبِ علم کے سامنے کسی بھی علم اور فن کے اندر کوئی ایسا لفظ آتا ہے، جس کو ضبط کرنے یا اس کے لغوی یا اصطلاحی معنیٰ جاننے کی ضرورت

پڑتی ہے، تو اسے ان کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

اور خصوصی بنیادی کتابوں سے مراد: درسی کتابوں کے متعلقات ہیں، مثلاً جب طالبِ علم کے سامنے کسی فقہی مسئلے کی کوئی صورت آتی ہے اور طالبِ علم کی فہم کے اعتبار سے اس عبارت میں کوئی غموض اور پیچیدگی ہوتی ہے یا متعدد احتمالات ہوتے ہیں، اور اس کے پاس اس کتاب کی کوئی شرح یا کوئی متعلقہ کتاب نہیں ہوتی تو وہ مسئلہ کو کیسے حل کرتا ہوگا۔

الغرض کتاب، کتاب کی عمومی اہمیت وافادیت، اور خاص طور سے طالبِ علم کی علمی ترقی میں ان کے کردار سے متعلق گفتگو: ایک ختم نہ ہونے والا موضوع ہے، **والله وليّ كلّ تيسير وتوفيق.**

چوتھی مشعل

زبان کی غلطیوں کو درست کرنے اور تہذیب وشائستگی پیدا کرنے کی ضرورت

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تعلیم وتربیت کا مبارک منصب عطا کرتے ہیں، اس کے کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں آن پڑتی ہیں، انھیں میں سے ایک ذمہ داری طلبہ کی زبان کو درست کرنے اور مہذب بنانے کی بھی ہے، یہ درحقیقت دو الگ الگ چیزیں ہیں:

پہلی شق: زبان کی غلطیوں کی اصلاح:

پہلی شق ہے: زبان کی عمومی غلطیوں پر متنبہ کرنا، استاذ کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبہ کی ان غلطیوں کی اصلاح کریں جو زبان زدِ عام ہیں، اس طرح کی غلطیاں بہت ہیں اور باوجودیکہ ان میں سے بعض غلطیاں ہمارے بعض علمائے سابقین کے قلم پر بھی آ گئی ہیں؛ لیکن بہرحال متقدمین، سابقین اور لاحقین سبھی علماء نے اس طرح کی غلطیوں کی تصحیح کا اہتمام کیا ہے اور اس پر کتابیں بھی لکھی ہیں، جس کا سلسلہ امام ابنِ قتیبہ کی ''**أدب الکاتب**'' سے شروع ہوکر ہمارے اس دَور تک پہنچتا ہے، جن میں بطور خاص امام نوویؒ نے اپنی کتابوں میں اس طرح کی غلطیوں پر بکثرت متنبہ کیا ہے، یہاں تک کہ انھوں نے مستقل طور پر ''**تهذيب الأسماء واللغات**'' بھی لکھی ہے، جس میں انھوں نے نام کی تصحیح کے ساتھ زبان کی غلطیوں کی بھی اصلاح کی ہے۔

زبان کی اصلاح اور دو ذمہ داریاں:

واضح رہے کہ زبان کی اصلاح کے تحت دو ذمہ داریاں آتی ہیں:

ایک ذمہ داری: ان غلط تعبیرات سے زبان کی حفاظت، جنھیں بعض علماء استعمال کرتے ہیں جن میں علماء سابقین بھی شامل ہیں، متأخرین بھی اور موجودہ دَور کے علماء بھی؛ حالانکہ وہ تعبیرات اہلِ عرب کے استعمال کے خلاف ہیں۔

دوسری ذمہ داری: عربی کے علاوہ دوسری زبان کے جو کلمات ہمارے یہاں رائج ہیں، اُن کی عربی بنا کر انھیں استعمال کرنا۔

غلط تعبیرات سے زبان کی حفاظت:

جہاں کی پہلی ذمہ داری کی بات ہے: تو اس کی بہت سی مثالیں ہیں، بہت سی غلط تعبیرات ہماری زبانوں پر رائج ہیں، مثلاً:

- کہا جاتا ہے: "**فلان عالمٌ نَحَويٌّ**" جبکہ صحیح "حاء" کے سکون کے ساتھ علمِ نحو کی طرف نسبت کرتے ہوئے "**نحْويٌّ**" ہے۔

- کہا جاتا ہے: "**فعلت كذا لأجل كذا**" جبکہ صحیح "**من أجل كذا**" ہے۔

- کہا جاتا ہے: "**أجب على الأسئلة التالية**" جبکہ صحیح "**أجب عن الأسئلة**" ہے۔

- کہا جاتا ہے: "**المتوفِّي**" جبکہ صحیح "**المتوفَّى**" ہے[1]۔

---

[1] یہ اسی طرح "متوفَّی" ہی عام اور مستعمل ہے، اور یہی استعمال بھی کرنا چاہیے، اگرچہ سخاویؒ نے "**الإعلان بالتوبيخ**" میں (مطبع "مؤسسة الرسالة" کے ص: ۵۴۳ پر "**علم التاريخ عند المسلمين**" کے ضمن میں اور مطبع "دار الكتب العلمية" کے ص: ۸۵ پر) لکھا ہے کہ: علماء کے کلام میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے: "**فلان المتوفي**" آپ اس کو فاء کے کسرے کے ساتھ

-اسی طرح بعض کتابوں کے محققین اپنے ''مقدمۃ التحقیق'' میں لکھتے ہیں: **''قابلت الكتاب على مخطوطين''** جبکہ صحیح **''قابلت الكتاب بمخطوطين''** ہے۔

-کہا جاتا ہے: **''هنا في مخطوطةِ أ -مثلاً- سَقْطٌ''** جب کہ صحیح **''سَقْطٌ''** ہے۔

-کہا جاتا ہے: **''بل ولا بدّ كذا''** جبکہ صحیح: حرفِ عطف کے حذف کے ساتھ **''بل لا بد كذا''** ہے؛ کیونکہ ''بل'' اور ''واوَ'' دونوں حرفِ عطف ہیں اور ایک حرفِ عطف کا دوسرے حرفِ عطف پر دخول صحیح نہیں ہے۔

-اسی طرح مشہور ہے: **''الشئون القُروِيَّة''** اور **''المؤتمرات الدُّوَلية''** جبکہ صحیح ان کے مفرد **''قَرْية''** اور **''دَوْلة''** کی طرف نسبت کرتے ہوئے **''الشئون القَرَوِيّة''** اور **''المؤتمرات الدَّوْلِيّة''** ہے۔

اسی طرح اور بھی متعدد تعبیرات ہیں۔

دوسری زبان کے کلمات کی تعریب:

جہاں تک دوسری ذمہ داری کی بات ہے: تو اساتذہ اس تعلق سے بھی اپنی اور اپنے شاگردوں کی زبانیں صحیح کرنے کی فکر کریں، جس کا طریقہ یہ ہے کہ دوسری زبان کے جو کلمات عربی زبان میں درآئے ہیں، انھیں استعمال کرنے کے بجائے عربی اوزان کے

☜ **متوفِّي** بھی پڑھ سکتے ہیں اور فتحہ کے ساتھ **متوفَّى** بھی، کسرے کی صورت میں مطلب ہوگا: اپنی زندگی کی مدت کو پورا وصول کرنے والا، کسرہ کی صحت پر حضرت علیؓ کی قرأت: ﴿**وَالَّذِيْنَ يَتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ**﴾ (سورۃ البقرہ: ۲۳۴) - یاء کے فتحہ کے ساتھ - شاہد ہے اور مطلب ہے: جو لوگ اپنی مدتوں کو پورا وصول کر لیتے ہیں الخ، اسی طرح کی بات ''روح المعانی'' اور ابو حیان کی ''البحر المحیط'' میں بھی ہے؛ پھر بھی بہر حال ''**المشهور خير من المهجور**'' کہ مشہور چیز متروک چیز سے بہتر ہوتی ہے۔

مطابق ان کی عربی بنا کر انھیں استعمال کریں؛ کیونکہ زبان تو فرد کی انفرادی شخصیت وشناخت کے لیے بنیادی جز کی حیثیت رکھتی ہے، پھر پوری قوم کی شناخت وامتیاز میں اس کا کس قدر دخل ہوگا ظاہر ہے، آج امت کی انفرادی شناخت ختم ہونے کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اب امت عربی زبان کے تعلق سے حساس نہیں رہی، وہ اب دوسری زبانوں پر جھپٹتی اور اس کو بولنے اور برتنے پر فخر محسوس کرتی ہے؛ اس لیے آج ضروری ہے کہ ہم طلبہ کے سامنے "**بوك**" کے "**كتاب**"، "**تليفون**" کے بجائے "**هاتف**"، "**فاكس**" کے بجائے "**فَقْس**"، "**موبايل**" کے بجائے "**جوّال**" یا "**نقّال**"، "**كيدون**" یا "**طارة**" کے بجائے "**مِقْود**" (اسٹیرنگ) "**شوفير**" کے بجائے "**سائق**" وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں اور طلبہ کو بھی اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ ان الفاظ یا ان جیسے دوسرے الفاظ کو استعمال کریں۔

دوسری شق: اساتذہ واسلاف کے تعلق سے مہذب زبان کا استعمال:

اس شق کی تفصیل یہ ہے کہ: اساتذہ اپنے طلبہ کی زبانوں پر توجہ دیں کہ: وہ اپنے اساتذہ سے گفتگو کرتے یا ان کا تذکرہ کرتے وقت یا اقوال یا کوئی بات نقل کرتے ہوئے علمائے سابقین کا نام لیتے وقت کس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

مجھے اس موقع پر امام مزنیؒ اور ان کے استاذ امام شافعیؒ کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، امام مزنیؒ فرماتے ہیں کہ: ایک روز مجھے امام شافعیؒ نے "**فلانٌ كذّابٌ**" کہتے ہوئے سنا کہ فلاں راوی کذاب ہے، تو فرمانے لگے کہ: ابراہیم! اپنے الفاظ کو لباس پہناؤ، ان کو بہتر بناؤ، یہ مت کہو: "**فلانٌ كذّاب**"، یہ کہو: "**حديثه ليس بشيء**" کہ اس کی احادیث کچھ بھی نہیں ہیں (۱)۔

اساتذہ اپنے طلبہ کو امام احمدؒ کا وہ جملہ بھی بار بار سنائیں جو انھوں نے اسحاق بن

(۱) فتح المغیث ۲: ۲۹۲

اسماعیل نامی ایک راوی کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا، جس وقت انھیں پتہ چلا کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کے بارے میں کلام کرتا ہے، امام احمدؒ نے فرمایا: **مالك أنت -ويلك- ولذكر الأئمة؟!** کمبخت! تجھے ائمہ کے تذکرے سے کیا لینا دینا؟!(۱)۔

اساتذہ اپنے طلبہ کو وہ ادب بھی سکھائیں جو قاضی عیاضؒ نے اپنے استاذ امام ابوعلی صدفیؒ کے واسطے سے ان کے استاذ امام ابومحمد رزق اللہ بن عبدالوہاب تمیمیؒ (۴۰۰-۴۸۰ھ) سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ: یہ بہت بُری بات ہے کہ تم لوگ ہمارے علم سے فائدہ اُٹھاؤ اور جب ہمارا نام لو اور ہمارا تذکرہ کرو تو ہمارے لیے رحمت کی دعا نہ کرو (یعنی رحمہ اللہ نہ کہو)(۲)۔

امام نوویؒ کے حوالے سے یہ بات پیچھے گزر چکی ہے(۳) کہ: طالبِ علم کے اپنے اساتذہ ہوں یا علمائے سابقین، یہ سب اس کے علمی آباء واجداد ہوتے ہیں، پھر ایک مسلمان اپنے آباء واجداد کے لیے رحمت کی دعا کیوں نہ کرے؟!۔

ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابنِ عمرؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تمہارے ساتھ کوئی شخص بھلائی اور احسان کا معاملہ کرے تو تم اس کا بدلہ دیا کرو، اگر تمہارے پاس بدلہ دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو اس کے لیے دعا ہی کرتے رہو؛ تا آنکہ تمہیں محسوس ہو کہ تم نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے''(۴) یہ طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے **وإسناده صحيح.**

(۱) لفظ ''**ويلك**'' کے اندر مخاطب کے لیے بربادی اور ہلاکت کی بددعا پائی جاتی ہے، جبکہ لفظ ''**ويحك**'' میں پیار اور شفقت کے معنی ہیں۔

(۲) الالماع ص ۲۲۶-۲۲۷

(۳) ص ۱۶۰

(۴) ابوداود (۱۶۶۹) نسائی (۲۳۴۸)

جب اسلام نے ہمیں یہ ادب سکھایا ہے کہ: اگر کوئی تمہارے ساتھ کوئی دنیوی احسان بھی کرے تو تم اس کے بدلے میں اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرو، اگر چہ دعا ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو، تو پھر سوچیے! ان ذواتِ قدسیہ کے تعلق سے ہم پر کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہوگی جو دین، دنیا، آخرت، اخلاق اور آداب وغیرہ تمام شعبوں میں ہم پر احسانات کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

اور جب اپنے اساتذہ کے تعلق سے یہ ذمہ داری بنتی ہے، تو ان سے اُوپر کے آباء واجداد کے تعلق سے کس قدر ذمہ داری عائد ہوتی ہوگی، جن کی محنتوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا! اور پھر شریعت کے سب سے اوّلین ناقل حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعلق سے کس قدر ذمہ داری بنتی ہوگی اور پھر معلّم اوّل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تئیں ہماری کس قدر ذمہ داری بنتی ہوگی، یقیناً یہ بہت بڑی اور بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے اور پوری امت کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بہترین بدلہ عطا فرمائے، جو ایک نبی کو اس کی امت کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔

پانچویں مشعل

لفظ کی حقیقت اور تہ تک پہنچنے کا عادی بنانا

استاذ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے اندر تحقیق کا مزاج پیدا کریں اور انھیں باریک بینی کا عادی بنائیں، جس کا ایک مظہر یہ ہے کہ: وہ ان کے اندر عربی الفاظ کے دقیق معانی تلاش کرنے اور ان کی حقیقت تک پہنچنے کا مزاج پیدا کریں، خاص طور پر قرآن وحدیث کے الفاظ کے اندر، وہ ان کو اس معنیٰ پر قناعت نہ کرنے دیں جو اوّل وہلہ میں لفظ سے سمجھ میں آتے ہیں؛ کیونکہ اس سے وہ آیتِ قرآنی، حدیث شریف یا استشہاد میں پیش کیے گئے شعر وغیرہ کے صحیح معنیٰ ومفہوم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

ہر دو کلموں کے درمیان فرق مان لیں:

ویسے تو عربی زبان میں ترادف کے پائے جانے کے سلسلے میں علماء کا بڑا اختلاف ہے کہ آیا ترادف پایا جاتا ہے یا ہر دو کلموں کے درمیان جلی یا خفی فرق ضرور ہوتا ہے، ان میں سے جو رائے بھی راجح ہو؛ طالبِ علم کے لیے فائدہ اسی میں ہے کہ وہ ہر دو کلموں کے درمیان فرق کو مان لے اور پھر ان دونوں کے دقیق معنیٰ تلاش کرنے اور ان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرے؛ تاکہ وہ اس آیتِ کریمہ یا اس حدیث پاک کے دقیق معنیٰ ومفہوم -یا کہہ لیجیے صحیح معنیٰ ومفہوم- تک پہنچ سکے۔

مکمل طور پر ترادف نہ پائے جانے کی کچھ مثالیں:

۱- مثال کے طور پر جب ہمیں کلمہ ''لب'' کی حقیقت سمجھ میں آگئی کہ: ''لب''

اس عقل کو کہتے ہیں جو خارجی موثرات اور انسان کی عارضی شہوتوں سے خالی ہو، تو ہمیں پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مدح کے لیے: "**أولوالألباب**" کا لفظ کیوں استعمال فرمایا، "**أولو العقل**" کیوں نہیں استعمال فرمایا۔

۲-اسی طرح لفظِ "**ریب**" کو لے لیجیے، آپ جب کسی سے اس کے معنیٰ پوچھتے ہیں تو اکثر یہی جواب ملتا ہے: ﴿لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ کے معنیٰ ہیں: "**لاشك فيه**" (اس میں کوئی شک نہیں) پھر آپ کو قرآنِ کریم میں کل چھ جگہوں پر اشکال ہوتا ہے، جن میں ایک سورۂ ہود کی آیت نمبر: ۱۱۰ ﴿وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ ہے جس کا مطلب یہ ہوگا: وہ لوگ شک پیدا کرنے والے شک میں ہیں؛ لیکن علامہ زمخشریؒ نے "**ریب**" کی حقیقت اور اس کے دقیق معنیٰ بتائے ہیں[1] فرماتے ہیں: "**حقيقة الريب: قلق النفس واضطرابها**" کہ ریب کی حقیقت نفس کا بے چین و مضطرب ہونا ہے (اب آیت کا مطلب بالکل صاف ہوگیا)۔

۳-اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**آتي باب الجنة يوم القيامة فأستفتح**" کہ میں قیامت کے دن جنت کے دروازے پر آؤں گا اور اسے کھلواؤں گا، اور ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ "**أتی**" اور "**جاء**" میں فرق ہے، "**أتی**" کی حقیقت ہے: ٹھہر کر اطمینان سے آنا، تو ہمیں سمجھ میں آگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ: آپ اہلِ جنت کے لیے جنت کا دروازہ کھلوانے کے لیے اس طرح آئیں گے جس طرح بڑے بڑے ذی وجاہت لوگ سکون اور وقار کے ساتھ آتے ہیں، جب کہ "**مجيء**" کے اندر یہ مفہوم نہیں پایا جاتا، "**مجيء**" کے معنیٰ مطلق آنے کے ہیں، چاہے اس طرح آیا جائے یا کسی اور طریقے سے۔

۴-اسی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ جب کسی آیت یا حدیث میں لفظ "**صنع**"

(۱) سورہ بقرہ کی ابتدائی تفسیر ۱: ۱۹ میں

پڑھتے ہیں، تو ذہن میں یہی آتا ہے کہ: ''**صنع كذا**'' کا مطلب ہے ''**فعل كذا**'' کہ اس نے کیا؛ حالانکہ ''**صنع**'' کا مطلب ہے: کسی کام کو پختگی اور عمدگی کے ساتھ کرنا، پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد: **ويصنع الفلك** کا مطلب ہے کہ نوح علیہ السلام اس کشتی کو نہایت مضبوط طریقے سے بنا رہے تھے؛ کیونکہ اس کشتی کو ایسی بارش اور سیلاب کا سامنا کرنا تھا جس میں پوری زمین غرق ہونے والی تھی اور بھی اس طرح کی متعدد مثالیں ہیں۔

۵- اور ان سے بھی زیادہ تعداد تو ان لوگوں کی ہے جو ﴿**اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ**﴾ کا مطلب ''**أدّوا الصلاة**'' (نماز ادا کرو) سمجھتے ہیں اور پھر ان کے ذہن میں ایک بڑا اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں: ﴿**وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ**﴾ (العنکبوت:۴۵) (کہ نماز ادا کرو، بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے) اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ نماز پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد بے حیائی اور ناشائستہ کاموں میں لگی ہوئی ہے!۔

جواب یہ ہے کہ: نماز بے شک بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں، اشکال اور غلطی تو ''اقامت'' کے معنیٰ سمجھنے میں ہے، اقامت کے معنیٰ ہیں: نماز کو علیٰ وجہ الکمال ادا کرنا، جس میں ایک طرف اس کے شرائط، ارکان، فرائض، واجبات اور مستحبات کی رعایت ہو اور دوسری طرف اس کی روح یعنی خشوع کی بھی رعایت ہو اور خشوع کے اندر قرآن کی آیتوں میں غور و تدبر کرنا بھی داخل ہے، چاہے وہ خود قرأت کر رہا ہو یا امام کی قرأت سن رہا ہو، پھر اس غور و تدبر کے اندر ایک اہم چیز یہ ہے کہ: وہ نماز کے باہر اپنی چوبیس گھنٹے کی زندگی میں، خواہ گھر میں ہو یا کاروبار میں، اُن آیات کو جنھیں نماز کے اندر سنا ہے، عملی جامہ پہنانے کی فکر کرے، جو شخص اس طرح سمجھ کر عمل کرنے کی کوشش کرے گا، وہ جلد ہی بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے باز آجائے گا، بلکہ آکر رہے گا(۱)۔

---

(۱) ''**رسالة المسترشدين**'' پر ہمارے شیخ رحمہ اللہ کا حاشیہ ص ۱۹۶ ضرور دیکھیے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو ہم نے پیش کی، اس سلسلے میں سب سے بہترین کتاب جس سے الفاظ کے دقیق معنیٰ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، راغب اصفہانیؒ کی ''مفردات'' اور ابنِ اثیرؒ کی ''النہایہ'' ہے، یہ دونوں کتابیں سفر و حضر میں ہمیشہ طالبِ علم کے ساتھ رہنی چاہئیں۔

کلمہ کی تحقیق فوراً کی جائے:

اس سلسلے میں ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ طالبِ علم کلمات کی لغوی تحقیق یا اعلام کا صحیح اعراب فوری ضبط کرنے کی عادت ڈالے، اس میں سستی اور ٹال مٹول نہ کرے، شروع میں جب کوئی لفظ یا نام زبان پر صحیح چڑھ جاتا ہے تو پھر زندگی بھر وہ لفظ صحیح ہی رہتا ہے، کبھی اس میں زبان بہکتی نہیں ہے۔

''ثبت'' بنیے:

ائمۂ محدثین اس راوی کو جو ثقہ سے اُوپر درجے کا ہو ''ثبت'' کہتے ہیں، ''ثبت'' کے معنیٰ ''**المصباح المنیر**'' میں ہیں: ''**متثبّت في أموره**''، وہ شخص جو اپنے متعلقہ اُمور میں محتاط رہتا ہو اور تحقیق سے کام لیتا ہو، ہر انسان کے متعلقہ اُمور مختلف ہوتے ہیں، جہاں تک عالم کی بات ہے تو عالم کا اپنے اُمور میں تثبت اور احتیاط یہ ہے کہ: وہ ہمیشہ اپنے علم کو پوری توجہ اور احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھتا ہو، جس کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ اسے جب بھی کوئی بات یاد کرنی ہو اور پھر اسے بیان کرنا یا لکھنا ہو، تو اس کے اندر خوب اطمینان پیدا کرلے اور اطمینان پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو صحیح تحقیق کے ساتھ یاد کرے، جس کے اندر اس کی لغوی صرفی تحقیق، اس کے معنیٰ کی تحقیق اور راجح حکم کو جاننا بھی شامل ہے، خواہ وہ حکم فقہ سے متعلق ہو یا اُصولِ فقہ سے یا حدیث سے یا کسی اور فن سے۔

پھر کبھی اس عالم یا طالبِ علم کو کسی جزئیے میں شک اور تردد ہوتا ہے، تو ایسے موقعوں پر وہ فوراً کتاب کی طرف رجوع کر کے اس کی تحقیق کرلے - کہ کتاب بھی ایک خاموش

استاذ ہے-؛ تا کہ اس کے اندر ''تثبت'' کا وصف باقی رہے، اگر ٹال مٹول اور سستی کرے گا تو بعد میں تحقیق کرنے کی ہمت نہیں ہوگی اور دل میں وہ شک اور تردد باقی رہ جائے گا۔

تثبت کے فقدان کا نقصان:

پڑھنے کے دوران طالبِ علم کا اس طرح تحقیق کرنا درحقیقت اس عمارت کی مضبوط بنیاد ڈالنا ہے جس کی تعمیر اس تحقیق پر ہونے والی ہے، جس میں اوّلاً تو حفظ اور فہم ہے اور اس کے بعد پھر تدریس، تلقین، تالیف اور فتوے کی ذمہ داریاں ہیں، یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر ان میں تثبت، تحقیق اور احتیاط سے کام نہ لیا گیا تو پھر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس سے ''تحریفات'' اور ''تصحیفات'' واقع ہوں گی، جن سے متعلق علماء کے بڑے دلچسپ واقعات منقول ہیں، جو کسی لطیفہ اور چٹکلے سے کم نہیں (۱)۔

اسی قبیل کا ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں: سننِ اربعہ، مصنّف ابنِ ابی شیبہ اور سنن ابنِ خزیمہ میں مروی ہے: **أن النبي صلّى الله عليه وسلم نهىٰ عن التحلق قبل الصلاة يوم الجمعة**''(۲) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن نماز سے پہلے

(۱) خطیبؒ نے ''جامع'' میں سند میں تصحیف کرنے والوں اور اس کے بعد متن میں تصحیف کرنے والوں کے واقعات لکھے ہیں (۶۱۲-۶۴۹) انھیں ضرور پڑھنا چاہیے، انھوں نے اخیر میں لکھا ہے کہ: (کہاں تک بیان کیا جائے) مثل مشہور ہے: ''**الحديث ذو شجنون**'' کہ یہ ایک الف لیلوی داستان ہے، ہم نے تصحیف کی اس نوع کو ہنسی مذاق تک پہنچا دیا ہے، اللہ تعالیٰ ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور نیک قول وعمل کی توفیق عطا فرمائے، خطیبؒ کے ذکر کردہ بہت سے واقعات امام ابواحمد عسکری کے ''**تصحيفات المحدثين**'' کے مقدمہ میں بھی موجود ہیں، اس مقدمہ کو بھی پڑھنا چاہیے۔

(۲)رواه أبوداود (۱۰۷۲) والترمذي (۳۲۲) وقال: حديث حسن، والنسائي (۷۹۳-۷۹٤) وابن ماجه (۱۱۳۳)، مطولا ومختصرا، وهو في مصنف ابن أبي شيبة (۵٤۵۰) مختصر، وعند ابن خزيمة (۱۰۳٤-۱۳۰٦) مطول

حلقے لگانے سے منع فرمایا اور ابنِ خزیمہ کی پہلی روایت میں ہے: "**نهى عن الحِلَق يوم الجمعة قبل الصلاة**" امام خطابیؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارے ایک استاذ اسے "**حِلَق**" کے بجائے "**حَلْق**" روایت کرتے تھے، انھوں نے مجھے بتایا کہ: چالیس سال ہو گئے انھوں نے جمعہ سے پہلے اپنا سر نہیں منڈوایا ہے، میں نے ان سے کہا کہ: یہ تو "**حِلَق**" ہے "**حلق**" کی جمع......، تو انھوں نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہنے لگے کہ: آپ نے تو میرا بوجھ ہلکا کر دیا اور پھر میرا شکریہ ادا کرنے لگے، اللہ ان پر رحم فرمائے، وہ بے چارے نیک لوگوں میں سے تھے(۱)۔

اس واقعہ کو پڑھ کر ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے اساتذہ ہمیں جو یہ واقعہ صحیفوں سے علم حاصل کرنے والوں پر تنقید کرتے ہوئے سناتے تھے، یہ ہزار سال پُرانی ایک سچی اور حقیقی تصویر ہے، اب آپ غور کیجیے! جب ہزار سال پہلے یہ حال تھا تو آج ہمارے اس دَور کا کیا حال ہوگا؟!۔

عبارت کی تحلیل، تحقیق اور تنقیح:

اساتذہ اور شیوخ کی اس ذمہ داری کے ساتھ ایک اور ذمہ داری جُڑی ہوئی ہے جو اہمیت میں اس سے کچھ کم نہیں ہے کہ اساتذہ اپنے طلبہ کی نشوونما اس طرح کریں کہ طلبہ پہلے عبارت کی نحوی وصرفی اعتبار سے خوب اچھی طرح تصحیح کریں، اس کو سمجھیں، اس کو حل کریں؛ بلکہ تحلیل کریں، اس میں موجود ضمیروں کا مرجع متعین کریں، ہر ضمیر کی قسم متعین کریں اور پھر پوری عبارت کا صحیح مفہوم سمجھیں۔

اس کے بعد استاذ ان کو اس سے اعلیٰ مرحلہ کی طرف لے جائیں اور عبارت میں موجود علوم: بلاغت، عربیت، منطق اور اُصولِ فقہ وغیرہ ان کو سمجھائیں اور اس میں موجود ہر علم سے

(۱) معالم السنن ۱: ۲۴۷

متعلق اصطلاحات انھیں بتائیں، اور بھی جو چیزیں عبارت کے اندر پائی جاتی ہوں جن کا عبارت تقاضہ کرتی ہو، وہ سمجھائیں، اسی کو علمائے ازہر "تعیین" کہا کرتے تھے۔

اسی منہج کے ذریعہ: کہ عبارت کو پڑھا جائے، اس کی تحلیل کی جائے اور اس میں موجود علمی اصطلاحات کو سمجھا جائے، ایک عالم غیر عالم سے ممتاز ہوتا ہے، میں نے بہت سے عوام کو دیکھا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے؛ لیکن انھیں کسی عالم سے تعلق اور ملازمت نصیب ہو جاتی ہے اور وہ ان کے درس میں بہت کچھ سمجھنے اور محفوظ کرنے لگتے ہیں، جس کی وجہ سے انھیں فقہ، تفسیر اور شرحِ حدیث کے تعلق سے اتنی باتیں یاد ہو جاتی ہیں جو بہت سے علماء کو بھی نہیں معلوم ہوتیں؛ لیکن مان لیجیے اگر وہ کوئی بات بھول جائیں، تو اس کو معلوم کرنے کے لیے کسی کتاب کی مراجعت نہیں کر سکتے، برخلاف کسی عالم کے کہ وہ مراجعت کر کے اس بات کو دوبارہ معلوم کر سکتا ہے۔

چھٹی مشعل

طلبہ کے اندر "لا أدري" کہنے کا مزاج پیدا کرنا

ایک اہم صفت؛ جو انصاف کی صفت کے ساتھ انتہائی مضبوط تعلق رکھتی ہے، اور وہ اساتذہ کی ایک اہم ذمہ داری بھی ہے، کہ وہ طلبہ کے اندر یہ مزاج پیدا کریں کہ: جب کبھی ان کے سامنے کوئی ایسی بات آئے جو انھیں معلوم نہ ہو، تو وہ بلا تکلف **"لا أدري"** اور **"واللہ أعلم"** کہہ دیا کریں، اس میں شرم محسوس نہ کریں؛ البتہ انھیں یہ بھی سکھایا جائے کہ وہ اس امانت بھرے جملے کے ذریعہ چھٹکارا پا کر بیٹھ نہ جائیں، اور پوچھی ہوئی بات یوں ہی اپنے دل میں اور سائل کے دل میں معلق نہ چھوڑ دیں؛ بلکہ اساتذہ سے رجوع کر کے اس کا جواب معلوم کریں یا خود تلاش کر سکتے ہوں تو اپنے کتب خانے سے رجوع کر کے اس کا جواب معلوم کریں۔

ادب الاختلاف سے کچھ اقتباسات:

میں چاہتا ہوں کہ اس موقعے پر "ادب الاختلاف" کے کچھ اقتباسات نقل کروں، میں نے وہاں لکھا ہے[1] کہ:

امام احمدؒ نے امام شافعیؒ سے، انھوں نے امام مالکؒ سے اور انھوں نے محمد بن عجلان تابعی سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: **"إذا أخطأ العالم لا أدري أصيبت مقاتله"** اگر عالم **"لا أدري"** کہنے سے چُوک جائے تو وہ اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے، اس روایت کی خوبی یہ ہے کہ اسے ائمہ اربعہ میں سے تین ائمہ نے تسلسل کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(۱) ص ۱۹۸

’’لاأدري‘‘ کہنے کے فوائد:

آگے میں نے لکھا ہے(۱) کہ: ایک عالم ’’لاأدری‘‘ کہہ کر درحقیقت اپنے نفس کو تواضع اور حدود میں رہنے کا عادی بناتا ہے اور ساتھ ہی وہ ضمناً اپنے آپ کو تحصیل علم اور مزید تحقیق و تفتیش پر اُبھارتا ہے؛ کیونکہ اگر اس نے ابھی سائل کو ’’لاأدري‘‘ کہہ کر جواب دے دیا اور یہ جواب اس کے لیے بہتر مانا گیا، کہ اگر بغیر علم کے جواب دیتا تو اپنے آپ کو آگ میں گرالیتا؛ لیکن اب اس کے لیے یہ بہتر نہیں مانا جائے گا کہ وہ دوبارہ اسی سوال کے جواب میں ’’لاأدري‘‘ کہے؛ کیونکہ عالم کے اُوپر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ وہ سائل کو اطمینان بخش جواب دے کر اسے جہالت یا پریشانی سے نکالے(۱)۔ یاقوت حموی نے جو اس جملے سے متعلق کہ: ’’لا أدري نصف علم ہے‘‘ یہ بات کہی ہے کہ: یہ نصف: ناپسندیدہ اور گھٹیا علم ہوتا ہے، تو یہ انھوں نے ایسے ہی شخص کے بارے میں کہا ہے، جو ہر سوال کے وقت اسی کلمہ کا سہارا لے لیتا ہے اور اپنے آپ کو جواب تلاش کرنے کی مشقت سے بچا لیتا ہے۔

اسلاف کا اپنے اجتہاد پر جزم اختیار نہ کرنا:

اسلاف کے یہاں تعلیم و تعلم کا ایک منہج یہ تھا - جو اختلاف کے آداب کو برقرار رکھنے کے لیے ایک ضروری چیز بھی ہے - کہ وہ حضرات اپنے اجتہاد کو خطا کے احتمال کے ساتھ بیان کرتے تھے اور جب تک کوئی واضح اور کھلی ہوئی دلیل نہ ملتی جزم اختیار نہیں کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے ایک شخص کا مسئلہ پیش کیا گیا، جس نے کسی عورت سے شادی کی؛ لیکن مہر مقرر نہیں کیا اور دخول سے پہلے ہی انتقال کر گیا، یعنی مفوِّضہ کا مسئلہ تھا(۳) تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فتویٰ دیا کہ: اسے مہر مثل ملے گا، جس میں نہ

---

(۱) ص ۱۹۹

(۲) شاید یہی توجیہ ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوالدرداءؓ کے جملے کی۔ ☜

زیادتی کی جائے گی نہ کمی کی جائے گی، اور میراث بھی ملے گی اور عورت پر عدت بھی واجب ہوگی۔

امام ترمذیؒ نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس پر ''**حسن صحیح**'' کا حکم لگایا ہے[1]۔

مجھے یہاں دراصل اس واقعہ سے متعلق ابوداؤد کی ایک روایت اور نسائی کی کچھ روایتیں ذکر کرنی ہیں۔

امام ابوداؤد نے روایت کیا ہے[2] کہ: حضرت عبداللہ مسعودؓ کو ایک شخص کے بارے میں مذکورہ تفصیل بتائی گئی اور مسئلہ دریافت کیا گیا، راوی کہتے ہیں کہ: لوگ ان کے پاس ایک مہینے تک - یا کہا: بار بار - آتے رہے، اخیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: میری اس مسئلے میں رائے یہ ہے کہ اس عورت کو مہر مثل ملے گا، جس میں نہ کمی کی جائے گی نہ زیادتی، اسے میراث بھی ملے گی اور اس پر عدت بھی واجب ہوگی، اگر میرا یہ اجتہاد صحیح ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو میرے اور شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ اس فیصلے سے بَری ہیں......، لوگوں نے گواہی دی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جیسی صورتِ حال میں یہی فیصلہ فرمایا تھا، جس پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بے حد مسرور ہوئے۔

امام نسائی نے بھی یہ روایت نقل کی ہے[3]، ان کی روایت میں ہے کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے پہلے ان سے فرمایا کہ: معلوم کرو، شاید تم میں سے کسی کے پاس اس

---

(۳) مفوِّضہ: بکسر الواو کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے مہر کا معاملہ اپنے شوہر یا ولی کے سپرد کر دیا اور بفتح الواو کا مطلب ہے کہ شریعت کی طرف سے مہر کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا گیا، چاہے تو باقی رکھے، چاہے تو ساقط کر دے۔

(۱) كتاب النكاح - باب ما جاء في الرجل يتزوج المرأة فيموت عنها قبل أن يفرض لها ٤: ١١١ (١١٤٥)

(۲) كتاب النكاح - باب فيمن تزوج ولم يسم صداقا حتي مات ٢:٥٨٩ (٢١١٦)

(۳) كتاب النكاح- إباحة التزوج بغير صداق ٦:١٢١ (٣٣٥٤ ومابعده)

تعلق سے کوئی اثر موجود ہو؟ انھوں نے کہا: ابو عبدالرحمٰن! ہمارے پاس کوئی اثر نہیں ہے، تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: تو پھر اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے الخ۔

اس کے بعد امام نسائی نے اس روایت کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے کہ: وہ لوگ ان کے پاس تقریباً ایک مہینہ تک آتے رہے؛ لیکن وہ ان کو فتویٰ نہیں دیتے تھے، ایک مہینہ کے بعد انھوں نے فرمایا کہ: اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ: اسے مہر مثل ملے گا الخ۔

اخیر میں امام نسائی نے اس حدیث کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سے فرمایا کہ: جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جدائی ہوئی ہے اتنا سخت مسئلہ مجھ سے کبھی نہیں پوچھا گیا، تم کسی اور سے معلوم کرلو، لوگ ان کے پاس ایک مہینہ تک آتے رہے اور آخر میں ان سے عرض کیا کہ: حضرت! اگر ہم آپ سے نہ پوچھیں تو پھر کس سے پوچھیں، آپ اس شہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، ہمیں آپ کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا؟! حضرت ابنِ مسعودؓ نے فرمایا: تو ٹھیک ہے، پھر میں اپنی رائے سے اس کا جواب بتاتا ہوں، اگر صحیح نکلا تو اللہ کی طرف سے اور اگر غلط ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگا، اور اللہ اور اس کے رسولؐ اس سے بَری ہوں گے، میری رائے یہ ہے کہ: اسے مہر مثل ملے گا الخ۔

ان دونوں صفات: انصاف اور لا اُدری کہنے سے متعلق میں نے ''اُدب الاختلاف'' میں کئی صفحات پر بحث کی ہے، جس کے کچھ اقتباسات یہاں بھی نقل کیے، باقی کے لیے میں قارئین کو مذکورہ کتاب کی طرف محول کرتا ہوں، ان شاء اللہ انھیں بہت سی کام کی چیزیں ملیں گی۔

جس مسئلہ پر پوری گرفت نہ ہو اس پر طالبِ علم بحث ومباحثہ سے پرہیز کرے:

میں یہاں ایک اور چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ طالبِ علم خود بھی اپنے آپ کو اس

بات سے بچائے اور اس کے اساتذہ بھی اس کو بچائیں کہ وہ اپنے ہم نشینوں یا جاننے والوں یا کسی اور کے ساتھ ان مسائل پر ہرگز بحث و مباحثہ اور مناقشہ نہ کرے، جن کی اسے پوری تحقیق نہیں ہے اور نہ ہر پہلو سے اس مسئلہ پر نظر ہے، خواہ وہ اعتقادی مسائل ہوں یا معاشرتی یا اقتصادی، یا سیاسی یا فکری، وہ یہ کہنے میں بالکل بھی نہ شرمائے کہ: مجھے معلوم نہیں، ابھی میں نے اس مسئلے کی تحقیق نہیں کی، کچھ لوگوں نے اس طرح کے مسائل میں گفتگو کرنے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے قدم پھسل گئے، اور وہ راہِ حق سے ہٹ کر گمراہی کا شکار ہو گئے، وہ اس اُمید میں تھے کہ دوسروں کو بچائیں گے؛ لیکن خود ہی غرق ہو گئے! صرف اس لیے کہ انھوں نے ایسے مسائل پر گفتگو کی جن پر انھیں پوری گرفت حاصل نہیں تھی۔

طالبِ علم کو اللہ تعالیٰ سے شرمانا چاہیے کہ وہ اس کے دین کے اندر ان مسائل میں زبردستی دخل اندازی کی کوشش کرے جن کے بارے میں اس کے پاس اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے علم نہیں ہے اور وہ ان پر اچھی طرح گفتگو نہیں کر سکتا؛ البتہ اسے اپنی جہالت پر برقرار رہنے سے بھی شرمانا چاہیے، اسے چاہیے کہ وہ جلد از جلد اپنے ان معتمد اساتذہ سے جو اس مسئلے پر اچھی گفتگو کر سکتے ہوں رجوع کر کے تشفی حاصل کرے، پس:

ایک بات تو یہ ہوئی کہ: اسے ان مناقشات میں نہیں پڑنا چاہیے، جن میں وہ صحیح سے گفتگو نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ کہ: اسے اپنی جہالت پر برقرار بھی نہیں رہنا چاہیے یہ اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ: اس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں کہ وہ معاشیات سے متعلق کوئی پیچیدہ فقہی مسئلہ عربی زبان کے کسی استاذ یا کسی ایسے فقیہ سے پوچھے جو نئے مسائل سے بالکل ناواقف ہوں؛ ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ رکھنا چاہیے۔

ساتویں مشعل

استاذ کا اپنے طلبہ کی نگرانی اور تربیت کرنا

طلبہ میں خودرائی کا مرض:

طالبِ علم-اور عالم- کا جو ادب ہم نے پیچھے بیان کیا ہے کہ: وہ پیش آمدہ ان مسائل میں، جن کے بارے میں اسے اتنی معلومات نہیں ہیں کہ وہ اللہ کے دین میں گفتگو کرسکے، ''**لا أدری**'' کہنے سے بالکل بھی نہ شرمائے، اس ادب کے ساتھ ایک اور ادب متعلق ہے، وہ یہ کہ: استاذ اپنے طالبِ علم پر اس وقت لگام لگانے کی کوشش کرے، جب اس کے اندر علمی نشوونما کی ابتدا میں ہی خودرائی کا مرض جنم لینے لگے اور وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اس نے ان ابتدائی سالوں میں جو کچھ پڑھا ہے وہی سارا علم ہے اور اب اس کے اندر ہر سوال کا جواب دینے کی اتنی صلاحیت پیدا ہوچکی ہے کہ وہ علمی مجلسیں لگا سکتا ہے؛ بلکہ فضائی چینلوں کی اسکرینوں پر آکر لوگوں کے سامنے اپنے علم کے مطابق دینی گفتگو کرسکتا ہے، اس علم کے مطابق جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہی ہے؛ لیکن اس کے زعم کے مطابق انتہائی درجہ تک پہنچ چکا ہے۔

یہ وہم مبتدی طلبہ کو بہت پیش آتا ہے اور کبھی دوسروں کو بھی پیش آجاتا ہے، جو طالبِ علمی کا مرحلہ تو پار چکے ہوتے ہیں؛ لیکن ابھی اس مرحلے تک نہیں پہنچتے کہ اپنے اساتذہ سے منقطع ہوکر مستقل اور خود مکتفی بن سکیں۔

اس تعلق سے میں دو واقعے سناتا ہوں، جن میں اس حوالے سے کافی نصیحت اور سبق موجود ہے کہ اساتذہ کو اپنے شاگردوں کے قلبی امراض اور بیماریوں پر متنبہ کرنا چاہیے۔

امام ابو یوسفؒ کا واقعہ:

پہلا واقعہ: آپ نے امام ابوحنیفہؒ کا ایک جملہ سنا ہوگا جو بہت مشہور ہوا- یہاں تک کہ وہ کہاوت کے طور پر استعمال ہونے لگا- آپ نے اپنے شاگرد امام ابو یوسفؒ سے فرمایا تھا: "**تزبَّبت قبل أن تُحصرِم**" کہ تم پکنے سے پہلے ہی منقیٰ بن رہے ہو۔

اس جملے کا پسِ منظر یہ ہے[1] کہ امام ابو یوسفؒ نے اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کو بتائے بغیر ہی اپنا حلقۂ درس شروع کر دیا تھا، امام صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک آدمی کو ان کے پاس بھیجا، جس نے آکر ان سے پانچ سوالات کیے:

پہلا سوال: یہ تھا کہ ایک دھوبی کپڑا لے کر مُکر گیا اور کہنے لگا کہ تم نے مجھے کپڑے ہی نہیں دیے؛ پھر کچھ وقت کے بعد ان کپڑوں کو دھو کر لے آیا، تو کیا وہ اُجرت کا مستحق ہوگا؟

دوسرا سوال: نماز میں دخول سنت کے ذریعہ ہوتا ہے یا فرض کے ذریعہ؟

تیسرا سوال: آگ پر چڑھی ہوئی ایک ہانڈی میں، جس کے اندر گوشت اور سالن پک رہا ہے، ایک پرندہ آکر گر گیا، تو کیا اس ہانڈی کے گوشت اور سالن کو کھایا جا سکتا ہے؟

چوتھا سوال: ایک مسلمان کی بیوی جو ذمیہ تھی حالتِ حمل میں مرگئی، اسے کس قبرستان میں دفنایا جائے گا؟

پانچواں سوال: کسی اُمِّ ولد نے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی کر لی، پھر آقا کا انتقال ہوگیا، تو کیا اس پر آقا کی عدت واجب ہوگی؟

امام ابو یوسفؒ اس کے ہر سوال کے جواب میں پہلے "**نعم**" کہتے، پھر جب وہ اسے غلط قرار دیتا، تو کچھ سوچ کر "**لا**" کہتے وہ اس کو غلط قرار دیتا، جب امام ابو یوسفؒ حیران ہوتے، تو انھیں وہ صحیح جواب بتاتا جو امام ابوحنیفہؒ نے اسے بتا رکھا تھا، اس واقعہ سے امام ابو یوسفؒ کو اپنی کوتاہی کا علم ہوا اور وہ امام صاحبؒ کے پاس لوٹ گئے، اس وقت امام صاحب نے ان سے

(۱) **أواخر الاشباه والنظائر لابن نجيم أول فن الحكايات** ص ۵۱۲

فرمایا: "تزبَّبت قبل أن تحصرم" کہ تم پکنے سے پہلے ہی منقیٰ بننے لگے۔

ابوالفتح ابن جنی اور ان کے استاذ ابوعلی فارسی کے درمیان بھی بالکل اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا، جیسا امام ابویوسفؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے درمیان پیش آیا اور ابوعلی جنی نے بھی امام ابوحنیفہؒ کا یہی جملہ ان الفاظ میں دہرایا تھا: "زبّبتَ وأنت حِصْرِم"[1] کہ تم ابھی پکنے کے ابتدائی مرحلے میں اور ابھی سے منقیٰ بن رہے ہو۔

یعنی: ابھی تمہارے اندر اہلیت پیدا نہیں ہوئی اور تم نے ابتدائی مرحلہ سے آخری مرحلے کی طرف چھلانگ لگادی، "حِصرِم" کہتے ہیں: اس انگور کو جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہو، یہ پکتے پکتے ایک وقت کے بعد کشمش بننا شروع ہوتا ہے اور یہ صاحب تو ابھی "حصرم" بھی نہیں ہوئے تھے! جلد بازی کرنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے!۔

"تاریخ بغداد" اور "آداب الفقيه والمتفقه" میں ہے[2] کہ: امام ابویوسفؒ ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے، تو امام ابوحنیفہؒ نے ان کی کئی مرتبہ عیادت کی، آخری مرتبہ جب عیادت کے لیے گئے تو دیکھا کہ حالت بہت نازک ہے، اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہنے لگے کہ: مجھے تو اپنے بعد ان مسلمانوں کے حق میں تم ہی سے اُمید تھی، اگر امت نے تمہیں کھودیا تو تمہارے ساتھ بہت سا علم چلا جائے گا؛ پھر اللہ کے فضل سے امام ابویوسفؒ کی صحت عود کر آئی اور وہ شفایاب ہوگئے، لوگوں نے ان کو امام صاحبؒ کی باتیں بتائیں، تو ان کے اندر کچھ بڑائی پیدا ہوگئی اور لوگوں کا ان کی طرف رجوع بھی ہونے لگا، تو انھوں نے اپنا فقہ کا ایک الگ حلقہ لگالیا اور امام ابوحنیفہؒ کے حلقہ میں جانا چھوڑ دیا، امام صاحبؒ نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ان کی کہی ہوئی باتیں ان تک پہنچ گئی تھیں اور انھوں نے اپنا ایک الگ حلقۂ درس شروع کردیا ہے۔

---

(۱) یہ بات ابن خلکان کے یہاں ابن جنی کی ترجمہ کے شروع ۳: ۲۶۴ میں آئی ہے

(۲) تاریخ بغداد ۵: ۸۷۴، آداب الفقيه والمتفقه (۲۲۷)

امام صاحب نے ایک شخص کو بلایا، جس کی ان کے یہاں کچھ قدر و منزلت تھی اور فرمایا کہ: یعقوب کی مجلس میں جاؤ، اور ان سے پوچھو کہ: آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس نے دھوبی کو ایک درہم کے عوض کپڑے دُھلنے کے لیے دیے اور جب چند دنوں کے بعد اس دھوبی کے پاس کپڑے لینے کے لیے گیا تو اس نے انکار کر دیا اور اسے خالی ہاتھ آنا پڑا؛ پھر دھوبی اس کا کپڑا دُھلا ہوا لے کر آ گیا، تو کیا اب اس کو اُجرت ملے گی؟ امام صاحب نے فرمایا کہ: اگر وہ اس کے جواب میں ''ہاں'' کہیں تو کہنا کہ: آپ نے غلط کہا اور اگر ''نہیں'' کہیں، تب بھی کہنا کہ: آپ نے غلط کہا؛ چنانچہ وہ شخص امام ابویوسفؒ کے پاس آیا اور ان سے مسئلہ دریافت کیا، تو امام ابویوسفؒ نے فرمایا کہ: اسے اُجرت ملے گی، اس نے کہا: آپ نے غلط کہا، امام ابویوسفؒ نے تھوڑی دیر غور کر کے فرمایا کہ: نہیں ملے گی، اس نے کہا کہ: اب بھی غلط کہا۔

امام ابویوسفؒ اسی وقت اُٹھ کر امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے، امام صاحبؒ نے فرمایا: کیا بات ہے، دھوبی والے مسئلہ کے لیے آئے ہو؟! امام ابویوسفؒ نے فرمایا: جی ہاں! امام صاحبؒ نے فرمایا: سبحان اللہ! ایک شخص بیٹھ کر لوگوں کو فتوے دیتا ہے، علمی حلقے لگا کر دین کی باتیں بتاتا ہے اور حال یہ ہے کہ اجارے کا ایک مسئلہ ٹھیک سے نہیں بتا پاتا، امام ابویوسفؒ نے فرمایا: حضرت! آپ ہی بتا دیجیے، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ: اگر اس نے غصب کرنے کے بعد دھویا ہے تو اُسے اُجرت نہیں ملے گی، اور اگر غصب سے پہلے دھویا ہے تو اُجرت ملے گی؛ کیونکہ اس وقت اس نے مال کے لیے ہی کپڑا دھویا ہے۔

اس کے بعد فرمایا: **''من ظن أنه يستغني عن التعلم فليبك علىٰ نفسه!''**(۱) جو شخص یہ سمجھنے لگے کہ اب اسے سیکھنے کی ضرورت نہیں رہی، تو اسے اپنے اُوپر رونا چاہیے۔

(۱) بظاہر یہ حکیمانہ جملہ امام صاحب کا ہے۔

ابنِ مدینیؒ اور شاذ کونیؒ کو عبد الرحمٰن بن مہدیؒ کی تنبیہ:

علی بن مدینیؒ کا بھی ایک عجیب وغریب واقعہ رامہرمزیؒ نے نقل کیا ہے[1]:

علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ: میں کوفہ آیا اور اعمش کی حدیثیں جمع کرنے میں جُٹ گیا، پھر جب واپس بصرہ آیا تو میں نے عبد الرحمٰن بن مہدیؒ سے ملاقات کی، سلام کے بعد وہ پوچھنے لگے کہ: علی! تمہارے پاس کیا ہے؟ میں نے کہا کہ: (میرے پاس اعمش کی اتنی حدیثیں جمع ہوگئی ہیں) کہ اب کوئی بھی مجھ سے اعمش کی کوئی نئی حدیث نہیں بیان کرسکتا! یہ سن کر وہ غصہ ہوگئے اور فرمانے لگے کہ: کیا اب اہلِ علم اس طرح کی باتیں کریں گے؟! کون ہے جو سارے علم کو ضبط کرسکتا ہے اور احاطہ کرسکتا ہے؟ کیا تم جیسا شخص بھی اب اس طرح کی باتیں کرے گا؟! اچھا بتاؤ تمہارے پاس کوئی چیز ہے جس پر تم لکھ سکو؟ میں نے کہا: ہاں ہے، فرمایا: تو لکھو! میں نے کہا: پہلے بتادیجیے کون سی حدیث لکھوانا چاہ رہے ہیں، ہوسکتا ہے وہ میرے پاس پہلے سے موجود ہو، انھوں نے فرمایا کہ: نہیں لکھو! میں تمھیں وہی حدیثیں لکھواؤں گا جو تمہارے پاس نہیں ہیں؛ چنانچہ انھوں ے مجھے تیس حدیثیں لکھوائیں اور واقعی ان میں سے ایک حدیث بھی میری سنی ہوئی نہیں تھی، اس کے بعد فرمایا کہ: آئندہ اس طرح کی باتیں مت کرنا، میں نے وعدہ کیا کہ: اب نہیں کروں گا۔

علی بن مدینیؒ کہتے ہیں کہ: اگلے سال شاذ کونیؒ مکہ میں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ: عبد الرحمٰن بن مہدی کے پاس چلو، آج انھیں مناسکِ حج کے سلسلے میں نیچا دکھائیں گے، سلیمان شاذ کونیؒ ہمارے اصحاب میں مناسکِ حج کے تعلق سے سب سے زیادہ علم رکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے؛ ہم ابنِ مہدیؒ کے پاس پہنچے، اور سلام کرکے ان کے سامنے بیٹھ گئے، انھوں نے پوچھا: کیا بات ہے، کس مقصد سے آنا ہوا؟ میرا خیال ہے سلیمان! تم ہی بتاؤ گے، سلیمان نے فرمایا: ہاں میں ہی بتاؤں گا، (ہمارے پاس اب

(۱) المحدث الفاصل (۱۵۹)، ان ہی کی طریق سے خطیب نے جامع (۱۹۰۶) میں روایت کیا ہے۔

حج سے متعلق اتنا علم ہے کہ) اب ہمیں کوئی بھی حج کے بارے میں کوئی نئ بات نہیں بتا سکتا! اس پر علی بن مدینیؒ نے انھیں بھی اسی طرح ڈانٹ پلائی جس طرح مجھے پلائی تھی، اور فرمایا کہ: بتاؤ، اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو جس نے حج کے تمام ارکان ادا کر لیے؛ لیکن بیت اللہ کا طواف کرنے سے پہلے ہی اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی؟ سلیمان نے فوراً روایت پڑھنی شروع کر دی: "**یتفرقان حیث اجتمعا ویجتمعان حیث تفرقا**"، ابن مہدیؒ نے فرمایا کہ: اِس بارے میں بھی تو کوئی روایت سناؤ کہ وہ کب جمع ہوں گے اور کب جدا ہوں گے؟ اب سلیمان خاموش ہو گئے، ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے فرمایا کہ: اب لکھو! اور انھیں مسائل لکھانے لگے، یہاں تک کہ تیس مسائل لکھوا ڈالے اور ہر مسئلہ میں ایک دو حدیثیں بھی بیان کرتے جاتے اور یہ بھی کہتے جاتے کہ: میں نے امام مالکؒ سے یہ بات پوچھی تھی، سفیان سے یہ بات پوچھی تھی، عبید اللہ بن حسن عنبری سے یہ بات پوچھی تھی۔

سلیمان کہتے ہیں کہ: جب میں واپسی کے لیے اُٹھنے لگا تو ابنِ مہدیؒ نے فرمایا کہ: دوبارہ ایسی بات مت کہنا، ہم کھڑے ہوئے اور باہر نکلے، ابنِ مدینیؒ کہتے ہیں کہ: سلیمان میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ: اس مہدی کی پشت سے یہ کون سی چیز پیدا ہوئی ہے!! ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ائمہ کے پاس بیٹھے ہوں کہ میں نے امام مالکؒ سے یہ سنا ہے، سفیان سے یہ سنا ہے، عبید اللہ سے یہ سنا ہے!!۔

راقم کہتا ہے کہ: یہ بڑا عجیب وغریب واقعہ ہے، جو بے شمار عبرتوں اور نصیحتوں پر مشتمل ہے، اس کی تشریح کے لیے ایک مستقل اور تفصیلی کتاب کی ضرورت ہے۔

یہ ایک جھلک تھی اِس بات کی کہ اساتذہ کس طریقے سے طلبہ کو ادب سکھاتے تھے، ان واقعات کے اندر ہمیں اسلاف کا وہی حال نظر آتا ہے جو ایک ڈاکٹر کا بیماروں اور ان کی بیماریوں کے متعلق ہوتا ہے۔

دیہاتیوں کے ذریعہ امام ماوردیؒ کی تربیت-ایک ضمنی واقعہ:

بات سے بات نکلتی ہے، میں اس واقعہ کی مناسبت سے ایک اور دلچسپ واقعہ سنانا چاہتا ہوں، جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک دیہاتی کے ذریعہ ایک عالم کو ادب سکھلایا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان عالم صاحب کا خیال رکھا اور بھٹکنے نہیں دیا۔

امام ابوالحسن ماوردیؒ فقہ شافعی کے ایک بڑے امام ہیں، ان کی جلالتِ قدری کے لیے امام ابواسحاق شیرازیؒ جیسے امام کی یہ شہادت ہی کافی ہے کہ: ماوردیؒ مسلکِ شافعی کے حافظ تھے، ''الحاوی'' انہی کی تصنیف ہے جو مطبوعہ ۱۸ر جلدوں پر مشتمل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر بن خطابؓ کا ارشاد ہے کہ: علم سیکھو اور علم کے لیے سنجیدگی اور وقار بھی سیکھو، اور جن سے تم علم حاصل کر رہے ہو ان کے سامنے تواضع بھی اختیار کرو؛ تاکہ تمہارے سامنے وہ لوگ تواضع اختیار کریں جو تم سے پہلے علم حاصل کریں گے، اسلاف میں کسی کا قول ہے کہ: جس نے اپنے علم کو لے کر تکبّر کیا اور بڑائی دکھلائی، اللہ تعالیٰ نے اس کو نیچے گرادیا اور جس نے تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ نے اسے بلندی عطا کی، علماء کے اندر عُجب اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ ہمیشہ اپنے سے کم درجے کے جہلاء پر ہوتی ہے، وہ ان علماء کو نہیں دیکھتے جو ان سے اُوپر ہیں؛ حالانکہ آدمی علم کی جس انتہا کو بھی پہنچ جائے اسے اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے علماء ضرور مل جائیں گے؛ کیونکہ علم اتنا زیادہ ہے کہ کوئی بھی انسان اس کا احاطہ نہیں کرسکتا(۱)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: میں تمہاری تنبیہ کے لیے اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں، میں نے بیوع کے اندر ایک کتاب لکھی تھی، جس کے اندر میں نے جتنی کتابیں مجھ سے ممکن ہوسکتی تھیں کردی تھیں اور خوب محنت کی تھی اور اپنے ذہن کو خوب تھکایا تھا، جب وہ منقح ہوکر

(۱) ادب الدنیا والدین ص ۱۲۰-۱۲۲

تیار ہوگئی اور میرے اندر عجب پیدا ہونے لگا اور یہ خیال آنے لگا کہ اب مجھے اِس باب پر سب سے زیادہ گرفت حاصل ہوگئی ہے، تو میرے پاس دو دیہاتی آئے، میں اس وقت اپنی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، ان دونوں نے مجھ سے بیع کے ایک معاملے کے بارے میں دریافت کیا، جو انھوں نے دیہات کے اندر کچھ شرطوں کے ساتھ کیا تھا، ان شرطوں کو دیکھنے سے کل چار مسائل بنتے تھے؛ لیکن حیرت ہے کہ مجھے ان میں سے کسی کا جواب نہیں آتا تھا، میں سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا اور اس صورتِ حال سے عبرت حاصل کرنے لگا، وہ دونوں کہنے لگے کہ: آپ اس جماعت کے سردار ہیں، اور آپ کے پاس ہمارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں؟ میں نے کہا: ہاں میرے پاس کوئی جواب نہیں، ان دونوں نے کہا: "**واهًا لك**" آپ پر افسوس ہے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پھر وہ ایک دوسرے عالم کے پاس گئے، جن کا علم میرے بہت سے شاگردوں سے بھی کم تھا اور ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا، انھوں نے فوراً انھیں تشفی بخش جوابات دے دیے اور وہ دونوں ان کے جواب سے مطمئن ہوکر اور ان کے علم کی تعریف کرتے ہوئے واپس ہوگئے، میں برابر اُلجھن میں پڑا رہا اور اس صورتِ حال سے عبرت حاصل کرتا رہا، مجھے اب تک بھی ان مسائل کا علم نہ ہوسکا، واقعی یہ واقعہ میرے لیے ایک سخت تنبیہ اور نصیحت تھی، جس کے ذریعہ میرے نفس کی لگام قابو میں کردی گئی، اور عجب کا زور ٹوٹ گیا، یہ ایک توفیق تھی جو مجھے نصیب ہوئی، ایک رہنمائی تھی جو مجھے عطا ہوئی۔

اللہ تعالیٰ امام موصوف پر رحم فرمائے کہ انھوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہمیں ادب سکھلایا۔

آٹھویں مشعل

بحث کے اندر انصاف کا عادی بنانا

اساتذہ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: وہ طلبہ کو انصاف کا عادی بنائیں کہ وہ مسائل کے اندر ہمیشہ انصاف سے کام لیں اور جب کبھی ان کا قلم پھسل جائے، یا سبقت لسانی ہوجائے، تو اس سے رجوع کرنے اور حق بات کو قبول کرنے میں ذرا بھی تردد نہ کریں یا کسی اور سے غلطی ہوجائے تو اس کی بھی بے جا حمایت کے بجائے حق بات کو بلاچون وچرا قبول کرلیں۔

اس سلسلے میں ائمہ کرام کے بے شمار واقعات منقول ہیں، جن کو تلاش کرکے جمع کرنا دشوار ہے، ان ائمہ کے لیے رہنما شخصیت امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی تھی، جن کا واقعہ مشہور ہے، جسے ابویعلیٰ نے اپنی ''مسند کبیر'' میں - جو مطبوعہ ''مسند صغیر'' کے علاوہ ہے- نقل کیا ہے(۱)۔

غلطی سے رجوع اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک روز منبر رسول پر چڑھے اور فرمایا کہ: مجھے کسی کے بارے میں بھی یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیے کہ اس نے چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کیا ہے، جب آپ منبر سے نیچے اُترے، تو قریش کی ایک عورت ان کے سامنے آکر کہنے لگی: امیر المؤمنین! آپ نے لوگوں کو چار سو درہم سے زیادہ مقرر کرنے سے منع فرمایا ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! اس نے کہا: کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا:

(۱) میں اس کو ابن حجرؒ کی ''**المطالب العالیة**'' اور تفسیر ابن کثیر سورۂ نساء آیت نمبر ۲۰ سے نقل کرتا ہوں۔

﴿وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا﴾ (النساء: ۲۰) (اور تم نے ان میں سے ایک کو انبار کا انبار مال دے رکھا ہو) حضرت عمرؓ کہنے لگے: اللہ معاف کرے، سب لوگ عمر سے زیادہ فقیہ ہیں، پھر دوبارہ منبر پر چڑھے اور فرمایا کہ: اے لوگو! میں نے تمہیں چار سو درہم سے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کیا تھا؛ لیکن اب کہتا ہوں کہ: تمہیں اختیار ہے، تم اپنے مال میں سے جتنا چاہو مہر دے سکتے ہو۔

اس کی سند میں ایک راوی مجالد بن سعید ہمدانی متکلم فیہ ہے؛ اسی لیے ابن کثیر نے اس پر صحت کا حکم لگانے سے گریز کیا ہے اور "**إسناده جيد قوي**" کہنے پر اکتفا کیا ہے، یعنی مجالد کی وجہ سے اس روایت کو صحت سے تھوڑا سا نیچے اُتار دیا ہے۔

امام ابنِ عبد البرؒ کی شدت:

امام ابنِ عبد البرؒ کو دیکھیے، وہ انصاف کو لازم پکڑنے کے سلسلے میں کس قدر شدت برت رہے ہیں اور اس سے پہلو تہی کرنے والے کو کس طرح خسارے میں بتا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ: علم کی برکت اور علم کے آداب میں سے ہے کہ: علم کے اندر انصاف کا پہلو اختیار کیا جائے، جس شخص نے انصاف سے کام نہیں لیا، اس نے کچھ بھی نہیں سمجھا(۱)۔

دیگر اخلاق وصفات کی طرح اب انصاف کی صفت بھی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے، ابنِ عبد البرؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا کہ: ہمارے زمانے میں انصاف سے زیادہ کمیاب کوئی چیز نہیں!!(۲)۔

حضرت علیؓ کا واقعہ:

امام مالکؒ کا مذکورہ بالا ارشاد امام قرطبیؒ نے بھی سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۲ کی تفسیر

(۱) جامع بیان العلم ۱: ۵۳۰

(۲) جامع بیان العلم (۸۶۶)

میں نقل کیا ہے[1] جس کا حاشیہ پڑھنے کے لائق ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ کا گزشتہ واقعہ ایک دوسری سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور پھر حضرت علیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے[2] کہ: ایک شخص نے آ کر ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے مسئلہ بتلا دیا، سائل کہنے لگا: امیر المومنین! یہ مسئلہ ایسے نہیں، ایسے ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: تم صحیح کہہ رہے ہو، مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، ﴿وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾ ہر علم والے سے اُوپر ایک علم والا ہوتا ہے۔

بکر بن حمادؒ کا واقعہ:

اس کے بعد قرطبیؒ نے ابو محمد قاسم بن اصبغؒ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ: میں مشرق کے سفر میں قیروان پہنچا اور بکر بن حماد سے مسدد کی حدیثیں حاصل کرنے لگا، پھر بغداد چلا گیا اور وہاں مختلف شیوخ سے ملاقات کی، وہاں سے دوبارہ بکر بن حماد کے پاس آیا اور مسدّد کی بقیہ حدیثیں حاصل کرنے میں لگ گیا، ایک دن میں نے ان کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پڑھی: "**أنه قدم عليه قوم من مضر من مجتابي النمار**" کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مضر کے کچھ لوگ آئے، جنھوں نے سیاہ دھاریوں والی قمیص پہن رکھی تھی، جن میں سامنے کی طرف لمبائی میں شگاف تھا، بکر بن حماد کہنے لگے کہ: یہ "**مجتابي النمار**" نہیں: "**مجتابي الثمار**" ہے، میں نے کہا: نہیں! "**مجتابي النمار**" ہی ہے، میں نے اندلس اور عراق میں جن سے بھی یہ حدیث پڑھی اسی طرح پڑھی ہے، وہ کہنے لگے: اچھا، تو اب تم عراق جانے کے نام پر ہم سے معارضہ کرو گے اور فخر جتلاؤ گے!۔

پھر انھوں نے مسجد میں ایک شیخ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ: ان کے پاس چلو، ان سے پوچھ لیتے ہیں، وہ اس طرح کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں، ہم اُٹھ کر ان کے پاس گئے

(۱) تفسیر قرطبی ۱:۲۸۶

(۲) جامع بیان العلم (۸۶۵)، اس کی سند میں ضعف ہے، لیکن ص ۴۳۴ پر میرا حاشیہ دیکھیے۔

اوران سے دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ: یہ "**مجتابي النمار**" ہی ہے، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، وہ لوگ آگے سے اپنی قمیصوں کے گریبان اُوپر سے نیچے تک پھاڑ کر پہنتے تھے، **نمار: نمرة** کی جمع ہے، یہ سن کر بکر بن حماد نے اپنی ناک پکڑلی اور کہنے لگے: "**رغم أنفي للحق، رغم أنفي للحق**" میری ناک حق کے تابع ہوگئی، میری ناک حق کے تابع ہوگئی، اور واپس ہوگئے۔

اس واقعہ سے ہمیں علاوہ اِس بات کے کہ حق بات کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور بھی کئی سبق ملتے ہیں، مثلاً: عالم کو تحقیق کے بعد ہی اپنے قول سے رجوع کرنا چاہیے، تحقیق سے پہلے رجوع کرلینا کمزوری اور ہلکے پن کی دلیل ہے، اسی طرح: رجوع ہمیشہ فن میں اختصاص رکھنے والوں سے ہی کرنا چاہیے؛ آپ ان کے جملے پرغور کیجیے کہ: ''ان کے پاس چلو، وہ اس طرح کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں''۔

ادب الاختلاف کے اقتباسات:

میں نے ''ادب الاختلاف'' کے اندر بھی انصاف کی صفت کے تعلق سے بحث کی ہے(۱)، میں چاہتا ہوں کہ اس کے کچھ اقتباسات یہاں نقل کروں، میں نے لکھا ہے کہ:

طالبِ علم کو آدابِ اختلاف کے حدود سیکھنے کے بعد جو کہ ایک عمومی صفت ہے، ایک اور اہم علمی صفت سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے اور وہ ہے انصاف کی صفت۔

اس صفت کی اہمیت کو امام ابنِ عبدالہادیؒ نے "**جزء الجهر بالبسملة**" میں اس طرح بیان کیا ہے کہ: طالبِ علم کے حق میں انصاف اور ترکِ تعصب سے بہتر کوئی صفت نہیں (۲)۔

(۱) ص ۹۵-۱۰۰

(۲) اسے زیلعی نے ''نصب الرایہ'' ۱: ۳۵۵ میں نقل کیا ہے، یہ ابن عبدالہادیؒ کے کلام کا ایک ٹکڑا ہے جو ۱: ۳۳۵-۳۵۸ سے شروع ہوتا ہے، بہت سے معاصر علماء اس کو امام زیلعیؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں

انصاف کا معنیٰ ومفہوم:

اگر انصاف کے مفہوم اور کلامِ عرب میں اس کے استعمال پر غور کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ انصاف نام ہے: عدل کرنے، صاحبِ حق کو حق ادا کرنے اور حق وصول کرنے کا، جس میں نہ کوئی ظلم ہو اور نہ کسی قسم کی کوئی کمی زیادتی ہو اور علمی بحثوں کے اندر عدل کا تعلق: حق، دین، علم اور اپنی رائے کے مخالفین کے ساتھ ہوگا۔

انصاف کا ماخذ:

اس صفت کی اصل اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (النحل) (اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم زیادتی سے روکتا ہے، وہ اب تمہیں نصیحت کر رہا ہے کہ تم نصیحت حاصل کرلو) ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (المائدہ) (اختلاف اور دشمنی جو تمہارے اور دوسروں کے درمیان ہے تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے)۔

جس نے تین چیزیں جمع کرلیں اس نے پورے ایمان کو جمع کرلیا:

حضرت عمار بن یاسرؓ فرماتے ہیں کہ: جس نے تین چیزیں جمع کرلیں اُس نے پورے ایمان کو جمع کرلیا، ایک انصاف، دوسرے ہر ایک کو سلام کرنا اور تیسرے تنگدستی کے باوجود خرچ کرنا۔ امام بخاریؒ نے اس اثر کو تعلیقاً روایت کیا ہے[1]، حافظ ابنِ حجرؒ نے

(۱) فتح الباری، کتاب الایمان، باب ۲۰۔

اسے مرفوعاً بھی نقل کیا ہے؛ لیکن اسے معلول قرار دیا ہے، صحیح یہی ہے کہ یہ موقوف ہے۔

اس کے بعد حافظ ابنِ حجرؒ نے لکھا ہے کہ: ابوالزناد ابنِ سراج وغیرہ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ان تین چیزوں کے جمع کرنے والے کو کامل مؤمن اس لیے کہا گیا ہے کہ ایمان کا مدار ان ہی تین چیزوں پر ہے؛ کیونکہ جب بندے کے اندر انصاف کی صفت پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے آقا کا ہر واجب حق ادا کرنے لگتا ہے، ان میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا اور اس کا آقا اسے جس چیز سے بھی روکتا ہے اس سے رُک جاتا ہے، اس طرح اس کے اندر ایمان کے تمام ارکان آگئے اور سلام کو عام کرنے میں مکارمِ اخلاق، تواضع اور کسی کو حقیر نہ سمجھنے جیسی اہم صفات آگئیں؛ نیز سلام کرنے سے باہمی اُلفت ومحبت بھی پیدا ہوتی ہے اور تنگدستی کے باوجود خرچ کرنا تو غایت درجے کی سخاوت ہے؛ کیونکہ جب ضرورت کے وقت خرچ کر رہا ہے تو گنجائش کے وقت اور بھی زیادہ خرچ کرے گا......

پھر اس کا تنگدست ہونا یہ اللہ پر اعتماد، دنیا سے بے رغبتی، آرزوؤں کی کمی اور ان جیسے اہم اہم اُمور آخرت کو مستلزم ہے۔ غور کریں تو یہ تشریح اس اثر کے مرفوع ہونے کا احتمال قوی کر رہی ہے؛ کیونکہ اس طرح کا کلام بظاہر اسی ذات کا ہونا چاہیے جنھیں ''جوامع الکلم'' عطا کیے گئے، واللہ اعلم۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ: ان کا یہ قول کہ ''جب بندے کے اندر انصاف کی صفت پیدا ہوتی ہے تو وہ اپنے آقا کا ہر واجب حق ادا کرتا ہے'' اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ آدمی اللہ کے بندوں کے حقوق ادا کرے اور بندوں کے حقوق ادا کرنے میں یہ بھی داخل ہے کہ: ان کے حقوق کو ادا کرنے اور اپنے حقوق کو وصول کرنے میں انتہائی انصاف سے کام لے؛ نیز اللہ کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ: وہ پوری امانت داری، سچائی اور اخلاص کے ساتھ دین اور علمِ دین کا حق ادا کرے، بھلے ہی اس کا تعلق اہلِ علم کی جماعت سے نہ ہو، اور اگر ہو تو پھر پوچھنا ہی کیا ہے۔

انصاف کے فوائد:

عالم اگر اپنے مباحثات میں انصاف سے کام لے تو خود اس کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو اس کے ساتھ بحث ومباحثہ میں شریک ہیں یا اس کے مباحثہ کو سن رہے ہیں یا تحریراً پڑھ رہے ہیں، حق تک پہنچنے کا راستہ آسان سے آسان تر ہو جائے گا۔

انصاف کرنے والا شخص زبان اور قلم کی لغزشوں سے محفوظ اور بے فائدہ علم کے اندر شور وشغب اور مغالطے سے دُور رہتا ہے۔

جو شخص بھی انصاف سے پہلو تہی اختیار کرے، سمجھ لو کہ وہ خواہشات کی طرف جھک چکا ہے، خلیفہ عباسی معتصم باللہ نے پتہ کی بات کہی ہے کہ: ''جب خواہشات کی مدد کی جاتی ہے تو رائے باطل ہو جاتی ہے''(۱)۔ یعنی خواہشات کی مدد صحیح رائے اختیار کرنے اور درست بات کہنے سے مانع بن جاتی ہے۔

یحییٰ القطان اور انصاف کا حیرت انگیز مظہر:

انصاف کا ایک مظہر وہ بھی ہے جو ذہبیؒ نے عفان بن مسلم صفارؒ کے ترجمہ میں فلاّس کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ: میں نے ایک روز یحییٰ (القطان) کو دیکھا کہ انھوں نے ایک حدیث بیان کی، جس پر عفان نے ان سے کہا کہ: یہ حدیث ایسے نہیں، ایسے ہے، اگلے روز جب میں یحییٰ (القطان) کے پاس پہنچا، تو وہ فرمانے لگے کہ: یہ حدیث اسی طرح ہے جیسے عفان نے بتائی تھی، میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ یہ حدیث میرے پاس عفان کے بیان کے خلاف نہ ہو(۲)۔

میں کہتا ہوں (یعنی امام ذہبیؒ) کہ: یہ تھے ہمارے اکابر واسلاف کے حالات،

---

(۱) تاریخ بغداد ۳: ۳۴۹ ترجمة ابن فَهْم - لا ابن فَهَم-

(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۰: ۲۳۹

اے مسکینو! دیکھ لو تم لوگ ان سے کس قدر دُور ہو چکے ہو۔

انصاف کے لیے ایک انتہائی ضروری چیز یہ بھی ہے کہ عالم کو جتنی بھی صحیح اور حق باتیں معلوم ہوں ان میں سے کوئی بات بھی نہ چھپائے، یہ اہلِ بدعت کی عادت ہے کہ: جو باتیں ان کے حق میں ہوتی ہیں ان کو لکھتے ہیں اور جو ان کے خلاف ہوتی ہیں ان کو نہیں لکھتے۔

دار قطنی نے امام وکیع بن جراحؒ سے سند کے ساتھ یہ قول نقل کیا ہے کہ: اہلِ علم تو ہر بات لکھ لیتے ہیں، چاہے ان کے حق میں ہو یا ان کے خلاف ہو، جبکہ اہلِ بدعت اور اہلِ اہواء صرف وہی چیزیں لکھتے ہیں جو ان کے حق میں ہوتی ہیں [1]۔

(۱) سنن دار قطنی (۳۶)

نویں مشعل

جمہور علمائے اسلام کے منہج کو لازم پکڑنا اور شذوذ سے بچنا

اساتذہ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو برابر اس بات کی تلقین کرتے رہیں کہ وہ علم، عمل اور افتاء کے اندر جمہور علمائے اسلام کے منہج کو لازم پکڑے رہیں، وسیع علمی خطوط میں بھی اور جزئی مسائل میں بھی، وہ انھیں اسلاف سے منقول بعض علمی شذوذ یا تفرداتِ علماء کہے جانے والے مسائل سے ڈرائیں اور دُور رہنے کی تلقین کریں۔

امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا ایک قیمتی ارشاد:

امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا مشہور مقولہ ہے، جسے ابنِ عبدالبر نے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: ''وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو علماء کے شاذ اقوال اختیار کرے، وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو ہر ایک سے روایت کرے، وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو ہر سنی ہوئی بات روایت کرے''(۱)۔

یہ کل تین جملے ہیں:

پہلا جملہ: ''وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو علماء کے شاذ اقوال اختیار کرے'' اس پر گفتگو آگے آرہی ہے۔

(۱) جامع بیان العلم (۱۵۳۹)، الجامع لاخلاق الراوی (۱۳۶۲)، مقدمۂ مسلم ۱: ۱۱ دیکھیے۔

دوسرا جملہ: ''وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو ہر ایک سے روایت کرے'' اس جملے سے ان کا مقصد واضح ہے کہ وہ ہر ایک سے روایت کرنے سے منع کررہے ہیں؛ لیکن صرف روایت کرنے سے، تحمل اور حدیث لینے سے نہیں۔

ہر اچھی بُری چیز پڑھنے کا حکم:

محدثین کے یہاں یہ بات معروف ہے کہ علم کے اندر تحمل وسماع اور چیز ہے اور روایت وادا اور چیز، اور عبد الرحمٰن بن مہدیؒ تحمل وسماع یعنی حدیث لینے سے منع نہیں کررہے ہیں؛ بلکہ ہر ایک کی روایت اور حدیث بیان کرنے سے منع کررہے ہیں، تا آنکہ اس راوی کا اور اس کی مرویات کا حال اچھی طرح واضح ہوجائے۔

لہٰذا طالبِ علم - جو آگے چل کر عالم بننے والا ہے - ہر ایک سے علم حاصل کرسکتا ہے، ہر ایک کی کتاب پڑھ سکتا ہے، ہر ایک کی حدیث سن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اچھے اور بُرے، کھرے اور کھوٹے، حق اور باطل کے درمیان امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہو، بلاشبہ ان دنوں جو چیزیں طبع ہوکر آرہی ہیں، یا بہت سے ذرائع ابلاغ پر دکھائی جارہی ہیں، ان میں سیلاب کا جھاگ زیادہ ہے؛ اس لیے طالبِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان چیزوں میں خوب احتیاط سے کام لے، وہ کوئی بھی چیز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک اپنے استاذ اور بصیرت کے حامل اپنے مربی سے مشورہ نہ کرلے کہ ان حضرات کی زمانے پر نگاہ ہوتی ہے اور وہ ذہن کو منتشر کرنے والے مصنّفین کی جماعت سے خوب واقف ہوتے ہیں۔

کیونکہ مبتدی طالبِ علم جب **''أضواء على السنة المحمدية''** جیسا پُرکشش نام دیکھتا ہے تو اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے اور اس کو تلاش کرنے اور پڑھنے میں لگ جاتا ہے، اسے پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کتاب کیسی گمراہیوں پر مشتمل ہے، اسی طرح **''فجر الإسلام''**، **''ضحى الإسلام''**، **''ظهر الإسلام''** اور **''يوم الإسلام''** جیسے نام سنتا ہے تو ان کو پڑھنے کے درپے ہوجاتا ہے، اسے خبر نہیں ہوتی کہ ان کے اندر کس قسم کا مواد بھرا

ہوا ہے، اور ان کے مصنّف نے کیسے کیسے انحرافات کرر کھے ہیں، اگر چہ وہ شرعی قضاء کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے!!(۱)۔

اسی طرح وہ **"جناية البخاري على الحديث"**، **"جناية الشافعي على الفقه"**، **"جناية سيبويه على النحو"** جیسے نام دیکھتا ہے یا سنتا ہے، تو اس کا دل ان کتابوں کی طرف لپکتا ہے اور انھیں پڑھنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے اور جب پڑھتا ہے تو ان کے جال اور ان کی گمراہیوں میں پھنستا چلا جاتا ہے اور پھر بخاری وشافعی کی

(۱) چونکہ یہاں تشویش میں ڈالنے والی بعض کتب اور مصنّفین کا تذکرہ ہوا ہے؛ اس لیے میں موقع کی مناسبت سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ: بعض اہلِ علم جن کا علم اور جن کا دین عمومی طور پر ان کے تمام جاننے والوں کے نزدیک اور بالخصوص ان کے تلامذہ کے نزدیک قابلِ اعتماد ہوتا ہے، وہ لوگ کبھی -کسی علمی مناسبت کی وجہ سے جس کے لیے وہ مجبور ہوتے ہیں- اس قسم کے بعض علماء اور مصنّفین سے کچھ باتیں نقل کر لیتے ہیں، جس سے قاری یہ سمجھتا ہے کہ یہ ان حضرات کی طرف سے اس کتاب اور کتاب کے مصنّف کی توثیق ہے اور پھر وہ ان لوگوں کے بارے میں حسنِ ظن کا شکار ہو جاتا ہے؛ حالانکہ اگر وہ اپنے استاذ سے اس کتاب اور اس کے مصنف کے تئیں ان کا عمومی نظریہ معلوم کرتا تو وہ بات کو واضح کر دیتے اور اسے اس کتاب سے دُور رہنے کی تلقین کرتے۔

اسی لیے میرا کہنا ہے کہ ہمیں اس طرح کی چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے، جن سے اس قسم کا وہم پیدا ہوتا ہے، خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچائیں، خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں اس طرح کی تشویش میں ڈالنے والی کتابیں اور مصنفین نہ پائے جاتے ہوں۔

اللہ تعالیٰ امام کوثریؒ پر رحم فرمائے، قاضی شوکانی اور صدیق حسن خان کے تعلق سے ان کا موقف کسی سے مخفی نہیں؛ لیکن جب علمی بحث کے اندر انھیں نزولِ عیسیٰ کے مسئلے میں ان دونوں کی رائے -جو علماءِ امت کے اجماعی موقف کے موافق تھی- نقل کرنے کی ضرورت پڑی، تو انھوں نے اپنے مقالے **"الرسالة والأزهر"** میں ان دونوں کی رائے نقل کرنے کے بعد یہ لکھا کہ: میں آراء نقل کرنے کے لیے ان دونوں کی طرف اس لیے گیا؛ کیونکہ یہ دونوں فریقِ مخالف کے نزدیک پسندیدہ آدمی ہیں، یعنی اس لیے نقل نہیں کیا کہ ان دونوں پر اعتماد ہے۔

حدیث وفقہ کے خلاف جنایت تو چھوڑیے، وہ ان کتابوں کی جنایات اور جرائم کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے، جو انھوں نے پورے اسلام کے خلاف برپا کر رکھی ہیں۔

اہلیت ہو تو ہر کتاب پڑھے:

ہاں اگر کسی کو اپنے اندر اہلیت محسوس ہو اور وہ اتنا پختہ ہو چکا ہو کہ گمراہی، بدعات اور اہلِ بدعات سے متاثر نہیں ہو سکتا، تو پھر اسے ان کتابوں کے پڑھنے اور سننے کا اہتمام کرنا چاہیے؛ کیونکہ ایک عالم اور مرجع کی حیثیت رکھنے والے شخص کے لیے علمی میدان اور علمی اسٹیج پر رونما ہونے والی چیزوں سے واقفیت بھی ضروری ہے؛ تاکہ وہ اپنے زمانے کے افکار اور اُصول کا جائزہ لے سکے اور جو صحیح فکر اس نے حاصل کی ہے اور جس صحیح منہج پر اس نے تربیت پائی ہے اس فکر اور اس منہج کی روشنی میں ان افکار کا علاج کر سکے، کہ ان میں جو چیزیں صحیح ہوں ان کو صحیح ثابت کر کے انھیں قوت عطا کرے، اور جو چیزیں غلط ہوں ان کو غلط بتا کر انھیں کمزور کرے۔

لیکن اسے لوگوں کے سامنے وہی روایات بیان کرنی ہیں اور وہی باتیں بتانی ہیں جو ان کے ذہن اور اخلاق کے اعتبار سے قابلِ تحمل ہوں، حتیٰ کہ اگر وہ حق اور سچی باتیں ہی بیان کرنا چاہ رہا ہو جو جمہور اہلِ اسلام کے موافق ہوں؛ لیکن لوگوں کے لیے ناقابلِ تحمل ہوں تو ان سے بھی گریز ضروری ہے، اور جب حق اور سچی بات کا یہ حکم ہے تو جو گمراہ کن باتیں اب بتائی جا رہی ہیں ان کا کیا حکم ہوگا، آپ اندازہ لگا سکتے ہیں؟!!۔

امام بخاریؒ نے ایک باب باندھا ہے[1]: **"باب من خص بالعلم قوما دون قوم كراهية أن لايفهموا"** علم کی باتیں بعض لوگوں کے سامنے بیان کرنا اور بعض کے سامنے بیان نہ کرنا، اس ڈر سے کہ وہ سمجھ نہیں پائیں گے، آگے لکھتے ہیں کہ: حضرت علیؓ کا ارشاد ہے کہ: لوگوں سے وہی باتیں بیان کیا کرو جن کو وہ سمجھتے ہوں، کیا تمھیں یہ بات اچھی

(۱) کتاب العلم- باب ۴۹

لگتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو جھٹلایا جائے؟ اس کے بعد امام بخاریؒ نے اس قول کی سند بھی ذکر کی ہے، اس اثر پر حافظؒ نے جو کلام کیا ہے اسے ضرور پڑھیے۔

تیسرے جملہ کی تشریح:

تیسرا جملہ ہے: ''وہ شخص کبھی امام نہیں بن سکتا جو ہر سنی ہوئی بات بیان کرے'' اسلاف کے زمانے میں طالبِ علم مشرق و مغرب کے آخری کناروں تک سفر کرتا تھا اور جس سے بھی ملاقات ہوتی، اس کو دیکھتا، اس کی باتیں سنتا اور اس کی حدیثیں لکھتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسے صحیح علم اور خیر کی باتیں غلط چیزوں کی بہ نسبت زیادہ ملتی تھیں؛ لیکن امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ ان دو جملوں کے اندر اسے پوری علمی زندگی کے لیے ایک انتہائی اہم پہلو کی طرف متوجہ کرنا چاہ رہے ہیں، وہ یہ کہ عالم اور طالبِ علم اپنے علم کے اندر عقل سے کام لے؛ کیونکہ علم کے اندر کچھ غرائب بھی ہوتے ہیں، اگر وہ ان کے بارے میں اپنی عقل استعمال نہیں کرے گا، تو بہت ممکن ہے کہ اس کا علم خود اس کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی وبالِ جان بن جائے۔

کتبِ تراجم میں بسا اوقات مدح و تعریف کے اندر یہ جملہ لکھا ہوا ملتا ہے: **"فلان عقله أكبر من علمه"** (کہ فلاں کی عقل ان کے علم سے بڑی تھی) اسی طرح مذمت کے اندر یہ جملہ ملتا ہے: **"فلان علمه أكبر من عقله"** (کہ فلاں کا علم ان کی عقل سے زیادہ تھا) پس یہ عالم کی عمومی زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے کہ وہ اپنے علم کے اندر اپنی عقل بھی استعمال کرے۔

کبھی کبھی اس قسم کے طالبِ علم یا عالم کو اپنے بارے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ: وہ اپنی گفتگو کتاب و سنت کے دائرے میں رہ کر ہی کرے گا؛ لیکن اس کی بصیرت کی نگاہیں دیکھ نہیں پاتیں کہ اس کی گفتگو سامعین کے دلوں پر کیا اثرات چھوڑے گی، امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ: ''میں نے کچھ حدیثیں ایسی بیان کی ہیں، جن کے متعلق میں آرزو کرتا ہوں کہ کاش

مجھے ان میں سے ہر حدیث کے بدلے میں دو کوڑے بھی مارے جاتے تو میں ان کو بیان نہ کرتا'' ان کا یہ ارشاد امام حاکمؒ نے نقل کیا ہے (۱) اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:
مالک بن انسؒ باوجودیکہ حدیث بیان کرنے میں تنگی اور قلت سے کام لیتے تھے؛ پھر بھی اس قدر ڈر رہے ہیں، تو پھر ان لوگوں کو کیا کہا جائے، جو رطب و یابس سب کچھ روایت کر ڈالتے ہیں؟!۔

پہلے جملے کی تشریح:

پہلا جملہ ہے: ''جو شخص علماء کے شاذ اقوال اختیار کرے وہ امام نہیں بن سکتا'' یہ تنبیہ عام ہے، خواہ اپنے لیے شاذ اقوال اختیار کرے اور خود ان پر عمل کرے یا دوسروں کے لیے شاذ اقوال اختیار کرے اور انھیں ان کے مطابق فتویٰ دے اور خواہ ایک مسئلے میں شاذ قول اختیار کرے یا متعدد مسائل میں، اسی طرح یہ تنبیہ علم کے تمام ابواب کو شامل ہے: خواہ عقیدے کا باب ہو یا عمومی احکام کا یا سلوک کا یا کسی اور چیز کا۔

اور اس تنبیہ سے مقصود: یہ ہے کہ عالم کو علم اور علماء کے شذوذ سے دُور رہنا چاہیے؛ تاکہ وہ ہمیشہ سلامتی کے راستے اور سیدھی راہ پر گامزن رہے، خاص طور پر جبکہ عالم امت کے لیے قدوہ اور مقتدی ہوتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے ''اثر الحدیث الشریف'' کے اندر بھی شاذ اقوال سے بچنے پر بحث کی ہے (۲)، وہیں سے حسبِ سہولت کچھ باتیں نقل کرتا ہوں اور ساتھ ہی **"فتاویٰ برزلی"، "معید النعم"، "مقالات الكوثري"** اور ''ابن المبارک'' سے بھی کچھ باتیں نقل کروں گا، پوری بحث کے لیے قارئین اصل کتاب کی طرف رجوع کریں۔

(۱) معرفۃ علوم الحدیث (۱۰۸)

(۲) ص ۱۳۶-۱۴۴

شاذ اقوال جمع کرنے والے پر زندیق کا حکم:

بیہقیؒ نے امام الشافعیہ فی العراق ابوالعباس ابن سریجؒ سے نقل کیا ہے[(۱)] وہ امام المالکیہ فی العراق قاضی اسماعیل بن اسحاق سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ معتضد باللہ کے پاس گیا تو انھوں نے مجھے ایک کتاب دکھائی، میں نے دیکھا تو اس میں ان کے لیے علماء کی **زلات**[(۲)] اور لغزشوں میں سے رخصت والے مسائل لے کر انھیں-مع دلائل کے-جمع کر دیا گیا تھا، میں نے کہا: امیر المومنین! اس کتاب کو لکھنے والا تو زندیق ہے! معتضد نے کہا: وہ کیسے؟ کیا یہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں؟ میں نے کہا: احادیث تو اپنی جگہ پر ہیں؛ لیکن جس امام نے نشہ آور چیز-یعنی نبیذ-کو جائز قرار دیا ہے، انھوں نے متعہ کو جائز قرار نہیں دیا اور جنھوں نے متعہ کو جائز قرار دیا ہے، انھوں نے غناء اور مسکر یعنی نبیذ کو جائز قرار نہیں دیا، ہر عالم سے کوئی نہ کوئی لغزش ہو جاتی ہے، اب جو شخص علماء کی لغزشوں کو جمع کر کے ان پر عمل کرنے لگے تو سمجھ لو کہ اس کا دین ہاتھ سے گیا! معتضد نے یہ بات سنی تو اس کتاب کو جلا دینے کا حکم دے دیا۔

شاذ قول پر امام برزلیؒ کے استاذ کی تنبیہ:

برزلیؒ کے ایک واقعہ سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ شذوذ اور تفردات سے دلچسپی کی یہ بے راہ روی: گمراہی کی شاہراہوں تک لے جاتی ہے، برزلی نے[(۳)] اپنا واقعہ

---

(۱) سنن بیہقی ۱۰: ۲۱۱

(۲) **زلّة**: کے معنیٰ ہیں بغیر قصد کے صادر ہونے والی پہلی غلطی، اس تعبیر میں علماء کے لیے حد درجہ احترام کا پہلو پایا جاتا ہے، مذکورہ کتاب کے مصنّف سے بظاہر دو غلطیاں ہوئی تھیں: ایک تو اس نے سب لغزشوں کو ایک جگہ جمع کر دیا اور دوسرے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ لغزشیں ہیں ان میں سے کل کو یا بعض کو اختیار کیا، آگے شاطبی کا کلام ضرور پڑھیے۔

(۳) اپنے فتاوی میں ۱: ۸۷

خود بیان کیا ہے، فرماتے ہیں کہ: مجھے وہ دن یاد ہے جب میں اپنے استاذ اور اپنے امام صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، میں ابھی مراہق تھا، بالغ نہیں ہوا تھا، وہ رمضان کا پہلا دن تھا، لوگوں نے رات میں روزہ رکھنے کی نیت نہیں کی تھی (اور دن میں روزے سے نہیں تھے) میں نے اپنے استاذ سے کہا کہ: میں آج کے روزے کی قضا نہیں کروں گا؛ کیونکہ بعض اصحابِ مالکیہ اس کے قائل ہیں، میرا اشارہ ایک شاذ روایت کی طرف تھا، میرے استاد نے یہ سنا تو میرا کان پکڑا اور کہا کہ: اگر علم اسی لیے حاصل کرنا ہے تو پھر آج ہی یہ راستہ چھوڑ دو، یاد رکھو! اگر دائیں بائیں کے راستوں میں جانے کی کوشش کروگے تو زندیق بن کر نکلوگے، ان کے یہی الفاظ تھے۔

تاج سبکیؒ اور امام کوثریؒ کے ارشادات:

تاج سبکی نے بھی "**معید النعم**"(۱) میں سینتالیسویں مثال پر کلام کرتے ہوئے اس بات کی تائید کی ہے، سینتالیسویں مثال انھوں نے اس مفتی کی دی ہے، جو شریعت کے معاملے کو ہلکا بنا دیتا ہے اور امراء وغیرہ کو ایسی رخصتیں دیتا ہے جو دوسروں کو نہیں دیتا، انھوں نے لکھا ہے کہ: یہ سب اللہ کے دین کے ساتھ استخفاف اور بے وقعتی کی علامتیں ہیں، آگے رخصتوں کی کچھ مثالیں دینے کے بعد لکھا ہے کہ: جس کا یہ حال ہوتا ہے، وہ العیاذ باللہ زندقہ تک پہنچ جاتا ہے۔

امام کوثریؒ نے اپنے مقالے "**اللامذهبية قنطرة اللادينية**" میں لکھا ہے کہ: ائمہ کے اقوال کے درمیان رخصتوں کو تلاش کرنا یا ان کی جو آراء اپنی خواہش کے موافق ہوں ان کو اختیار کرنا یہ دونوں چیزیں سراسر نفس پرستی پر مبنی ہیں، ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں، چاہے ان کو جائز قرار دینے والا کوئی بھی ہو اور کتنا ہی بڑا ہو۔

(۱) ص ۸۱

خواہشات کے مطابق اقوال اختیار کرنا:

ائمۂ مجتہدین میں سے امام ابن المبارکؒ نے خاص لغزشوں اور رخصتوں کے حوالے سے تو نہیں؛ البتہ مطلقاً اپنی نفسانی خواہشات کے مطابق علماء کے اقوال کو اختیار کرنے سے ڈرایا ہے؛ چنانچہ ابن ابی العوامؒ نے ''فضائل ابی حنیفہؒ''(۱) میں علی بن حسن بن شقیقؒ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے عبداللہ بن مبارکؒ سے صحابۂ کرام کے اختلاف کے بارے میں پوچھا کہ: کیا سب کے اقوال درست اور صواب ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ: صواب تو ایک ہی ہوتا ہے؛ البتہ غلطی قوم سے اُٹھالی گئی ہے- یعنی غلطی پر ان سے مواخذہ نہیں ہوگا- میں نے کہا: پھر تو اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کے بھی ایک قول کو اختیار کرلے، تو اس سے مواخذہ نہیں ہوگا؟ انھوں نے فرمایا: ہاں! مجھے یہی اُمید ہے؛ لیکن اگر کوئی کسی ایک قول کو تو حق سمجھ کر اختیار کرے، پھر جب کوئی بات پیش آئے تو اسے چھوڑ کر دوسرے قول کو اپنالے تو اس کی گنجائش نہیں دی جاسکتی۔

تفردات سے متعلق ابن المبارک کا ایک دلچسپ مناظرہ:

شاطبیؒ نے ''موافقات'' کے اندر عبداللہ بن مبارکؒ سے ہی اہلِ کوفہ کے ساتھ ان کا ایک مناظرہ نقل کیا ہے(۲) عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ: ہم کوفہ میں تھے، لوگوں نے مجھ سے اس سلسلے میں- یعنی: نیند کے بارے میں- مناظرہ کیا، میں نے ان سے کہا کہ: تم رخصت کی دلیل میں جس صحابی کا چاہو قول پیش کرو، اگر ہم نے بسندِ صحیح اسی صحابی سے شدت کے ساتھ اس کا رَدپیش نہ کیا تو تم اس دلیل پر عمل کرلینا۔

چنانچہ وہ جس صحابی سے رخصت کا قول نقل کرتے، ہم ان ہی صحابی سے شدت کے

---

(۱)(۵۶۹)

(۲)۴:۱۲۳کتاب الاجتهاد، المسألة الثامنة، الفصل الأول

ساتھ اس کا رَد پیش کرتے، جب ان کے پاس عبداللہ بن مسعودؓ کے سوا کسی کا قول نہیں بچا -اور ان کا بھی جو قول وہ دلیل میں پیش کر رہے تھے وہ صحت کے درجے کا نہیں تھا- تو میں نے کہا: بے وقوف! مان لو اگر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ یہاں بیٹھے ہوتے، اور وہ کہتے کہ: نبیذ تمھارے لیے حلال ہے اور ہم نے ابھی بتایا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے اس سلسلے میں کس قدر شدت برتی ہے، تو تم کیا کرتے، یقیناً تم بچتے، یا ڈرتے یا کچھ سمجھ میں نہ آتا!! اس پر کسی نے کہا کہ: پھر نخعیؒ اور شعبیؒ -اور بھی کچھ نام لیے- یہ سب حرام پیتے تھے، میں نے کہا کہ: استدلال کے وقت علماء کے نام نہیں گنوائے جاتے، ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی کی اسلام کے تئیں بہت خدمات ہوں؛ اور اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے، تو کیا اس سے استدلال کرنا شروع کر دیا جائے گا؟ اگر تم نہیں مانتے تو پھر بتاؤ: عطاء بن ابی رباح، طاؤس، جابر بن زید، سعید بن جبیر اور عکرمہ کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ: یہ تو بڑے نیک لوگ تھے، میں نے کہا کہ: یہ بتاؤ کہ ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں نقد بیچنا کیسا ہے؟ انھوں نے کہا: حرام ہے، ابنِ مبارکؒ نے کہا کہ: یہ لوگ تو اسے حلال سمجھتے تھے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ حرام کھاتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے؟! وہ سب چُپ ہو گئے، اور کوئی جواب نہیں بن پڑا اور ساری دلیلیں کالعدم ہو گئیں۔

شاطبی کہتے ہیں کہ: حق بات وہی ہے جو عبداللہ بن مبارکؒ نے کہی ہے۔

شاذ اقوال سے متعلق دیگر ائمہ کے ارشادات:

بیہقی نے امام اوزاعیؒ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے[1]، وہ فرماتے ہیں کہ: اہلِ عراق کے پانچ اقوال سے اور اہلِ حجاز کے پانچ اقوال سے بچنا چاہیے- یا کہا: چھوڑ دینا چاہیے- پھر آگے انھوں نے ان اقوال کو شمار کرایا۔

ابوبکر آجری کہتے ہیں کہ: اگر کوئی شخص شطرنج کے جواز پر یہ دلیل پیش کرے کہ: بہت

(۱) سنن کبریٰ ۱۰: ۲۱۱

سے ایسے لوگوں نے بھی شطرنج کھیلا ہے جو اہلِ علم سمجھے جاتے تھے؟ تو ایسے شخص سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ: جو بات تم کہہ رہے ہو یہ وہی کہتا ہے جو علم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی پیروی کرنا چاہتا ہو، یہ ہرگز مناسب نہیں کہ اہلِ علم میں سے کسی سے کوئی لغزش ہو جائے تو اس میں اس کی اتباع کی جائے، ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے اور ہمارے اسلاف کو اس تعلق سے ہم پر خوف رہتا تھا(۱)۔

اس کے بعد انھوں نے حضرت عمر بن خطابؓ کا یہ ارشاد سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ: تین چیزیں گمراہ کرنے والی ہیں: ایک گمراہ کرنے والے ائمہ، دوسرے منافق کا قرآن کو لے کر جھگڑنا اور تیسرے عالم کی لغزش۔

بلکہ امام الحدیث والتفسیر والکلام ابو علی کرابیسیؒ نے اسلاف کے کچھ شاذ اقوال نقل کرنے کے بعد یہاں تک لکھا ہے کہ: آپ یہ نہ کہیں کہ: یہ سب شاذ اقوال اختیار کرنے والے اہلِ علم ہی تو ہیں؛ کیونکہ ایک عالم کی لغزش اسلام کی پوری عمارت ڈھا دیتی ہے، جبکہ ہزار جاہلوں کی لغزش اسے منہدم نہیں کر سکتی (۲)۔

بخدا انھوں نے سچ کہا؛ مگر یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کی لغزش کو کسی جہالت یا حماقت کے ذریعہ تقویت پہنچائی جائے، یہاں تک کہ اس کی اس لغزش کو ہی حق اور صواب قرار دے دیا جائے اور اس کے علاوہ سب کو غلط اور باطل ٹھہرایا جائے اور اگر ایسا نہ ہو؛ بلکہ اس کو اہمیت نہ دے کر یا اس کی تردید کر کے اس کو دفن کر دیا جائے تو پھر وہ اس قدر نقصان دہ نہیں رہتی۔

ابنِ عبد البرؒ نے اپنی ''جامع''(۳) میں لکھا ہے کہ: حکماء نے عالم کی لغزش کو کشتی کے

---

(۱) **تحریم النرد والشّطرنج والملاهي** ص ۱۷۰

(۲) طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی ۲: ۱۲۵

(۳) (۱۸۷۳)، خطیب نے ''آداب الفقیہ والمتفقہ'' (۶۴۶) میں اس تشبیہ کو عبد اللہ بن المعتز کی طرف منسوب کیا ہے۔

ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے؛ کہ جب کشتی ڈوبتی ہے، تو اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو لے کر ڈوبتی ہے۔

لغزش اور شذوذ کو پہچاننے کی کسوٹی:

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی قول کا لغزش ہونا کیسے پہچانا جائے، اس کی کیا علامات ہیں؟

تو اس کا جواب ابوداؤد وغیرہ کے اندر (۱) حضرت معاذ بن جبلؓ کے ایک اثر میں ملتا ہے، جس میں انھوں نے ایک انتہائی سچی اور ٹھوس بات کہی ہے، جلیل القدر تابعی یزید بن عمیرہؒ جو حضرت معاذؓ کے خاص تلامذہ میں ہیں، فرماتے ہیں کہ: حضرت معاذؓ جب کبھی وعظ کے لیے بیٹھتے تو فرماتے: "اللہ حَکَمٌ عَدْلٌ" ایک دن انھوں نے اپنے وعظ میں فرمایا کہ: تمھارے بعد ایسے فتنے آنے والے ہیں، جن میں مال بہت زیادہ ہوجائے گا اور قرآن عام ہوجائے گا، یہاں تک کہ اسے مؤمن، منافق، آزاد، غلام، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے سب حاصل کرنے لگیں گے (۲)، ہوسکتا ہے اس وقت کوئی کہنے والا کہے کہ: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ میری اتباع نہیں کرتے؛ حالانکہ میں نے

(۱) ابوداود کتاب السنۃ ۵:۱۸۶ (۴۵۹۲)، تاریخ یعقوب بن سفیان ۲:۳۲۱، ان ہی کے طریق سے بیہقی ۱۰:۲۱۰ نے روایت کیا ہے، المدخل للبیہقی ص ۴۴۴، مستدرک حاکم ۴:۴۶۰ (۸۴۲۲) حاکم نے اس کو علی شرط الشیخین صحیح قرار دیا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، پھر آگے ۴:۴۶۶ (۸۴۴۰) ایک دوسرے طریق سے اس کو روایت کیا ہے اور علی شرط مسلم صحیح قرار دیا ہے اور مطبوعہ نسخے کے مطابق ذہبی نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے، یہ حدیث "جامع بیان العلم" میں بھی ہے۔
زلۃ الحکیم کی ایک مثال مسند شامیین ۲:۳۳۳ میں دیکھیے، اسی قسم کی ایک مثال یعقوب بن سفیان ۲:۳۲۲ کے یہاں بھی ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کا وہ واقعہ بھی دیکھیے جو پیچھے ص ۳۱۶ پر گزرا ہے۔

قرآن پڑھ رکھا ہے، میں سمجھ گیا کہ یہ اسی وقت میری اتباع کریں گے جب میں ان کے سامنے کوئی نئی چیز گھڑ کر لاؤں گا۔

تو یاد رکھو! تم اس کی گھڑی ہوئی باتوں سے بچنا؛ کیونکہ اس کی باتیں گمراہی پر مشتمل ہوں گی؛ نیز تم حکیم (عالم) کی لغزش سے بھی بچتے رہنا اور محتاط رہنا؛ کیونکہ شیطان کبھی حکیم کی زبان پر بھی گمراہی کا کلمہ جاری کر دیتا ہے اور کبھی منافق بھی حق بات کہہ جاتا ہے۔

یزید بن عمیرہؒ کہتے ہیں کہ: میں نے پوچھا کہ: ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ حکیم کی بات گمراہی پر مشتمل ہے یا منافق حق بات کہہ رہا ہے۔

حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ: حکیم کی جو باتیں ''مشتبہات'' ہوں جنہیں سن کر تم کہہ اٹھو: کہ یہ کیسی چیزیں بیان کی جارہی ہے؟ تو سمجھ لو وہی گمراہ کن بات ہے، اس سے بچنے کی کوشش کرو؛ لیکن اس کی وجہ سے اس حکیم سے دُور مت ہو جاؤ؛ عین ممکن ہے کہ جب وہ حق بات کو سنے تو اپنی بات سے رجوع کر کے حق کو قبول کر لے، یاد رکھو! حق کے اُوپر ایک قسم کا نُور ہوتا ہے۔

بیہقیؒ اس اثر کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ: اس اثر میں حضرت معاذ بن جبلؓ نے بتلایا ہے کہ: حکیم کی لغزش کی وجہ سے اس سے اعراض نہیں کرنا چاہیے؛ البتہ اس کی ان باتوں کو چھوڑ دینا چاہیے جن پر نُور نہ ہو؛ کیونکہ حق بات پر ایک قسم کا نُور ہوتا ہے، نُور سے ان کی مراد -واللہ اعلم- قرآن، حدیث، اجماع یا قیاس سے اس بات پر دلیل کا موجود ہونا ہے۔

غرض حضرت معاذؓ نے دو الگ الگ جماعتوں کے بارے میں خبر دی: ایک جماعت تو وہ ہوگی جو اسلام سے بالکلیہ خارج ہوگی، وہ ایسے اُصول گھڑے گی جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، جبکہ دوسری جماعت صحیح لوگوں کی ہوگی، ان کے اندر ایمان وحکمت بھی ہوگا؛ البتہ ان سے کچھ لغزشیں اور غلطیاں صادر ہوں گی، اب کسی خواہشات کے اسیر کو یہ حق نہیں کہ وہ اس جماعت کو پہلی جماعت کے ساتھ لاحق کر دے؛ بلکہ اسے چاہیے کہ وہ

صحیح اور خیر کی باتوں کے اندر اس جماعت کو لازم پکڑے رہے اور جو شذوذ اور لغزشیں ان سے صادر ہو رہی ہیں ان سے بچتا رہے۔

حضرت معاذؓ نے ہمیں لغزش کی علامت بھی بتلائی کہ: وہ گدلی اور میلی ہوگی، اس میں حق کی صفائی اور چمک نہیں ہوگی، اسے انھوں نے ''مشتبہات'' کہا ہے، یعنی وہ ایسی چیز ہوگی کہ فطری طور پر تمہارا دل یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوگا کہ اس کا تعلق خالص چمکدار اور روشن حق سے ہو؛ اور تم کہہ اُٹھو گے کہ: یہ کیسی چیز ہے؟(۱)

کیونکہ جو خالص حق ہوتا ہے اس پر نُور اور دلیل ہوتی ہے، جو اس کی تائید کرتی ہے۔ واللہ اعلم

ائمہ کے تفردات اور ابنِ قیمؒ کا بصیرت افروز کلام:

امام ابنِ قیمؒ نے اس تعلق سے نہایت عمدہ بحث کی ہے(۲) جس میں انھوں نے علماء کی لغزشوں سے بچنے پر کلام کیا ہے، میں اس کے شروع کا کچھ حصہ نقل کرتا ہوں، جس میں انھوں نے سمجھایا ہے کہ ائمہ کے طریقے کو لازم پکڑنا اور جو اقوال ان کے لینے کے قابل نہیں ہیں اُن سے دُور رہنا، یہ دونوں چیزیں کس طرح جمع ہو سکتی ہیں، فرماتے ہیں کہ:

یہاں پر دو چیزیں ضروری ہیں: ایک چیز جو دوسری چیز سے بڑھی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ، اُس کے رسولؐ، اس کی کتاب اور اس کے دین کے تعلق سے نصح اور خیر خواہی پیدا کی جائے، اور انھیں ایسے اقوالِ باطلہ سے پاک رکھا جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت اور واضح دلائل سے متعارض ہوں۔

---

(۱) اس تشریح پر ابنِ عبدالبرؒ کی ''جامع'' کی روایت (۱۸۷۳) بھی دلالت کرتی ہے، جس میں ہے کہ: لوگوں نے پوچھا کہ: حکیم کی لغزش کیسی ہوگی؟ تو انھوں نے فرمایا کہ: وہ ایسی بات ہوگی جو تمہیں گھبراہٹ میں ڈال دے گی اور تمہیں اجنبی سی لگے گی، اور تم کہو گے کہ: یہ کیسی بات ہے؟۔

(۲) اعلام الموقعین ۳: ۲۹۴ فما بعدہا

دوسری چیز: ائمہ اسلام کے فضائل، ان کی حیثیت، ان کے حقوق اور ان کے مراتب کو سمجھا جائے؛ لیکن ایسا نہ ہو کہ ان کے فضائل، ان کے علم اور اللہ اور رسولؐ کے تئیں ان کی خیر خواہی کی وجہ سے ان کی ہر بات کو قبول کرلیا جائے اور ایسا بھی نہ ہو کہ ان کے فتاویٰ میں جو مسائل اس طرح کے آگئے ہیں جن میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ حکم سے واقف نہ ہو سکے اور انھوں نے اپنے علم کے اعتبار سے ایک بات کہہ دی، جبکہ حق اس کے برعکس تھا، تو اس کی وجہ سے ان کے تمام اقوال کو یکسر چھوڑ دیا جائے اور ان کی تنقیص وتحقیر کی جائے، یہ دونوں راستے اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں، اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے، ہم نہ تو کسی کو گنہگار ٹھہراتے ہیں اور نہ ہی کسی کو معصوم قرار دیتے ہیں۔۔۔ہم اس سلسلے میں وہی راستہ اپناتے ہیں جو خود ان حضرات نے اپنے اسلاف یعنی صحابۂ کرامؓ کے بارے میں اپنایا تھا۔۔۔اور یہ دونوں باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہیں، جس کسی کے سینے کو اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو اسے ان دونوں کے درمیان کوئی منافات نظر نہیں آئے گی، ہاں دو قسم کے لوگوں کو منافات نظر آسکتی ہے: ایک تو وہ جو ائمہ کرام کی قدر ومنزلت اور ان کے فضائل سے ناواقف ہوں اور دوسرے وہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی حقیقت سے ناواقف ہوں؛ ورنہ جس کو شریعت اور واقع دونوں کا علم ہوگا وہ اِس بات کو بخوبی سمجھ لے گا کہ وہ جلیل القدر شخصیات جنھیں اسلام کے اندر فوقیت وبرتری حاصل ہے اور ان کے عمدہ کارنامہ ہیں اور وہ اسلام اور اہلِ اسلام کے نزدیک ایک مقام رکھتے ہیں، کبھی ان سے لغزشیں بھی ہو جاتی ہیں، جن میں وہ معذور ہوتے ہیں؛ بلکہ اپنے اجتہاد کی وجہ سے ماجور ہوتے ہیں؛ لہٰذا کسی کے لیے نہ تو ان کی لغزشوں میں ان کا اتباع جائز ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ ان کے مقام ومرتبہ، ان کی امامت اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی قدر ومنزلت کو نظر انداز کرے۔

تفردات وشذوذ پر تفصیلی کلام کی وجہ:

میں نے اس مسئلے میں اتنا تفصیلی کلام اس لیے کیا؛ تا کہ ان لوگوں کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے، جو اپنی یا عوام کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور غلط طرزِ زندگی پر شاذ اقوال یا ضعیف آراء یا بعض ایسے تفردات کے ذریعہ پیوند لگانے کی کوشش کرتے ہیں، جن میں حضراتِ صحابہؓ سے لے کر بعد کی صدیوں کے تمام جمہور علمائے امت کی مخالفت پائی جاتی ہے۔

چنانچہ میں نے اسی ڈر سے کہ شذوذ اختیار کرنے والے اور دین کے ذریعہ دنیا کی پیوند کاری کرنے والے اس بات سے استدلال نہ کر بیٹھیں کہ: ہمارے علماء کے سارے اقوال کتاب وسنت سے مستنبط ہوتے ہیں جن کا ایک مقام اور اعتبار ہوتا ہے، اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ: یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے؛ لیکن ان حضرات سے کبھی کچھ تفردات اور لغزشیں بھی صادر ہو جاتی ہیں، جن کو تلاش کر کے اپنانا اور اختیار کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، اللہ ہی اپنے فضل سے ہدایت دینے والے ہیں۔

مختلف فیہ مسئلہ میں نکیر:

اسی تفسیر - یا کہہ لیجیے: اسی تخصیص - کی روشنی میں امام سفیان ثوریؒ کے اس قول کی بھی تفسیر کی جائے گی، جس میں انھوں نے فرمایا کہ: جب تم کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھو جو مختلف فیہ ہو اور تمہاری رائے کچھ اور ہو، تو اس کو منع مت کرو۔

یعنی: جب اس مسئلے میں کیا جانے والا اختلاف درست اور معتبر ہو، علماء کے درمیان یہ شعر مشہور ہے:

فليس كلّ خلافٍ جاء معتبراً ❖ إلا خلافٌ له حظٌّ من النظر

''ہر اختلاف معتبر نہیں ہوتا، وہی اختلاف معتبر ہوتا ہے جس کے ساتھ کچھ دلیل بھی ہو''(۱)۔

---

(۱) یہ شعر امام ابوالحسن ابنِ حصار مالکیؒ (متوفی ۶۱۱ھ) کا ہے، ان کا ایک قصیدہ ہے، ☜

☜ جس میں انھوں نے مکی، مدنی اور مختلف فیہ سورتوں کے تذکرے میں بائیس شعر کہے ہیں، یہ اسی کا آخری شعر ہے، مکمل قصیدہ سیوطیؒ کی ''الاتقان'' (۱/ ۴۵) میں موجود ہے۔

باقی جہاں تک تفرد او شاذ اختلاف کی بات ہے تو اس کے کرنے یا کہنے والے کے بارے میں سکوت اختیار کرنا صحیح نہیں، تفردات اور شاذ اقوال کی کچھ مثالیں پیچھے امام ابنِ حزمؒ کے کلام میں گزر چکی ہیں (۱)، اگرچہ انھوں نے وہ مثالیں اختلاف کو رحمت قرار دینے والوں کے رَد میں پیش کی تھیں۔

ضعیف اختلاف اور شاذ قول کو اپنانے والے پر نکیر ضروری ہے:

اس اختلاف اور اختلاف کرنے والے کی غلطی کو بیان کرنا تو اللہ، اس کے رسول اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی میں شامل ہے۔

چنانچہ ابنِ رجب حنبلیؒ اپنی نافع اور مبارک کتاب **"جامع العلوم والحکم"** میں لکھتے ہیں (۲) کہ: اللہ، اُس کے رسولؐ اور اُس کی کتاب کے تئیں خیر خواہی کی ایک قسم -جو علماء کے ساتھ خاص ہے (۳)- یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں گمراہ کن خواہشات وبدعات کی تردید کی جائے اور کتاب وسنت کے ان دلائل کو بیان کیا جائے جو ہر قسم کی

(۱) ادب الاختلاف ص ۱۲۲

(۲) ۱: ۲۲۳ - ۲۲۴ ساتویں حدیث کی تشریح

(۳) اس قید پر غور کیجیے! کتنی اہم قید ہے کہ: ''خیر خواہی کی یہ قسم علماء کے ساتھ خاص ہے''، پس حق اور معروف کو بیان کرنا اور منکر اور گمراہ کن چیزوں سے ڈرانا یہ علماء ہی کا کام اور انہی کی ذمہ داری ہے، دوسروں کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس مقام پر چڑھنے کی کوشش کریں؛ پھر بھی کتنی بڑی تعداد ہے جو اس مقام پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے، اور اپنے آپ کو اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا وصی قرار دیتی ہے!! لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ عام ہے کہ: اسلام کے اندر یہود ونصاریٰ کی طرح مذہب کے ٹھیکیدار نہیں ہوتے، یعنی: دین سے متعلق گفتگو کرنا ہر مسلمان کا حق ہے، بات تو صحیح ہے؛ لیکن غلط جگہ پر پیش کی جارہی ہے۔

خواہشات و بدعات کے خلاف ہیں، اسی طرح علماء کی لغزشوں اوران کے ضعیف اقوال کی بھی تردید کی جائے اوراس کی تردید میں بھی کتاب وسنت کے دلائل پیش کیے جائیں۔

وہ فرماتے ہیں(۱) کہ: نکیر کرنا اسی منکر پر واجب اور ضروری ہے جو متفق علیہ ہو، جہاں تک مختلف فیہ منکر کی بات ہے تو اس میں ہمارے بعض اصحاب کی رائے یہ ہے کہ: اگر کوئی شخص اپنے اجتہاد سے یا کسی مجتہد کی جائز تقلید کی بنا پر اس منکر کو کر رہا ہو تو اس پر نکیر ضروری نہیں؛ البتہ قاضی نے **"الأحكام السلطانية"**(۲) کے اندر ان میں سے ان مسائل کا استثناء کیا ہے، جن میں اختلاف کمزور ہو اور وہ کسی متفق علیہ منکر کا ذریعہ بن رہا ہو، جیسے: ربا اور نکاحِ متعہ، جو زنا کا ذریعہ بنتا ہے، امام احمدؒ سے صراحتاً شطرنج کھیلنے والے پر بھی نکیر منقول ہے؛ لیکن قاضی نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ نکیر اسی شخص کے بارے میں ہے جس نے بغیر اجتہاد اور بغیر کسی مجتہد کی جائز تقلید کے شطرنج کھیلا ہو۔

اس اعتبار سے جس شخص کا بھی اختلاف کسی مسئلہ میں کمزور ہو اور اس کی تردید میں نصوص پائے جاتے ہوں، تو اس کا وہ قول بھی شذوذ اور تفردات میں شمار ہوگا، واللہ اعلم۔

ائمہ کی لغزشوں پر امام شاطبیؒ کا بصیرت افروز کلام:

امام شاطبیؒ نے آٹھویں مسئلہ میں عالم کی لغزش کے اسباب پر گفتگو کی ہے(۳) اور اس میں حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی وہ احادیث ذکر کی ہیں جو پیچھے گزر چکی ہیں اور سلیمان تیمیؒ کا اثر بھی نقل کیا ہے، اس کے بعد ایک فصل قائم کی ہے(۴) جس میں فرماتے ہیں کہ:

عالم کی لغزش پر اعتماد کرنا اور اس کی تقلید میں اس لغزش کو اختیار کرنا کسی صورت بھی جائز

(۱) ۲:۲۵۴

(۲) لابی یعلی الفراء ص ۲۹۷

(۳) الموافقات ۴:۱۶۸

(۴) ۴:۱۷۰-۱۷۳

نہیں؛ کیونکہ اس لغزش کو ہم نے شریعت کے مخالف مان لیا ہے؛ اسی لیے تو اسے لغزش قرار دیا ہے؛ ورنہ اگر وہ قابلِ اعتبار ہوتی تو اسے اس طرح نہ گرایا جاتا، اور نہ اس عالم کی طرف لغزش کی بات منسوب کی جاتی، ہاں؛ مگر یہ مناسب نہیں کہ اس عالم کی طرف کوتاہی کی نسبت کی جائے، یا اس کی وجہ سے اس پر طعن وتشنیع کی جائے یا اس کی تنقیص کی جائے یا اس کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اس اختلاف میں اس کے پیشِ نظر صرف مخالفت مقصود تھی، یہ سب چیزیں اس کے مقام ومرتبہ کے خلاف ہیں۔

آگے لکھتے ہیں: فصل: مسائلِ شرعیہ میں کسی عالم کی لغزش کو اختلاف مان کر اس پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ وہ لغزش حقیقت میں اجتہاد سے صادر نہیں ہوئی اور نہ وہ مسئلہ اجتہادی مسائل میں سے ہے، اگر اس عالم نے اجتہاد کیا بھی ہے تو غلط جگہ پر کیا ہے؛ لہٰذا اس کے قول کی نسبت شریعت کی طرف ایسے ہی ہوگی جیسے غیر مجتہد کے اقوال کی ہوتی ہے، واضح رہے کہ اختلاف میں صرف ان ہی اقوال کو شمار کیا جاتا ہے جو شریعت میں معتبر دلائل سے صادر ہوں، خواہ وہ دلائل قوی ہوں یا ضعیف۔

غیر معتبر اختلاف کو پہچاننے کا ضابطہ:

شاطبی لکھتے ہیں کہ: اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ: کیا غیر مجتہد فقہاء ومفتیان کے لیے اس سلسلے میں -یعنی معتبر اور غیر معتبر اختلاف کو پہچاننے کے سلسلے میں- کوئی ضابطہ ہے، جس پر اعتماد کیا جاسکے؟

تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ: حتمی تو نہیں؛ البتہ ایک تقریبی ضابطہ ہے اور وہ یہ کہ شریعت میں ایسے اقوال تو بہت ہی کم ہیں جنھیں چوک اور لغزش شمار کیا گیا ہے، زیادہ تر ایسا ہوا ہے کہ کسی مجتہد نے کسی قول میں تفرد اختیار کرلیا اور کسی دوسرے مجتہد نے اس کا ساتھ نہیں دیا، الا ماشاء اللہ؛ لہٰذا آپ جب بھی کسی عالم اور مجتہد کو کسی مسئلے میں عام امت سے ہٹ کر کوئی الگ رائے اختیار کرتے ہوئے دیکھیں، تو سمجھ لیں کہ یہ اختلاف غیر معتبر ہے،

ایسے موقع پر تمہارا اعتقاد یہ ہونا چاہیے کہ حق مجتہدین کی سوادِ اعظم کے ساتھ ہے، نہ کہ مقلدین کی سوادِ اعظم کے ساتھ۔

غور کیجیے شاطبی کا یہ کلام، ابنِ قیم کا کلام اور ابنِ رجب کا کلام، یہ سب ایک ہی چراغ سے نکل رہے ہیں اور ایک ہی مضمون کے اِردگرد گھوم رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی خاص رحمتیں نازل فرمائے۔

اب استاذ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے طلبہ کے اندر یہ علمی خصلتیں پیدا کرنے کی کوشش کرے، جو بظاہر تو اپنی ذات میں جزئی اور معمولی ہیں؛ لیکن مستقبل کے تئیں بڑی پُراثر ہیں۔

بڑے القاب سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں:

طالبِ علم کو اس بات سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ اس کے پاس کوئی شیخی بگھارنے والا آکر اپنا علم نہ جھاڑنے لگے اور ان شاذ اقوال کے بارے میں یہ نہ سمجھانے لگے کہ: یہ تو حضرت ابنِ عباسؓ کا قول ہے، جنھیں ''حبر الامۃ'' کہا گیا ہے، یہ ابنِ عمرؓ کا قول ہے، جن کا تمسک بالدین اور سنتوں کا اتباع معروف ومشہور رہے، یہ سعید بن مسیّب کا قول ہے، جو امام التابعین تھے، یہ شریح کا قول ہے، جو اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے قاضی گزرے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اگر کوئی اس طرح کی باتیں کرے تو آپ اس سے سوال کریں کہ: اچھا پھر یہ بتاؤ کہ ان دسیوں صحابہؓ، سیکڑوں تابعینؒ، ہزاروں تبع تابعین اور ان کے بعد آنے والے لاکھوں، کروڑوں علماء کو تم نے کس خانہ میں رکھا ہے، جنھوں نے اس قول پر کوئی توجہ نہیں دی اور اس کو چھوڑ دیا؛ حالانکہ ان کی جلالتِ علمی مجموعی طور پر ان علمی مراتب سے کئی گنا زیادہ ہے، جو تم ان شذوذ کے قائلین کے بارے میں گنوا رہے ہو، سن لو وہ تو اپنے اجتہاد کی وجہ سے اجر وثواب پا گئے اور تم اپنی خواہشاتِ نفسانی اور رخصت پسندی کی وجہ سے گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لاد رہے ہو۔

دسویں مشعل

ہر شہر کے لوگوں کو وہاں کے علم وعمل پر برقرار رکھنا

اساتذہ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: وہ اپنے شاگردوں کے دل ودماغ میں یہ بات بٹھائیں کہ وہ اپنے علاقے والوں کے ساتھ ہمیشہ حکمت کی راہ اپنائیں، خواہ تدریس کی مسند پر بیٹھے ہوں یا وعظ کی مجلسوں میں علمی باتیں بیان کررہے ہوں یا دارالافتاءاور شرعی عدالتوں میں فتوے اور فیصلے صادر کررہے ہوں، شہر والے اگر کسی صحیح اور درست عمل پر ہوں، جو جمہور علمائے اسلام کے یہاں معتبر کسی بھی اسلامی رجحان کے موافق ہو، تو ان سے ہرگز تعرض نہ کریں، انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیں، یہ ہرگز مناسب نہیں کہ شہر والوں کو اُلجھن میں مبتلا کیا جائے اور جس قول اور جس حکم کو وہ اختیار کیے ہوئے ہیں اس سے انھیں ہٹا کر کسی اور قول اور حکم کی طرف لے جایا جائے، اگرچہ آپ اپنے فتاویٰ اور فیصلوں میں انھیں ایسے احکام ہی کی طرف لے جانا چاہ رہے ہوں جو آپ کے نزدیک ان کے اختیار کردہ احکام سے راجح ہوں۔

یہ چیز بہت سے ان طلبہ سے سرزد ہوتی ہے، جو ایسے علاقے میں فقہ سیکھتے ہیں جہاں ہر قسم کے مسلک کی گنجائش ہوتی ہے، یہ طلبہ جب اپنے شہر لوٹ کر آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ان کے شہر والے سب کے سب ایک ہی مسلک پر ہیں اور کسی دوسرے مسلک کو جانتے ہی نہیں، تو وہ بجائے اپنے شہر والوں کے ساتھ سمجھ بوجھ کا راستہ اختیار کرنے کے ان کے درمیان انتشار پیدا کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا یہ علم خود ان کے لیے بھی اور شہر والوں

کے لیے بھی وبالِ جان بن جاتا ہے، وہ شہر والوں کو گمراہ قرار دیتے ہیں اور شہر والے انھیں گمراہ قرار دیتے ہیں۔

اسلاف کا طرزِ عمل:

میں نے جو یہ بات کہی ہے کہ: شہر والے جب تک کسی درست اور صحیح عمل پر ہوں، جو کسی بھی معتبر اسلامی رجحان کے موافق ہو، تو ان سے تعرض نہ کریں، یہ کوئی نئ بدعت میں نے ایجاد نہیں کی اور نہ یہ تصلب فی الدین کے خلاف ہے، یہ تو عین اسلاف کا طریقہ ہے، میں نے اس موضوع پر ''ادب الاختلاف'' میں بھی لکھا ہے[1]، وہیں سے میں کچھ اقتباسات جن میں یہ مضمون کافی وضاحت کے ساتھ ہے، نقل کرتا ہوں۔

میں خاص طور پر دو مجتہد اماموں کا موقف نقل کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے تمام لوگوں کو ایک اجتہاد اور ایک مسلک کا پابند بنانے کی تجویز پر قابلِ رشک موقف اپنایا تھا۔

ایک مسلک کا پابند بنانے کی تجویز اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا موقف:

امام دارمیؒ نے اپنی ''سنن' میں روایت کیا ہے کہ: حمید طویل نے خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ سے عرض کیا کہ: کیا ہی اچھا ہو کہ آپ تمام لوگوں کو کسی ایک مسلک پر مجتمع کر دیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ: مجھے یہ چیز اچھی نہیں لگتی کہ لوگ اختلاف نہ کریں، راوی کہتے ہیں کہ: پھر انھوں نے تمام شہروں میں خطوط ارسال کیے کہ: ہر علاقے کے لوگ اسی کے مطابق فیصلہ کریں جس پر وہاں کے فقہاء مجتمع ہوں (۲)۔

ابوزرعہ دمشقیؒ نے یہ واقعہ قاضی دمشق سلیمان بن حبیب محاربی تابعی سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک مرتبہ ارادہ ہوا کہ عوام اور فوج سب کو

(۱) ص ۳۹ فما بعدہا

(۲) باب اختلاف الفقہاء ۱: ۱۵۱

ایک ہی اجتہاد اور ایک ہی مسلک کا پابند بنادیں؛ لیکن پھر فرمایا کہ: ہر اسلامی شہر اور ہر اسلامی فوج میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہؓ موجود تھے، جن میں کچھ قاضی بھی ہوتے تھے، جو پیش آمدہ مسائل میں فیصلے کرتے تھے، ان فیصلوں کو دوسرے صحابہؓ صحیح قرار دیتے تھے اور راضی رہتے تھے، اور اہلِ شہر بھی باہمی صلح کے طور پر ان فیصلوں پر عمل کرتے تھے، پس یہ لوگ آج انہی فیصلوں پر عمل کررہے ہیں، جو صحابہؓ نے کیے تھے؛ چنانچہ انھوں نے اپنا ارادہ ترک کردیا، دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو اس بات کی حرص رہتی تھی کہ امت کے احوال میں سے کسی بھی ایسی چیز کو جس سے لوگ مانوس ہوچکے ہوں نہ بدلیں، جب تک شریعت میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہو[1]۔ جلد ہی حاشیہ میں ان کا ایک اور واقعہ اسی قسم کا آرہا ہے۔

امام مالکؒ کا موقف:

دوسرا موقف جو بالکل اسی کے ہم مثل ہے امام مالکؒ کا ہے، جس وقت ان کے سامنے تمام لوگوں کو ان کی موطا کا پابند بنانے کی تجویز پیش کی گئی، گرچہ اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ یہ رائے کس نے پیش کی، اور امام مالکؒ نے اس کے جواب میں کیا الفاظ کہے؛ لیکن وہ سب ایک ہی محور کے اِردگرد گھومتی ہیں کہ: انھوں نے لوگوں کو ایک مسلک کا پابند بنانے کی تجویز مسترد کردی تھی، صرف اس لیے؛ تاکہ لوگوں پر وسعت برقرار رہے اور ان کے لیے تنگی نہ پیدا ہو۔

۱- ابن ابی حاتمؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے[1] کہ: ایک مرتبہ مجھ سے ابوجعفر منصور نے کہا کہ: میں نے اس علم کو ایک علم بنانے کا ارادہ کیا ہے اور وہی علم لشکر کے امراء اور قضات کو لکھ کر بھیجوں گا، کہ وہ سب اسی کے مطابق عمل کریں اور جو بھی اس کی مخالفت

(۱) تاریخ ابی زرعہ دمشقی ۱:۲۰۲

(۲) تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۲۹

کرے گا میں اس کی گردن اُڑا دوں گا، میں نے کہا: امیر المومنین! ایسا مت کیجیے، دیکھیے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امت میں تھے، آپ سرایا بھیجتے تھے اور خود بھی نکلتے تھے، آپ کے زمانے میں زیادہ ملک فتح نہیں ہوئے، یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے پردہ فرما گئے، آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، آپ رضی اللہ عنہ کے دَور میں بھی زیادہ ملک فتح نہیں ہوئے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، ان کے ہاتھ پر بہت سے ملک فتح ہوئے، جس کی وجہ سے انھیں ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مختلف علاقوں میں معلّم بنا کر بھیجا، پھر ان معلّمین سے نسل در نسل یہ دین اور علم لیا جاتا رہا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اب اگر آپ لوگوں کو ان کی مانوس چیزوں سے ہٹا کر ایسی چیزوں کی طرف لے جانا چاہیں گے جن سے وہ نا آشنا ہیں تو وہ اس کو کفر سمجھیں گے (۱)، آپ ہر شہر والوں کو اسی علم پر عمل کرنے دیجیے جو وہاں پہلے سے موجود ہے اور اس علم کو اپنے لیے لے لیجیے، یہ سن کر خلیفہ منصور نے کہا: آپ نے کس قدر دُور اندیشی کی بات کہی ہے، اس علم کو محمد کے لیے لکھ دیجیے۔ یعنی ان کے بیٹے مہدی کے لیے جو بعد میں چل کر خلیفہ بنا۔

---

(۱) یہ بات تابعین اور تبع تابعین کے دور میں کہی جا رہی ہے، اب اگر ان حضرات کے بعد مسلمان کسی ایک مسلک کو لازم پکڑ لیتے ہیں اور اس کے مطابق وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی پر جمے رہتے ہیں، جس میں نہ کوئی جھگڑا ہوتا ہے نہ کوئی فتنہ کھڑا ہوتا ہے، تو کیا یہ تابعین کے دَور کی اس صورتِ حال سے کچھ الگ ہے؟!، اسی مضمون کی طرف امام مالک رحمہ اللہ یہاں اشارہ فرما رہے ہیں اور اگلے واقعہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ بھی اسی چیز سے بچ رہے ہیں کہ لوگوں کو ان کی مانوس چیزوں سے نہ ہٹایا جائے جب تک کہ وہ شریعت اور دلائل کے ساتھ ہوں۔

چنانچہ لیث بن سعد رحمہ اللہ اپنے مشہور خط کے اندر امام مالک رحمہ اللہ کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ان ہی مسائل میں سے ایک مسئلہ **"قضاء بشاهد ويمين"** والا ہے، آپ جانتے ہیں کہ مدینہ میں تو اسی کے مطابق فیصلہ ہوتا رہا؛ لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نہ شام میں اس پر فیصلہ کیا، نہ حمص میں، نہ مصر میں اور نہ عراق میں اور نہ ہی خلفائے راشدین: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کبھی اس کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے کوئی خط لکھا۔ ☜

۲- ''القسم المتمم'' میں ابنِ سعد نے اپنے شیخ واقدی سے روایت کیا ہے[1] -واقدی کے بارے میں ذہبیؒ نے لکھا ہے[2] کہ: اگر چہ ان کے ضعف میں کسی کا اختلاف نہیں؛ لیکن پھر بھی وہ زبان کے سچے اور بڑے مرتبہ والے تھے- واقدیؒ کہتے ہیں کہ: میں نے امام مالکؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جب ابو جعفر منصور حج پر آئے تو انھوں نے مجھے بلایا، میں ان کے پاس گیا، تو انھوں نے مجھ سے کچھ گفتگو کی، کچھ چیزیں انھوں نے مجھ سے پوچھیں، جن کا میں نے جواب دیا، اس کے بعد انھوں نے کہا کہ: میں نے عزم کرلیا ہے کہ میں آپ کی ان کتابوں کو جنھیں آپ نے لکھا ہے-یعنی موطا کو[3]- لے کر ان کی مختلف نقلیں تیار کرواؤں گا اور ہر علاقے میں ان کا ایک ایک نسخہ بھیجوں گا کہ سب لوگ ان ہی کے مطابق عمل کریں اور ان سے سرِ موانحراف نہ کریں اور ان کے علاوہ جو بھی نیا علم ان کے پاس ہے اسے چھوڑ دیں؛ کیونکہ میں مدینے کی روایات اور اہلِ مدینہ کے علم کو ہی اصل علم سمجھتا ہوں۔

☜ پھر جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے، جن کی احیائے سنت کی فکر، اقامتِ دین کی سعی، اصابتِ رائے اور لوگوں کے گزشتہ احوال سے واقفیت آپ بخوبی جانتے ہیں، انھیں رزیق بن حکیم نے خط لکھا کہ: آپ مدینہ میں تو ایک گواہ اور مدعی کی قسم پر فیصلہ کر دیا کرتے تھے؟ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ: ہم مدینہ میں یقیناً اس پر فیصلہ کرتے تھے؛ لیکن ہم نے اہلِ شام کا عمل کچھ اور دیکھا؛ اس لیے ہم یہاں دو عادل مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں پر ہی فیصلہ کریں گے۔

''تمہید'' (۱/۱۰) کے اندر ابنِ عبدالبرؒ کا کلام بھی دیکھیے کہ انھوں نے یحییٰ بن لیثی کی روایت کو ہی تشریح کے لیے کیوں اختیار کیا، آگے ص: ۳۷۲ پر بھی اس کا اقتباس آ رہا ہے۔

(۱) طبقات ابن سعد ص ۴۴۰، الانتقاء ص ۸۰

(۲) سیر اعلام النبلاء ۷: ۱۴۲

(۳) یہ غور کرلیا جائے کہ یہ تشریحی کلمات کس کا ہے؛ کیونکہ ابو جعفر منصور کی وفات ''ترتیب المدارک'' (۲۱۶/۱) کے مطابق ''موطا'' کی تکمیل سے پہلے ہی ہوگئی تھی، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ: ان کی مراد ''موطا'' کے وہ ابواب ہیں جنھیں امام مالکؒ لکھ کر فارغ ہو چکے تھے، تو یہ تشریح ٹھیک ہے اور یہ عبارت سے واضح بھی ہے، الانتقاء کا حاشیہ دیکھیے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے کہا: امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں؛ کیونکہ لوگوں تک مختلف اقوال پہنچ چکے ہیں، انھوں نے مختلف احادیث سن رکھی ہیں اور مختلف روایات نقل کی ہیں اور جس قوم کے پاس جو بھی مسائل پہنچے، خواہ وہ مختلف فیہ مسائل ہوں یا غیر مختلف فیہ، انھوں نے ان مسائل کو لے کر ان پر عمل کیا اور ان کو اپنا مسلک بنایا، اب انھیں ایسی چیزوں سے ہٹانا جن کا وہ اعتقاد رکھے ہوئے ہیں ان کے لیے سخت ثابت ہوگا، لوگوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیجیے اور ہر شہر کے اندر لوگ جس علم کو اپنائے ہوئے ہیں انھیں اسی پر رہنے دیجیے۔

منصور نے کہا کہ: بخدا! اگر آپ ہاں کہہ دیتے تو میں یہ کام کر گزرتا۔

۳- زبیر بن بکار کی روایت میں ہے[1] کہ: امام مالکؒ نے ابوجعفر سے کہا کہ: ہر شہر والوں کے دلوں میں اب وہ چیزیں راسخ ہو چکی ہیں، جن کو وہ دین سمجھتے ہیں اور جن پر وہ عمل کرتے ہیں اور ایسی چیزوں سے عوام کو ہٹانا دشوار ہوتا ہے۔ یہاں امام کوثریؒ کا حاشیہ بھی ضرور دیکھیے۔

۴- "ترتیب المدارک" میں ہے[2] کہ: خلیفہ مہدی نے امام مالکؒ سے کہا کہ: ابوعبداللہ! کوئی ایسی کتاب لکھ دیجیے جس پر میں پوری امت کو آمادہ کروں، تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ: جہاں تک اس علاقے یعنی مغرب کی بات ہے، تو یہاں آپ کو اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور رہی بات شام کی تو وہاں امام اوزاعیؒ موجود ہیں اور عراق والے تو عراق والے ہیں، یعنی مغرب کے اندر تو امام مالکؒ کے شاگرد پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں؛ اس لیے فرمایا کہ: آپ کو یہاں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہی اور رہی بات شام کی تو وہاں ایک مجتہد اور صحیح امام موجود ہیں، جن سے مزاحمت کرنا یا ان کی طبیعت کو مکدر کرنا ہرگز مناسب نہیں؛ بلکہ وہاں کے لوگوں کو ان ہی کے مسلک پر برقرار رکھنا چاہیے۔

---

(۱) ابن عبدالبر نے "الانتقاء" ص ۸۱ میں اس کو نقل کیا ہے

(۲) ۱:۲۱۸، و مثله في السير ۸:۷۸

۵-''حلیہ'' کی روایت میں (۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ: مجھ سے رشید نے تین چیزوں کے سلسلے میں مشورہ کیا اور پھر امام مالکؒ نے ان تین چیزوں کی تفصیل بیان کی، جن میں ایک چیز یہ تھی کہ رشید یہ چاہتے تھے کہ وہ موطا کو کعبہ پر لٹکادیں اور تمام لوگوں کو اس پر عمل کا پابند بنادیں، جس پر امام مالکؒ نے ان سے فرمایا کہ: صحابۂ کرامؓ نے متعدد فروعی مسائل میں باہم اختلاف کیا تھا اور وہ حضرات دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلے اور ہر صحابی اپنے اعتبار سے صواب پر تھا (۲)۔

۶-خطیب کی ''الرواة عن مالك'' میں ہے کہ: رشید نے کہا کہ: ابوعبداللہ! ہم یہ کتابیں لکھیں گے اور انھیں مختلف اسلامی ممالک میں بھیجیں گے؛ تاکہ پوری امت کو ان پر عمل کا پابند بنائیں!، امام مالکؒ نے فرمایا کہ: امیر المومنین! علماء کا اختلاف اس امت پر اللہ کی طرف سے رحمت ہے، جس کے نزدیک جو بات صحت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے وہ اسی کو اپناتا ہے، ہر ایک ہدایت پر ہے اور ہر ایک کا مقصد اللہ ہی ہے (۳)۔

۷-''حلیہ'' میں ہے (۴) کہ: خلیفہ مامون نے امام مالکؒ سے کہا کہ: آیئے، میں نے عزم کیا ہے کہ تمام لوگوں کو موطا پر عمل کا پابند بنادوں، جس طرح حضرت عثمانؓ نے تمام

(۱)۶:۳۲۲

(۲) سیوطیؒ کی ''جزیل المواہب'' میں **''وكلٌّ عند نفسه مصيب''** کے بجائے **''وكلٌّ مصيب''** کا لفظ ہے کہ ہر صحابی صواب پر تھا، ذہبیؒ ''سیر'' (۹۸/۸) میں لکھتے ہیں کہ: اس کی سند حسن ہے؛ لیکن شاید راوی سے وہم ہوگیا ہے کہ اس نے ہارون کہہ دیا، راقم کہتا ہے کہ: شاید صحیح یہاں پر مہدی ہے؛ کیونکہ اسی طرح کا قصہ ''ترتیب المدارک'' (۲۵۰/۱) میں مہدی کے بارے میں ہے؛ لیکن ابنِ تیمیہ نے اس قصہ کو دوجگہ ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ رشید ہی لکھا ہے۔ دیکھیے: مجموع الفتاویٰ: ۷۹/۳۰ اور الفتاویٰ الکبریٰ: ۱۸/۵۔

(۳) **كشف الخفاء للعجلوني** ۱:۶۵ (۱۵۳)

(۴)۶:۳۳۱

لوگوں کو ایک قرآن کا پابند بنایا تھا، امام مالکؒ نے فرمایا کہ: امیر المؤمنین! آپ ایسا نہیں کر سکتے؛ کیونکہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابۂ کرام مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیلے اور وہاں انھوں نے حدیثیں بیان کیں؛ لہٰذا ہر شہر والے کسی علم کی روشنی میں ہی عمل کر رہے ہیں۔

اس روایت میں مامون کا ذکر ہے؛ لیکن قاضی عیاضؒ نے لکھا ہے کہ: امام مالکؒ نے مامون کا زمانہ نہیں پایا، اس سے پہلے ہی ان کی وفات ہوگئی تھی، مامون کا یہاں تذکرہ وہم ہے(۱)۔ یہ بات انھوں نے ایک دوسری روایت پر نقد کرتے ہوئے کہی ہے اور وہاں انھوں نے مامون کے بجائے رشید کو صحیح قرار دیا ہے، وہی بات یہاں اس روایت میں بھی کہی جاسکتی ہے، یہاں جو روایات میں ناموں کا اختلاف ہے تو ہوسکتا ہے کہ امام مالکؒ سے یہ درخواست متعدد بار کی گئی ہو، ایک بار ابو جعفر کی طرف سے، دوسری بار ان کے لڑکے مہدی کی طرف سے اور تیسری بار رشید کی طرف سے۔

سب کو ایک مسلک کا پابند بنانے سے انکار:

ان تمام روایتوں میں یہ بات قدرِ مشترک ہے کہ امام مالکؒ نے صحابہؓ اور امت کے اختلاف کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا اور سب کو ایک مسلک کا پابند بنانے کی تجویز مسترد کردی، خطیب کی روایت کے ان الفاظ پر غور کیجیے کہ: علماء کا اختلاف اللہ کی طرف سے اس امت کے لیے ایک رحمت ہے، اسی طرح ''حلیہ'' کی روایت کا یہ جملہ بھی دیکھیے کہ: ہر ایک اپنے نزدیک صواب پر ہے۔

دیگر ائمہ کی آراء کا احترام:

اس واقعہ میں امام مالکؒ کی طرف سے دوسرے ائمہ کی رائے کا احترام بھی دیکھنے کے

(۱) ترتیب المدارک ۱: ۲۴۳

قابل ہے؛ وہ خود ایک امامِ مجتہد ہیں، وہ جو رائے بھی اختیار کرتے ہیں پوری محنت اور کوشش صَرف کرنے کے بعد اور اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد ہی اختیار کرتے ہیں کہ یہی قول درست ہے اور دوسرے تمام اقوال غلط ہیں؛ اس کے باوجود انھوں نے دوسری آراء اختیار کرنے والوں اور ان کی اتباع کرنے والوں کو ان کے حال پر باقی رکھا اور خلیفہ کی اس پیشکش پر راضی نہیں ہوئے کہ سب کو ان ہی کی رائے اور ان ہی کے مسلک کا پابند بنایا جائے۔

لوگوں کو ان کے حال پر برقرار رکھنا:

اس واقعہ کے اندر علماء کے ایک اہم ادب پر بھی تنبیہ ملتی ہے، وہ یہ کہ: لوگ جب تک کسی درست اور شرعی نقطۂ نظر پر ہوں انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، انھیں اُلجھن میں مبتلا نہ کیا جائے، ابنِ ابی حاتم کی روایت کے ان الفاظ پر غور کیجیے کہ: اگر آپ لوگوں کو ان کی مانوس چیزوں سے ہٹا کر نامانوس چیزوں کی طرف لے جانا چاہیں گے تو وہ اس کو کفر سمجھیں گے!! حالانکہ خلیفہ منصور انھیں جن نامانوس چیزوں کی طرف لے جانا چاہ رہے تھے وہ چیزیں خود امام مالکؒ کی ہی روایت کردہ اور تدوین کردہ تھیں، بالفاظِ دیگر وہ ایسی چیزوں کی طرف لے جانا چاہ رہے تھے جو امام مالکؒ کی نگاہ میں سب سے زیادہ راجح اور درست تھیں!۔

غور کیجیے! عوام کی اس شدت پسندی نے امام مالکؒ کو پریشان نہیں کیا اور نہ امام مالکؒ نے اسے گمراہی سمجھا اور نہ یہ سوچا کہ اب ان لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہیے اور اس فکر کو چھوڑنے پر انھیں مجبور کرنا چاہیے؛ بلکہ انھوں نے اس کو ''تعصب''، ''اندھی تقلید'' اور ان جیسے بُرے القاب سے بھی نہیں نوازا، جن القاب کو آج لوگ اپنی گفتگو اور تحریروں میں بار بار دہراتے ہیں، جنھیں سن سن کر ہمارے کان پک چکے ہیں!!(۱)۔

(۱) تعصب کے معنی اور اس کے حکم کی تحقیق کی لیے ''اثر الحدیث الشریف'' کا حاشیہ ص ۱۱۳- ۱۱۴ ضرور دیکھیے۔

امام مالکؒ کے متبعین کا حال:

امام مالکؒ کا یہی ادب کہ لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے جب تک وہ کسی درست قول پر ہوں، ان کے مسلک کے مخلص ائمہ کو وراثت میں ملا، مجھے اس تعلق سے جو روایات ملی ہیں اُن میں ایک روایت ''**الاستذکار**'' کے اندر ابنِ عبدالبرؒ کی ہے(۱)، وہ فرماتے ہیں کہ: میرے شیخ ابوعمر احمد بن عبداللہ -روایت میں اسی طرح ہے، جبکہ صحیح عبدالمالک ہے- بن ہاشم کہتے تھے کہ: ابوابراہیم اسحاق بن ابراہیمؒ، ''موطا'' میں مذکور ابنِ عمرؓ والی روایت کے مطابق رفع یدین کیا کرتے تھے، وہ بڑے پایہ کے امام تھے، میں نے ان سے افضل، افقہ اور صحیح علم کا حامل کسی کو نہیں پایا، اس پر میں نے -مراد ابنِ عبدالبر ہیں- اپنے شیخ ابوعمر سے کہا کہ: پھر آپ بھی رفع یدین کیوں نہیں کرتے؟ ہم آپ کی اقتدا کریں گے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ: میں ابن القاسم کی روایت کی مخالفت نہیں کرنا چاہتا؛ کیونکہ ہمارے یہاں مالکیہ کی جماعت اسی روایت پر عمل کرتی ہے اور مباح چیزوں میں جماعت کی مخالفت کرنا ائمہ کی شان نہیں ہے۔

ابنِ عبدالبرؒ نے تمہید میں (۲) ایک جگہ لکھا ہے کہ: میں نے موطا کی روایت میں یحییٰ بن یحییٰ کی روایت پر اعتماد اس لیے کیا، کہ ان کا ہمارے شہر والوں کے یہاں ثقافت، دین، علم، فضل اور فہم کے اعتبار سے بڑا مقام ہے اور لوگ اپنے شیوخ اور علماء سے وراثت کے طور پر انہی کی روایت کو زیادہ استعمال کرتے ہیں، اور ہر قوم کے لیے یہی مناسب ہے کہ جو خیر بھی ان کے اسلاف کے پاس پہلے پہنچ گیا اس میں ان کی اتباع کی جائے اور انہی کے نہج پر چلا جائے، اگر چہ دوسری چیزیں بھی مباح اور مرغوب فیہ ہوں۔

(۱) ۴:۱۵۲

(۲) ۱:۱۰

تالیفِ قلوب کے لیے مختلف فیہ مستحبات کو چھوڑنا:

امام ابنِ تیمیہؒ نے ہمارے موضوع سے قریب ایک موضوع پر جو نسبتہً عام ہے گفتگو کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا ہے کہ: آدمی کو چاہیے کہ وہ تالیفِ قلوب کے لیے ان مستحبات (آمین بالجہر اور جہر بالبسملہ وغیرہ) کو چھوڑ دے؛ کیونکہ دین کے اندر تالیفِ قلوب کی مصلحت اس طرح کے افعال کی انجام دہی سے بڑھ کر ہے[1]۔ قریب ہی ان کا پورا کلام آرہا ہے۔

آپ ایک طرف اس مبارک اور پُرسکون صورتِ حال پر غور کیجیے اور دوسری طرف آج کی صورتِ حال پر ایک نظر ڈالیے، جہاں الم انگیز لاقانونیت کا دَور دَورہ ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کا وہ سیاہ عمل بھی یاد کیجیے جو اپنے آپ کو اس امام برحق (ابنِ تیمیہؒ) کی طرف منسوب کرتے ہیں، کس طرح انھوں نے خطیب بغدادی کی ''تاریخِ بغداد'' میں سے امام ابوحنیفہؒ کا ظالمانہ اور سیہ ترین ترجمہ اخذ کر کے اسے شائع کروایا اور ساتھ ہی اسلاف کے فقہ کی عظیم الشان دیوان ''مصنّف ابنِ ابی شیبہ'' سے وہ فصل بھی لے کر شائع کی جس کے اندر ابنِ ابی شیبہؒ نے ''**كتاب الرد على أبي حنيفة**'' کے عنوان سے ۱۲۵ ایسے مسائل ذکر کر رکھے ہیں جن میں ان کی رائے اور اجتہاد کے مطابق امام صاحبؒ نے حدیث کی مخالفت کی تھی[2]۔

ان لوگوں نے اس ترجمہ اور اس فصل کو شائع کیا اور پورے ہندوستان کے طول وعرض میں بلا قیمت تقسیم کروایا، وہ بھی ایسے وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین صرف امام ابوحنیفہؒ کے مسلک سے آشنا تھی!!۔

---

(۱) مجموع الفتاوی ۲۲:۴۰۶-۴۰۷

(۲) وہ مقدمہ ضرور پڑھیے جو میں نے اپنی تحقیق سے شائع شدہ مصنف ابن ابی شیبہ کی بیسوین جلد پر لکھا ہے۔

مخالف اجتہاد کو برقرار رکھنے کے تعلق سے اسلاف کا طرزِ عمل:

میں دوبارہ اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں، بلاشبہ ائمہ کرام کا دوسرے مجتہدین کے مخالف اجتہادات کو برقرار رکھنا، جیسا کہ ہم نے ابھی امام مالکؒ کے یہاں دیکھا، ان حضرات کی ایک عام اور مشہور بات تھی، میں آپ کے سامنے ایک اور مجتہد امام کا قول پیش کرتا ہوں، جس سے اس مضمون کی مزید تائید ہوتی ہے۔

"آداب الفقیہ والمتفقہ"(۱) میں امام سفیان ثوریؒ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: جب تم کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھو جو مختلف فیہ ہو، اوتمہاری رائے کچھ اور ہو، توتم اس کو منع مت کرو۔

امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ: امام احمدؒ سے کسی نے مغرب سے پہلے دو رکعتیں پڑھنے کے بارے میں پوچھا، تو انھوں نے فرمایا کہ: میں نہیں پڑھتا ہوں، اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس میں حرج بھی نہیں، امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ: میں نے کچھ وقت پہلے انھیں اس عمل کی تصویب کرتے اور اس کو مستحسن قرار دیتے ہوئے سنا تھا(۱)۔

اسی کے قریب ایک اور مجتہد امام: امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے، جسے خطیب نے نقل کیا ہے، امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ہمارا یہ قول ایک رائے ہے اور یہ سب سے بہتر چیز تھی جو ہم لا سکتے تھے، اگر کوئی اس سے بہتر چیز ہمارے پاس لے آئے تو وہ صواب کا ہم سے زیادہ حقدار ہوگا(۳)؛ بلکہ ''الانتقاء'' میں(۴) امام صاحبؒ کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے

---

(۱)(۷۶۰-۷۶۱)

(۲)**"مسائل الامام احمد" الفقهيه لابي داود** ص ۷۲

(۳) تاریخ بغداد ۱۳: ۳۵۲

(۴) ص ۱۴۰

کہ: ہم نے جو یہ قول اختیار کیا، یہ ایک رائے ہے، ہم کسی کو اس پر مجبور نہیں کرتے اور نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ: چار و نا چار اس کو ماننا ضروری ہے، جس کسی کے پاس اس سے بہتر کوئی رائے ہو وہ لے آئے۔

اسی کے مثل ایک اور مجتہد امام: امام احمدؒ کا قول ہے، جو "**سیر أعلام النبلاء**" میں مذکور ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: پُل پار کر کے خراسان آنے والوں میں اسحاق جیسا کوئی نہیں گزرا، اگر چہ وہ بعض مسائل میں ہماری مخالفت کرتے تھے؛ لیکن یہ ہوتا رہا ہے، لوگ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے آئے ہیں (۱)۔

عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ جملہ بھی کس قدر عظیم ہے، وہ بھی ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ: بسا اوقات میں کوئی حدیث سنتا ہوں تو اس کو لکھ لیتا ہوں؛ حالانکہ نہ اس پر عمل کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اور نہ اس کو بیان کرنے کا، صرف اس نیت سے لکھ لیتا ہوں کہ اگر میرے اصحاب میں سے کوئی اس پر عمل کرے تو میں کہہ سکوں کہ: انھوں نے حدیث پر عمل کیا ہے (۲)۔ ابنِ مبارکؒ کے اس جملے سے جہاں ایک طرف مضمون بالا کی تائید ہوتی ہے، وہیں دوسری طرف اپنے اصحاب کے تئیں بے مثال شرافتِ نفسی اور وسعتِ قلبی کا ایک عظیم نمونہ سامنے آتا ہے، رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

ابنِ عبد البرؒ کی "تمہید" میں ہے (۳) کہ: امام اوزاعیؒ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا جو وضو کرنے کے بعد اپنی بیوی کا بوسہ لے کہ: اگر وہ میرے پاس پوچھنے کے لیے آئے تو میں اسے وضو کا حکم دوں گا؛ اور اگر وہ وضو نہ کرے تو میں اسے بُرا بھلا بھی نہیں کہوں گا! امام اوزاعیؒ بھی ائمہ مجتہدین میں سے ہیں۔

---

(۱) ۱۱: ۳۷۱ ترجمۃ الامام اسحاق بن راہُویہ

(۲) **الکفایۃ للخطیب** ص ۴۰۲

(۳) ۲۱: ۱۷۲ اسی کے مثل "الاستذکار" ۱: ۳۲۳ میں ہے، اور ڈاکٹر قلعجی کے نسخے میں ۳: ۵۰ پر ہے۔

"تمہید" میں(۱) اثرم سے یہ بھی منقول ہے کہ: میں نے ابوعبداللہ یعنی امام احمد بن حنبلؒ کوتاویل کرنے والے شخص کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر اس کی تاویل کی حدیث میں گنجائش نکلتی ہو۔

ان حضرات کے متبعین بھی اسی راستے پر چلے، جن کے احوال کی تفصیل کافی طویل ہے اور میں سمجھتا ہوں اب اس تفصیل کی ضرورت بھی نہیں رہی۔

ہم بحیثیت آپ ﷺ کی بات سمجھنے کے حنفی، شافعی ہیں:

اس کے بعد میں ایک اہم چیز کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ: طالبِ علم؛ بلکہ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی نماز، اپنی زکوٰۃ اور اپنے روزوں کے اندر؛ بلکہ ساری ہی عبادات اور سارے ہی معاملات اور اپنے ہر تصرف کے اندر جب بھی کوئی عمل کرنا چاہیں، تو اس میں اللہ اور اُس کی شریعت کے حقوق جاننے کی کوشش کریں اور ہر عمل کو علم کے ساتھ شریعت کی روشنی میں ہی انجام دیں؛ چنانچہ جب کسی کو یہ بتایا جائے کہ: مثلاً نماز کے فلاں مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کی یہ رائے ہے اور وہ شخص نماز پڑھتے وقت امام صاحبؒ کے اس قول پر عمل کرے، تو اس وقت ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ اس نے اس حکم کو اس طرح اس لیے ادا کیا ہے کہ امام صاحبؒ کی فہم کے مطابق یہ حکم اسی طرح ادا کیا جاتا ہے، باقی جہاں تک قلبی احساسات کی بات ہے تو ضروری ہے کہ وہ قلبی طور پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جُڑا رہے، اس کے دل کے اندر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور اسوے کی اقتداء، آپؐ کے اوامر کا اتباع اور آپؐ کی نواہی سے اجتناب کا جذبہ ہی پیشِ نظر ہو۔

دراصل مسلمانوں کی اکثریت چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے

(۱) ۱۱:۱۳۹

استیعاب سے عاجز اور اس کو سمجھنے سے قاصر تھی اور خود سے پوری شریعت کو جان اور سمجھ کر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا؛ اس لیے اس وقت مسلمانوں نے -بغیر کسی سابقہ منصوبے کے- چار مسالک کی اتباع پر اتفاق کر لیا اور علماء اپنے اپنے مسلک کی تنقیح وتدوین میں لگ گئے اور ان ہی کے مطابق لوگوں کو فتوے دینے لگے، اسی وقت سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کی اصطلاح چل پڑی، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ: مسلمان اپنے مقتدیٰ اور پیشوا کے اعتبار سے محمدی ہی ہیں؛ البتہ اپنے مقتدیٰ کی منشا کو جاننے اور سمجھنے کے اعتبار سے حنفی اور شافعی ہیں۔

گیارہویں مشعل

ثابت احادیث اور احکام کا قصد کرنا

استاذ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے، جو ان کی ذات سے بھی متعلق ہے اور ان کے شاگردوں سے بھی؛ بلکہ یہ ہر عالم اور ہر طالبِ علم کی ذمہ داری ہے کہ: وہ ایسی احادیث اور احکام کی طلب میں رہیں جو قوی الثبوت ہوں اور کمزور مضامین اور ناپسندیدہ غرائبات سے خالی ہوں اور اگر کبھی غیر صحیح اشیاء کو لینا پڑے تو علم، عقل اور حکمت کے ساتھ لیں، بلاشبہ بعض ضعیف احادیث ایسی ہوتی ہیں جو اپنی مذکورہ سند سے تو ضعیف ہوتی ہیں، جن کی طرف آپ مثلاً "**رواه الدارقطني**" وغیرہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں؛ لیکن وہ قرآنِ کریم اور دوسری احادیث سے شواہد ملنے کی وجہ سے قوی ہوجاتی ہیں، اس طرح کی احادیث اگر موقف سے مناسبت رکھتی ہوں تو انھیں ذکر کیا جاسکتا ہے۔

طالبِ علم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کتاب اللہ کی تفسیر کے اندر قوی اقوال اور احکامِ شرعیہ فقہیہ وغیر فقہیہ کے اندر معتمد احکام کے ہی درپے رہے، یہ عالم کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ایسی چیز کا مصدر ومنبع بنے جسے اللہ کے دین میں اُوپرا اور ناپسندیدہ سمجھا جائے۔

یہ چیز علومِ شرعیہ کی تعلیم کے اندر مشارکت کا طریقہ اپنانے سے حاصل ہوتی ہے؛ چنانچہ اُصولِ حدیث اور اُصولِ فقہ دونوں کو پڑھنے سے طالبِ علم کے علمی آفاق بلند اور وسیع ہوتے ہیں، معلومات منقح ہوتی ہیں، حدیثوں کے اندر صحت پیدا ہوتی ہے اور اس کے افکار وخیالات روشن ہوتے ہیں؛ کیونکہ ان دونوں علوم کے اندر اسے منقولات ومعقولات کے لیے ایک میزان مل جاتی ہے۔

غیر ثابت احادیث بیان کرنے کے نقصانات:

دیکھنے میں آتا ہے کہ وعدہ، وعید اور ترغیب وترہیب سے متعلق بہت سی احادیث، جن پر واعظین اپنے عمومی اور خصوصی مجلسوں میں اعتماد کرتے ہیں، ان سے یا کسی اور سے ان احادیث کے بارے میں پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ وہ انتہائی ضعیف یا موضوع احادیث ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان احادیث کو سننے والا پہلے تو ایمانی جذبہ سے سرشار ہوتا ہے، پھر جب یہ حقیقی اور کڑوا نتیجہ اس کے علم میں آتا ہے، تو وہ پریشان ہوجاتا ہے، اس کے ایمانی جذبات سرد پڑجاتے ہیں اور وہ اس واعظ پر اعتماد کھوبیٹھتا ہے اور کبھی دوسرے واعظین کی مجلسوں میں بھی اس کے ساتھ یہی معاملہ پیش آتا ہے، جس سے اس کے ایمانی جذبات پھر کبھی حرکت میں نہیں آتے، اگرچہ وہ صحیح احادیث ہی کیوں نہ سن لے۔

غیر ثابت احادیث سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں کمی:

اس نتیجہ کی خطرناکی اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ان احادیث کا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی خصائص، معجزات، فضائل اور نبوت کے دلائل سے ہو، جب سامع کو ان حدیثوں کے ضعف کا پتہ چلتا ہے تو اس کے اندر وہ شوق ومحبت اور وہ عظمت واحترام بھی کمزور پڑجاتا ہے جو ان حدیثوں کو سن کر پیدا ہوا تھا، یہ انتہائی خطرناک چیز ہے، جس سے عالم کو بچنے کی ضرورت ہے؛ نیز سامع کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے قلب اور ایمان کی نگرانی کرتا رہے، وہ یہ سمجھے کہ اگر فلاں نے اس موقف میں غلط رُخ اختیار کیا ہے اور اس طرح کی منکر اور ضعیف وساقط احادیث ذکر کی ہیں، تو اس کے اس غلط رویے کا سلسلہ کسی دوسرے کی ذات تک نہیں پہنچ سکتا؛ بلکہ یہ جائز ہی نہیں ہے کہ یہ سلسلہ ان غلط رُخ اختیار کرنے والوں کے حدود سے تجاوز کرے، بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ سلم کا مقام ومرتبہ محفوظ اور محترم ہے۔

بارہویں مشعل

مصادرِ اصلیہ سے نقول کی مراجعت کا عادی بنانا

استاذ کی علمی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: وہ طلبہ کے اندر بتدریج ایک اور علمی صفت پیدا کرنے کی کوشش کریں، جس کا ہونا ان کے لیے ازحد ضروری ہے، وہ ہے نقول کی اصل مصادر سے مراجعت کی عادت؛ استاذ جب بھی کسی طالبِ علم کو کوئی بحث لکھنے یا کسی جزء پر تحقیقی کام کرنے کا مکلّف بنائیں، تو انھیں چاہیے کہ وہ تمام نقول کی اصل مصادر سے تخریج بھی اس کے لیے لازم کردیں۔

(اس سلسلے میں کل تین مراحل ہیں:)

پہلا مرحلہ: حوالوں کی صحت کا اطمینان اور وثوق:

میں اس صفت کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں: مثال کے طور پر میں نے ''میزان الاعتدال'' میں کسی کی توثیق یا تضعیف کے سلسلے میں کوئی قول دیکھا، تو اب میرے لیے ضروری ہے کہ میں اصل مصادر کی طرف رجوع کروں، مثلاً میں نے دیکھا کہ: حافظ ذہبی نے یحییٰ بن معینؒ، امام احمدؒ، ابوحاتمؒ اور ابوزرعہ رازیؒ وغیرہ سے اس راوی کی توثیق نقل کی ہے، تو مجھے چاہیے کہ میں ان اقوال کے لیے ان حضرات کی اصل کتابوں کی طرف رجوع کروں، جہاں تک میرے لیے ممکن ہو، یہ نہ ہو کہ میں صرف ''میزان الاعتدال'' کی جلد، صفحہ اور ترجمہ نمبر کا حوالہ دینے پر اکتفا کرلوں، اور یہ سمجھ بیٹھوں کہ مثالی تحقیق یہی ہوتی ہے، جو میں نے کرڈالی، نہیں؛ بلکہ مجھے متاخرین کی ان کتابوں کو علم کے ایسے خزانے فرض کرنا

چاہیے جو اصل مصادر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، یہی اصل مصادر نہیں ہیں، جیسا کہ آج کل بہت سے طلبہ سمجھتے ہیں۔

میں آج کل کے کمپیوٹر کے ایپس اور پروگراموں کو بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ صرف اصل مصادر کی رہنمائی کے لیے ہیں، ان پر اعتماد کر کے علمی نتائج کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

دوسری مثال: ایک دوسری مثال لے لیجیے: مثلاً امام ابن حجر ہیتمیؒ نے امام نوویؒ سے کوئی فقہی حکم نقل کیا، پھر میں نے ''مجموع'' میں مراجعت کی تو مجھے وہ حکم مل گیا؛ لیکن میں نے دیکھا کہ انھوں نے اسے عمرانی کی ''البیان'' سے نقل کیا ہے، تو اب میرے لیے یہ مناسب نہیں کہ میں ''مجموع'' کی مراجعت پر اکتفا کرلوں؛ بلکہ مجھے ''البیان'' کی طرف رجوع کرنا چاہیے، پھر جب میں نے ''البیان'' کی طرف رجوع کیا، تو دیکھا کہ انھوں نے مزنی کی ''المختصر'' سے اسے نقل کر رکھا ہے، تو اب مجھے مزنی کی ''المختصر'' اُٹھانی چاہیے، اسی طرح رجوع کرتے رہنا چاہیے، تا آنکہ میں پہلے مصدر تک پہنچ جاؤں۔

دوسرے مسلک کی تحقیق اسی مسلک کی کتابوں سے:

ایک اور چیز جس کی طرف ہر باحث کو توجہ دلانا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ: جہاں کہیں بھی آپ کسی عالم کو کسی دوسرے مسلک کی کوئی بات نقل کرتے ہوئے دیکھیں تو اس سلسلے میں پورا وثوق حاصل کرنے کی کوشش کریں، مثلاً اگر کہیں ابوبکر جصاص رازی حنفیؒ اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں کسی دوسرے مسلک کا کوئی حکم نقل کریں، تو اس وقت اس مسلک کی اصل کتاب سے رجوع کر کے اس نقل کی صحت کا اطمینان حاصل کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح کی بات اِلکیاہرّاسی شافعی کی کتاب ''احکام القرآن'' میں منقول دوسرے مسلک کے احکام کے بارے میں کہی جائے گی اور یہی بات ابوبکر ابن العربی مالکیؒ کے نقول کے بارے میں کہی جائے گی۔

اور اس کا سلسلہ فقہ، اُصولِ فقہ، شرح حدیث اور تمام علوم کی کتابوں تک جائے گا، ان تمام علوم کے اندر ہر مسلک کے احکام اس مسلک کی اصل کتابوں سے ہی لینے چاہئیں؛ بلکہ ہمارے اساتذہ تو ہمیں ایک اور بات کی تاکید کرتے تھے، وہ یہ کہ ہر مسئلہ کو اس مسلک کی کتاب کے اسی باب سے لیا جائے؛ چنانچہ جو حکم نماز سے متعلق ہو، وہ **"کتاب الصلاۃ"** سے ہی لیا جائے، اگر **"کتاب الحج"** میں بھی اس کا ضمناً تذکرہ آ گیا ہو، تو وہاں سے نہ لیا جائے اور نہ اس پر اعتماد کیا جائے، ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی قید ہو جو اصل جگہ **"کتاب الصلاۃ"** میں مذکور ہو؛ اس لیے وہاں سے رجوع کرنا ضروری ہے؛ تاکہ پورے اطمینان کے ساتھ اس مسئلہ کو لیا جاسکے اور اس پر پورا اعتماد کیا جاسکے۔

نیز میرے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ میں ہر عمل، ہر بحث اور ہر مراجعت کے وقت پہلی کتاب کے حاشیہ پر اس دوسری کتاب کا جلد اور صفحہ نمبر بھی لکھ دوں، جس کی میں مراجعت کررہا ہوں؛ تاکہ اگر بعد میں کبھی ضرورت پڑے تو دوبارہ محنت نہ کرنی پڑے۔

غرض جب میں اصل مصدر تک پہنچ گیا تو میرا پہلا مرحلہ مکمل ہوگیا، جو حوالے کی صحت سے متعلق تھا۔

دوسرا مرحلہ: اصل عبارت سے مقارنہ:

اب مجھے دوسرے مرحلہ کی طرف منتقل ہونا ہے، اور وہ ہے منقولہ عبارت کو اصل ماخذ سے ملانا؛ کیونکہ ہمارے ائمہ نقل کرتے وقت عبارتوں کو مختصر کردیتے ہیں، جس سے کبھی مفہوم کے اندر خلل بھی پیدا ہوجاتا ہے؛ اس لیے جس طرح حوالے کی صحت کا اطمینان ضروری ہے، اسی طرح عبارت کے معنیٰ ومفہوم اور محل استشہاد کی صحت کا اطمینان بھی ضروری ہے۔

غور کیجیے کہ آج مطبوعہ کتابوں کے اندر جو عبارتیں میں پڑھتا ہوں اگر وہ طباعت کی غلطیوں سے پاک ہوں، تب بھی مجھے عبارت کے اندر مؤلف کے تصرف یا اختصار کی وجہ

سے صحیح معنیٰ ومفہوم سمجھنے میں دشواری ہوسکتی ہے، تو پھر اس وقت میرا کیا حال ہوتا ہوگا جب میرے سامنے طباعت کی ہی اتنی غلطیاں ہوتی ہوں جو بالعموم شمار سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہیں، حتیٰ کہ تحقیق شدہ کتابوں میں بھی!!

تیسرا مرحلہ: عبارت کی تحقیق:

اس مرحلہ سے گزرنے کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے اور وہ ہے ان نقول کو سمجھنا، ان پر اعتماد، ان کی غلطیوں کی تصحیح، اپنی سابقہ معلومات کو کام میں لانا، صحیح چیز پر اعتماد اور جو بات غلط لگے اس پر نقد، یہ ایک پُرخطر مرحلہ ہے، جسے وہی شخص انجام دے سکتا ہے، جس نے شیوخ سے متوارث نہ کہ صحیفوں اور کتابوں سے ماخوذ علم کے اندر سالہا سال لگائے ہوں، جس کے بعد اسے اللہ کی طرف سے توفیق اور درستگی عطا ہوئی ہو۔

تحقیق نقول کے موانع ومحرکات:

یہ منہج جس پر اپنے شاگردوں کی تربیت کرنا ضروری ہے، جب وہ اس منہج تک پہنچ جاتے ہیں تو انھیں مختلف رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؛ لیکن ساتھ میں کچھ محرکات بھی ہوتے ہیں۔

رکاوٹیں:

اس راہ کی رکاوٹیں ہیں: تھکن، محنت، مشقت، مال اور وقت کی قربانیاں؛ چنانچہ تحقیق کا کام کرنے والے طالبِ علم کو بسا اوقات ایک ایک کلمہ کی تحقیق میں کئی کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں؛ حالانکہ وہ اس کے لیے جدید دور کے نئے پروگرامس اور ایپس بھی استعمال کرتا ہے، پھر اس کے بعد کبھی تو وہ کسی حتمی نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی ان سب کے باوجود بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پاتا، اسے تحقیق کے دوران ہر وہ کتاب بھی خریدنی پڑتی ہے، جس کے بارے میں اسے توقع ہوتی ہے کہ اس کے اندر اس مسئلے کا حل موجود ہوگا اور کبھی ایک

ہی کتاب کے مختلف نسخے بھی خریدنے پڑتے ہیں اور کبھی تحقیق اسے اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کتاب کے کچھ مخطوطات کی بھی مراجعت کرے؛ تاکہ وہ کسی اطمینان بخش نتیجہ تک پہنچ سکے۔

محرکات:

لیکن ان رکاوٹوں کے ساتھ کچھ محرکات بھی ہیں: اور وہ یہ کہ اس کے تحقیق شدہ کلمے یا جملے پر جس مسئلے کی بنیاد ہوتی ہے، اس میں حق اور صحیح بات تک پہنچنے کا عظیم ثمرہ ہاتھ آتا ہے، خاص طور پر جبکہ اس کی تحقیق سے طباعت کی کوئی ایسی غلطی سامنے آتی ہے جس میں حرفِ نفی کا سقوط ہو، مثلاً **"لا یصح"** کے بجائے **"یصح"** ہو گیا ہو۔

یا کسی حدیث کا کوئی ایسا حوالہ ہاتھ آجائے جہاں سے اس کتاب کے اندر وہ حدیث نہ لی گئی ہو۔

میں اس کی اہمیت کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھاتا ہوں: مثال کے طور پر میں نے کسی چھوٹے سے جزء کی تحقیق کی، جس میں سو نقول تھے اور میں نے اس کے اندر اس بات کا التزام کیا کہ تمام نقول کی اصل مصادر سے تخریج کروں، اب اگر مجھے سو کے سو نقول صحیح ملیں اور ان سب کے حوالے اور استشہادات درست نکلیں، تو یہ بہت اچھی بات ہے اور یہ کام کر کے میں نے علم اور دین کی وہ ذمہ داری ادا کردی جو میرے کاندھوں پر تھی، اسی طرح میں نے مؤلف کی ذمہ داری بھی ادا کردی؛ نیز قاری کی ذمہ داری بھی ادا کردی، کہ میں نے اسے اطمینان دلا دیا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے وہ ثابت اور صحیح ہے۔

اور اگر مجھے ننانوے نقول کے حوالے اور استشہادات صحیح ملے؛ لیکن ایک نقل صحیح نہیں ملی، تو میں نے ننانوے نقول کے اندر تو وہ ذمہ داری ادا کردی جو میرے کاندھوں پر تھی اور اس ایک نقل کے اندر میں نے علم اور دین کی کئی گنا زیادہ ذمہ داری ادا کی؛ کیونکہ میں نے محنت کر کے اس وہم کی تصحیح کردی جو اس عبارت کے اندر ہو گیا تھا، ساتھ ہی

میں نے اس کتاب کے مؤلف کی خدمت بھی کر دی کہ میں نے ان کے وہم کو صحیح کر دیا، جس سے اُمید ہے کہ وہ ان شاء اللہ عالم برزخ میں خوش ہو رہے ہوں گے۔

عبارت کی تحقیق سے متعلق دو ذمہ داریاں

یہاں دو اہم چیزوں پر متنبہ کرنا ضروری ہے:

استدارک میں ادب ملحوظ ہو:

پہلی بات یہ ہے کہ: یہ تنبیہ اور استدراک نرمی اور ادب کے ساتھ ہونا چاہیے، نہ کہ استعلاء اور تکبّر کے ساتھ، مان لو اگر مذکورہ مثال کے اندر مصنّف سے سو نقول میں سے ایک نقل میں غلطی ہوئی ہے، تو کیا میں اپنے بارے میں اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ: جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سب صحیح ہے، یہ بے حد ضروری ہے کہ تم نہ صرف اپنی زبان؛ بلکہ اپنے دل کی بھی حفاظت کرو اور اس کے اندر کسی بھی طرح کا تکبّر یا کسی بھی عالم کے مقام و مرتبہ کی تنقیص نہ پیدا ہونے دو، نہ اس عالم کی جس پر تم نے استدراک کیا ہے اور نہ کسی اور عالم کی، ہمارے ائمہ کی عزت و عظمت محفوظ ہے، یہ یا اس جیسے چند استدراکات ان کے صحیح نقول کے اتھاہ سمندر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

یہی بات سیّد التابعین حضرت سعید بن مسیّبؒ کے اس اثر کے اندر ہے جسے ابنِ عبد البرؒ نے امام مالکؒ سے اور انھوں نے سعید بن مسیّبؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: کوئی عالم، کوئی صاحبِ شرف اور کوئی فضل والا ایسا نہیں جس میں عیب اور خامی نہ ہو؛ لیکن جس کی خوبیاں اس کی خامیوں سے بڑھ جائیں تو ان خوبیوں کی وجہ سے اس کی خامیاں چلی جاتی ہیں، یعنی ان سے چشم پوشی کر لی جاتی ہے اور جس کی خامیاں زیادہ ہو جائیں تو اس کی خوبیوں کا اعتبار نہیں رہتا[1]۔

(۱) جامع بیان العلم (۱۵۴۰)

اس کے بعد ابنِ عبد البرؒ نے کسی دوسرے کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: عالم کبھی غلطیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا؛ اس لیے ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص غلطیاں کم کرتا ہو اور درست باتیں زیادہ کرتا ہو، تو وہ عالم ہے اور جو شخص درست باتیں کم کرتا ہو اور غلطیاں زیادہ کرتا ہو، تو وہ جاہل ہے۔

یہ ایسا پیمانہ ہے جس سے کسی بھی عقلمند شخص کو انکار نہیں ہوسکتا؛ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ شخص جس کی درست باتیں زیادہ ہوں اس کے کام کے اندر منہجیت، علم، تجربہ اور مشق وتدریب بھی پائی جاتی ہو؛ تاکہ اس کی غلطیوں سے چشم پوشی کی جاسکے، خواہ کم ہوں یا زیادہ؛ ورنہ تو پھر اس کی غلطیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں اور اس کی صحیح باتیں بھی **"رمیة من غیر رام"** (بغیر تیر پھینکے تیر چل جانے) کے قبیل سے شمار ہوں گی؛ کیونکہ وہ کسی راہنما اور مرشد کے بغیر کام کر رہا ہے۔

۲-نفی میں احتیاط ملحوظ ہو:

دوسری بات یہ ہے کہ: تحقیق کرنے والا اپنے استدراک میں احتیاط سے کام لے، بالخصوص نفی کی صورت میں؛ کہ اثبات کے اندر تو معاملہ آسان ہوتا ہے؛ لیکن جب مصنف نے مثلاً کسی حدیث کو "صحیح بخاری" کی طرف منسوب کیا ہو اور محقق کو اپنی تحقیق کے دوران وہ حدیث نہ ملی ہو، تو اسے احتیاط سے کام لینا چاہیے، اسے وہ بات کہنی چاہیے، جو اسلاف نے ہمیں سکھلائی ہے، کیونکہ وہ حدیث یا راوی کے بارے میں کہتے ہیں: **"لا أعرفه"** یا **"لا یُعرف"** اسی طرح حدیث کے بارے میں کہتے ہیں: **"لم أجد له أصلًا"** یا **"لا أصل له"**، ان دونوں تعبیرات کے درمیان بڑا فرق ہے، یہ ہمارے لیے ایک علمی اور عملی درس ہے۔

ایک عملی مثال:

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کی پہلی حدیث **"إنما الأعمال بالنیات"** کو امام مالکؒ

کی سند سے روایت کیا ہے، جو ان کی ''موطا بروایت امام محمدؒ'' کے اندر موجود ہے [۱]؛ لیکن ابنِ دحیہؒ نے اس کو موطا کی طرف منسوب کیا، تو حافظ ابنِ حجرؒ ان پر گرفت کر بیٹھے اور موطا میں ہونے کی نفی کی [۲]، اس پر علامہ سیوطیؒ نے حافظ ابنِ حجرؒ کی گرفت کرتے ہوئے لکھا کہ: یہ حدیث موطا بروایت امام محمدؒ کے اندر ''کتاب النوادر'' سے تین ورق پہلے موجود ہے [۳]۔

یہ ہمارے لیے ایک سبق اور نصیحت ہے کہ ابنِ دحیہؒ تو حدیث کو موطا کی طرف منسوب کرنے میں صحیح ہیں اور حافظ ابنِ حجرؒ جیسے شخص سے غلطی ہو رہی ہے، بات وہی ہے جو میں نے کہی کہ: اثبات کی صورت میں تو معاملہ آسان ہوتا ہے؛ لیکن نفی کی صورت میں نہایت دشوار ہو جاتا ہے، اس کے لیے فن کے اندر تتبع و استقراء کی اہلیت رکھنے والے امامِ فن کی طرف سے طویل استقراء اور تتبع کی ضرورت ہوتی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ امام ابنِ حجرؒ جیسی شخصیت جن کا مقام و مرتبہ کسی سے مخفی نہیں، ان سے بھی ایک ایسے فن میں غلطی ہو رہی ہے جس کے اندر انھیں امامت کا مقام حاصل ہے، اللہ تعالیٰ ان پر اور تمام علمائے اسلام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

نفیِ غیر صریح کے لیے بھی استقراءِ تام کی ضرورت:

نفی کبھی تو صراحۃً ہوتی ہے، جیسا کہ ابنِ دحیہ اور ابنِ حجر کی مذکورہ مثال میں ہے اور کبھی ضمناً اور غیر صریح ہوتی ہے، مثال کے طور پر آپ نے کہا کہ: فلاں حدیث ضعیف ہے، تو اس میں ضمناً نفی پائی جا رہی ہے؛ کیونکہ آپ گویا یہ کہہ رہے ہیں کہ: اس حدیث کی کوئی دوسری صحیح یا حسن درجے کی سند یا اسی جیسی ضعیف سند موجود نہیں ہے، جس سے اس حدیث کو قوت مل سکے اور یہ حسن لغیرہ بن سکے۔

(۱) التعليق الممجد ۳: ۵۱۳ (۹۸۲)

(۲) فتح الباري ۱: ۱۱، التلخيص الحبير ۱: ۵۵

(۳) تنویر الحوالک ۱: ۱۰ وغیرہ

اسی طرح آپ نے کہا: "**هٰذا الحديث غريب**" یہ حدیث غریب ہے، یعنی: اس کی ایک ہی سند ہے، یا "**هٰذا الحديث عزيز**" کہ یہ حدیث عزیز ہے، یعنی اس کی دو ہی سندیں ہیں، تو اس میں ضمناً کسی اور سند کے پائے جانے کی نفی ہورہی ہے، جس سے یہ غریب حدیث عزیز یا عزیز حدیث مشہور بن سکے۔

اس ضمنی نفی کے لیے بھی امامِ فن کی ضرورت ہوتی ہے، جو اپنے فن میں تتبع اور استقراء تام رکھتا ہو؛ تا کہ اس کی نفی کو قبول کیا جاسکے؛ لیکن اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے؛ کیونکہ بعد میں آنے والے لوگ اگلوں پر استدراک بھی کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ "دراساتِ کاشف"(۱) اور بعد کی کتابوں کے اندر یہ بات بہت سی مثالوں کے ساتھ ثابت کی گئی ہے، بلاشبہ احتیاط اور جلد بازی سے پرہیز یہ دو طالبِ علم کے ضروری شعار ہیں، جن کا ہونا طالبِ علم کے لیے لابدی ہے، اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

(۱) ص ۱۰۵

تیرہویں مشعل

فتویٰ کے لیے جماعت تیار کرنا اور اساتذہ کی نگرانی میں ان کی تدریب کرانا

استاذ اور شاگرد کا یہ طویل علمی اور تربیتی سفر طے کرنے کے بعد اب میں ایک ایسی چیز تک پہنچ چکا ہوں، جو طالبِ علم اور اساتذہ کے اس سفر کا ثمرہ ونتیجہ ہے اور وہ ہے اساتذہ کا طلبہ کو اللہ کے دین اور شریعت کے سلسلے میں فتویٰ دینے کے قابل بنا دینا، میں اس حوالے سے ایک عمومی گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو فقہ وفتاویٰ سے بھی متعلق ہو اور شریعت کے دوسرے اُمور سے متعلق بھی۔

افتاء کی نزاکتیں:

پیش آمدہ معاملہ ہو یا کوئی مسئلہ پوچھا گیا ہوئی یا نوازل وواقعات والی کوئی صورت ہو، بہت سی مرتبہ تو وہ کوئی عام سی چیز ہوتی ہے جس کا جواب آسان ہوتا ہے؛ لیکن بہت سی مرتبہ معاملہ پیچیدہ ہوتا ہے، جس کے اندر مختلف پیچیدگیاں ہوتی ہیں یا کہہ لیجیے اس کا کچھ خاص پس منظر ہوتا ہے، اس کے اندر مفتی کے لیے اتنا کافی نہیں ہوتا کہ وہ کاغذ کے تراشے پر پیش کیے گئے الفاظ پڑھ کر یا بالمشافہ یا فون پر مستفتی کی گفتگو سن کر فتویٰ لکھ دے، نہیں؛ بلکہ اسے بصیرت کے ساتھ معاملہ میں غور وفکر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اسے چاہیے کہ وہ لکھی ہوئی سطروں کے پیچھے کی چیزیں پڑھنے کی کوشش کرے اور سنائے ہوئے واقعات

کے پیچھے کی باتیں سننے کی کوشش کرے یا پھر مستفتی کو اپنے پاس بلا کر اور اپنے سامنے بٹھا کر اس کو اچھی طرح پر کھے۔

نیز کبھی سوال اقتصادیات کی کسی پیچیدہ شکل کے بارے میں ہوتا ہے، جسے کفار نے اپنے نئے طریقوں کے اندر ہم پر مسلط کر رکھا ہے اور مفتی اس شکل سے دُور ہوتا ہے یا قریب ہی ہوتا ہے؛ لیکن وہ شکل ایسی ہوتی ہے کہ اس طرح کی کوئی شکل اب تک اس کی نظر سے نہیں گزری، ایسے وقت میں اسے چاہیے کہ وہ مالیات کے ماہرین کو بلا کر ان سے اس شکل کی تفصیلات اور اس کے اندر پائے جانے والے محذورات کو معلوم کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

نیز اس طرح کی صورتِ حال میں اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جو تمام مسلمانوں کی ضرورت سے متعلق ہو، تو اسے دیگر ائمہ کے مذاہب سے بھی اُنسیت اور واقفیت حاصل کرنا چاہیے پھر کبھی اس طرح کے مسائل میں تنہا اپنے طور پر فتویٰ دینا اس کے لیے مناسب نہیں ہوتا، تو ایسے وقت اجماعی اجتہاد کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جس میں کبار اہلِ علم کی ایک جماعت جو دنیا کے احوال سے واقف اور باخبر ہو، شریک ہو۔

لہٰذا شیخ مربی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بتدریج اپنے شاگردوں کو فتویٰ نویسی کی مشق کرائے اور ان کے ساتھ اس عالمِ ربانی کا طریقہ اختیار کرے، جو اپنے شاگردوں کو بڑے مسائل سکھانے سے پہلے چھوٹے مسائل سکھاتا ہے۔

ہندوستان میں افتاء کی تعلیم کا بہترین نظام:

اس موقع پر ہندوستان اور اس کے پڑوسی ممالک کے علماء (اللہ تعالیٰ ان میں سے مرحومین کی مغفرت فرمائے اور جو لوگ حیات ہیں ان کی حفاظت فرمائے اور ان کو ہر قسم کی برکتوں سے مالا مال فرمائے) کا طرزِ عمل بھی قابلِ ستائش ہے، یہ حضرات اپنے مدارس کے فضلاء کو فراغت کے بعد ان ہی مدرسوں میں قائم افتاء کے شعبوں میں منتقل کر دیتے ہیں،

جہاں وہ اپنی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد کسی ماہر استاذ کی نگرانی میں دو سال تک فتویٰ نویسی کی مشق کرتے ہیں اور پھر جس کے اندر استاذ کو اہلیت محسوس ہوتی ہے وہ اسے فتویٰ نویسی کی اجازت دے دیتے ہیں۔

وہاں کی بعض بڑی یونیورسٹیوں میں افتاء کا شعبہ وسعت اور طلبہ واساتذہ کی تعداد کے اعتبار سے عرب کی کسی کلیۃ الشریعہ سے کم نہیں، جہاں تدریب کرانے والے اساتذہ کی تعداد ساٹھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر استاذ کے پاس مشق کرنے والے طلبہ کی ایک بڑی تعداد رہتی ہے، کاش عرب کے مدارس بھی اس طرز کو اپناتے اور افتاء کی تدریب کے لیے مستقل شعبے قائم کرتے۔

علماءِ دیوبند کی خدمت میں ایک تجویز:

میں یہ بھی کہتا ہوں کہ: کاش ہندوستان وغیرہ کے یہ علماء تخریجِ حدیث اور رُوات کی جرح وتعدیل کی مشق وتدریب کے لیے بھی کچھ شعبے قائم کرتے، جہاں ایسے اساتذہ جن کے اندر انصاف اور سنجیدگی کے ساتھ رجال پر حکم لگانے، اسانید کے اتصال وانقطاع اور متون کی تصحیح وتضعیف کا فیصلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہو اور وہ پورے اطمینان اور غور وفکر کے بعد جس سے حق بات تک رسائی ہو جاتی ہو گرچہ کچھ تاخیر سے ہو، فیصلہ کرتے ہوں، اپنی نگرانی میں طلبہ کی مشق وتدریب کراتے۔

مفتی کی شرائط:

فتویٰ دینے کے لیے مفتی کے اندر علم کی شرط کے علاوہ اور بھی بہت سی صفات وشرائط کا پایا جانا ضروری ہے، مثلاً: اللہ رب العزت کا استحضار، اپنی ذمہ داری کا احساس، اللہ کے دین کے تئیں امانتداری، اللہ کی ذات پر کامل توکل واعتماد اور ان سب کے ساتھ نئے مسائل سے بھرپور واقفیت اور پھر مستفتی کو پرکھنے کی صلاحیت وغیرہ، یہاں اگر ان صفات

اور ان جیسی دوسری صفات پر روشنی ڈالی جائے، تو گفتگو طویل ہو جائے گی۔

البتہ میں دو باتیں کہنا چاہتا ہوں:

مستفتی کو پرکھنے کی ضرورت:

ایک تو میں انتہائی مختصر لفظوں میں مستفتی کو پرکھنے کی اہمیت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں؛ لیکن یہ موضوع مجھ سے تقاضا کر رہا ہے کہ میں فتویٰ دینے میں جلد بازی کے موضوع پر بھی کچھ گفتگو کروں، بالخصوص جو طریقہ آج کل بہت زیادہ رائج ہو رہا ہے کہ لائیو چینلوں کے ذریعہ لوگوں کے سوالات کے جوابات اور فتوے دیے جا رہے ہیں۔

لائیو چینلوں پر فتوے دینے کے سنگین نقصانات:

اس طریقہ سے فتویٰ دیتے ہوئے ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی خاص یا عام معاملے میں فتویٰ دینے میں جلد بازی ہو جائے؛ بلکہ کہہ لیجیے کہ اس طرح کی جلد بازیاں ہو چکی ہیں، کم ہوں یا زیادہ اور آپ جانتے ہیں کہ ان چینلوں میں مخاطب صرف مستفتی نہیں ہوتا کہ مفتی صاحب کی جلد بازی کا نقصان صرف اسی کی ذات تک محدود رہے اور نہ مخاطب صرف فریقین ہوتے ہیں؛ بلکہ ان چینلوں کو تو ہزاروں؛ بلکہ دسیوں ہزار لوگ دیکھتے ہیں اور بعض چینلوں کو دیکھنے اور سننے والوں کی تعداد تو کئی ملین تک پہنچ جاتی ہے!! سوچیے کہ جلد بازی میں دیے گئے فتوے کا نقصان کتنے بڑے پیمانے پر ہو سکتا ہے!۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مفتی کا مقصد کسی مسئلے میں کوئی خصوصی علاج اور تدبیر بتانی ہوتی ہے، جو مستفتی کی ذات تک محدود رہے؛ لیکن اس کا جواب سب لوگوں تک پہنچ جاتا ہے اور بھی اس طرح کی کئی ایک گڑبڑیاں ہوتی ہیں؛ اس لیے اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

پھر یہ بات مخفی نہیں کہ بہت سے سننے والے ایسے فتووں کے انتظار میں رہتے ہیں،

جن کو آڑ بنا کر وہ اپنی فاسد اغراض پوری کر سکیں اور مفتی کو ان کا علم نہیں ہوتا، اگر اسے اس کی خبر ہوتی تو یقیناً وہ اس مسئلے میں کوئی اور موقف اختیار کرتا یا فتویٰ دیتے وقت لوگوں کو ڈراتا یا اپنے فتویٰ میں تخصیص پیدا کرتا یا کوئی اور خصوصی قدم اٹھاتا۔

اور یہ ساری باتیں بھی اس وقت ہیں جبکہ مفتی زبان کی لغزش، حکمِ شرعی کے استحضار کے سلسلے میں ذہن کی لغزش یا سائل کے کلام کو سمجھنے میں چوک یا اس قسم کی اور دوسری لغزشوں سے محفوظ رہے۔

اس تنبیہ کے بعد اب یہ انتہائی اہم تنبیہ آتی ہے کہ: مفتی کے لیے اپنے مستفتی کو پرکھنا ضروری ہے؛ ہوتا یہ ہے کہ مستفتی موبائل کے پیچھے سے یا کسی دوسرے ملک سے سوال پوچھتا ہے یا صرف کاغذ کا ٹکڑا بھیج دیتا ہے اور مفتی اس کا چہرہ نہیں دیکھ پاتا، جبکہ بہت سی مرتبہ صحیح جواب دینے کے لیے مستفتی کو دیکھنا یا اس مسئلے کی شقیں نکالنا یا اس کے شہر کی تاریخ سے واقفیت ضروری ہوتی ہے، جیسا کہ ذیل کے شواہد سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

مستفتی کو پرکھنے کی کچھ مثالیں:

امام مالکؒ نے ''موطا''(۱) کے اندر یہ اثر نقل کیا ہے کہ: حضرت ابنِ عباسؓ سے روزہ دار کے بوسہ لینے کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپؓ نے بوڑھے کو اس کی اجازت دی اور نوجوان کے لیے اس کو ناپسند کیا۔

اسی طرح کی بات عبدالرزاق (۲) نے حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت عمرؓ سے اور ابنِ ابی شیبہ (۳) نے مکحولؒ اور ابنِ عمرؓ سے نقل کی ہے۔

---

(۱) ۱:۲۹۳ (۱۹)

(۲) (۷۴۲۰،۱۸۷۴)

(۳) (۹۵۲۷،۹۵۱۱)

ابنِ ابی شیبہ نے نقل کیا ہے کہ: ایک شخص حضرت ابنِ عباس ؓ کے پاس مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا کہ: کیا کسی مؤمن کو قتل کرنے والے کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ تو حضرت ابنِ عباس ؓ نے فرمایا: نہیں، وہ جہنم میں جائے گا، جب وہ شخص چلا گیا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ: آپ نے ہمیں تو کبھی اس طرح کا فتویٰ نہیں دیا! حضرت ابنِ عباس ؓ نے فرمایا کہ: میرا خیال ہے کہ یہ شخص غصّے میں بھرا ہوا تھا اور کسی مؤمن کو قتل کرنا چاہ رہا تھا، لوگوں نے اس کے پیچھے آدمی بھیجا تو معاملہ وہی نکلا جو ابنِ عباس ؓ نے فرمایا تھا(۱)۔

بخاری اور ترمذی کی روایت میں ہے(۲) کہ: ایک عراقی شخص نے حضرت ابنِ عمر ؓ سے دریافت کیا کہ: اگر کپڑے میں مچھر کا خون لگ جائے تو کیا حکم ہے؟ حضرت ابنِ عمر ؓ فرمانے لگے: اسے دیکھو، یہ مچھر کے خون کے بارے میں مسئلہ پوچھ رہا ہے، جبکہ ان لوگوں نے نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا تھا کہ: ''حسن اور حسین یہ دونوں میرے لیے دنیا کے پھول ہیں''، یہ ترمذی کی روایت کے الفاظ ہیں، بخاری کی روایت میں یہ بھی ہے کہ: حضرت ابنِ عمر ؓ نے سوال سننے کے بعد اس سے دریافت کیا کہ: تم کہاں سے ہو؟ کیونکہ اس کا سوال انھیں عجیب سا لگا تھا۔

صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی'' فرماتے ہیں کہ: حضرت ابنِ عمر ؓ نے حسن وحسین والی یہ حدیث بطور تعجب ذکر کی تھی کہ: یہ اہلِ عراق معمولی چیزوں کے بارے میں تو سوال کرنے کے بڑے حریص ہو رہے ہیں اور جو اہم چیز تھی اس میں کوتاہی برتی (۳)۔ لیکن درحقیقت ابنِ عمر ؓ نے یہ حدیث سائل کا سوال سننے اور اس کا پتہ پوچھنے کے بعد ذکر کی تھی۔

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ (۲۸۳۲۶)

(۲) بخاری (۳۷۵۳، ۵۹۹۵) ترمذی (۳۷۷۰)

(۳) ۱۰: ۲۷۵

امام ابوالقاسم قشیریؒ فرماتے ہیں کہ: بیان کیا جاتا ہے کہ: بشر حافیؒ کی بہن امام احمد بن حنبلؒ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ: ہم اپنی چھتوں پر بیٹھ کر اُون کاتتے ہیں، ہمارے پاس سے بنو طاہر کے محافظ سپاہی مشعلیں لے کر گزرتے ہیں، جن کی شعاعیں ہم تک پہنچتی ہیں، کیا ہمارے لیے ان شعاعوں کی روشنی میں اُون کاتنا جائز ہے، امام احمدؒ کہنے لگے: اللہ تجھے عافیت عطا کرے، خدا کی بندی! تُو کون ہے، کہاں سے آئی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ: میں بشر حافی کی بہن ہوں، یہ سن امام احمدؒ رونے لگے اور فرمایا کہ: حقیقی تقویٰ تمہارے گھر میں ہی پلتا ہے، ان شعاعوں کی روشنی میں اُون مت کاتا کرو(۱)۔

یہ اور ان جیسے بے شمار سلف وخلف کے واقعات ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ ہم جواب دینے سے پہلے سائل اور اس کے سوال کے بارے میں تحقیق اور غور وفکر سے کام لیں؛ تا کہ ہمارا جواب درست اور مقصد کے مطابق ہو۔

بفضلہٖ تعالیٰ اس دَور کے جو علماء مقامی اور عالمی دارالافتاؤں کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، وہ فتاویٰ کے اندر قابلِ رشک خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کے فتاویٰ میں جو غلطیاں ہوتی ہیں ان کی دوسرے فتاویٰ سے اصلاح ہو جاتی ہے اور حسنِ نیت ان شاء اللہ اس منصب کے اہل سے ہونے والی لغزشوں اور غلطیوں کے لیے شفیع اور سفارشی بن جائے گی؛ لیکن ان دارالافتاؤں کے لیے کچھ ضوابط کا ہونا ضروری ہے۔

مطالعہ کے لیے چند ضروری کتابیں:

اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ افتاء اور مفتی کے آداب سے بھی واقف ہو، جس کے لیے ائمہ سابقین کی درجِ ذیل چار کتابوں کا گہرائی اور بصیرت کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے: خطیب بغدادیؒ کی **"آداب الفقیه والمتفقه"**

(۱) **الرسالة القشيرية ۲: ۱۵۹ بشرح القاضي زكريا مع حاشية العروسي،** دیکھیے: تاریخ بغداد ۱۶: ۶۲۴

(۱۰۳۲-۱۲۲۰)، ابنِ عبدالبرؒ کی ''**جامع بيان العلم**'' (۱۵۰۰-۲۴۱۳)، ابنِ صلاحؒ کی ''**أدب المفتي والمستفتي**'' اور نوویؒ کی '**المجموع**'' کے مقدمے کی بحث (۱:۴۰-۵۸)، جس میں انھوں نے ابنِ صلاحؒ وغیرہ کی بحثوں کی تلخیص کی ہے۔

اور دَورِ حاضر کے علماء میں ڈاکٹر یوسف القراضاویؒ کی ''**الفتوى بين الانضباط والتسيُّب**'' اور شیخ عبداللہ بن بیّہ (موریتانی الاصل) کی ''**صناعة الفتوى وفقه الأقليات**'' پڑھنے کے قابل ہے، یہ دونوں حضرات موجودہ دَور کے احوال اور غیر مسلم ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کی شرعی رکاوٹوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

چودھویں مشعل

طالبِ علم کا اپنے زمانے کے احوال سے واقف ہونا

استاذ کی بنیادی ذمہ داریوں میں یہ بھی ہے کہ: جس وقت وہ طلبہ کو مستقبل کے لیے بتدریج تیار کر رہے ہوں، انھیں اِس بات کی بھی تاکید کریں کہ وہ بلا استثناء اپنے زمانے کے تمام گوشوں اور پہلوؤں سے واقف رہیں، یہ ہرگز مناسب نہیں کہ طالبِ علم اپنی گرد وپیش کی زندگی سے غافل ہو؛ لیکن اس میں غلو بھی نہ ہو جو اس کو اس کے علمی سفر کے لیے اختیار کردہ کسی بھی راستے سے دُور کردے یا اس کے لیے رکاوٹ بن کر اس کی رفتار کو سست کردے۔

لوگوں کے احوال سے واقفیت سنتِ نبویؐ ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ: آپ لوگوں سے ان کے درمیان ہونے والے احوال وواقعات کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے، جیسا کہ ہند بن ابی ہالہؓ کی طویل حدیث کے اندر موجود ہے۔

مذکورہ سنتِ نبویؐ کو اپنانے کے فوائد:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عادتِ شریفہ کو اپنانے میں بے شمار فوائد ہیں:
ایک فائدہ یہ ہے کہ: عوام الناس اس طرح کے عالم کے اندر ایک پاکیزہ اسلامی صفت محسوس کرتے ہیں کہ وہ ان پر توجہ دیتا ہے، ان کے احوال دریافت کرتا ہے، ان کے

دُکھ سُکھ میں شریک رہتا ہے اور اپنی دینی ذمہ داری صرف منبر پر چڑھ کر ہر ہفتہ مامورات ومنہیات بیان کرنے کو ہی نہیں سمجھتا۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ: عالم اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعہ اپنے محلّہ والوں یا شہر کے دوسرے علاقے کے لوگوں کے ساتھ محبت، تعلق اور اتحاد کا ایک نیا رشتہ قائم کرتا ہے۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ: اس کی باتیں اور اس کے فتاویٰ ٹھوس اور مستحکم ہوتے ہیں؛ کیونکہ وہ زمانہ کے احوال اور زندگی کے مزاج سے پورح طرح باخبر ہوکر بولتا ہے، اس ڈاکٹر کی طرح جو پہلے بیماری کو سمجھتا ہے، پھر دوا تجویز کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی دوا سودمند ثابت ہوتی ہے؛ اسی لیے امام محمدؒ کے بارے میں منقول ہے کہ: وہ رنگریزوں کے پاس جاکر ان کے باہمی معاملات اور لین دین کے طور طریقے معلوم کیا کرتے تھے، یہ ان کی کمال درجے کی فقاہت اور اللہ کے دین کی تئیں غایت درجہ ورع واحتیاط کی بات تھی، وہ اس کے ذریعہ اہلِ صنعت وحرفت کے درمیان ہونے والے باہمی معاملات کی شکلوں اور قدیم اور جدید عرف کے درمیان فرق کی صورتوں کو سمجھنا چاہتے تھے؛ تاکہ کسی بھی معاملے میں حکمِ شرعی بیان کرتے وقت ان سے غلطی سرزد نہ ہو(۱)۔

ایک اور فائدہ جو گزشتہ فائدے کا ہی نتیجہ ہے کہ: یہ باخبر عالم نفسانی خواہشات یا منحرف خیالات رکھنے والے لوگوں کی طرف سے دھوکا نہیں کھا سکتا، کہ وہ لوگ اس سے جس طرح کا چاہیں فتویٰ حاصل کرلیں اور اسے ان کے اُن غلط مقاصد کا علم ہی نہ ہو، جن کو وہ اس فتویٰ کی آڑ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہ چیز لوگوں میں پہلے کم تھی؛ اب بہت زیادہ ہوگئی ہے۔

مدینہ منورہ کے اندر میں ایک نیک اور صالح عالم دین کے ساتھ پچیس سال سے زائد رہا، وہ مدینہ کے مجاورین میں تھے، میں ان کی دعاؤں اور برکتوں کا معتقد رہتا تھا، ان کے

---

(۱) قاله الكوثري رحمه الله في بلوغ الأماني ص ۴۴

متعدد علوم ایسے تھے، بالخصوص اپنے مسلک کا فقہ اور علوم عربیہ کہ ان سے کوئی بھی پیچیدہ علمی مسئلہ پوچھا جاتا، تو وہ نہایت تشفی بخش جواب دیتے؛ لیکن وہ اپنے زمانے کے احوال سے بالکل ناواقف تھے، یعنی پندرہویں ہجری کے ثلثِ اول کے احوال سے!۔

ایک عالم اپنی امت کے ''احوال'' سے واقفیت کا دائرہ جتنا وسیع کرتا جاتا ہے، اسی قدر اس کا خیر اور نفع بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ پوری امت کے لیے عالمی سطح کے علماء میں شمار ہونے لگتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنی امت کے ''افکار'' بلکہ تمام اقوام وملل کے ''افکار'' سے جتنا زیادہ باخبر ہوتا جاتا ہے، اسی قدر اس کا خیر اور نفع بڑھتا جاتا ہے اور علم، ہدایت اور بصیرت پر مبنی اس کی دعوت کا نطاق وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لوگوں کے احوال سے واقفیت

''لیبین لھم'' کے مفہوم میں داخل ہے:

ویسے تو اللہ بہتر جانتے ہیں؛ لیکن بظاہر یہ چیز سورۂ ابراہیم کے شروع میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ (اور ہم نے تمام پیغمبروں کو ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؛ تاکہ وہ ان کے سامنے احکامِ الٰہیہ واضح کریں) کے مفہوم کے اندر داخل ہے؛ کیونکہ بیان اور وضاحت اسی وقت ہوسکتی ہے جب نبی اپنی قوم سے نہ صرف ان کی مادری زبان –مثلاً عربی زبان– میں گفتگو کریں؛ بلکہ ان کی علمی زبان اور علمی اصطلاحات سے بھی خوب واقف ہوں اور ان ہی کی روشنی میں ان سے مخاطب ہوں، تبھی وہ احکامِ الٰہیہ کی وضاحت اور تبلیغ کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں اور ان کے شبہات کا دفعیہ صحیح طور پر کر سکتے ہیں؛ اگر وہ شبہات ہی کو سمجھ نہ پائیں تو ان کا جواب کیسے دے سکتے ہیں!!۔

قارئینِ کرام! یہ مختلف اُمور جن کی طرف میں اشارے کررہا ہوں، جو نہایت اہمیت کے حامل اور مختلف شاخوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں، مجھے معلوم ہے کہ ان سب کا ایک شخص کے اندر پایا جانا ممکن نہیں، پھر وہ اُمور جن کی طرف میں نے اشارے ہی نہیں کیے، وہ کیسے پائے جاسکتے ہیں، بالخصوص جبکہ آج مسلمان اپنے ہونہار اور ذہین بچوں کو دینی علوم میں نہیں لگاتے؛ اس لیے اس وقت ضرورت ہے علوم کے اندر اختصاص پیدا کرنے اور اپنے آپ کو لگانے اور کھپانے کی اور بھی مختلف چیزوں کی۔

میں پھر سے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے کہتا ہوں کہ: آج کے دَور میں ''مغفل'' طالبِ علم کے لیے کوئی جگہ نہیں، اساتذۂ کرام جو طلبہ کو بنانے اور مستقبل کے لیے انھیں تیار کرنے میں لگے رہتے ہیں، انھیں اس پہلو پر بہت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ وہ طلبہ کے اندر بیداری اور زمانے کے احوال سے واقفیت کا مزاج پیدا کریں؛ تا کہ ان کا عطیہ امت کے سامنے کامل صورت میں آسکے۔

پندرہویں مشعل

ادب کے دائرے میں رہ کر نقد کا ملکہ پیدا کرنا

مربی استاذ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ: وہ اپنے طلبہ کے اندر بتدریج نقد کا ملکہ پیدا کریں، کہ وہ جو کچھ بھی پڑھیں اور سنیں اس کو پرکھ کر آگے بڑھیں، جس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر بیداری، سمجھ بوجھ اور معلومات کے استحضار کی صفت کو اس درجہ بڑھایا جائے، کہ طالب علم اپنے زمانۂ طالبِ علمی میں بھی اور مستقبل میں بھی جب بھی کچھ پڑھے یا سنے اسے اپنی معلومات کی روشنی میں جانچ اور پرکھ کر ان کی قوت وضعف اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے، ایسا نہ ہو کہ طالبِ علم اپنی عقل کو سُلا دے اور جب بھی اس کے سامنے کوئی نئ معلومات آئیں تو اپنی پُرانی معلومات کو غلط ٹھہرانے لگے!!۔

نقد کی چند مثالیں:

میں آپ کے سامنے کچھ مثالیں ذکر کرتا ہوں، جو ہم نے ابتدائے طالبِ علمی کے زمانے میں سنی تھیں۔

پہلی مثال: ہم نے "**الحِکَم العطائیة**" کی تعریف اور مدح سرائی میں یہ بات سنی تھی کہ: سیّدہ رابعہ عدویہ رضی اللہ عنہا نے یہاں تک کہا ہے کہ: اگر نماز میں غیر قرآن کو پڑھنا جائز ہوتا تو میں ابنِ عطاء اللہ کی حکمتیں پڑھتی۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ابنِ عطاء اللہ کی وفات ۷۰۹ھ میں ہوئی، جبکہ سیّدہ رابعہ

عدویہ کی وفات ۱۳۵ھ اور ایک قول کے مطابق ۱۸۵ھ میں ہو چکی تھی، تو پھر اس قول کی نسبت ان کی طرف کیسے صحیح ہو سکتی ہے!!۔

پھر میں نے "**الحِکَم العطائیة**" کا ایک قدیم نسخہ دیکھا، جس میں ناشر نے کتاب کے سرِ ورق کی پیشانی پر دو شعر لکھ رکھے تھے، جن میں یہی مضمون تھا، شاید وہ شعر ملاح فلاں نامی کسی شخص کی طرف منسوب تھے۔

دوسری مثال: میں نے زمانۂ طالبِ علمی میں کبھی پڑھا تھا کہ: علمائے سمرقند نے امام بخاری کو سمرقند سے اس لیے نکالا کہ: ان سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ: کیا ایک ہی گائے کا دودھ پینے والے دو بچوں کے درمیان رضاعت ثابت ہو جائے گی؟ تو انھوں نے فرمایا: ہو جائے گی، جس پر علمائے سمرقند ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھیں شہر بدر کر دیا۔

یہ ۱۳۸۷ھ کا سال تھا، میں نے یہ واقعہ پڑھا اور اگلے روز فقہِ حنفی کے سبق میں پہنچا، جس میں ہمارے استاذ شیخ عبداللہ سراج الدینؒ تھے، میں مگن تھا کہ آج میں ایسی معلومات لے کر آیا ہوں جس کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا! میں نے اپنے استاذِ محترم کو یہ واقعہ سنایا، اللہ ان سے راضی ہو، انھوں نے یہ واقعہ سن کر ایک جملہ کہا، جسے میں بغیر کسی کمی اور زیادتی کے بعینہٖ نقل کر رہا ہوں، انھوں نے فرمایا: "**لا تصدق کل ما تقرأ**" کہ ہر پڑھی ہوئی چیز کی تصدیق مت کیا کرو، یہ جملہ نہیں تھا، میرے لیے ایک عظیم سبق تھا، جس میں مجھے ایک نہایت معتدل اور مضبوط منہج مل گیا، جس کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، واقعی یہ بات ہر انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے کہ وہ ہر پڑھی ہوئی یا سنی ہوئی بات کی تصدیق نہ کرے؛ تصدیق کرنی ہو تو علم کی روشنی میں کرے اور انکار کرنا ہو تو علم کی روشنی میں کرے۔

ایک ضمنی تنبیہ:

اس واقعہ کے ضمن میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ: شیخ ربانی کو اس طرح کے مواقع سے فائدہ اُٹھا کر اپنے شاگردوں کے سامنے مختصر سے الفاظ میں کوئی ایسا منہج اور قاعدہ بیان

کر دینا چاہیے، جو ہمیشہ ان کے کام آئے اور اس سے عمومی نفع پہنچے۔

اس وقت جبکہ میں یہ واقعہ لکھ رہا ہوں، مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے، جو امام شافعیؒ اور ان کے شاگرد محمد بن عبداللہ بن عبدالحکمؒ کے درمیان پیش آیا۔

بیہقی کی "مناقب شافعیؒ"(۱) کے اندر یہ واقعہ موجود ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ابنِ عبدالحکمؒ نے کسی موقع پر امام شافعیؒ کی طرف منسوب کر کے کوئی جملہ نقل کیا، جس کی خبر امام شافعیؒ کو پہنچی، تو انھوں نے انکار کر دیا اور اپنی طرف اس جملہ کی نسبت کو غلط ٹھہرایا، یہ خبر ابنِ عبدالحکم کے والد یعنی عبداللہ بن عبدالحکمؒ کو پہنچی، تو انھیں سخت تکلیف ہوئی اور وہ رنجیدہ ہو گئے؛ کیونکہ انھیں امام شافعیؒ سے بڑی عقیدت تھی اور ان کے اعتقاد کے مطابق ان کے بیٹے نے نقل کرنے میں غلطی کی تھی؛ چنانچہ انھوں نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ امام شافعیؒ نے اس جملہ کا انکار کر دیا ہے، یہ سن کر ابنِ عبدالحکم امام شافعیؒ کے پاس آئے اور انھیں وہ وقت، وہ جگہ اور وہ موقع یاد دلانے لگے جب انھوں نے یہ جملہ کہا تھا، امام شافعیؒ کو یاد آگیا اور انھوں نے اس جملہ کا اقرار کر لیا، اس کے بعد امام شافعیؒ نے ان کی علمی زندگی کے لیے ایک زریں قاعدہ بیان کیا کہ: "**يا محمد، لا تحدث عن حي فإن الحي لايؤمن عليه النسيان**" "محمد! کسی زندہ شخص کی بات نقل مت کیا کرو؛ کیونکہ زندہ شخص پر نسیان طاری ہو سکتا ہے" اس نسیان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نقل کرنے والا شخص جسے اپنے نقل پر پورا اعتماد ہے، دِقّت اور پریشانی میں پڑ جائے گا اور بڑے بڑے مادی اور معنوی حقوق بھی اس پر مرتب ہو سکتے ہیں(۲)۔

نہ ظاہری الفاظ پر جمود ہو نہ ضرورت سے زیادہ تاویل:

نقد کے اس ملکہ کے اندر ایک اہم چیز جو طالبِ علم کے اندر پیدا ہونی چاہیے، یہ ہے کہ: وہ نص کے ظاہری الفاظ کو بھی سمجھے اور اس سے مستفاد ہونے والے مفہوم کو بھی، وہ اس

(۱) ۲:۲۱۶

(۲) لیکن پھر بھی بہر حال اسے ایک عمومی ضابطہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تعلق سے وہی منہج اختیار کرے جو ہمارے علماء اور مشائخ نے گزشتہ علماء کی عبارتوں اور کتاب وسنت کی نصوص کے سلسلے میں اپنایا ہے کہ ان کے یہاں نہ تو ظاہری الفاظ پر جمود ہوتا تھا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''**ظاهرية ولا ابن حزم لها**'' اور نہ اس حد تک تاویل اور الفاظ سے دُوری ہوتی تھی کہ معاملہ وہاں تک پہنچ جائے، جس کے بارے میں ہمارے مشائخ کہا کرتے تھے: ''**التأويل دهليز الإلحاد**'' کہ تاویل الحاد کی دہلیز ہے؛ لہٰذا طالبِ علم بھی نہ تو نص کے ظاہری الفاظ پر جمود اختیار کرے اور نہ نص کو ظاہر سے پھیر کر اپنی فہم کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔

عبارت کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھنے کی کوشش ہو:

اسی سے جُڑی ہوئی ایک اور چیز جو گفتگو کی متقاضی ہے، یہ ہے کہ: طالب علم حتی الامکان عبارت کو صحیح مان کر اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کرے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرے، پھر بھی بات نہ بن پائے تو طباعت کی غلطی مان کر اس غلطی کا پتہ لگائے اور اس کی تصحیح کرے۔

طباعت کی غلطیوں کی تصحیح، ضرورت واہمیت:

موجودہ دَور میں طباعت کی غلطی کی تصحیح طالبِ علم کے لیے انتہائی اہم شے ہوگئی ہے، کچھ دہائیوں پہلے بھی اس کی ضرورت پڑی تھی، جب دینی کتابوں کی طباعت کو تجارت کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنالیا گیا تھا اور تاجروں کے دلوں میں نہ کوئی خوف ہوتا تھا نہ کوئی مانعِ شرعی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے کتب خانے ایسی کتابوں سے بھر گئے جو اغلاط سے پُر اور غیر منقح ہوتی تھیں اور ان ہی کتابوں پر ان کا اعتماد ہوتا تھا؛ اس لیے اگر طالبِ علم کو شروع ہی سے عبارتوں کی غلطی پکڑنے اور ان کی تصحیح کرنے کا عادی نہیں بنایا گیا، تو وہ انجانے میں سنگین تحریفات کا شکار ہوگا، وہ غلط پڑھے گا، غلط سمجھے گا، غلط یاد کرے گا اور دوسروں کو بھی غلط پڑھائے گا اور یہ علم اس کے پاس مختلف زبانوں سے تیار شدہ ایک عجمی علم بن کر رہ جائے گا!!

پھر وہ شعر صادق آنے لگے گا، جسے بعض اساتذہ اس طرح کے موقعوں پر پڑھا کرتے تھے:

أقول له زيد فيسمعه عمرو ❖ وينطقه خالد ويكتبه بكر

"میں اس سے "زید" کہتا ہوں، تو وہ "عمرو" سنتا ہے اور "خالد" کہتا ہے اور "بکر" لکھتا ہے"۔

میں نے پیچھے ذکر کیا تھا[1] کہ پہلے یہ مصیبت مخطوطات کے اندر ہوتی تھی؛ اسی لیے علماء صحیفوں سے علم حاصل کرنے سے ڈراتے تھے کہ ان میں ایسی تحریفات ہوتی تھیں جو ان صحیفوں یا صحیفوں والے علماء سے علم حاصل کرنے والے طالبِ علم کو خراب کر دیتی تھیں، میں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ: یہ مصیبت ہمارے زمانے میں پہلے سے زیادہ سنگین ہوگئی ہے؛ کیونکہ پہلے اگر کسی کتاب میں تحریف ہوتی تھی، تو اس کے نسخوں کی تعداد چاہے جتنی بھی زیادہ ہو، بہر حال آج کی مطبوعہ کتاب کے نسخوں سے کم ہی رہتی تھی؛ کیونکہ آج کسی بھی کتاب کے ایک ایڈیشن کے نسخوں کی تعداد کم از کم تین ہزار ہوتی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ طالبِ علم کو ان دونوں مرحلوں کا عادی بنایا جائے، پہلا مرحلہ: یہ کہ وہ عبارت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کو اسی طرح صحیح مان کر اس کو سمجھنے کے لیے مختلف پہلوؤں سے غور کرے، اس مسئلہ کو دوسری کتابوں میں بھی تلاش کرے کہ شاید اس عبارت کا کوئی صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے، پھر بھی عبارت کو صحیح ماننا ممکن نہ ہو تو دوسرے مرحلہ کی طرف منتقل ہو اور عبارت کے اندر طباعت کی غلطی مان کر اس کو درست کرے، غرض یہ دو مرحلے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ: پہلے آپ اپنی فہم اور سمجھ کو قصوروار ٹھہرائیے، پھر مطبع کو قصوروار ٹھہرائیے۔

غلطیوں کی تصحیح میں ایک معین چیز:

تحریف شدہ عبارتوں کی تصحیح کے سلسلے میں طالبِ علم کے لیے ایک چیز نہایت معین ثابت ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ: جن کتابوں پر عمدہ انداز میں تحقیقی کام ہوا ہے، طالبِ علم ان کا

(۱) ص ۱۸۰

بدقت نظر مطالعہ کرے اور جہاں کہیں محقق کو دیکھے کہ وہ مخطوطات کے تغایر واختلاف کی طرف اشارہ کررہا ہے، وہاں ٹھہر کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ سابق کاتبین سے کس طرح تحریف اور سبقت نظری واقع ہوئی ہے، اس سے اس کے اندر تصحیح کا ملکہ پیدا ہوگا اور وہ خود غلطیوں میں پڑے بغیر دوسروں کی غلطیوں سے بہت کچھ سیکھ لے گا۔

اگر کوئی محنتی محقق جو روزانہ چند گھنٹے تحقیقی کام کرتا ہو، ایک مہینے تک یہ کام کرے کہ اپنے سامنے سے گزرنے والی طباعت کی ہر غلطی کو نوٹ کرتا جائے اور ان سب کو ایک کتاب کے اندر جمع کردے، تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے لیے اور بعد والوں کے لیے ایک نفع بخش علمی ذخیرہ تیار کرلے گا اور اگر ایک سال کی غلطیاں جمع کرلے تو پھر پوچھنا ہی کیا!۔

تصحیح کے حوالے سے اپنی ایک مثال:

آج جبکہ میں ان صفحات کو لکھ رہا ہوں، میرے سامنے سے گزرنے والی طباعت کی سب سے آخری غلطی وہ ہے جو مجھے امام بخاری کی **"الأدب المفرد"**[1] میں نظر آئی، میں نے جب **"الأدب المفرد"** میں یہ سند پڑھی: **حدثنا مخلد بن مالك، قال حدثنا حجاج بن محمد، قال أخبرنا ابن المبارك، عن بكر بن عبدالله المزني...**

اور میں نے دیکھا کہ ابن المبارکؒ بکر مزنیؒ سے روایت کررہے ہیں، تو مجھے اس میں تردد ہوا؛ چنانچہ میں نے سب سے پہلے "تہذیب الکمال" کی مراجعت کی، تو مجھے ان دونوں کے درمیان کوئی روایت نہیں ملی، پھر میں نے تاریخ کی مراجعت کی، تو دیکھا کہ عبداللہ بن مبارک کی پیدائش ۱۱۸ھ کی ہے، جبکہ بکر مزنیؒ ۱۰۶ھ یا ۱۰۸ھ میں وفات پاچکے ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ عبداللہ بن مبارکؒ ان سے روایت نہیں لے سکتے؛ لیکن عبارت کی تصحیح کیسے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ: سند کے اندر ابن المبارکؒ اور بکر مزنیؒ کے درمیان انقطاع ہے۔

(۱) رقم (۷۶۱)

پھر میں نے یہ روایت مصنّف ابنِ ابی شیبہ(۱) کے اندر دیکھی، اس میں ''مبارك بن فصاله عن بكر المزني'' تھا، اب یا تو ابنِ فضالہ اور ابنِ مبارک کے درمیان متابعت تھی یا پھر ''الأدب المفرد'' کے نسخے میں ''ابن'' زیادہ ہوگیا تھا؛ لیکن اس زیادتی کا اتنی جلدی فیصلہ کرنا دشوار تھا۔

پھر کافی تلاش وجستجو کے بعد مجھے امام بخاری کی ہی ایک روایت ان کی ''تاریخِ کبیر'' کے اندر اسی ''الادب المفرد'' والی سند سے مل گئی اور وہیں سے ابنِ عسا کر نے بھی اپنی ''تاریخ'' میں نقل کر رکھی تھی، ان دونوں میں المبارك بن فضاله عن بكر المزني تھا؛ نیز امام احمدؒ کی ''الزهد'' میں بھی ''المبارك عن بكر بن عبدالله'' کا لفظ ملا(۲)۔

پس ثابت ہوگیا کہ ''الأدب المفرد'' کے ایڈیشنوں میں ''ابن'' کے زائد ہونے کی بات صحیح ہے اور صحیح عبارت ''ابن'' کے حذف کے ساتھ ہے، ''الادب المفرد'' اور اس کی شرح ''فضل الله الصمد''(۳) کے ایڈیشنوں میں اس کی تصحیح کر لی جائے۔

غرض طالبِ علم کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ جو کچھ پڑھے اسے بلا چون وچرا تسلیم کرلے۔

نقد کے اندر ادب کی رعایت:

لیکن جو مربی استاذ اپنے طلبہ کے اندر نقد کا ملکہ پیدا کرنا چاہتے ہیں انھیں چاہیے کہ: وہ اس کے ساتھ ان کے اندر ادب کی صفت بھی پیدا کریں کہ ایک پلڑے میں ''احتیاط پر مبنی نقد'' ہو اور دوسرے پلڑے میں ''اعتدال آمیز ادب'' ہو، وہ بھی اس طرح کہ دونوں پلڑے برابر سرابر ہوں، کبھی کوئی پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری نہ ہونے پائے؛ کیونکہ اگر نقد کا پلڑا بھاری ہوگا تو طالبِ علم ٹھوکر کھائے گا اور ادب کے دائرے سے نکل جائے گا

(۱)(۳۶۸۵۳) (۲)التاریخ الکبیر ۲(۱۶۷۹)، ابن عساکر ۱۶:۸، الزهد للامام احمد ص ۲۵۴

(۳)۲:۲۳۰، أو ۲:۱۹۶، من الطبعة الجديدة سنة ۱۴۳۲ھ

اور اگر ادب کا پلڑا بھاری ہوگا، تب بھی طالبِ علم ٹھوکر کھائے گا اور علم کا وہ حق جو علم کی تحقیق وتفتیش کے تعلق سے اس کے ذمہ واجب تھا اسے چھوڑ بیٹھے گا اور اغلاط کا شکار ہو جائے گا۔

شیخ عبدالفتاحؒ کا ایک واقعہ:

میں اپنے عزیز طلبہ کو اپنا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں، جو میرے مرشد ومربی سیّدی عبدالفتاح ابوغدہؒ کے ساتھ ۱۳۷۸ھ میں پیش آیا، یہ واقعہ ہمارے اس زیر بحث موضوع سے کسی قدر تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ میں حلب کے فرافرہ محلّے میں - جو مدارسِ دینیہ سے پُر ایک قدیم محلّہ ہے- مدرسہ سیافیہ کے اندر تھا، یہ مدرسہ شیخ کا ہی تھا، میں اپنے کمرے میں تھا، تبھی شیخ میرے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ: کیا تمہارے پاس ''جامع صغیر'' کی عزیزی والی شرح ہے، میں نے کہا: ہاں ہے اور انھیں مطلوبہ جلد نکال کر دی، انھوں نے اس کے اندر ایک عبارت پڑھی اور اس کو دہرایا اور پھر مجھے کتاب واپس کر دی اور کہنے لگے کہ: شیخ یہی بات کہہ رہے تھے شیخ یہی بات کہہ رہے تھے، ہمیں ان کی بات صحیح سے سمجھ میں نہیں آتی۔

اس واقعہ کے تقریباً تیس سال بعد، جب میں شیخ کے ساتھ مدینہ منورہ میں تھا، کسی موقع پر علامہ احمد شاکرؒ کے ''مسند احمد'' پر کیے گئے تحقیقی کام اور ڈاکٹر حسینی عبدالمجید ہاشمؒ کے تکملہ کا ذکر چھڑا، تو شیخ نے ان پر نقد کرتے ہوئے کہا کہ: انھوں نے ''مسند'' کے حاشیہ میں ''عزیزی'' کی بات کیسے نقل کر دی؟ مطلب یہ تھا کہ: مسند احمد حدیث کی امہات الکتب میں سے ہے، اس کی تحقیق اور شرح کے اندر بڑی کتابوں اور چوٹی کے ائمہ کی بات ہی نقل کرنی چاہیے۔

راقم کہتا ہے کہ: اس طرح تدریج کے ساتھ تربیت کی جاتی ہے: پہلے موقع پر انھوں نے صرف اتنا کہا کہ: شیخ یہی بات کہہ رہے تھے، شیخ یہی بات کہہ رہے تھے، ہم ان کی مراد سمجھ نہیں پاتے ہیں، اس وقت میرا طالبِ علمی کا ابتدائی زمانہ تھا اور شیخ ہی میرے نزدیک سب کچھ تھے، پھر اس کے تیس سال بعد جبکہ میں ان کی اجازت؛ بلکہ ان کے حکم

سے خود بھی کچھ کتابوں پر کام کرنے لگا، اس وقت انھوں نے یہ دوسری بات مجھ سے کہی۔

ان دونوں جملوں میں متعدد فوائد اور سبق ملتے ہیں، مثلاً: تربیت کے اندر تدریج، علماء پر نقد کے ساتھ ساتھ ان کا ادب، اسلاف کی کتابوں پر تحقیقی کام کا طریقۂ کار اور ہر کتاب کو اس کا علمی مقام عطا کرنے کے حوالے سے ایک ہدایت وغیرہ وغیرہ۔

حفاظِ حدیث کے یہاں نقد کے دوران ادب کی رعایت:

اس موقع پر مجھے اپنے ائمہ واسلاف کے احوال میں سے ایک چیز بطور مثال ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جو حقیقت میں صرف اسی ایک چیز کی مثال نہیں؛ بلکہ ایک بے حد عمومی مثال ہے اور وہ ہے ہمارے اسلاف اور علماء کا وہ طرزِ عمل جو ہمیں ان کی تخریج کی کتابوں مثلاً: ''تخریج احیاء'' کتبِ فقہ کی تخریجات: **''نصب الراية''**، **''الدراية''**، **''البدر المنير''**، **''التلخيص الحبير''** وغیرہ میں یا کتبِ اُصول اور کتبِ تفسیر وغیرہ کی تخریجات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ان کتابوں کے اندر ہم حفاظِ حدیث: زیلعیؒ، ابنِ کثیرؒ، عراقیؒ، ابن الملقنؒ اور ابنِ حجرؒ وغیرہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ کتاب کی حدیثوں کو کبھی ضعیف قرار دیتے ہیں، کبھی موضوع، کبھی باطل اور کبھی **لا أصل له** کہتے ہیں، کبھی کچھ اور حکم لگاتے ہیں، کیونکہ ان پر دین اور علم کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر علمی تحقیق کے دوران ان کے سامنے حدیثوں کا یہ حال ظاہر ہو تو ان پر اس طرح کے احکام لگائیں، یہ تو نقد کا پہلو ہوا؛ دوسری طرف آپ ان حضرات کی ڈھیر ساری کتابوں کے درمیان ایک لفظ بھی ایسا نہیں پائیں گے اور نہ پا سکتے ہیں، جو ناموزوں اور ادب کے حدود اور علماء کے احترام کے دائرے سے نکلا ہوا ہو۔

بے ادبی پر حافظ ابنِ حجر کی گرفت:

بلکہ ایک جگہ ابنِ طاہر مقدسیؒ کے قلم نے حد سے تجاوز کیا، جو بڑے حفاظ میں شمار

ہوتے ہیں اور وہ امام الحرمین کے ساتھ بے ادبی کر بیٹھے[1] تو حافظ ابنِ حجرؒ نے ان کی پکڑ کی؛ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی اجتہاد والی حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے حافظ لکھتے ہیں[2] کہ: ابنِ طاہر نے لکھا ہے کہ: اس سلسلے میں مجھے سب سے گھٹیا قول امام الحرمین کا ملا، جو ان کی اُصولِ فقہ والی کتاب میں مذکور ہے[3] کہ: اس باب کے اندر سب سے قابلِ اعتماد حدیث حضرت معاذؓ کی ہے، ابنِ طاہر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: اگر انھیں نقل کے علم سے کچھ بھی واقفیت ہوتی، تو اس طرح کی جہالت کا ارتکاب نہ کرتے، میں کہتا ہوں - مراد ابنِ حجر ہیں - کہ: انھوں نے امام الحرمینؒ کے ساتھ بے ادبی کی ہے، وہ اس بات کو نرم لہجے میں بھی کہہ سکتے تھے......

ابنِ حجرؒ کی گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ حدیث پر ابنِ طاہر کے لگائے ہوئے حکم کو صحیح مان رہے ہیں؛ بلکہ انھوں نے خود بھی امام الحرمینؒ کے بارے میں پیچھے کلام

---

(۱) یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ ابنِ طاہر مقدسی، ابنِ حزم کے مکتبِ فکر کے ہیں؛ کیونکہ وہ **"جمع بین الصحیحین"** کے مصنف ابوعبداللہ حمیدی کے شاگرد ہیں اور حمید ابنِ حزم کے شاگرد ہیں اور ابنِ حزم کی زبان تو حجاج کی تلوار تھی، **رحمهم الله جميعا.**

(۲) **التلخيص الحبير** ۴:۱۸۳

(۳) یعنی "البرہان" ۲: ۵۰۵ (۷۲۰) کے اندر۔ امام الحرمینؒ کے اس قول پر ذہبیؒ نے بھی "سیر" (۱۸/۱۷۴) میں تنقید کی ہے، جس پر سبکیؒ نے "طبقات" (۵/۱۸۷) میں ان کی سخت گرفت کی ہے؛ البتہ ابنِ حجرؒ کا موقف اور ان کا دفاع نرم ہے، سبکی نے جو باتیں ذہبی کی گرفت میں کہی ہیں ان میں ایک بات جو میرے موضوع کے موافق ہے، یہ ہے کہ: سبکی ۵:۱۸۸ لکھتے ہیں کہ: یہی ایک حدیث نہیں ہے جس کے صحیح نہ ہونے کے باوجود امام الحرمین نے صحت کا دعویٰ کیا ہو؛ بلکہ انھوں نے اس کے علاوہ بھی کئی ایک غیر صحیح حدیثوں پر صحت کا حکم لگایا ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے ان کی تنقیص نہیں کی جاسکتی اور نہ انھیں ان کے مقام سے جو آسمانوں سے بھی بلند تر ہے گرایا جاسکتا ہے؛ البتہ سبکیؒ کا حدیث معاذؓ کے بارے میں یہ کہنا کہ: یہ صحیح نہیں ہے، سخت قابلِ اشکال ہے، مقالات کوثری کا دسواں مقالہ ضرور دیکھیے۔

کیا ہے(۱)؛لیکن ان کے لہجے میں نرمی تھی اور ابنِ طاہر کی عبارت چونکہ سخت تھی؛اس لیے انھیں بے ادبی کرنے والا قرار دیا۔

یہ ایک سبق اور ایک منہج ہے،جس میں دَورِ حاضر کے اپنے آپ کو علم کی طرف منسوب کرنے والے لومڑی کے بچوں کی اس کج روی کو درست کیا گیا ہے، جو انھوں نے ائمہ سابقین کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے،سوچیے اگر امام ابنِ حجرؒ اور دوسرے ائمہ اس دَور میں ہوتے اور ان لوگوں کی باتیں سنتے جو ایک امامِ فقہ کو اس کے دین اور اس کے علم کے اندر متہم ٹھہراتے ہیں کہ وہ حدیث میں تصرف کر کے اس کو اپنے مذہب کے مطابق بنالیا کرتے تھے!! یا جو لوگ امام غزالیؒ پر چڑھ بیٹھتے ہیں،صرف اس وجہ سے کہ ان کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں کچھ بے اصل حدیثیں آ گئی ہیں،تو یہ حضرات کیا کہتے۔

اللہ تعالیٰ ادب اور حاملینِ ادب سے راضی ہو،کیا ہی اچھا ہوا کہ وہ لوگ مروت اور اہلِ مروت کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مررت على المروءة وهي تبكي ❖ فقلت على مَ تنتحب الفتاة؟
فقالت: كيف لا أبكي وأهلي ❖ جميعا -دون خلق الله- ماتوا!

''مروت کے پاس سے میرا گزر ہوا، جو بیٹھی رو رہی تھی، میں نے پوچھا: یہ دوشیزہ اس قدر کیوں رو رہی ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ: میں کیوں نہ روؤں، جبکہ میرے اپنے تمام لوگ خلقِ خدا کو چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے''۔

الغرض کہاں تک گفتگو کی جائے، مذکورہ چاروں ارکان یعنی: طالبِ علم کے اندر نقد کا ملکہ پیدا کرنا، ادب کو لازم پکڑنے کا مزاج بنانا، ان دونوں صفتوں پر اس کو پروان چڑھانا اور ان دونوں صفتوں کا برابر سرابر رہنا، یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ان پر گفتگو کے لیے طویل وقت چاہیے؛اتنا اشارہ ضروری تھا جو میں نے کیا۔

(۱)التلخيص الحبير ۱:۲۵۶

چوتھا باب

مربی استاذ کی اپنے طلبہ کی تئیں
کچھ تربیتی مشعلیں

پہلی مشعل

طلبہ کی تربیت اور کردار سازی میں تدریج اختیار کرنا

طلبہ کی تربیت اور کردار سازی میں تدریج کی اہمیت، تعلیم میں تدریج اختیار کرنے سے کچھ کم نہیں ہے، جس کے بارے میں ہم نے پیچھے گفتگو کی ہے (۱)، میں یہاں امام نوویؒ کے کلام کے کچھ جواہر پارے آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں (۲)۔

امام نوویؒ کی ہدایات:

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ: ”استاذ کو چاہیے کہ وہ بتدریج طالبِ علم کو بلند آداب اور پسندیدہ عادات سے آراستہ ہونے، اپنے نفس کو آداب اور مخفی دقائق کا خُوگر بنانے اور تمام ظاہر اور پوشیدہ اُمور میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا عادی بنائیں، چنانچہ وہ سب سے پہلے: اپنے اقوال واحوال کے ذریعہ طالبِ علم کو مسلسل اخلاص، سچائی، حسنِ نیت اور ہر لحہ اللہ کے استحضار کی ترغیب دیں، اسے بتائیں کہ ان صفات کو اپنانے سے اس پر علوم ومعارف کے دروازے کھلیں گے، اس کے سینے میں انشراح پیدا ہوگا اور اس کے دل سے حکمتوں کے سوتے پھوٹیں گے، اسی کے ساتھ اس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا کریں اور اسے سمجھائیں کہ یہ دنیا فانی اور ختم ہونے والی ہے اور آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے۔

(۱) ص ۳۰۳، نیز ص ۴۰۱-۴۰۲ پر علمی تربیت کے حوالے سے میرا اور میرے شیخ کا واقعہ بھی دیکھیے۔
(۲) المجموع ۱: ۳۰

ساتھ ہی اس کے اندر علم کا شوق پیدا کریں، اسے علم اور علماء کے فضائل بتائیں اور سمجھائیں کہ کائنات میں اس سے بڑا کوئی مقام ومرتبہ نہیں ہے۔

امام نوویؒ کی یہ باتیں طلبہ کے اندر بتدریج پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ: مربی استاذ ہمیشہ نہایت دقت اور باریک بینی کے ساتھ ان کی نگرانی کرتے رہیں، اسی طرح جیسے ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کی نگرانی کرتی ہے، آگے کے صفحات میں ان شاء اللہ اس کی وضاحت آئے گی۔

علامہ زاہد کوثریؒ کی ہدایات:

امام کوثریؒ نے اپنے آخری مقالے ''**إحياء علوم السنة بالأزهر**'' کے اندر طلبہ کے احوال کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں، لکھتے ہیں کہ: فاضل مربی تمام احوال میں اپنے طلبہ کی نگرانی کرتا رہے، کھانے پینے، صفائی ستھرائی، لباس وپوشاک، باہمی گفتگو، معاملات، لب ولہجہ، راستوں پر چلنے کی کیفیت اور صبح وشام کے تمام احوال میں؛ تاکہ وہ ایسے افراد پیدا کرنے میں کامیاب ہوسکے جو امت کے لیے صحیح معنوں میں سلیقہ مند ہادی بن سکیں۔

دو اہم چیزیں: تدریج اور شمولیت:

اس استاذ کے ساتھ مربی کی صفت لگانا اس سے متقاضی ہے کہ: وہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں دو چیزوں کا خیال رکھے: ایک تدریج اور دوسرے ہمہ گیریت کا، تدریج اختیار کرے: طلبہ کو خوب سے خوب تر کی طرف لے جانے میں اور ہمہ گیریت کا مطلب ہے: تمام احوال میں ان کی نگرانی کرتا رہے، اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بھی اور ان کے لیے بھی مدد اور سیدھے راستے کی دعا کرتا رہے۔

دوسری مشعل

علم کے آداب اپنانے اور
علم پر عمل کرنے کا مزاج بنانا

شیخ مربی کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ: وہ اپنے طلبہ کو علم کے آداب اپنانے، علم پر عمل کرنے اور علم کے دوران آنے والے عمدہ اوصاف وکمالات سے متصف ہونے پر آمادہ کریں، انھیں اسلاف اور علماءِ ربانیین کے واقعات سنا کر عملی پہلو سے مسلسل آگے بڑھائیں اور بلندیوں تک پہنچنے کے لیے ان کے حوصلوں کو مہمیز لگائیں، اس سے طلبہ کے دل ان کی طرف کھنچیں گے؛ کیونکہ جب وہ اپنے شیخ کو اپنے اُوپر توجہ دیتے ہوئے پائیں گے، تو ان کے دل میں شیخ کا تعلق اور ان کی محبت بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

اس حوالے سے: دسیوں مرفوع احادیث اور سیکڑوں موقوف آثار موجود ہیں، جن میں اپنے علم پر عمل، اپنے اقوال، افعال اور اعمالِ قلب کا محاسبہ، کردار وعمل کے اندر کمال پیدا کرنے کی فکر اور ہر چیز کے اندر اسلاف کے آداب اپنانے کی کوشش وغیرہ اہم اُمور پر زور دیا گیا ہے۔

مذکورہ احادیث وآثار کے مطالعہ کا طریقہ:

ان دلائل اور شواہد سے قریب ہونے کے لیے طالبِ علم کو چاہیے کہ: وہ خطیب بغدادیؒ کی کتاب ''**اقتضاء العلم العمل**'' کا مطالعہ کرے، اسی طرح تراجمِ علماء کی

کچھ بڑی کتابوں مثلاً: ابونعیم کی ''**حلية الأولياء**'' یا اس کا اختصار ابن الجوزیؒ کی ''**صفة الصفوة**'' یا ذہبیؒ کی ''**سير أعلام النبلاء**'' وغیرہ پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈال لے۔

اسی طرح وہ اپنے دل میں تیزی کے ساتھ ان احادیث کا جائزہ لے، جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ اور ان کے واسطے سے پوری امت کو خطاب کرتے ہوئے عمومی طور پر تقویٰ کی اور الگ الگ مختلف نیک اقوال وافعال کو اپنانے اور متعدد نامناسب اقوال وافعال سے باز رہنے کی وصیتیں کی ہیں۔

ہر موقع کی بات الگ ہوتی ہے اور ہر انسان کا مقام مختلف ہوتا ہے اور اسی مقام کے اعتبار سے اس کا محاسبہ کیا جاتا ہے؛ ایک عام صحابی سے اس چیز پر مواخذہ نہیں ہوتا، جس پر کبارِ صحابہؓ اور اہلِ علم صحابہؓ سے مواخذہ کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۂ حجرات کی ابتدائی آیات نازل ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح بات کرتے تھے جیسے کوئی راز کی بات کہہ رہے ہوں[1]، جبکہ دوسری طرف ان صحابی کو بھی دیکھیے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''**لاتُزْرِموه**'' کہ ان کا پیشاب مت روکو۔

طلبہ کو اسلاف کے واقعات سنائے جائیں:

شیخ مربی کو اپنے طلبہ کے سامنے اپنے اسلاف کی سیرت وسوانح میں سے بطورخاص ان کے علم پر عمل؛ بلکہ عمل کی طرف تیزی سے لپکنے کے واقعات سنانے چاہئیں اور بار بار سنانے چاہئیں، میں اس موقع پر دوبارہ ان باتوں کو دہرانا چاہتا ہوں جن کو میں نے پیچھے ذکر کیا ہے[2]:

---

(۱) كما في رواية البخاري (۴۸۴۵)، مع رواية ابن المنذر التي في الفتح۸:۵۹۱

(۲) ص ۲۴۱

خطیب بغدادیؒ امام ابراہیم حربیؒ کا قول نقل کرتے ہیں(۱) کہ: آدمی جب بھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے کوئی ادب سنے تو اس کو مضبوطی سے تھام لے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے، اسی طرح انھوں نے حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ: پہلے آدمی علم حاصل کرتا تھا تو اس کا اثر بہت جلد اس کی سیرت، اس کی زبان، اس کی نگاہ اور اس کے ہاتھوں پر نظر آنے لگتا تھا۔

اسلاف کے چند واقعات:

خطیب بغدادی نے ابوعصمہ بیہقیؒ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک رات امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں ٹھہرا تو انھوں نے پانی لاکر میرے پاس رکھ دیا، جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ پانی جُوں کا تُوں رکھا ہے، کہنے لگے: سبحان اللہ! ایک آدمی علم سیکھتا ہے اور اس کا رات میں اُٹھنے کا کوئی معمول نہیں۔

عقبہ نے ابوعمرو محمد بن ابوجعفر احمد بن حمدان سے روایت کیا ہے، وہ اپنے والد ابوجعفر (فیحد ود ۲۴۰-۳۱۱) سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک روز ابوعبداللہ مروزی کی مجلس میں تھا -شاید ان کی مراد امام محمد بن نصر مروزیؒ (۲۰۲-۲۹۴ھ) ہیں- اتنے میں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا، ابوعبداللہ نے اذان دی اور میں وضو کے لیے مسجد سے نکلا، ابوعبداللہ کہنے لگے: ابوجعفر! کہاں جا رہے ہو؟ میں نے کہا: وضو کرنے، کہنے لگے: میرا گمان تو تمہارے بارے میں کچھ اور تھا، نماز کا وقت آ گیا اور تم بغیر وضو کے ہو!!۔

اسی طرح کے ایک واقعہ پر میرے مرشد و مربی شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے انتہائی عمدہ الفاظ میں تبصرہ کیا ہے، وہ "**رسالۃ المسترشدین**"(۲) کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ: یہ غایت درجے مراقبہ اور استحضار کی بات ہے؛ کیونکہ مملوک کے ذمہ مالک کا یہ حق ہے کہ وہ مالک کے پاس اس کے بلانے سے پہلے ہی موجود رہے، نہ یہ کہ بلانے کے بعد حاضر ہو۔

(۱) الجامع (۱۷۶، ۱۷۸، ۱۸۱، ۱۸۲) (۲) ص ۲۴۵

میں پچھلی باتوں پر اضافہ کرتے ہوئے اس موقع پر امام ابوداوٗد صاحبِ ''سنن'' کا واقعہ بھی نقل کرتا ہوں، حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ: ابنِ عبد البرؒ نے بسند جید کے ساتھ امام ابوداوٗدؒ سے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ وہ کشتی میں سوار تھے، انھوں نے دریا کے کنارے کسی چھینکنے والے شخص کو الحمدللہ کہتے ہوئے سنا، تو فوراً ایک درہم کے عوض ایک چھوٹی کشتی کرائے پر لے کر اس چھینکنے والے کے پاس گئے اور اسے **یرحمک اللہ** کہہ کر واپس آئے، کسی نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا کہ: ہوسکتا ہے وہ شخص مستجاب الدعوات رہا ہو، رات میں جب لوگ سوئے تو انھوں نے ایک آواز سنی، کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا: کشتی والو! ابوداوٗد نے ایک درہم کے بدلے جنت خرید لی(۱)۔

اسی طرح اضافہ کے طور پر میں امام زاہد ابوعثمان سعید بن اسماعیل حیریؒ کا واقعہ بھی نقل کرنا چاہتا ہوں، جسے خطیب نے (۲) روایت کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ابوجعفر احمد بن حمدان حیریؒ نے صحیح مسلم پر استخراج کا کام کیا، جسے وہ مسجد کے اندر مغرب سے عشاء تک لوگوں کو پڑھ کر سناتے تھے، اس مجلس میں ابوعثمان حیریؒ بھی شریک ہوتے تھے، مجلس کے آخر میں اور نماز کے بعد ابوجعفر احمد بن حمدان کے بیٹے محمد ان کے پاس آتے تھے؛ تاکہ وہ اپنے والد کو گھر لے جائیں، ایک دن وہ مسجد میں آئے، تو ابوعثمان حیریؒ عشاء کی نماز شروع کر چکے تھے، وہ کہتے ہیں کہ: میں نے دیکھا کہ ان کے جسم پر ایک ازار اور ایک چادر تھی، انھوں نے ہمیں نماز پڑھائی اور اپنے گھر چلے گئے، میں بھی اپنے والد کے ساتھ گھر آ گیا، گھر پہنچ کر میں نے والد صاحب سے دریافت کیا کہ: ابوجان! کیا ابوعثمان نے احرام باندھ لیا ہے؟، انھوں نے فرمایا: نہیں! بلکہ ان کا یہ معمول ہے کہ جب بھی کسی ایسی سنت کے بارے میں سنتے ہیں جس پر انھوں نے اب تک عمل نہ کیا ہو، تو وہ کوشاں رہتے

(۱) فتح الباری ۱۰: ۶۱۰-۶۱۱ (۶۲۲۵)

(۲) الجامع (۱۸۸)

ہیں کہ اسی دن اس پر عمل کرلیں، آج انھوں نے میرے پاس یہ حدیث سنی تھی کہ: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ازار اور ایک چادر میں نماز پڑھائی، تو انھوں نے چاہا کہ صبح سے پہلے اس پر عمل کرلیں۔

اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے حوالے سے ایک عجیب وغریب واقعہ وہ بھی ہے، جسے ابونعیم اور ابنِ ابی یعلی نے ابراہیم بن ہانی نیساپوری کے ترجمہ میں ذکر کیا ہے(۱)، ابراہیم کہتے ہیں کہ: امام احمدؒ میرے پاس تین دن چھپے رہے، اس کے بعد فرمانے لگے کہ: میرے لیے کوئی جگہ تلاش کرو جہاں میں منتقل ہوجاؤں، میں نے کہا: ابوعبداللہ! ابھی آپ محفوظ نہیں ہیں، انھوں نے فرمایا کہ: تم جگہ تلاش کرو، پھر میں تمہیں اس کا سبب بتاؤں گا؛ میں نے ان کے لیے ایک جگہ تلاش کی، جب وہ وہاں سے نکلے تو انھوں نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار میں تین دن تک روپوش رہے اور تین دن کے بعد باہر نکل آئے، یہ ہمارے لیے مناسب نہیں کہ ہم آسانی کے زمانے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کریں اور سختی کے زمانے میں اتباع چھوڑ دیں، رضی اللہ عنہ وارضاہ(۲)۔

ان واقعات کے پاس رُک کر استاذ کو چاہیے کہ وہ طلبہ کو متوجہ کریں، خاص طور پر اس طرح کے نوادرات کے پاس انھیں ضرور روکیں۔

اب سوچیے! کہاں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اس درجہ اہتمام اور کہاں وہ صورتِ حال جس کی شکایت امام کوثریؒ نے سابق شیخ ازہر شیخ مصطفیٰ عبدالرزاقؒ سے کی تھی، جو ۱۳۶۵ھ اور ۱۳۶۶ھ کے درمیان شیخ ازہر تھے، یہ شکایت ان کے آخری مقالے میں ہے، وہ لکھتے ہیں کہ: ہم نظامیہ کے شعبوں میں دیکھتے ہیں کہ وہاں طلبہ اس وقت بھی

(۱) ابونعیم نے حلیہ ۹: ۱۸۰ میں اور ابن ابی یعلی نے اپنی طبقات ۱: ۲۵۲ میں اس کو ذکر کیا ہے

(۲) حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وہ واقعہ بھی دیکھیے جو ص ۲۰۸ پر گزر چکا ہے

بدستور پڑھتے رہتے ہیں، جب مؤذن اذان دیتا ہے اور مسلمان اللہ کے داعی کی بات پر لبیک کہتے ہوئے مسجد پہنچ جاتے ہیں اور ان طلبہ کے پہلو میں اور ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے لگتے ہیں؛ لیکن ہمارے یہ بڑے حضرات ان طلبہ میں سے کسی کو بھی اس خدائی دعوت پر لبیک کہنے کی ترغیب نہیں دیتے۔

پیچھے جو میں نے دَورِ حاضر کے کچھ قابلِ رشک نمونے پیش کیے تھے[1]، ان میں سے ایک نمونہ دوبارہ پیش کرنا چاہتا ہوں، جو داعیِ کبیر شیخ ڈاکٹر محمد عوضؒ نے خود مجھ سے بیان کیا ہے، ڈاکٹر محمد عوضؒ مربی کبیر شیخ عبدالکریم رفاعیؒ کے سب سے جلیل القدر شاگرد ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ: ایک مرتبہ انھوں نے مسجد میں چاشت کی نماز پڑھی اور سلام پھیرنے کے بعد فوراً اُٹھ کر چل دیے، ان کے شیخ پیچھے سے انھیں دیکھ رہے تھے، جب انھیں جاتے ہوئے دیکھا تو آواز دے کر کہنے لگے کہ: شیخ محمد! ایسا لگتا ہے کہ تم اپنے رب سے بے نیاز ہوگئے ہو؟ شاگرد نے گھبرا کر پوچھا: حضرت! میں کچھ سمجھا نہیں؟ فرمایا کہ: تم سلام کے بعد فوراً چل دیتے ہو اور اللہ سے کچھ مانگتے نہیں!!۔

علمائے ربانیین اسی طرح اپنے شاگردوں کی نگرانی کیا کرتے ہیں، اب بتایئے کہ وہ شخص جسے ان علمائے ربانیین سے کوئی واسطہ اور تعلق نہ رہا ہو اور نہ اس نے ان حضرات سے کچھ حاصل کی ہو، اسے یہ ہدایات اور رہنمائیاں کہاں سے مل سکتی ہیں، وہ ایسی نگرانی کہاں سے پاسکتا ہے اور جب نہیں پاسکتا تو پھر اسے عمدہ صفات اور خوبیوں میں ترقی کیسے نصیب ہوسکتی ہے!!۔

اور پھر تربیت کے راستے کی یہ ترقیاں اس شخص کو کہاں نصیب ہوسکتی ہیں، جو سرے سے شیوخ ہی سے علم حاصل نہیں کرتا اور اس شخص کو کہاں سے نصیب ہوسکتی ہیں جو محض جامعات میں داخلہ لے کر ڈگریاں حاصل کرلیتا ہے، نہ پابندی، نہ شیوخ کی ملازمت، نہ

(۱) ص ۲۴۱

علمی بحث ومباحثہ اور پھر ان ترقیات کی بُو بھی اس شخص کو کیسے نصیب ہوسکتی ہے جو آن لائن جامعات میں محض برقی آلات کی اسکرینوں کے پیچھے اپنے استاذ سے دُور کہیں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرلیتا ہے اور بڑی بڑی ڈگریاں پالیتا ہے (جو صرف نام اور لقب کی ڈگریاں ہوتی ہیں حقیقت سے ان کا دُور دُور تک واسطہ نہیں ہوتا) ؟!!۔

والأجوبة عند المسئول لا السائل.

اس طرح تربیت کرنے اور اپنے شاگردوں کے حوصلے بڑھانے سے بہت جلد طالبِ علم کے کردار میں تبدیلیاں آنے لگتی ہیں، جیسا کہ ہم نے حسن بصریؒ کے ارشاد کے اندر دیکھا۔

خطیب بغدادیؒ نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ: جو شخص علم کی طلب میں لگے، اس کے اندر وقار، سنجیدگی اور خشیت کا پایا جانا ضروری ہے اور ساتھ ہی وہ گزشتہ لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے والا بھی ہو[1]۔

علم کا حصول عمل کے لیے ہے:

لیکن اگر کوئی شخص علم کو ایک پیشہ اور ملازمت سمجھ بیٹھے اور اسے روزی کمانے کا ذریعہ بنالے، تو اس کے اندر کوئی خیر نہیں ہوسکتی، نہ اس کے علم میں کوئی خیر ہوسکتی، نہ اس کے طلبِ علم میں۔

اسی طرح جو شخص علم کو اعتراضات ومناقشات، فلاں اور فلاں پر جرح کرنے، اس کی ساکھ کو متاثر کرنے اور لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا ذریعہ بنالے کہ: فلاں کا تعلق تو فلاں مکتبِ فکر سے ہے اور فلاں تو فلاں مکتبِ فکر کا حامل ہے، ایسے شخص کے اندر بھی کوئی خیر نہیں ہوسکتی، نہ اس کی ذات میں کوئی خیر ہوسکتی ہے، نہ اس کے علم میں کوئی خیر ہوسکتی ہے اور نہ اس کی تحریروں میں کوئی خیر ہوسکتی ہے۔

(۱) الجامع لاخلاق الراوی (۲۱۲)

علم کا حصول تو اس لیے ہے کہ اس پر عمل کیا جائے، امت کو سکھایا جائے، اپنے اور امت کے افکار وعقائد کو درست کیا جائے اور جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اور منشا ہے جس کو ہمارے ائمۂ سلف اور ان کا نہج اختیار کرنے والوں نے سمجھا ہے اسی کے مطابق اپنے اور امت کے اعمال کو ڈھالا جائے۔

عمل دو چیزوں کے مجموعے کا نام:

عمل نام ہے: تخلیہ (خالی کرنے) اور تحلیہ (یعنی آراستہ کرنے) کا، تخلیہ سے مراد ہے: معاصی اور منہیات کو چھوڑ کر اپنے آپ کو رذائل سے پاک کرنا اور تحلیہ سے مراد ہے: مامورات اور اچھے کاموں کے ذریعہ اپنے آپ کو سنوارنا۔

امام ابن الحاج (متوفی ۷۳۷ھ) کے حوالے سے گزر چکا ہے[1] کہ: انھوں نے اپنے زمانے یعنی آٹھویں صدی ہجری کے اوائل کے علماء کے کچھ احوال بیان کرنے کے بعد[2] جو اہلِ علم وکمال کے مقام ومنصب سے میل نہیں کھاتے، لکھا ہے کہ: یہی وجہ ہے کہ سیّدی ابو محمد ابن ابی جمرہؒ کے سامنے جب ان کے زمانے کے علماء میں سے کسی کا تذکرہ ہوتا، جو اس طرح کے نازیبا اعمال کی طرف منسوب ہوتا اور اس شخص کے علم کی تعریف کی جاتی، تو وہ فرماتے: ناقل ناقل (کہ وہ ناقل ہے، ناقل ہے)، اس ڈر سے کہ کہیں علم کا منصب نااہلوں کی طرف منسوب نہ ہوجائے اور اس خوف سے کہ یہ بات جھوٹ نہ ہوجائے؛ اس لیے کہ ناقلِ علم حقیقت میں عالم نہیں ہوتا وہ تو پیشہ وروں میں سے ایک پیشہ ور ہوتا ہے۔

ان کے الفاظ پر غور کیجیے کہ: اس ڈر سے کہ کہیں یہ جھوٹ نہ ہوجائے، یعنی: علم پر عمل نہ کرنے والے کو عالم کہنا ان کی نظر میں جھوٹ ہے!!۔

(۱) ص ۲۱
(۲) المدخل ۱: ۱۷

اسلاف معاصی کو علم کے لیے رکاوٹ سمجھتے تھے:

متعدد ائمۂ اسلام نے علم کی حفاظت کے لیے معاصی اور گناہ چھوڑنے کی وصیت کی ہے، جن میں امام مالکؒ، بشر حافیؒ، وکیع بن جراحؒ اور صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے افراد شامل ہیں (۱)۔

امام مالکؒ کی ایک نصیحت وہ ہے جو انھوں نے امام شافعیؒ سے کی تھی، جس وقت امام شافعیؒ پہلی بار ان کے پاس گئے تھے اور موطا پڑھنا شروع کیا تھا، انھوں نے فرمایا: محمد! اللہ سے ڈرتے رہو اور معاصی سے بچو، عنقریب تمہاری ایک شان ہوگی (۲)۔ اس کے بعد امام بیہقیؒ نے اپنی سند سے امام مالکؒ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے، جو انھوں نے امام شافعیؒ سے ہی فرمایا تھا کہ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں ایک نُور ڈالا ہے، اس نُور کو گناہوں کے ذریعہ بجھامت دینا۔

امام صاحبؒ کا عبرت آمیز طرزِ عمل:

امام ابوحنیفہؒ کے احوال میں یہ بات ملتی ہے کہ: انھیں جب کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آتا، تو اپنے شاگردوں سے کہتے کہ: یقیناً مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے، پھر استغفار کرتے اور بسا اوقات کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگتے اور آپ کو وہ مسئلہ سمجھ میں آجاتا، آپ فرماتے کہ: اُمید ہے کہ میری توبہ قبول ہوگئی ہے، یہ بات جب فضیل بن عیاضؒ کو معلوم ہوئی تو وہ بہت روئے اور فرمایا کہ: ان کے گناہوں کی کمی نے انھیں یہ کیفیت عطا کی ہے؛ دوسروں کو اس طرف کہاں توجہ ہوتی ہے (۳)۔

(۱) ان کے اقوال کے لیے دیکھیے: الجامع لاخلاق الراوی (۱۸۴۶) فما بعدہ

(۲) یہ ایک طویل واقعہ ہے، دیکھیے: مناقب الشافعی للبیہقی ۱: ۱۰۲

(۳) اس کو ہمارے شیخ نے "**رسالة المسترشدين**" **للمحاسبي** ص ۲۱۸ کے حاشیہ میں ملا علی قاری کی "**طبقات الحنفية**" سے نقل کیا ہے، جو "**الجواهر المضية**" **للقرشي** (مطبوعہ حیدر آباد، ہندوستان) کے آخر میں موجود ہے۔

امام صاحبؒ کا یہ معمول تو ان مسائل کے تعلق سے تھا جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتے اور حل نہیں ہو پاتے تھے، ایک دوسرا معمول آپ کا علم میں اضافہ کے تعلق سے بھی تھا؛ چنانچہ زرنوجیؒ[1] نے نقل کیا ہے، آپ فرماتے تھے کہ: ''میں نے یہ علم حمد اور شکر کے ذریعہ حاصل کیا ہے، جب بھی مجھے کوئی بات سمجھ میں آئی اور کسی حکمت اور فقہی نکتے کا علم ہوا اور اس پر میں نے الحمدللہ کہا، تو میرے علم میں اضافہ ہوا''، یہ آپ نے اللہ رب العزت کے اس ارشاد سے اخذ کیا تھا: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ (ابراہیم:۷) (اگر تم شکر کروگے تو تم کو زیادہ نعمت دوں گا) یہ بھی کتاب اللہ کا فقہ ہے۔

معاصی کا طالبِ علم پر اثر انداز ہونا اور اس کے سفر میں رکاوٹیں پیدا کرنا، ایک مسلّم بات ہے، اس قسم کے مضامین اس بحث کے شروع میں بھی گزر چکے ہیں، یہ علم دراصل میراثِ نبویؐ اور نُور ہے اور نُور و ظلمت ایک قلب میں جمع نہیں ہو سکتے۔

پھر طالبِ علم کے گناہ کی نحوست، اس کی وباء اور اس کا وبال صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے قبیل سے ہوتا ہے ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً﴾ (الانفال:۲۵) (کہ تم اس وبال سے بچو جو خاص انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا، جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں)۔

ایک زریں جملہ:

اس بحث کے اختتام پر میں امام حافظ علی بن احمد بن محمد حسینی بغدادیؒ (متوفی ۵۷۵ھ) کا ایک قیمتی جملہ نقل کرنا چاہتا ہوں کہ: ''نوافل کو فرائض کی طرح سمجھو اور معاصی کو کفر کی طرح جانو''[2] مطلب یہ ہے کہ: نوافل کا اسی طرح اہتمام کرو جس طرح فرائض کا کرتے ہو اور معاصی سے اسی طرح بچو جیسے کفر سے بچتے ہو، یہ جملہ ہر مسلمان اور ہر طالبِ علم کے لیے ایک گراں قدر نصیحت ہے، جس میں تحلیہ اور تخلیہ دونوں چیزیں آگئی ہیں۔

(۱) ص ۵۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ۴: ۱۳۶۲، طبقات السبکی ۷: ۲۱۳

تیسری مشعل

ہر موقع پر طلبہ کی حوصلہ افزائی کی صورتیں اختیار کرنا

مربی استاذ کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ انھیں جب بھی موقع ملے، وہ اپنے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی صورتیں اختیار کریں، مثلاً امامت یا تقریر ووعظ کے لیے انھیں آگے بڑھادیں یا ان کی کوئی بات اپنی کتاب میں نقل کردیں یا ان سے کوئی حدیث یا کوئی علمی مسئلہ روایت کردیں یا عوام الناس یا ہم عصروں کے سامنے ان کی تعریف کردیں، اسلاف سے اس قسم کے بے شمار واقعات منقول ہیں، اجمالی طور پر علومِ حدیث کی بڑی کتابوں کے اندر **''رواية الأكابر عن الأصاغر''**، **''رواية الآباء عن الأبناء''**، **''المدبج''** اور **''السابق واللاحق''** جیسی انواع کے اندر ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

امام بخاریؒ کا اپنے شاگردوں سے روایت کرنا:

ان ہی واقعات میں امام بخاریؒ (۱۹۴-۲۵۶) کا اپنے دو شاگردوں: ابنِ خزیمہ صاحبِ ''صحیح'' (۲۲۳-۳۱۱) اور ابوالعباس سراج (۲۱۶-۳۱۳) سے روایت کرنا ہے، ابنِ خزیمہ سے روایت کا تذکرہ تو ''سیر'' میں موجود ہے[1]، ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ: ان سے بخاری اور مسلم نے غیر صحیحین میں روایت لی ہے اور ابوالعباس سراج کے بارے میں سخاویؒ لکھتے ہیں کہ: بخاری نے ان سے اپنی ''تاریخ'' وغیرہ میں کچھ چیزیں روایت کی ہیں[2]۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۴: ۳۶۶

(۲) فتح المغیث ۴: ۱۷۳

امام بخاری کے ایک اور شاگرد: امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ سے ان کی روایت کی صراحت تو مجھے کہیں نہیں ملی؛ البتہ ان کے ''سماع'' کی صراحت خود امام ترمذیؒ نے اپنی ''سنن'' میں کی ہے(۱)۔

امام دارقطنیؒ کا اپنے شاگرد کی کتاب سماعت کرنا:

حافظ ذہبیؒ نے حافظ عبدالغنی بن سعید ازدیؒ کے ترجمہ میں ان کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے، جو ان کے شیخ امام دارقطنیؒ کے ساتھ پیش آیا، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے جس وقت **''المؤتلف والمختلف''** لکھنی شروع کی، تو ہمارے یہاں امام دارقطنی تشریف لائے؛ چنانچہ میں نے ان سے بہت سی چیزیں لے کر اپنی کتاب میں شامل کیں، جب میں کتاب لکھ کر فارغ ہوا، تو امام دارقطنیؒ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کتاب کو ان کے سامنے پڑھوں؛ تاکہ وہ مجھ سے اس کتاب کی سماعت کریں، میں نے کہا کہ: آپ ہی سے تو میں نے اکثر چیزیں لی ہیں!! وہ فرمانے لگے: نہیں! یہ بات مت کہو، وہ باتیں تم نے مجھ سے الگ الگ طور پر مختلف اوقات میں لی ہیں اور اس کے اندر تم نے وہ سب باتیں اکٹھی جمع کردی ہیں؛ نیز اس میں بہت سی چیزیں وہ بھی ہیں جو تم نے دوسرے شیوخ سے حاصل کی ہیں۔ حافظ عبدالغنیؒ کہتے ہیں کہ: میں نے پھر وہ کتاب ان کو پڑھ کر سنائی(۲)۔

اسی طرح ہم حافظ مزیؒ کو ''تہذیب الکمال'' میں دیکھتے ہیں کہ وہ بکثرت رواۃ کے بارے میں کہتے ہیں: **''روى عنه فلان وهو من شيوخه''** کہ فلاں نے بھی ان سے روایت کی ہے اور وہ ان کے شیوخ میں سے تھے۔

اسی طرح حافظ ابنِ حجرؒ نے امام ابوحیان اندلسیؒ کے ترجمہ میں ان کی تعریف کرتے

(۱) حدیث (۳۳۰۰، ۳۷۲۷) کے بعد، اسی طرح کی بات علل صغیر میں بھی ہے، جو ان کی سنن کے آخر میں کتاب کے اختتام سے دوصفحات پہلے ہے۔
(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۷:۲۷۰

ہوئے اِس علمی اور تربیتی صفت کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ: وہ اپنے طلبہ میں سے ذہین طلبہ پر توجہ رکھتے تھے، ان کو اہمیت دیتے اور ان کی صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے تھے (۱)۔

یہ چند انفرادی احوال اور واقعات ہیں، جو ہم نے پیش کیے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چیز نے طلبہ پر بڑا گہرا اثر چھوڑا ہوگا۔

شاگردوں کی حوصلہ افزائی اُسوۂ رسولؐ ہے:

اس صفت کے اندر ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ: اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، جو اپنے صحابہؓ کی اُن عمدہ صفات کا تذکرہ کرتے تھے، جن میں ہر صحابی دوسرے سے ممتاز ہوتا تھا؛ چنانچہ حضرت انسؓ کی ایک حدیث کے اندر ہے، وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ: میری امت کے اندر امت کے تئیں سب سے رحم دل ابوبکر، اللہ کے معاملے میں سب سے سخت عمر، حیا کے اندر سب سے کامل عثمان، حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبل، میراث سے سب سے زیادہ واقف زید بن ثابت اور قرآن کے سب سے بڑے قاری اُبی بن کعب ہیں، ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور میری امت کے امین عبیدہ بن جراح ہیں (۲)۔

مسند احمد میں (۳) حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں ہے کہ: تم ان دو لوگوں کی اقتدا کرنا جو میرے بعد ہوں گے: یعنی ابوبکر اور عمر کی اور عمار کے عہد کو مضبوطی سے تھامنا اور ابنِ مسعود جو کچھ بیان کریں اس کی تصدیق کرنا۔

---

(۱) الدرر الکامنۃ ۴: ۳۰۳

(۲) ترمذی (۳۷۹۰، ۳۷۹۱)، نسائی (۸۲۴۲)، ابن ماجہ (۱۵۴)، امام ترمذی نے اس کو **حسن صحیح** قرار دیا ہے، اس کا آخری جز بخاری (۳۷۴۴) اور مسلم ۴: ۱۸۸۱ (۵۳) کے یہاں حضرت انسؓ سے بھی ہے۔ (۳) ۵: ۳۸۵، اس کا ابتدائی حصہ امام ترمذی کی یہاں بھی ہے (۳۶۶۲، اس کو انہوں نے **حسن** قرار دیا ہے، ۳۶۶۳)

ان ہی دونوں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے خطیب نے یہ بات کہی ہے کہ: فقیہ کے لیے مستحب ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کے علمی مقام ومرتبہ سے لوگوں کو واقف کرائے، ان کے فضل وکمال کا تذکرہ کرے اوران کی قدرومنزلت واضح کرے؛ تاکہ اس کے جانے کے بعد لوگ نئے پیش آمدہ مسائل میں ان شاگردوں کی طرف رجوع کرکے اپنے مسائل حل کروائیں(۱)۔ خطیبؒ نے ان دو حدیثوں کے علاوہ حضرت عمرؓ کا ایک اثر بھی ذکر کیا ہے، جس میں انھوں نے حضرت ابنِ عباسؓ سے فرمایا کہ: آپ کو وہ علم حاصل ہے جو ہمیں حاصل نہیں ہے۔

طلبہ کی خصوصیات ذکر کرنے کا فائدہ:

دوسروں کی خصوصیات سے اس طرح آگاہ کرنا خود اس شخص کے لیے بھی اور اس کے جانے کے بعد امت کے لیے بھی بہترین منافع اور ثمرات کے حصول کا سبب بنتا ہے؛ کیونکہ اس میں متکلم کی طرف سے ایک طرف تمام لوگوں کو اس بات کی ترغیب ہوتی ہے کہ: ان لوگوں کے اندر موجود ان مذکورہ خصوصیات سے فائدہ اُٹھائیں اور دوسری طرف طلبہ کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اس عالم سے اس کا وہ خصوصی علم حاصل کرلیں جس میں وہ اپنے ہم عصروں سے ممتاز ہیں۔

حوصلہ افزائی بقدرِ ضرورت ہی ہو:

لیکن ان سب کے ساتھ استاذ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ: طلبہ کے ساتھ یہ حوصلہ افزائی دوا کے درجے میں ہونی چاہیے کہ ضرورت کی جگہ پر ہی رکھی جائے اور اتنی ہی مقدار میں رکھی جائے جتنی ضرورت ہے، نہ کم نہ زیادہ۔

(۱)آداب الفقیہ والمتفقہ ۲:۲۹۰

چوتھی مشعل

طلبہ کو متقدمین علماء کی سیرتیں پڑھنے کی تاکید کرنا

مربی استاذ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ متقدمین علماء کی سیرت اور ان کے علمی اور عملی احوال وواقعات کے مطالعہ کی طرف اپنے طلبہ کی توجہ مبذول کریں اور اس پر خوب زور دیں؛ تا آنکہ ان کو اس کی عادت پڑ جائے اور یہ چیز ان کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔

امام ابن الجوزیؒ کی ائمہ سلف کے احوال پڑھنے کی تاکید:

امام ابن الجوزیؒ نے کئی جگہوں پر اس کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ: متقدمین علماء کی ہمتیں بہت بلند ہوتی تھیں، جس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے، جو ان کی زندگیوں کا نچوڑ ہیں؛ لیکن اب ان میں سے بیشتر کتابیں بوسیدہ ہو چکی ہیں؛ کیونکہ اب طلبہ کی ہمتیں کمزور پڑ گئی ہیں اور وہ مختصرات تلاش کرنے لگے ہیں؛ لیکن سمجھ لو! کہ جس کسی کو بھی طلبِ علم میں کمال حاصل کرنا ہو، اس کے لیے راستہ یہی ہے کہ وہ گزشتہ کتابوں سے واقف ہو اور ان کا خوب مطالعہ کرے، اسے ان کتابوں کے اندر ایسے علوم ملیں گے اور ایسی بلند ہمتی نظر آئے گی، جس سے اس کا ذہن تیز ہوگا اور محنت اور جدو جہد کے لیے اس کے عزائم کو ایک تحریک ملے گی، کوئی بھی کتاب فائدے سے خالی نہیں ہوتی، میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ان لوگوں کی روِش سے جن کے بیچ ہم زندگی گزار رہے ہیں، ان میں کوئی بھی ایسا باہمت نظر نہیں آتا جس کی مبتدی طالبِ علم اقتداء کر سکے اور نہ کوئی ایسا پرہیزگار جس سے کوئی سالک استفادہ کر سکے، خدا کے لیے کچھ تو خوف کرو، اپنے اسلاف

کی سیرتوں کو لازم پکڑو اوران کی تصنیفات اور واقعات کا خوب مطالعہ کرو(۱)۔

یہ ایک گہری بصیرت رکھنے والے عالم کی نصیحت ہے، جو علمائے سابقین کے احوال کے مطالعہ پر زور دے رہے ہیں، دراصل علمائے سابقین کی سیرتوں کو پڑھنا، ان کے ساتھ زندگی گزارنا ہے اوراس سے پڑھنے والوں کی روح کے اندر علمائے سلف کے احوال وکیفیات اسی طرح سرایت کرجاتے ہیں، جیسے سبز لکڑی کے اندر پانی سرایت کرجاتا ہے اوراس کو سخت، قوی اور بار آور بنادیتا ہے۔

متقدمین علماء کی سیرتوں کے تعلق سے کچھ کتابیں:

میں طالبِ علم کو نصیحت کرتا ہوں کہ: وہ امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیریؒ (۳۷۶-۴۶۵ھ) کی "**الرسالة القشيرية**" کے شروع کا تراجم والا حصہ ضرور پڑھے، امام قشیریؒ بڑے پائے کے عالم تھے، ابوسعد سمعانیؒ اپنی کتاب "الانساب" میں "قشیری" مادّے کے اندر ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: وہ علم، فضل اور زہد کے اعتبار سے دنیا کے مشاہیر علماء میں شمار ہوتے ہیں، حافظ ذہبیؒ نے سمعانیؒ سے ہی قشیری کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے کہ: امام قشیریؒ نے خود بھی اپنے جیسا باکمال اور فائق شخص نہیں دیکھا، وہ شریعت اور طریقت دونوں کے جامع تھے(۲)۔ ابنِ عساکرؒ نے باخَرزی سے نقل کیا ہے اور ان کی موافقت بھی کی ہے کہ: انھیں علوم پر جو دسترس حاصل تھی وہ انسان کے بس کی بات نہیں!(۳)۔

سبکیؒ کی "طبقات" میں(۴) امام سمعانیؒ سے ہی ایک طویل کلام منقول ہے جس کے

(۱) صید الخاطر ص ۳۷۵ (۷۳۳)، لفتۃ الکبد ص ۲۰ بھی دیکھیے۔

(۲) سیر اعلام النبلاء ۱۸: ۲۳۰

(۳) تبیین کذب المفتری ص ۲۷۴

(۴) ۵: ۱۵۸

اندر یہ واقعہ بھی ہے کہ: امام قشیریؒ ایک مرتبہ حج پر گئے، اس سال حج کے لیے چار سو (۴۰۰) قضات وائمہ آئے ہوئے تھے، ان لوگوں نے سوچا کہ بیت اللہ کے اندران میں سے کسی کو بات کرنی چاہیے، تو سب کی متفقہ طور پر رائے ہوئی کہ ابوالقاسم قشیری ہی بات کریں گے؛ چنانچہ انھوں نے ہی بات کی، یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی نظیر ائمہ کی سوانح میں کم ملے گی!۔

یہ تو مؤلِف کا تعارف ہوا، رہی بات مؤلَف (کتاب) کی تو اس کی غیر معمولی شہرت اور گزشتہ تقریباً ایک ہزار سال سے علماء کے اس پر اعتماد نے اب اس کی تعریف کی ضرورت باقی نہیں چھوڑی، حتیٰ کہ خود مصنف امام قشیری کا تعارف بھی کتاب ہی سے ہونے لگا؛ چنانچہ کتب تراجم میں ان کے ترجمہ کے شروع میں لکھا ہوتا ہے: **"هو أبوالقاسم عبد الكريم صاحب الرسالة"**(۱)۔

تو جب کتاب کے مصنف اس پایہ کے ہیں اور خود کتاب کو علماء کی طرف سے اتنی طویل صدیوں تک اس درجہ تلقی بالقبول حاصل ہے، تو کیا وہ اس لائق نہیں کہ اس پر توجہ دی جائے اور اس سے استفادہ کیا جائے۔

میں ایک اور کتاب کی طالبِ علم کو نصیحت کرتا ہوں، وہ ہے: ذہبی کی **"سير أعلام النبلاء"** یہ اُسوہ بنائے جانے کے قابل کتاب ہے، اس میں علم بھی ہے، عمل بھی ہے، سلوک بھی ہے اور اسلاف اور ان کے نہج پر چلنے والے اور ان کی کامل اتباع کرنے والے علماء کی سیرتیں بھی، اللہ تعالیٰ سب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے، اس کتاب کے بعض حواشی میں جو نحوست اور خشکی درآئی ہے، اس پر توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔

(۱) جیسا کہ آپ ذہبیؒ کی سیر ۱۸: ۲۲۷ اور تاج سبکی کی طبقات ۵: ۱۵۳ میں دیکھیں گے۔

پانچویں مشعل

دنیا اور اہلِ دنیا کے مال ومتاع سے اعراض

ایک اور چیز جس کا اپنے شاگردوں میں خیال رکھنا شیخ مربی کے لیے ضروری ہے، یہ ہے کہ: وہ ان کے اندر دنیا اور اہلِ دنیا کے حقیر مال ومتاع سے اعراض اور دنیا کی چمک دمک اور زیب وزینت سے بے اعتنائی کی صفت پیدا کریں، عالم تو عالم، طالبِ علم کے لیے بھی یہ بات کس قدر شرف وعزت کی ہے کہ وہ طالب کے بجائے مطلوب، قاصد کے بجائے مقصود اور راغب کے بجائے مرغوب الیہ بن جائے!!۔

استغنا کا ایک عبرت انگیز واقعہ:

آدمی اگر بقدرِ کفایت تھوڑی سی دنیا پر راضی رہنے کا مزاج بنالے تو اس کے لیے بے نیازی اور دنیا سے اعراض بہت آسان ہوجاتا ہے۔

حدیث شریف کے ایک راوی ہیں، قبیصہ بن عقبہ سوائیؒ، یہ امام بخاری کے اساتذہ میں ہیں، ابنِ ابی حاتمؒ نے ان کا ترجمہ لکھا ہے اور اس میں ایک قصہ بھی ذکر کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: خلفائے عباسیہ کے خاندان کا کوئی شخص ان کے پاس آیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے حدیث کی الگ مجلس لگائیں، جو صرف اسی کے لیے ہو، قبیصہ نے کہا کہ: تم دوسروں کے ساتھ مجلس میں حاضر ہوا کرو، مطلب یہ تھا کہ الگ سے کوئی خصوصی مجلس نہیں لگائی جائے گی، وہ عباسی شخص کہنے لگا کہ: آپ بنی ہاشم کا کچھ حق نہیں سمجھتے -گویا دھمکی دے رہا تھا-، قبیصہ یہ سن کر کھڑے ہوئے اور اندر گئے اور ایک روٹی پر کچھ نمک رکھ کر آئے اور فرمایا کہ: جو اتنی سی دنیا پر راضی ہو اس پر تمہاری باتیں کیا اثر کرسکتی ہیں!(۱)۔

(۱) الجرح والتعدیل ۷ (۲۲۲)

قاضی شریکؒ اور علی بن حسن صندلیؒ کے واقعات:

اسی طرح کا ایک واقعہ قاضی جلیل: شریک بن عبداللہ نخعیؒ کے ساتھ پیش آیا[۱]، کہ ان کے پاس خلیفہ مہدی کی اولاد میں سے کوئی شخص آیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کسی حدیث کے بارے میں معلوم کرنے لگا، شریک نے اس کی طرف توجہ نہیں دی، اس نے دوبارہ سوال دہرایا، انھوں نے پھر بھی توجہ نہیں دی، وہ کہنے لگا کہ: آپ گویا خلفاء کی اولاد کو ذلیل کررہے ہیں؟! انھوں نے فرمایا: نہیں؛ لیکن علم اہلِ علم کے نزدیک اتنا نظیف اور قیمتی ہے کہ وہ اس کو ضائع نہیں کرسکتے، یہ سن کر وہ عباسی شخص گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنا سوال دہرایا، تو شریک نے فرمایا: ہاں! اس طرح علم حاصل کیا جاتا ہے۔

"**الجواهر المضية في طبقات الحنفية**"[۲] میں علی بن حسن صندلیؒ (متوفی ۴۸۴ھ) کے ترجمہ میں ہے کہ: سلطان نے ان سے پوچھا کہ: آپ ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟ انھوں نے فرمایا کہ: میں چاہتا ہوں کہ آپ بہترین بادشاہوں کی صف میں شامل ہوں کہ آپ علماء کے پاس جایا کریں اور میں بُرے علماء میں شامل نہ ہوں کہ میں بادشاہوں کے دروازوں پر جایا کروں۔

علم سے مال طلب کرنے والے کی مثال:

طالبِ علم اور طالبِ میراث نبوی کو اس بات سے بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کہ: کہیں وہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی اِس بات کا مصداق نہ بن جائے، جو انھوں نے "احیاء العلوم" میں مرشدِ معلّم کی ذمہ داریوں میں سے دوسری ذمہ داری کے تحت لکھی ہے کہ: جس شخص نے علم کے ذریعہ مال طلب کیا، وہ ایسے ہی جیسے کسی نے اپنے چہرے سے اپنے جوتے کے نچلے حصے کو صاف کیا، کہ مخدوم کو خادم اور خادم کو مخدوم بنادیا[۳]۔

(۱) کما رواہ الخطیب فی الجامع (۳۴۶) (۲) للحافظ القرشی ۲: ۵۵۴ (۳) احیاء علوم الدین ۱: ۵۶

یہ معمول اپنائیں:

ہمیں پہلے تو عوام الناس کے بارے میں کج روی کا خوف رہتا تھا اور ہم انھیں نصیحت کرتے تھے کہ وہ سیّدنا ابوبکر صدیقؓ کے اس معمول کو اپنا دائمی معمول بنالیں [1]، جو موطا میں منقول ہے، کہ آپ مغرب کی تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد رکوع سے پہلے یہ دعا پڑھتے تھے: ﴿رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝﴾ (آل عمران) (اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو کج نہ کیجیے بعد اس کے کہ آپ ہم کو ہدایت دے چکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت خاصہ عطا فرمائیے، بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں) لیکن اب تو ہمیں طلبہ؛ بلکہ طلبہ کی ہیئت اختیار کرنے والوں پر زیادہ خوف رہنے لگا ہے؛ کیونکہ ان میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جو دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں، علم کے ذریعہ شہرت کے متلاشی ہوتے ہیں اور جاہ، منصب، اقتدار اور مال والوں کو خوش کرنے کے لیے اللہ کے دین سے کھلواڑ کرتے ہیں، گویا اس شعر کی عملی تصویر بن جاتے ہیں:

يوما يمانيٌّ إذا لاقيتَ ذا يمن ❖ وإن لقيت معدِّيا فعدناني

”تم کسی دن کسی یمنی سے ملتے ہو تو یمنی ہوتے ہو اور جب کسی معدی سے ملاقات ہوتی ہے تو عدنانی بن جاتے ہو“

یا اس شعر کے:

تزندق معلنا ليقول قوم ❖ من الأدباء زنديق ظريف

فقد بقي التزندق فيه وصفا ❖ وما قيل الظريف ولا الخفيف

”اس نے علی الاعلان زندقہ اختیار کیا؛ تاکہ ادباء کی ایک جماعت اسے خوش اسلوب زندیق کہے، زندیق کا وصف تو اس کے ساتھ لگا رہ گیا، باقی نہ اسے خوش اسلوب کہا جا سکا نہ خوش مزاج“۔

---

(۱) رواہ عنہ مالک فی الموطا ۱: ۷۹ (۲۵)

غرض جو نصیحت عوام کو کی جاتی تھی اب طلبہ کے لیے اس پر عمل کرنا اور اس معمول کو اپنانا زیادہ ضروری ہو گیا ہے؛ کیونکہ ان کا معاملہ عوام کی طرح نہیں ہے، وہ امت کے راہبر و راہنما ہیں، ''**وإذا انطمست النجوم أوشك أن تضل الهداة**'' کہ جب ستارے ڈوب جاتے ہیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ مسافر راستہ بھٹک نہ جائیں۔

علماء کی صورتِ حال:

ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ آپ کو ان میں سے ایک کے اندر بھی اللہ کو خوش کرنے کی سچی فکر نہیں ملے گی، گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا ہی نہیں: ﴿**وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ**﴾ (التوبہ: ۶۲) (اللہ اور اس کے رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ یہ لوگ اس کو راضی کریں) ان کا رُخ تو اسی طرف ہوتا ہے جس طرف ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کو یہ راضی کرنا اور خوش کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ لوگ مشرق میں جاتے ہیں تو یہ بھی مشرق میں چلے جاتے ہیں اور اگر وہ مغرب میں جاتے ہیں تو یہ بھی مغرب میں چلے جاتے ہیں!! تو پھر ان کے سروں پر موجود اسلام کا شعار کہاں چلا گیا؟! اور ان کے چہرے پر سجے ہوئے سنت کے شعار کا کیا ہوا؟!

میرے اساتذہ کا استغناء:

ہم نے اپنے شیوخ میں ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کے پاس اپنے اہلِ خانہ کے لیے اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ پیٹ بھر سکیں؛ لیکن پھر بھی وہ اپنے علم پر افتخار اور اپنے سر پر موجود اسلام کے تاج کی عظمت و احترام میں تمام اہلِ دنیا پر اپنی ناک چڑھائے رکھتے تھے، ان کا زمانہ زیادہ دُور کا نہیں ہے، وہ ہمارے ان خاص اساتذہ میں ہیں، جن کی نسبت حاصل ہونے اور جن کی شاگردی اختیار کرنے پر ہمیں فخر ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت اور مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے۔

چھٹی مشعل

علمی اور تربیتی اعتبار سے
اچھی بات کی تحسین اور بُری بات کی بُرائی کرنا

شیخ کے ذمہ اپنے شاگردوں کے تعلق سے ایک علمی واخلاقی ذمہ داری اور بھی ہے، جو دراصل ایک عمومی معاشرتی تربیت سے تعلق رکھتی ہے اور اس ذمہ داری کا ذکر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان شمائل میں بھی ملتا ہے، جو ہند بن ابی ہالہؓ کی مشہور طویل حدیث کے اندر مذکور ہیں، جسے ترمذی نے اپنی ''شمائلِ محمدیہ'' میں متفرق جگہوں پر ذکر کیا ہے؛ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: آپ اپنے صحابہؓ کی خبرگیری فرماتے تھے اور لوگوں کے احوال اور باہمی معاملات کے بارے میں دریافت فرماتے تھے، آپ اچھی بات کی تحسین فرما کر اس کی تقویت فرماتے اور بُری بات کی بُرائی بتا کر اس کو زائل فرماتے تھے (۱)۔

---

(۱) ترمذی نے اس حدیث کو شمائلِ محمدیہ میں چار جگہ (۸، ۲۲۵، ۳۳۶، ۳۵۱) ذکر کیا ہے، یہ ٹکڑا تیسری جگہ پر ہے، اسے بہت سے لوگوں نے ان ہی کی سند سے روایت کیا ہے، اس کی سند میں کئی ایک ضعیف راوی ہیں، جن میں سب سے ضعیف راوی جمیع بن عمیر عجلی ہے، جس پر ابنِ حبان نے ''مجروحین'' (۱/۲۸۱) میں وضع کی تہمت لگائی ہے، اگرچہ ''ثقات'' (۸/۱۶۶) میں بھی اس کو ذکر کیا ہے؛ لیکن اس ضعف کے باوجود بھی بیشتر علماء جنھوں نے شمائل پر کتابیں لکھی ہیں، اس حدیث کو ذکر کر کے اس پر اعتماد کیا ہے، اس میں موجود مضامین کے الگ الگ شواہد بھی بہت ہیں۔

شاگردوں کی خبر گیری:

چونکہ میری گفتگو کا محور استاذ و مربی اور ان سے علم وعمل سیکھنے والے ان کے شاگرد ہیں؛ اس لیے میں مذکورہ شمائل سے متعلق صرف وہی باتیں کہنا چاہتا ہوں جو ہمارے موضوع سے مناسبت رکھتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ: شیخ مربی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اِس پہلو کی اقتدا کرنی چاہیے؛ وہ سب سے پہلے اپنے شاگردوں کی خبر گیری کرے اور ان کی موجودگی اور عدم موجودگی میں ان کا تفقد احوال کرے، کبھی کوئی غائب ہو تو اس کی وجہ معلوم کرے اور جو بھی وجہ ہو اس کے ساتھ مل کر اسے حل کرنے کی کوشش کرے، ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہو اور ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسبِ حال غمخواری کرے۔

لوگوں کے احوال سے واقفیت:

وہ ان سے لوگوں کے کے بارے میں بھی پوچھتا رہے؛ تا کہ وہ اس کامیاب ڈاکٹر کی طرح ہو جائے جس کی دوا اور علاج سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور شفا ملتی ہے؛ کیونکہ اسے ان سوالات سے لوگوں کی بیماریوں سے آگاہی حاصل ہوگی، پھر وہ علاج کرے گا تو بصیرت کے ساتھ کرے گا، اس طرح وہ اپنے زمانہ اور ماحول کے ساتھ جینے لگے گا، وہ پندرہویں صدی ہجری میں رہ کر دسویں صدی ہجری کی ذہنیت کے ساتھ نہیں جیے گا۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عادتِ مبارکہ کو اپنانے میں دو فائدے ہیں: ایک تو عالم کا اپنے زمانے کے ساتھ جینا، دوسرے بصیرت کے ساتھ لوگوں کی بیماریوں کا علاج کرنا۔

اچھی چیز کی اچھائی اور بُری چیز کی بُرائی بیان کرنا:

پھر شیخ اور شاگردوں کے اس تعلق میں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ: شیخ ان طلبہ کے اندر جو چیز اچھی دیکھے اس کی تحسین کرے، مثلاً اگر کسی طالبِ علم کے اندر کسی صفت یا کسی علم کے تئیں نجابت نظر آئے تو اس کی تحسین کرے اور اسے بتائے کہ فلاں چیز تمہارے

اندر اچھی ہے اور ساتھ ہی اس پر برقرار رہنے کے لیے اس کو ترغیب دے، اس سے اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی مہمیز ملے گی، اور خود اس طالبِ علم کے اندر مزید کمال اور مہارت پیدا کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا، اسی طرح اگر وہ کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے یا اس کے سامنے کوئی ناپسندیدہ چیز ذکر کی جائے، تو اس کی مذمت بھی کرے اور ساتھ ہی نرمی اور آہستگی کے ساتھ خواہ اشارۃً ہو یا صراحۃً اس کے فاعل کی بھی مذمت کرے؛ تاکہ سب کے دل میں اس قول اور فعل کی بُرائی بیٹھ جائے۔

اس کی ایک مثال ابھی قریب ہی میں گزری ہے، جو بیہقیؒ کی ''مناقبِ شافعی''(۱) کے حوالے سے نقل کی گئی تھی کہ جس وقت امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کے اندر فصاحت اور نجابت دیکھی، تو ان سے ان کا نام دریافت کیا، انھوں نے بتایا: محمد، تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ: محمد! اللہ سے ڈرتے رہنا اور گناہوں سے بچتے رہنا، عنقریب تمہاری ایک شان ہوگی۔

یہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے:

ہند بن ابی ہالہؓ کا یہ جملہ کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھی چیز کی تحسین فرما کر اس کی تقویت فرماتے تھے اور بُری بات کی بُرائی بتا کر اس کو کمزور کرتے تھے'' اس کو میں تربیت اور کردار سازی کے باب میں خواہ قولاً تربیت ہو یا عملاً، جوامع الکلم میں شمار کرتا ہوں، یہ ایک جامع کلمہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے درمیان پیش آئے اُن بہت سے الگ الگ واقعات اور مواقع سے ماخوذ ہے، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھی چیز کی تحسین فرما کر اس کو تقویت عطا کی اور بُری چیز کی بُرائی بتا کر اُس کو کمزور کیا، یہ جملہ ہر ذمہ دار شخص کے لیے اپنے ماتحتوں کے بارے میں ایک اُصول اور ایک ہدایت ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے سلسلے میں لاپرواہی برت کر اور ان کی کج روی کو درست نہ کر کے انھیں ضائع نہ کرے؛ کیونکہ **''الدین النصیحۃ''** دین سراسر خیرخواہی کا نام ہے۔

(۱) ۱:۱۰۲

خاتمہ

طالبِ علم کی رہنمائی اور اس کے علمی راستے کو روشن کرنے کے لیے جن مشعلوں کی ضرورت ہے وہ بے شمار ہیں، ان صفحات کے ذریعہ تو اس موضوع پر لکھنے کے لیے صرف راستہ کھولنے کی کوشش کی گئی ہے، مجھے اُمید ہے کہ میں نے جو چیز پیش کرنی چاہی تھی اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق دے دی، میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ مجھ کو، میری اولاد کو، میرے شاگردوں کو اور تمام قارئین کو نفع پہنچائے اور جو ذمہ داریاں اس طالبِ امروز اور عالمِ فردا کے حوالے سے بیان کرنے سے رہ گئی ہیں ان کے استدراک کی توفیق عطا فرمائے۔

علامہ محمد العربی الفاسیؒ کی ایک نہایت جامع وصیت:

حال ہی میں ڈاکٹر محمد بن عزوز نے **"مختارات من وصايا اندلسية مغربية"** کے نام سے ایک عمدہ رسالہ طبع کرایا ہے، جس میں انھوں نے اندلس کی مختلف وصیتیں منتخب کر کے جمع کر دی ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، ویسے تو یہ ساری وصیتیں ہی نہایت دلچسپ اور نفع سے بھرپور ہیں؛ لیکن مجھے اس میں بطور خاص گیارہویں صدی ہجری کے مغرب کے چوٹی کے علماء میں شمار ہونے والے، ماہر علوم وفنون علامہ ابو حامد محمد العربی بن یوسف الفاسیؒ (۹۸۸-۱۰۵۲) کی وصیت، جو انھوں نے اپنے بچوں کو کی تھی، جس وقت وہ علم حاصل کرنے کے لیے فاس جا رہے تھے، بہت اچھی لگی، اس وصیت کی کشش یہ ہے کہ اس میں نہایت اختصار کے ساتھ طالبِ علم کی تمام ذمہ داریوں کو سمیٹ دیا گیا ہے اور ساتھ

ہی اسے پڑھنے اور علم حاصل کرنے کے لیے ایک راستہ اور ایک منہج بھی بتایا گیا ہے۔

اس وصیت سے پہلے ڈاکٹر ابنِ عزوز نے وصیت کا، وصیت لکھنے والے کا اور جن کے لیے وصیت لکھی گئی ہے ان سب کا تعارف کرایا ہے، میں اس تعارف کو چھوڑتے ہوئے صرف وصیت کو نقل کرتا ہوں(۱) علامہ فاسیؒ اپنے بچوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ(۲):

علامہ الفاسیؒ کی پہلی نصیحت:

میں تمھیں سب سے پہلے خلوت وجلوت میں اللہ رب العزت سے ڈرتے رہنے، کام کی چیزوں پر توجہ دینے، جماعت کی نماز کو لازم پکڑنے، علم میں ہمہ تن مشغول رہنے اور جتنا زیادہ ہو سکے علم حاصل کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔

تمھاری توجہ ''**الاهم فالاهم**'' پر ہونی چاہیے، علوم تو سارے ہی اہم ہیں؛ لیکن سب سے اہم علم شریعت کا ہے، یاد رکھو! جس مسئلہ کو آج سیکھ سکتے ہو، اسے کل پر مت ٹالو اور کسی بھی علم کو حقیر مت جانو ﴿**هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝**﴾ (الزمر) (آپ کہیے کیا علم والے اور جہل والے (کہیں) برابر ہوتے ہیں وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہلِ عقل (سلیم) ہیں)۔

علمِ نحو حاصل کرو:

لہٰذا تم علمِ نحو میں لگ جاؤ اور خوب محنت سے اس کے اہم قواعد حاصل کرو، اس سلسلے میں ''**ألفية**'' تمھارے لیے کافی ہوگی، اسے خوب اچھی طرح سمجھو اور یاد کرو؛ کیونکہ نحو

(۱) ص ۱۴۱-۱۴۷

(۲) اس وصیت کے درمیان کچھ ایسے اسماء، اعلام اور مؤلفات کا بھی ذکر آیا ہے، جو اندلس کے اُس مغربی دیار میں تو معروف ومشہور ہیں؛ لیکن ہمارے یہاں مشرق میں غیر معروف اور غیر متداول ہیں؛ اس لیے ان سب کا حاشیہ میں تعارف کرادیا گیا ہے۔

امتِ عربیہ کے علوم کی کنجی ہے، پھر علمِ نحو سے علمِ صرف بھی جُڑا ہوا ہے (۱)، اسی طرح اس کے توابع میں علمِ عروض بھی ہے؛ کیونکہ نحو کے بعض مسائل میں اس کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

علمِ عقائد، علمِ کلام اور منطق وفلسفہ:

اسی طرح عقائد کا علم بھی حاصل کرو؛ کیونکہ وہ دین کی اصل اور بنیاد ہے، اس کے بعد اگر تمہیں کوئی محقق استاذ مل جائے تو اس سے علمِ کلام بھی پڑھ لو، اور اگر کسی کے پاس اسلامی فلسفہ کی تحقیق ممکن ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اسے بھی کرلو؛ کیونکہ اسلامی فلسفے سے عقل کے اندر حدت، فکر کے اندر پختگی، بات کے اندر گہرائی وگیرائی، عبارت کے اندر جامعیت، نتیجہ نکالنے میں درستگی اور نتیجہ نکالنے والے کے اندر جرأت پیدا ہوتی ہے، اس سے کسی بھی علم کے اندر فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، پھر اس کے اندر سب سے اہم علم ''منطق'' ہے، شیخ ابنِ عرفہؒ فرماتے ہیں کہ: جو شخص علمِ منطق سے ناواقف ہو اس کے علم پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک متداول علم ہے، جس کو بآسانی حاصل کیا جاسکتا ہے؛ لہٰذا تم اس پر توجہ دو۔

علمِ حساب:

علمِ حساب میں سے بھی بقدرِ ضرورت حاصل کرلو، جو علمِ فرائض اور علمِ ہیئت وغیرہ

(۱) اسی کتاب **''مختارات من وصايا اندلسية مغربية''** کے اندر ایک وصیت عبدالرحمٰن بن عذرہ انصاریؒ (متوفی ۶۰۶ھ) کی بھی ہے، جس میں انھوں نے اپنے بیٹوں کو حصولِ علم میں محنت کرنے پر اُبھارا ہے، آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ: نحو پڑھنے کے ساتھ ساتھ لغت کا علم بھی حاصل کرو اور جو اس میں سے تمہارے پاس ظاہری طور پر محفوظ ہو بس اسی کے مطابق گفتگو کرو، خوب سمجھ لو کہ نحو اور لغت دونوں ایک دوسرے کے لیے رضاعی بھائی کی طرح ہیں، یہی دونوں علوم انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتے ہیں، یہ دونوں علوم؛ علومِ شرعیہ وطبعیہ کے لیے بنیاد اور بڑے بڑے علوم ومعارف کے لیے محور کی حیثیت رکھتے ہیں؛ ان دونوں میں سے خوب اپنا حصہ لو، اس کے بعد پھر ان شاء اللہ تمہارے لیے ہر علم آسان ہوجائے گا۔

میں کام آئے، اس سلسلے میں قلصادی(۱) کی کتابیں کافی ہیں۔ یہ علم مقصود لغیرہ ہے؛ اس لیے اسے اتنا ہی حاصل کرو جتنی دوسرے علوم میں ضرورت پڑتی ہے، اس کو مقصود بالذات مت بناؤ، کہ اسی میں منہمک ہو کر رہ جاؤ اور دوسرے اہم علوم سے غافل ہو جاؤ۔

علمِ نجوم:

علمِ نجوم بھی بقدرِ ضرورت حاصل کرلو، جس کے ذریعہ عبادات میں سے نماز کے اوقات اور قبلہ کا رُخ اور عادات میں سے مختلف موسموں کا پتہ لگا سکو، اس سلسلے میں متداول کتاب ابو مقرع کی ''رجز'' ہے، اگر موقع ہو تو اس کو اور ''روضہ'' کو پڑھ لو، اور پھر ابن البنا کی ''یسارۃ'' کو بھی اگر سمجھنے کا موقع مل جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، بس اتنا کافی ہے، اتنا حاصل کرلو، تو سمجھ لو کہ تم نے اس علم کے اندر اپنی خواہش پوری کرلی، اب تم سے جو کچھ بچا ہے اس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

علمِ طِب:

جہاں تک علمِ طب کی بات ہے تو اس سلسلے میں ابنِ سینا کی ''ارجوزہ'' کافی ہے؛ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس کو پڑھانے والا تمھیں کوئی نہ ملے۔

تجوید وقرأت:

ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ کتاب اللہ کو اچھی طرح حفظ کرو اور اس کی ادائیگی اور رسم وضبط کی تحقیق کرو اور اس کے لیے اپنی وسعت کے بقدر بہتر سے بہتر استاذ تلاش کرو اور کتابوں میں سے خزار اور ابنِ بری کی رسم اور ضبط کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

(۱) یہ ابوالحسن علی بن محمد قلصادی ہیں، جو اصلاً اندلسی ہیں، اور تونس میں وفات پائی، سن وفات ۸۹۱ھ ہے، علمِ حساب میں ان کی بہت سی کتابیں ہیں، سخاویؒ نے ''الضوء اللامع'' (۵ر ۱۴) میں ان کا ترجمہ لکھا ہے، ان کی کتابوں میں ''رجز ابی مقرع'' کی شرح بھی ہے، جس کا ذکر چند سطروں بعد آرہا ہے۔

تفسیر قرآن:

یاد رکھو! تمھیں درہم و دینار قرآن کی ترکیب، قرآن کی تفسیر اور قرآن کے احکام جیسی اہم چیزوں کے حصول سے غافل نہ کرنے پائیں، اگر ہمارے استاذ و امام سیّد عبدالرحمٰن (۱) کے درسِ تفسیر میں تمھیں حاضر ہونے کا موقع مل جائے تو ان شاء اللہ یہ چیز مالِ غنیمت ثابت ہوگی، باقی مطالعہ کرنے اور سمجھنے کے لیے سب سے اچھی تفسیر جو میں تمھارے لیے پسند کرتا ہوں وہ ابنِ جزی کی تفسیر (۲) ہے، اس سلسلے میں اختلاف کرنے والوں کا اختلاف مجھے منظور نہیں۔

علمِ بیان اور علمِ معانی:

علمِ بیان اور علمِ معانی اور ان کے ذیلی علوم کو جاننا بھی ضروری ہے، ان ہی علوم کے ذریعہ کتاب اللہ اور احادیثِ مبارکہ کے اسرار سے واقفیت ہوتی ہے، اس سلسلے میں قزوینی کی ''تلخیص'' (۳) نہایت تشفی بخش ہے، خاص طور پر جب اس کے ساتھ شیخ سعد الدین کی شرح ملالی جائے، تم لوگ ہمارے استاذ سیّد عبدالرحمٰن سے اُن چیزوں کی اجازت حاصل کرنا، جس کی انھیں شیخ قصار (۴) سے اجازت ملی ہے، اسی طرح ان کی اپنی تالیفات، نظم اور نثر کی بھی اجازت حاصل کرلینا اور اگر تمھیں ان سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم سننے کا موقع مل جائے تو پھر کیا کہنے۔

(۱) یہ ابو زید عبدالرحمن بن محمد الفاسی متوفی سنہ ۱۰۳۶ ہیں

(۲) اس تفسیر کا نام ''التسھیل'' ہے، جو متعدد بار طبع ہوچکی ہے، یہ تفسیر بیضاوی اور تفسیر نسفی سے قریب تر ہے، اور اس سے استفادہ بہ نسبت ان دونوں کے زیادہ آسان ہے؛ لیکن اس کا مطالعہ کرنے کے لیے کتاب اللہ کا حافظ ہونا ضروری ہے۔

(۳) یہ ''تلخیص'' قزوینی کی ہے، جس میں انھوں نے سکاکی کی ''مفتاح العلوم'' کی تلخیص کی ہے اور سعد الدین کی یہ شرح دونوں کی شرح ہے۔

(۴) یہ ابو عبداللہ محمد بن القاسم القصار متوفی سنہ ۱۰۱۲ ہیں۔

فقہ:

ان سب کے ساتھ فقہ کو اپنی سب سے بڑی پونجی بناؤ اور سب سے زیادہ توجہ اسی پر دو، اس کے لیے ''**الرسالة**'' اور ''**المختصر**''(۱) کو زبانی یاد کرنا اور سمجھنا ضروری ہے، اگر کسی مسئلہ میں کوئی اشکال ہو یا کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے، تو ایسا نہ ہو کہ تم اسے ٹھنڈے بستے میں ڈال دو اور جب تک وہ پیٹھ پھیرے رہے تم بھی پیٹھ پھیرے رہو، تم اس کے پیچھے پڑ جاؤ اور اس فن سے واقف لوگوں سے رجوع کر کے اور کتابوں کے مطالعہ سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو؛ تا آنکہ تمھیں تشفی حاصل ہو جائے اور جس سے تم پوچھو اسے حقیر مت جانو، یہی ہمارے استاذ امامِ وقت سیّد محمد قصّار نے ہمیں وصیت کی تھی۔

پھر اس تحقیق و تفتیش میں پڑ کر تم اس کام میں لگنے سے غافل مت ہو جاؤ، جو ایک طالبِ علم کے لیے سب سے بہترین کام ہے، بشرطیکہ اس کے اندر غور و فکر کی اہلیت اور سمجھنے کی صلاحیت ہو اور اس کام کو کرنے کی استعداد بھی پیدا ہو چکی ہو اور وہ کام یہ ہے کہ طالبِ علم کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ اور اجماعِ امت سے مسائل کے دلائل اور مآخذ معلوم کرے، یہاں تک کہ ہر فرع اصل کے ساتھ جُڑ جائے اور دونوں باہم مربوط ہو جائیں۔

اُصولِ فقہ اور مسلک کے قواعد کا علم:

اسی طرح اپنے امام کے ان قواعد کو بھی جاننے کی کوشش کرے، جن پر انھوں نے

(۱) یہ ''**الرسالة**'' امام ابنِ ابی زید قیروانی مالکیؒ (متوفی ۳۸۶ھ) کا ہے، جنہیں ''مالکِ صغیر'' کہا جاتا تھا، ان کی یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی، لوگ اس کو حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، یہاں تک کہ اسے سونے سے بھی تحریر کیا گیا۔

اور جہاں تک بات ''المختصر'' کی ہے، تو وہ امام خلیل بن اسحاق جندیؒ (متوفی ۷۷۶ھ) کی ہے، وہ متاخرین مالکیہ میں سب سے مشہور امام ہیں اور ان کی کتاب بھی متاخرین مالکیہ کی سب سے مشہور کتاب ہے۔

اپنے اُصول وفروع کی بنیاد رکھی ہے، اس کے لیے ایک تو اُصولِ فقہ پڑھنا ضروری ہے، جس کے لیے ابن السبکیؒ کی ''جمع الجوامع'' کافی وشافی ہے، دوسرے: مسلک کے قواعد جاننا بھی ضروری ہے، جس کے لیے وَنشرِیسی کی ''ایضاح المسالک'' میں تشفی بخش مواد موجود ہے، جس کو ان کے بیٹے سیّدی عبدالواحد(۱) نے ایک مقید ''ارجوزے'' میں کچھ اضافے کے ساتھ نظم بھی کیا ہے؛ نیز زقّاق (۲) نے بھی مسلک کے قواعد کو نظم کیا ہے، جسے اس کے مظان: قرافی اور مقری وغیرہ کے قواعد میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

اخلاص اور اخلاقِ حمیدہ سے آراستگی:

پھر ان سب سے تمہارا مقصود اللہ تعالیٰ کا قرب ہونا چاہیے، تم اخلاص کو اپنا ہم رکاب بنالو، ایسا نہ ہو کہ اپنے ارادہ میں کوئی دنیوی غرض ملا کر اس کی صفائی اور نکھار کو گدلا کردو؛ دنیا اس لائق نہیں کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے سب سے معزز ومحترم مقصود کو ذریعہ بنایا جائے، علم کا فائدہ عمل ہے اور عقلمند کو اللہ کے علاوہ کسی سے اُمید نہیں لگانی چاہیے، حدیث میں **"إنما الأعمال بالنيات الخ"** کہا گیا ہے کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے؛ لہٰذا جتنا ہوسکے اپنی نیتوں کی تصحیح کی کوشش کرو اور تقویٰ اور نیکی کو لازم پکڑلو؛ یہ دنیا اور آخرت میں ذخیرہ اور نجات کا سبب ہے۔

تم نیک لوگوں کے زیور سے آراستہ ہونے کی ہر ممکن سعی کرو اور اپنے اندر ان چیزوں کی عظمت پیدا کرو، جن کو اللہ نے عظیم بتلایا ہے؛ نیز تواضع، حیا، عفت وپاکدامنی، حسنِ

(۱) یہ فقیہ مفتی عبدالواحد بن احمد بن یحییٰ ونشریسی ہیں، تنبکتی نے ''نیل الابتہاج'' (ص/۲۸۹) پر ان کی تاریخ وفات ۹۵۵ھ لکھی ہے، لفظ **"مقيدة"** یہ اسی طرح اس مطبوعہ کتاب کے اندر جہاں سے میں نے نقل کیا ہے، شاید یہ فا کے ساتھ **"مفيدة"** ہے۔

(۲) علامہ ابوالحسن علی بن محمد الزقاق التجیبی متوفی سنہ ۹۱۲، رحمہ اللہ

معاشرت، نرم مزاجی، عفوو درگزر، وقار و سنجیدگی، اعضاء کی شرافت، عالی ظرفی، نامناسب چیزوں سے نظروں کی حفاظت، پاکیزگی نفس، گھٹیا اور خلافِ مروت کاموں سے دُوری اور ان کے علاوہ جتنے بھی اوصافِ حمیدہ ممکن ہوں پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

رذائل سے اجتناب:

اور تکبّر سے اپنے آپ کو بچاؤ، یاد رکھو! سب سے نقصان دہ تکبّر علم کے حصول میں کیا جانے والا تکبّر ہے، سخت گیری اور خواہش پرستی سے بچو، ایک انتہائی نقصان دہ چیز بُرا ساتھی ہے؛ کیونکہ وہ ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اور طبیعتیں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتی ہیں، عوام کے درمیان یہ جملے مشہور ہیں: "**كن مع من تكون، فمثله**" تم جس کے ساتھ چاہو رہو، ویسے ہی بن جاؤ گے، "**مع من رأيتك شبهتك**" میں تمھیں جس کے ساتھ بھی دیکھوں گا اُسی سے تشبیہ دوں گا، اور "**إياك أن ترضى بصحبة ساقط**" تم کسی گھٹیا شخص کی صحبت میں رہنے سے بچو۔

''ایسے شخص کے ساتھ مت رہو جس کا فعل تمہارے لیے ترغیب کا باعث نہ ہو اور جس کا قول تمھیں اللہ کی یاد نہ دلائے''(۱) اگر تم کسی قوم کے درمیان رہو تو ان میں سے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو اور جب نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو تو ادب اور وقار کو لازم پکڑو؛ اور زیادہ بے تکلفی اور ناز و نخرے سے احتراز کرو؛ کہ اس سے دلوں میں کینے پیدا ہوتے ہیں اور دبی ہوئی چیزیں ابھر آتی ہیں، جو شخص لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے، اس کی وقعت ختم ہو جاتی ہے، اور لوگ اسے اہمیت نہیں دیتے؛ بلکہ اس کو حماقت اور کم عقلی سے متصف کرتے ہیں؛ یقیناً طبیعتیں مزاح کی متقاضی ہوتی ہیں، لیکن مزاح کلام کے اندر اتنا ہی ہو جتنا کھانے میں نمک ہوتا ہے۔

(۱) پیچھے ص ۱۵۵ پر گزر چکا ہے کہ یہ ابن عطاء الاسکندری کی حکمتوں میں سے ہے۔

اپنے کلام کو بھی اپنے اعمال کا ایک حصہ سمجھو اور اپنے اعمال کو جتنا ہو سکے سنوارنے کی کوشش کرو اور کام کی چیزوں میں مشغول رہو؛ کیونکہ "آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے" اور اپنے والد سے محبت رکھنے والوں کا حق پہچانو؛ یہ بھی آدمی کی نیکی میں سے ہے کہ وہ اپنے باپ سے محبت کرنے والوں کا اکرام کرے۔

وصیت مکمل ہوئی اور اسی کے ساتھ کتاب بھی مکمل ہوگئی۔

میں اللہ تعالیٰ سے توفیق، اخلاص، قبولیت اور کتاب کی نافعیت کا سوال کرتا ہوں، بلاشبہ وہ اکرم الاکرمین ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امتِ محمدیہ کے ساتھ تمام احوال کے اندر کشادگی، مدد، مہربانی اور شرف وعزت کا معاملہ فرمائیں، بلاشبہ وہ ارحم الراحمین ہیں۔

وصلّى الله عليه وسلم علىٰ سيّدنا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

محمد عوامہ

مدینہ منورہ

۹/۲/۱۴۳۴ھ

کتاب کے بارے میں

اِس دَور کے عظیم محقق، محدث فقیہ شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ ورعاہ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، وہ اپنے خصوصی استاذ شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کے محدثانہ وفقیہانہ ذوق کے امین اور سچے جانشین ہیں، موصوف کی شاہ کار تصنیف ''معالم إرشادية لصناعة طالب العلم'' اُن کے رُسوخ فی العلم، وسعتِ علمی، دقتِ نظری، درایت وفقاہت، علمی غیرت، تحقیق واتقان اور سلفِ صالحین کی پیروی جیسی بیش بہا صفات کا آئینہ دار ہے، یہ ایک رہبر اور ذہن ساز کتاب ہے، جس کی سطر سطر فکر انگیز اور دل ودماغ کی گرہوں کو کھولنے والی ہے، قابلِ مبارک باد ہیں عزیز گرامی حضرت مولانا مفتی محمد قاسم اُور صاحب حیدرآبادی (سابق معین مدرّس دارالعلوم دیوبند) جنھوں نے صرف تین یا چار ماہ کے اندر پانچ سو صفحات پر مشتمل اس بے نظیر کتاب کا ترجمہ مکمل کرلیا حیرت ہوتی ہے کہ اتنی کم مدت میں ایسا سلیس اور رَواں دَواں ترجمہ! شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ ورعاہ کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے احساس تھا کہ اس کی اُردو ترجمانی آسان نہیں ہوگی؛ اِس لیے کہ شیخ علمِ لغت کے بھی ماہر ہیں اور الفاظ کے انتخاب اور تعبیرات کے تعلق سے کافی دقت سے کام لیتے ہیں؛ لیکن مفتی قاسم صاحب جو خود اُردو ادب اور عربی ادب دونوں میں مہارت رکھتے ہیں، اُنھوں نے خدا تعالیٰ کی توفیق ومدد، فنی مہارت اور اپنے صاف ستھرے ذوق کی وجہ سے بلاشبہ ترجمانی کا حق ادا کردیا، مزید برآں کتاب کے شروع میں ایک مفصل مقدمہ لکھ کر پوری کتاب کے مغز اور نچوڑ کو پیش کردیا ہے، مقدمہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف مترجم نے کتاب کی عبارت کا لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے؛ بلکہ شیخ کے فکر واحساس کا بھرپور ادراک حاصل کرنے کے بعد مضامین کی تہہ میں جاکر بہترین ترجمانی کی ہے، یہ مقدمہ بجائے خود ان شاء اللہ مہمیز کا کام دے گا۔

(اقتباس از تاثرات حضرت مولانا مفتی محمد مصعب صاحب قاسمی نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

maktabatul_ittihad@yahoo.com

www.ittihad.in

₹ 440.00